کرن
اگست 2016
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY
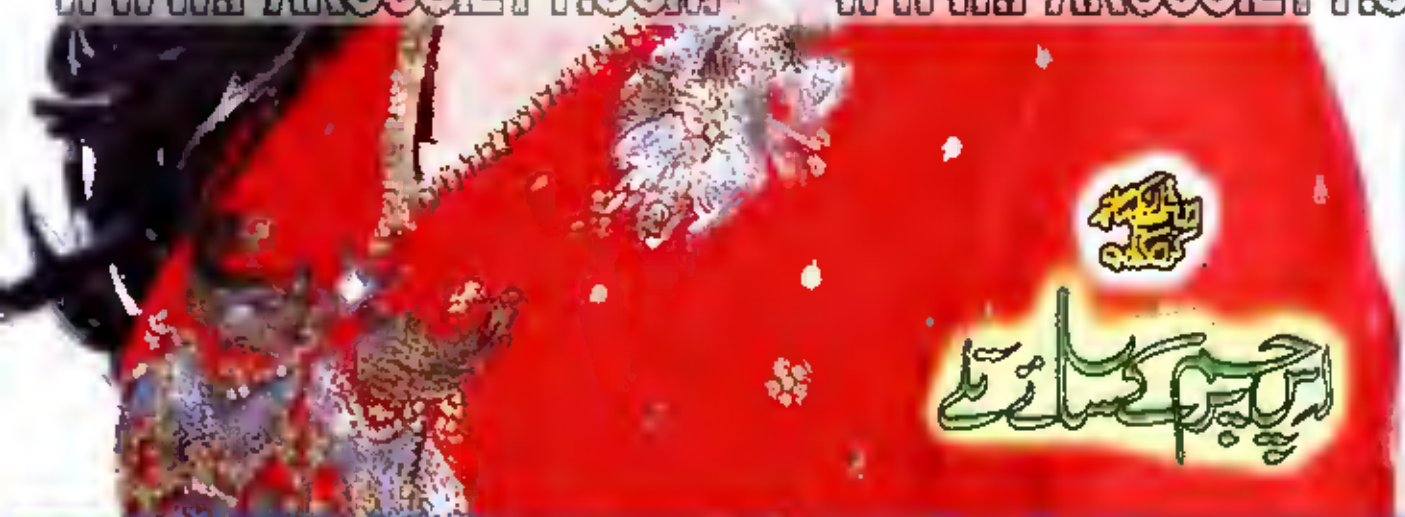
زرسالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 7000 روپے

اگست 2016
جلد 39 شمارہ 5
قیمت 60 روپے

37- اردو بازار کراچی
خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔
پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

اگست کا مہینہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک خوش گوار اور روشن تاریخ رکھتا ہے۔
14 اگست 1947ء وہ دن جب ہمیں آزادی کی نعمت ملی۔ پاک وطن، اپنی سرزمین جہاں ہم قدم جما کر کھڑے ہو سکیں۔ آزادی سے اپنے مذہب، اپنے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اپنی تہذیب اپنی روایات کا تحفظ کر سکیں۔
آزادی کتنی بڑی نعمت اور اپنا وطن قدرت کا کتنا بڑا بے بہا انعام ہے۔ اس کی قدر ان سے پوچھیں جو اس سے محروم ہیں اور اس کے حصول کے لیے جانیں گنوا رہے ہیں۔
پاکستان کا قیام ایک معجزہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سرزمین سے نوازا جہاں ہر نعمت موجود تھی لیکن افسوس ہم نے اس کی قدر نہ کی۔ اس مقصد کو بھول گئے جس کے لیے پاکستان بنا تھا۔ مختلف تعصبات اور آپس کی نفرتوں میں الجھ گئے۔ ہمارے ازلی دشمن نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ہم اپنا آدھا ملک گنوا بیٹھے۔
افسوس کہ ہم اب بھی اپنے دشمن کی چالوں کو نہیں سمجھ سکے اور آپس کے جھگڑوں میں الجھے ہوئے ہیں۔
قارئین کو جشن آزادی مبارک۔
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم آپس کے جھگڑوں، تعصب اور نفرتوں کو بھول کر متحد ہو جائیں۔ ہمارا اتحاد ہی دشمن کی چالوں اور اس کے مذموم ارادوں کو ناکام بنا سکتا ہے۔

محمود خاور کی برسی،

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ جس سے انکار ممکن نہیں لیکن کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی جدائی کو دل کبھی تسلیم نہیں کرتا۔
بچوں کے ممتاز ادیب اور کالم نویس محمود خاور کو ہم سے بچھڑے سترہ سال گزر گئے، لیکن آج بھی وہ ہمارے اور اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ 20 اگست کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں کو درگزر فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- عبدالستار ایدھی کی یاد میں۔ شاہین رشید، اداکارہ سونیا مشال سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "زینت جمیل" کہتی ہیں میری بھی سنیے" ، اس ماہ "غنویٰ اکرم" کے مقابل ہے آئینہ"
- تنزیلہ ریاض کا سلسلے وار ناول "راپنزل"
- "دست مسیحا" نگہت سیما کا مکمل ناول، "تم دینا ساتھ میرا" دیا شیرازی کا مکمل ناول،
- "در پردہ محبت" ، ثمامہ ثابت غزل کا مکمل ناول، "شیشنگ یادیں" مہوش افتخار کا ناولٹ،
- "قصہ ایک انوکھے لاڈلے کا" ام ایمان قاضی کا ناولٹ، "منزل عشق" حنا بشریٰ کا ناولٹ،
- نفیسہ سعید، صبا ممتاز، اقرا اعجاز اور نادیہ خان کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب "اس پرچم کے سائے تلے" مفت حاصل کریں۔

حمد باری تعالیٰ

اے رب سماوات تیری ذات ورا ہے
ہیبت سے تیری کوہ گراں کانپ رہا ہے

انسان بے چارہ تجھے کیا جان سکے گا
ادراک کی دنیا میں تجھے ڈھونڈ رہا ہے

ہیں تیرے ہی انداز، عزیزی و امیری
دیتا ہے کبھی اور کبھی مانگ رہا ہے

معلوم ہے اتنا کہ ہمیں کچھ نہیں معلوم
جانا ہے کہ کیا جانے گا جو جان گیا ہے

ہر سمت ہے وجہ اللہ عیاں خالق احسن
خود آئینہ خود دیدۂ حیران ہوا ہے

واصف علی واصف

نعت رسول مقبول

ہے ثبت تری ذات سے تاریخ بشر میں
وہ عزم کہ تھکتا نہیں طائف کے سفر میں

تو نور ازل تاب سر مطلع تخلیق
فیضان ضیا تجھ سے ہے دامان سحر میں

خورشید کے کاسے میں ترا صدقۂ انوار
خیرات ترے حسن کی کشکول قمر میں

اے سارے جہانوں کے لیے مژدۂ رحمت
احوال زمانوں کے سبھی تیری نظر میں

اشکوں کو زمیں پر بھی میں گرنے نہیں دیتا
سرمایہ تری یاد کا ہے دیدۂ تر میں

انور مرے دیوان میں نعت پیمبر
کیا توشۂ عقبیٰ ہے مرے رخت سفر میں

انور مسعود

سونیا مشال سے ملاقات

شاہین رشید

سونیا مشال کا شمار ان فنکاراؤں میں نہیں ہوتا جو راتوں رات شہرت کی بلندیوں کو چھو لیتی ہیں۔ کیونکہ زمانہ مقابلے کا ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ دو تین پروجیکٹ کرکے ہی سونیا نے پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کے دل میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ ٹھہرے ہوئے انداز میں اداکاری کرنے والی سونیا مشال کو آپ آج کل ڈرامہ سیریل "خواب سرائے" میں دیکھ رہے ہیں۔ جس میں سونیا کی اداکاری بے مثال ہے۔

★ "کیا حال ہیں؟"

✳ "جی اللہ کا شکر ہے۔"

★ "کیا مصروفیات ہیں آج کل؟"

✳ "جی مصروفیات تو کافی ہیں۔ پہلی بار کراچی آئی ہوں اور 7th Sky کے ساتھ دو تین پروجیکٹ کر رہی ہوں۔ کچھ اور لوگوں کے ساتھ بھی کام کر رہی ہوں.... اور الحمد للہ سب میں میرے رولز اچھے بھی ہیں اور لیڈنگ بھی ہیں۔"

★ "مطمئن ہیں اپنے رولز سے' کیا یہ حقیقت کے قریب ہوتے ہیں؟"

✳ "میرے خیال میں جتنے بھی ڈرامے بن رہے ہیں.... وہ حقیقت کو ٹچ کرکے ہی آرہے ہوتے ہیں' ایسے ہی کسی کے دماغ میں نہیں آجاتا کہ چلو یہ لکھ لیتے ہیں۔ کسی کے ساتھ کچھ ہوا ہوگا' کسی نے کچھ محسوس کیا ہوگا۔ کسی نے کچھ کہیں دیکھا ہوگا تب ہی لکھا گیا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ حقیقت میں کچھ ہوتا ہوگا یا ہوا ہوگا تب ہی کہانی لکھی گئی ہوگی۔"

★ "آپ کے ایک سیریل میں دکھایا گیا کہ آپ کو طلاق ہوگئی مگر آپ نے اپنے والدین کو جو کہ امریکہ میں رہتے ہیں نہیں بتایا.... تو ایسا تو نہیں ہوتا؟"

✳ "دیکھیں جس ڈرامے کی آپ بات کر رہی ہیں تو اس میں دکھایا گیا ہے کہ لڑکی امریکہ سے آئی ہے اور والدین ہی اس کا اثاثہ ہیں اور والد اکثر بیمار رہتے ہیں تو بس وہ اسی لیے نہیں چاہتی تھی کہ اس کے والدین کو کوئی صدمہ پہنچے۔"

★ "مگر امریکہ میں پرورش پانے والی لڑکیاں تو بہت بولڈ ہوتی ہیں' اپنے حق کے لیے آواز اٹھاتی ہیں.... مگر آپ....؟"

✳ "ضروری نہیں کہ آپ امریکہ میں ہیں تو بولڈ بھی ہوں.... آپ کی پرورش جس انداز میں کی گئی ہوگی آپ اسی طرح ری ایکٹ کریں گی۔ اب جیسے میں آپ کو اپنے بارے میں بتاؤں کہ میں "قطر" میں پیدا ہوئی وہیں پلی بڑھی۔ لیکن مجھے اپنی مورل ویلیوز پتا ہیں.... مجھے پتا ہے کہ میں نے نہ صرف اپنے والدین کی بلکہ ان سے وابستہ تمام لوگوں کی عزت کرنی ہے.... تو یہ سب تربیت کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔"

★ "آپ بتا رہی ہیں کہ آپ قطر میں پیدا ہوئیں۔ تو ڈیٹ بتانا پسند کریں گی؟"

✳ "3 نومبر 1991ء میں' میں قطر میں پیدا ہوئی' میرے والد پنجاب سے ہیں' وہ آرمی میں تھے اور میری اماں کشمیری ہیں.... میرے تین بھائی ہیں اور میں سب سے چھوٹی ہوں.... بھائی تینوں باہر رہتے ہیں اور میں یہاں اپنے اماں ابا کے ساتھ رہتی ہوں۔ چونکہ ایک ہی بہن ہوں تو سب کی لاڈلی بھی بہت ہوں۔ اور میں فائن آرٹ میں گریجویٹ ہوں۔"

★ "ابا پنجاب سے' اماں کشمیر سے آپ دونوں کا مکسچر ہوں گی اور آپ لمبی بھی بہت ہیں.... تو لمبا ہونا اچھا لگتا ہے؟"

✳ "جی میری ہائیٹ 5 فٹ 9 انچ ہے اور کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کو دوسروں میں ممتاز کرتی ہیں.... اور مجھے کبھی مشکل نہیں ہوئی' ہاں جو مرد آرٹسٹ ہائیٹ میں تھوڑے کم ہوتے ہیں۔ ڈائریکٹر ان کے ساتھ بڑے طریقے سے ایڈجسٹمنٹ کرلیتے ہیں۔"

★ "گھر میں کونسی زبان بولتی ہیں اردو' پنجابی یا کشمیری؟"

✳ "گھر میں اردو اور انگریزی بولتی ہوں۔ پنجابی سمجھ میں آجاتی ہے مگر بول نہیں سکتی۔"

★ "فائن آرٹ میں گریجویشن کرکے اس فیلڈ میں آنے کا ارادہ تھا کیا؟"

✳ "ارادہ تو نہیں تھا.... لیکن لکھا ہوا تھا اللہ تعالیٰ نے تو آگئی اس فیلڈ میں.... گھر والوں کی رضامندی کافی مشکل سے ہوئی سب نے اعتراض کیا.... کہا کہ شادی کرو.... گھر بساؤ.... مگر میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ

میں اپنے پیروں پہ کھڑی ہوں اور خود کماؤں.... مجھے ہمیشہ سے سیلف میڈ لوگ پسند ہیں اور اپنے لیے بھی میں یہی سوچ رکھتی تھی کہ مجھے کسی سے مانگنے کی ضرورت نہ پڑے اور نہ میں کسی پر بوجھ بنوں۔ چنانچہ میں نے اپنے گھر والوں کو سمجھایا اور اپنے تعلیمی اخراجات بھی خود پورے کیے.... تو بس پھر کسی نے کچھ نہیں کہا۔

★ "گھر والے ڈرامے دیکھ کر کہتے ہوں گے کہ بہت اچھا کیا تم نے' جو اس فیلڈ میں آگئیں....؟"

✳ "ہاں.... ہاں بالکل کہتے ہیں اور آپ کو بتاؤں کہ یوکے اور امریکہ میں ہمارے ڈرامے بہت پسند کیے جاتے ہیں تو مجھے اپنے ڈراموں کا بھی بہت اچھا فیڈ بیک ملا۔"

★ "فخر ہوتا ہے اپنے آپ پر؟"

✳ "فخر ایک حد تک ہوتا ہے.... کہ ہاں میں نے کر لیا۔ مگر خوشی اس بات پر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرا ساتھ دیا۔ ورنہ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں

اداکاری نہیں کرپاؤں گی۔"

★ "کون لایا اس فیلڈ میں؟"

✻ "میری دوست نے کہا مجھے کہ جیو چینل ایک ڈرامہ بنا رہا ہے جس میں ان کو ایک نئی لڑکی کی ضرورت ہے۔ چلو چل کر آڈیشن دے آؤ.... میں نے کہا کہ.... نہیں بھئی.... مجھے تو کیمرے سے ڈر لگتا ہے میں فیس نہیں کرپاؤں گی.... لیکن پھر پتا نہیں کیسے ہمت کرکے اس کے ساتھ گئی۔ وہاں میں نے اسکرپٹ پڑھ کر ان کو سنایا۔ وہ سیکنڈ لیڈ کا کردار تھا اور فرسٹ لیڈ کے لیے ان کا سلیکشن ہوچکا تھا.... مگر انہوں نے پھر فرسٹ لیڈ والا کردار پڑھنے کو بھی کہا۔ تو انہیں میری ادائیگی اتنی اچھی لگی کہ انہوں نے مجھے فرسٹ لیڈ والا کردار دے دیا۔ یوں میرا پہلا سوپ "میکے کو دے دو سندیس" تھا.... تو چھ مہینے اس کی ریکارڈنگ چلی.... اور مکمل ہونے کے ٹائم کے بعد یہ آن ایئر ہوا.... اس کے بعد "عشق آوارہ" کیا۔ مگر وہ پہلے آن ایئر ہوگیا۔ تو ایک ساتھ دو پروجیکٹ کرنے سے کیمرے کے سامنے والی جھجک بھی دور ہوگئی اور کام کرکے مزا بھی آیا۔"

★ "معاوضہ اچھا ملا تھا یا نئی لڑکی کرکے کم دیا تھا؟"

✻ "سچی بات بتاؤں.... مجھے تو کچھ پتا نہیں تھا کہ پیسے کس حساب سے ملتے ہیں پڑے کرکے ملتے ہیں.... یا کوئی پیکج ہوتا ہے.... یا قسط وار ملتے ہیں.... میں تو چپ کرکے بیٹھی رہتی تھی کہ جو ہوتا ہے.... ہو رہا ہے' میرا سین آجاتا تھا تو میں سیٹ پہ چلی جاتی تھی.... مگر بعد میں کسی نے بتایا کہ چیک کے لیے بولنا پڑتا ہے کہ چیک دے دیں.... ورنہ کبھی نہیں ملے گا.... تب میں نے بھی چیک مانگا تو اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اچھے اماؤنٹ کا چیک ملا.... اور میری یہ خواہش بھی پوری ہوگئی کہ میں خود کماؤں.... اور اپنے اوپر بھی خرچ کروں اور دوسروں پر بھی۔ مگر دلچسپ بات بتاؤں کہ میں ان پیسوں کو بالکل بھی خرچ نہیں کیا بلکہ سیونگ اکاؤنٹ کھولا اور سارے پیسے اس میں جمع کرا دیے۔ اور اب پیسے آتے جارہے ہیں اور میں جمع کراتی جارہی ہوں.... ماشاءاللہ۔"

★ "اتنے پیسے جمع کرکے کیا کریں گی؟"

✻ "اپنا گھر لوں گی.... بہت آرزو ہے کہ میرا اپنا ذاتی گھر ہو.... کیونکہ ابھی کراچی میں تو میں گیسٹ ہاؤس میں رہتی ہوں' اور میری فیملی یعنی اماں ابا لاہور میں رہتے ہیں۔ مجھے کام کے لیے کراچی رہنا پڑتا ہے۔"

★ "اس فیلڈ میں آکر کیا سوچتی ہیں.... اچھا ہوا کہ آگئی.... یا نہیں آنا چاہیے تھا؟"

✻ "نہیں کوئی پچھتاوا نہیں ہے.... ایسا نہیں سوچتی کہ نہ آتی تو اچھا تھا.... برائی تو ہر فیلڈ میں ہے.... پرانی بات ہے کہ انسان کو خود اچھا ہونا چاہیے.... جن کے ساتھ میں کام کررہی ہوں۔ الحمدللہ سب بہت اچھے ہیں۔ ڈائریکٹرز بہت اچھے ہیں۔ پروڈیوسرز بہت اچھے ہیں۔"

★ "میں نے جتنے بھی ڈرامے آپ کے دیکھے ہیں۔ اس میں آپ ماڈرن نہیں بلکہ دیسی لڑکی لگتی ہیں۔ ایسا ہے؟"

✻ "جی بالکل ایسا ہے.... میں بہت چپ رہنے والی لڑکی ہوں' بہت مختلف ہوں دوسری لڑکیوں سے' میں اپنے اندر رہنے والی لڑکی ہوں۔ اور میں نے اب تھوڑا بولنا شروع کیا ہے ورنہ لوگ سمجھتے تھے کہ مجھ میں بہت ایٹی ٹیوڈ ہے لیکن ایسا کچھ نہیں ہے۔ بس مجھے شرم آتی تھی۔ میری نیچر ہی ایسی ہے.... اور سچ کہا آپ نے.... دیسی لڑکی ہوں' سادگی پسند ہوں۔ میک اپ بھی زیادہ نہیں کرتی۔"

★ "تو پھر کبھی ماڈرن رول ملے.... تو کریں گی؟"

✻ "اگر بہت ماڈرن ہوا' جو میری نیچر کے خلاف ہوا تو ان سے بات کروں گی کہ کیا.... ایسا ہوسکتا ہے کہ میں ایسا نہیں ویسا کرلوں' کچھ باتیں آپ میری مانیں.... کچھ میں آپ کی مانوں گی.... اور یہ کہ میں اپنی حدود پار نہیں کروں گی۔ تو اگر مان جائیں گے تو ٹھیک نہیں تو پھر وہ کسی اور کو بک کرلیں گے۔"

★ "ہوں.... لڑکیوں کا خود کمانا کتنا ضروری ہے؟"

✻ "میں سمجھتی ہوں کہ بہت ضروری ہے.... اور یہاں پاکستان میں' میں نے دیکھا ہے کہ سب کو برابر کا درجہ نہیں دیا جاتا.... خواتین کو ہمیشہ کم سمجھا جاتا ہے.... جو امیر ہے وہ بہت زیادہ امیر ہے جو غریب ہے وہ بہت غریب ہے کوالٹی آف لائف نہیں ہے.... لڑکیوں کے لیے کمانا اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پڑھائی صرف ڈگری کی حد تک نہ کریں پھر مہنگائی اتنی ہے کہ گھر کے ہر فرد کو کمانا چاہیے۔ تو ہی گھر چلے گا.... ورنہ نہیں چلے گا لیکن میں نے دیکھا ہے کہ عورت جب کام کرتی ہے تو مرد اپنے آپ کو "ان سیکور" محسوس کرتے ہیں.... حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

★ "آپ کیا چاہیں گی کہ آپ کی زندگی میں جو مرد آئے وہ کیسا ہو؟"

✻ "میرا خیال ہے کہ ایک تو یہ کہ وہ مجھ پر بھروسا

کرے۔ فرینڈ شپ اتنی ہو کہ لگے کہ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں میاں بیوی نہیں... اور مجھے سمجھے کہ میں کیا ہوں۔"

★ "عموماً" لڑکیاں جاب کی طرف اس وقت راغب ہوتی ہیں جب گھر میں انہوں نے کچھ تنگی یا برا وقت دیکھا ہو؟"

✻ "ہاں۔ ایسا بھی ہوتا ہے... اگرچہ ماں باپ اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ لیکن بچوں کو احساس ہو ہی جاتا ہے۔ جب ہم لوگ "قطر" سے پاکستان آئے تو اگرچہ میں چھوٹی تھی مگر مجھے احساس ہوا کہ گھر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ تین چار سال کافی مشکل میں گزرے اور اسی وقت عقل میں یہ بات آئی کہ بڑے ہو کر اپنے پیروں پہ کھڑے ہونا ہے اور خود بھی کمانا ہے اور اس وقت نے مجھے سکھایا بھی بہت... اور آج جب لوگ میری تعریف کرتے ہیں خواہ میری اداکاری پر یا میرے کمانے کی تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے سچ میں برے وقت کا کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ اس لیے بڑے دھیان سے اور سوچ سمجھ کر خرچ کرتی ہوں۔"

★ "آپ لاہور کی رہنے والی ہیں... تو کراچی کیسا لگا؟"

✻ "کراچی میں میں کہیں گھومنے نہیں گئی، میں نے کراچی تو دیکھا ہی نہیں... بس گیسٹ ہاؤس سے سیٹ پہ اور سیٹ سے گیسٹ ہاؤس... ویسے اوور آل جو بھی ہے... کراچی اچھا ہے۔"

★ "سینئر آرٹسٹوں کے ساتھ بیٹھنا کیسا لگتا ہے؟"

✻ "بہت اچھا۔ جیسے اگر کبھی قوی خان انکل کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملے تو بہت کچھ سیکھنے کا موقعہ ملتا ہے اور نالج میں اضافہ ہوتا ہے۔"

★ "کون سے سین کرنے میں مشکل ہوتی ہے؟"

✻ "کافی سین ایسے ہوتے ہیں جو مشکل بھی ہوتے ہیں اور جن کو کر کے مزا بھی آتا ہے۔ رونے دھونے والے بھی کافی ہوتے ہیں اور رومانٹک سین کرتے وقت تو میری ہنسی ہی نہیں رکتی... بڑی مشکل سے سین اوکے ہوتا ہے... اور پھر میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں... مجھے یاد ہے کہ "عشق آوے" کے ایک سین میں مجھے کھانسی کا شربت پی کر سونے کی اداکاری کرنی تھی تو میں نے سین کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے سچ مچ آدھی بوتل پی لی اور یوں نہ صرف لمبا سو گئی بلکہ سین بھی بہت اچھا ہو گیا۔"

★ "فیوچر پلاننگ کیا ہے؟"

✻ "یہی کہ بہت کام کرنا ہے۔ اپنا نام بنانا ہے۔ کمائی کرنی ہے... پھر شادی کرنی ہے اور... بچے پالنے ہیں اور... میاں کو اچھی بیوی بن کے دکھانا ہے۔"

★ "محبت اندھی ہوتی ہے؟"

✻ "بالکل ہوتی ہے اور جس محبت کے بارے میں آپ پوچھ رہی ہیں وہ واقعی اندھی ہوتی ہے اور میں نے کی ہے اور جلد ہی اس کا اچھا انجام سامنے آئے گا۔ لاہور جاؤں گی تو ان شاء اللہ بات پکی ہو گی۔"

★ "اپنے ملک کی فلموں کے بارے میں کچھ کہیں گی؟"

✻ "اپنے ملک کی فلموں کے بارے میں یہی کہوں گی کہ پتا نہیں کیوں ہماری فلموں میں "بالی ووڈ" کا ٹچ آ رہا ہے آئیٹم سونگ، آئٹم نمبر... یہ سب کیا ہے اپنی انفرادیت ہونی چاہیے تاکہ پتا چلے کہ یہ پاکستانی فلم ہے۔"

★ "آپ کریں گی؟"

✻ "نہیں میں تو آرٹ موری میں کام کرنا چاہوں گی۔"

★ "سوشل میڈیا کے حوالے سے کچھ کہنا چاہیں گی؟"

✻ "سوشل میڈیا پہ لوگ فیک اکاؤنٹ بنا لیتے ہیں۔ انسٹاگرام بنا لیتے ہیں تو ایسا نہ کریں کیونکہ بہت غلط قسم کی معلومات ہوتی ہیں جو لوگوں تک پہنچائی جاتی ہیں۔ چونکہ میں بہت پرائیویٹ پرسن ہوں تو میں نہیں چاہتی کہ میرا فیک اکاؤنٹ بنے... بس مجھے یہی کہنا ہے۔"

☆ ☆

میری بھی سنیے

زینب جمیل

شاہین رشید

1 "میرا نام؟"
"زینب جمیل۔"

2 "پیار کا نام؟"
"زینی۔"

3 "زمین پہ آمد کب ہوئی؟"
"30 مارچ 1990ء کو۔"

4 "شہر؟"
"گوجرانوالہ۔"

5 "ستارہ؟"
"Pices۔"

6 "لمبی ہوں؟"
"جی میں 5 فٹ 7 انچ ہوں۔ لڑکیوں کے حساب سے لمبی ہوں۔"

7 "پہلوٹی ہوں یا کھرچن؟"
"پہلوٹی ہوں۔ اپنے گھر میں بڑی ہوں دو بہنیں اور ایک بھائی چھوٹا ہے۔"

8 "لوگ پوچھتے ہیں؟"
"نئی لڑکی اور پرانا نام... تو میں کہتی ہوں کہ مجھے اپنا نام بہت پسند ہے۔ اسلامی نام ہے اور پھر پرانا فیشن واپس آ سکتا ہے تو پرانا نام کیوں نہیں۔"

9 "تعلیم؟"
"بیچلرز تعلیم بھی اور میں بھی۔"

10 ”بیچلرز میں سے ایک کب بنے گا؟“

”ہنستے ہوئے ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔۔۔ جو اللہ کو منظور ہو گا وہی ہو گا۔“

11 ”ٹی وی پہ پہلی انٹری؟“

”خبرناک“ اس نے شہرت دی اور اس کی وجہ سے ڈراموں کی آفرز ہوئیں۔“

12 ”میرے آن ایئر ڈرامے؟“

”جو آج کل ہے وہ ”من چلی“ ہے جبکہ پرانے تو ریپیٹ ہوتے ہی رہتے ہیں۔“

13 ”شرمیلی ہوں؟“

”طبیعتاً“ shy ہوں۔ لیکن اداکاری کے وقت نہیں کیونکہ اداکاری پروفیشن ہے اور کام کے لیے بولڈ ہونا پڑتا ہے۔“

14 ”اس فیلڈ میں اگلی منزل؟“

”بہت آگے جانا ہے۔ بہت نام کمانا ہے اور پیسہ بھی۔“

15 ”اس فیلڈ میں نہ ہوتیں تو؟“

”تو ہاؤس وائف ہوتی۔۔۔ اور ہاؤس وائف بنوں گی۔ مگر ذرا دیر میں۔“

16 ”گھر میں کون سی زبان بولتی ہیں؟“

”میری مادری زبان پنجابی ہے اور گھر میں اردو پنجابی دونوں چلتی ہیں۔“

17 ”ناشتے سے جی چراتی ہوں؟“

”ہرگز نہیں۔۔۔ مجھے ناشتا لازمی چاہیے ہوتا ہے۔“

18 ”میں فٹ رہتی ہوں؟“

”ڈائیٹنگ سے نہیں ایکسرسائز سے۔“

19 ”میک اپ میں میری کمزوری؟“

”پرفیومز۔“

20 ”اس فیلڈ میں کتنا پیسہ ہے؟“

”بہت۔۔۔ کیونکہ میں نے اپنی کمائی سے اپنے لیے قیمتی گاڑی خریدی ہے۔“

21 ”محبت اندھی ہوتی ہے۔۔۔ بہری یا گونگی؟“

”اندھی، بہری گونگی سب ہی ہوتی ہے۔ اگرچہ ہو تو۔“

22 ”کیا چیزیں بیگ میں لازمی رکھتی ہوں؟“

”موبائل۔ پیسے۔ پرفیوم اور دیگر ضروری چیزیں۔“

23 ”فیصلہ کس کا مانتی ہوں؟“

”اپنے دل اور دماغ کا پہلے دونوں کو اپنا مسئلہ سناتی ہوں، پھر رائے مانگتی ہوں اور دل و دماغ دونوں کی سنتی ہوں۔“

24 ”میری بری عادت؟“

”جو دل سے اتر جائے وہ واپس دل میں نہیں آتا۔“

25 ”اچھی عادت؟“

”پریشانی نہیں دیکھ سکتی، کسی کی اور فوراً“ مدد کرتی ہوں۔“

26 ”غصے میں منہ سے کیا لفظ نکلتا ہے؟“

”دفع ہو جاؤ۔“

27 ”زندگی بری لگتی ہے؟“

”نہیں، کبھی نہیں۔۔۔ زندگی اللہ کا تحفہ ہے اگر صحت کے ساتھ ہو اور مجھے اپنی زندگی سے بہت پیار ہے۔“

28 ”پاکستان کے علاوہ پسندیدہ ملک؟“

”مجھے پورا یورپ بہت پسند ہے۔ بہت خوب صورت ہے۔“

29 ”لوگوں کی بری عادت؟“

”اکثریت لوگوں کی ایسی ہے جو اپنے قیمتی وقت میں دوسروں کی برائیاں اور چغلیاں کرتے ہیں۔“

30 ”غصہ آتا ہے؟“

”اگر کوئی مجھے گہری نیند سے اٹھا دے تو۔“

31 ”زندگی کب بدلی؟“

”جب اس میڈیا میں آئی۔۔۔ اللہ نے عزت و شہرت دی۔“

32 ”نیند سے بے دار ہونے کے بعد کب فریش ہوتی ہوں؟“

”تقریباً“ دو گھنٹے کے بعد۔۔۔ اتنا ٹائم تو لگ ہی جاتا ہے۔“

33 ”کب کھانا کھانے کا مزا نہیں آتا؟“

”جب ٹیبل پہ رائتہ نہ ہو اور جو کھانے کی ڈیمانڈ ہوتی ہیں۔ کہ جن کے بغیر کھانا ادھورا لگتا ہے۔ پانی بہت ضروری ہے۔“

34 ”گھر آتے ہی دل چاہتا ہے کہ؟“

”کہ کوئی گرم گرم چائے دے دے۔“

35 ”ناشتا اور کھانا کے لیے میری خواہش؟“

”کہ کوئی نہ بنائے صرف مما بنائیں۔“

36 ”میں خوف زدہ ہو جاتی ہوں؟“

”ہر جانور سے ہر پرندے سے۔۔۔ بہت زیادہ ڈرتی ہوں۔“

37 ”کھانا اہتمام سے کھاتی ہوں یا جہاں موقعہ مل جائے؟“

”اہتمام سے کھاتی ہوں اور ڈائننگ ٹیبل پہ کھانا کھانے کا زیادہ مزا آتا ہے۔“

38 ”میں عام انسان جیسی ہوں؟“

”نہیں۔۔۔ میں سب سے بہت مختلف ہوں اور آج سے نہیں بچپن سے ہوں۔“

39 ”کون سی رسم کے بغیر شادی ادھوری لگتی ہے؟“

”مہندی کی رسم کے بغیر۔۔۔ اور جس شادی میں رسم مہندی نہ ہو وہاں میں نہیں جاتی۔“

40 ”اگر کسی کو اغوا کروں گی تو کیا مانگوں گی؟“

”پیسے۔۔۔ میرے خیال میں ہر کوئی پیسے کے لیے ہی اغوا کرتا ہے۔“ (قہقہہ)

41 ”فیس بک سے دلچسپی؟“

”بہت زیادہ ہے۔“

42 ”کھانے پسند ہیں ملکی یا غیر ملکی؟“

”ملکی۔۔۔ اپنے ملک کے کھانوں کی بات ہی کیا ہے۔“

43 ”مجھے انتظار رہتا ہے؟“

”اپنے ہر نئے پروجیکٹ کا تاکہ میں خود بھی دیکھ سکوں اور مجھے لوگوں کا رسپانس بھی پتا چلے۔“

44 ”تھکن میں بھی کہاں جانے کا موڈ ہوتا ہے؟“

”کہیں نہیں۔۔۔ اپنا بیڈ اور بس۔“

45 ”غصے کا اظہار کرتی ہوں؟“

”چیخ چیخ کر۔“

46 ”کوئی مجھے گھورے تو؟“

”توبہ ہے جی۔۔۔ بہت زیادہ گھبرا جاتی ہوں۔“

47 ”مردوں اور لڑکوں کی بری عادت؟“

"ایک ہی عادت بری لگتی ہے کہ جھوٹ بہت بولتے ہیں۔"

48 "کس ملک کی بہت کی خواہش ہے؟"
"امریکہ اور سوئٹزرلینڈ۔ کاش ایسا ہو جائے۔"

49 "بہت دکھ سے گزرتی ہوں؟"
"اگر کوئی نظرانداز کرے۔"

50 "مطالعہ کرتی ہوں؟"
"انگریزی رائٹرز کی کتابوں کا۔"

51 "کنجوس ہوں؟"
"نہیں نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔ اگر کبھی دوستوں کے ساتھ کہیں جاؤں تو پھر کوشش کرتی ہوں کہ میں خود ہی خرچ کروں۔"

52 "اپنی شخصیت کے لیے ایک جملہ؟"
"ڈریمر Dreammer ہوں۔"

53 "اٹھنے میں جلدی کرتی ہوں؟"
"اگر جلدی جانا ہو تو پھر چھلانگیں مارتی ہوئی اٹھ جاتی ہوں ورنہ آرام سے اٹھتی ہوں کہ جلدی کیا ہے۔"

54 "سچی محبت کون کرتے ہیں۔ دوست یا رشتے دار؟"
"میرے خیال سے رشتے دار اپنے تو اپنے ہوتے ہیں۔"

55 "گھر میں کس کے کمرے میں سکون ملتا ہے؟"
"صرف اور صرف اپنے کمرے میں۔"

56 "میری عادت ہے کہ؟"
"اگر کسی کام کو کرنے سے انکار کردوں تو پھر وہ کام کوئی مائی کا لعل نہیں کروا سکتا مجھ سے۔"

57 "تحفہ دیتی ہوں؟"
"پرفیوم کا، میرے نزدیک یہ بہترین تحفہ ہے۔"

58 "ایک شام گزارنا چاہتی ہوں؟"
"سلمان خان کے ساتھ۔"

59 "ایک دعا جو لبوں پہ رہتی ہے؟"
"اے اللہ جو عزت و احترام اور جو شہرت دی ہے اسے برقرار رکھنا (آمین)۔"

☼ ☼

عبدالستار ایدھی کی یاد میں

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

شاہین رشید

عبدالستار ایدھی ایک مکمل شخصیت کے مالک تھے اور جو مکمل ہو ان کے بارے میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ حقیقت ہے کہ جو جتنا زیادہ مشہور ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ عوام سے دور ہوتا ہے۔ مگر "عبدالستار ایدھی" جتنے زیادہ مقبول تھے اتنے ہی زیادہ عوام کے قریب تھے۔ 9 جولائی پاکستان کی تاریخ کا ایک بدترین دن تھا کہ اس دن یہ عظیم شخصیت دنیا سے رخصت ہوئی۔

بڑی اور نامور شخصیات سے انٹرویو کرنا سب کے لیے باعث فخر ہوتا ہے اور مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے اس عظیم شخصیت کا انٹرویو کیا۔ کئی سال قبل کیے جانے والے اس انٹرویو کو ایک بار پھر آپ کے لیے پیش ہے۔

"السلام علیکم۔" ایدھی صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کیا اور پھر پوچھا "آپ کون سے اخبار سے آئی ہیں؟"

"وعلیکم السلام۔" ہم نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ہم خواتین ڈائجسٹ سے آئے ہیں اور آپ کا اور بلقیس صاحبہ کا انٹرویو کرنا چاہتی ہوں۔ ایک دیرینہ خواہش پوری ہو جائے گی۔

"او۔۔۔ اچھا اچھا۔۔۔ یہ جو آپ کے ساتھ بیٹھی ہیں یہ میری بیوی بلقیس ہے اور اس کے لیے میں یہ کہوں گا کہ اللہ نے ہم سے اچھا کام لینا تھا اس لیے اس کی میری جوڑی بنا دی۔ جیسی روح ہوتی ہے ویسا فرشتہ ملا دیتا ہے اللہ تعالیٰ۔ ہم دونوں پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ مگر اچھے کاموں کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری بھی نہیں ہے۔"

* "ایدھی صاحب۔ اللہ تعالیٰ آپ کی بہت بڑی عمر کرے مگر کیا آپ نے سوچا کہ یہ نیک کام آپ کے بعد کون کرے گا؟"

☆ "آپ یقین کریں یہ سوال مجھ سے سب ہی کرتے ہیں تو میں یہی کہتا ہوں کہ اللہ جب تک مجھ سے کام لے رہا ہے میں کروں گا اور میرے مرنے کے بعد میری بیوی یہ کام کرے گی اور میری بیوی کے بعد میرے بچے اس کام کو سنبھالیں گے اور ہم دونوں نے

یہ بھی سوچا ہے کہ ہم دونوں ایک وصیت لکھ کر جائیں گے تاکہ اس کے مطابق کام ہو سکے۔ میں اس کام کو وراثت نہیں بنانا چاہتا تو ہم دونوں کے بعد ایک بار تو ہمارے بچے اس کام کو سنبھالیں گے۔ مگر پھر جب وصیت پڑھیں گے تو اس کے مطابق کام ہوگا اس میں ہم سب کچھ لکھیں گے کہ یہ سسٹم کس طرح چلے گا..... بچوں کو بھی کچھ نہ کچھ اہمیت دیں گے مگر انہیں پاور نہیں دیں گے۔"

* "آپ کے بچوں میں آپ جیسا جذبہ ہے؟ وہ دلچسپی لیتے ہیں؟"

☆ "بچے دلچسپی لیتے تو ہیں..... مگر میں تمام ذمہ داری ان پر چھوڑنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ پھر وہ اپنے بعد کس کو کہیں گے؟ اپنے بچوں کو؟ تو پھر تو یہ وراثت بن جائے گی اور میں وراثت بنانا نہیں چاہتا..... لیکن میں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ ہم اسے برباد تو نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہمارے بعد بھی اس طرح انسانیت کی خدمت ہو جس طرح ہم کرتے ہیں۔ تو اس کے لیے وصیت لکھنا بہت ضروری ہے کسی کو "امین" بنائیں ..... یہ بہت ضروری ہے۔"

قارئین ہم آپ کو بتائیں کہ یہ انٹرویو کافی سال پہلے لیا تھا اور اس وقت کی جو سیاست تھی اور جو حالات تھے اس کے مطابق بھی کچھ سوال ہوئے تھے۔

* "کیا آپ عورت کی حکمرانی کو پسند کرتے ہیں؟"

☆ "میں سمجھتا ہوں کہ خدا نے مرد اور عورت دونوں کو برابر کا درجہ دیا ہے مگر میرا اپنا خیال ہے کہ عورت 60 فیصد طاقت ور ہے اور مرد پچاس فیصد اور اگر عورت سے کام لیا جائے تو یہ مردوں سے آگے نکل جائیں یہ بہت اچھا نظام چلا سکتی ہیں اور اچھے سے اچھی اکنامکس دے سکتی ہیں اور اچھے سے اچھا بجٹ بھی دے سکتی ہیں..... لیکن مرد حضرات چاہتے نہیں ہیں کہ عورت ہم سے آگے بڑھے اور اسے اہمیت ملے۔ 80 فیصد ٹیکس چوری ہوتا ہے ہمارے ملک میں یہ سب کون کرتا ہے اس ملک میں تین لوگوں کی جنگ ہے۔ زمین دار، تاجر (انڈسٹریلسٹ) industrilist اور جاگیردار یہ ایک دوسرے کو آگے نہیں بڑھنے دیتے اور ان تینوں نے مل کر عوام کو بے وقوف بنایا ہوا ہے۔ یہ باتیں بہت گہری ہیں اور ہمیں ان میں پڑنا بھی نہیں چاہیے۔"

* "جی بالکل..... تو پھر کچھ اور باتیں کرتے ہیں یہ بتائیے کہ بلقیس صاحبہ سے شادی آپ نے اپنی پسند سے کی یا والدین کی پسند سے؟"

☆ "میرا زیادہ کام عورتوں سے ہی پڑتا تھا..... تو میں ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو آگے چل کر میرے کام آئے۔ تو بلقیس میں مجھے ایسی خوبیاں نظر آئیں تو میں نے ان سے شادی کی ورنہ میرا تو ارادہ ہی نہیں تھا شادی کرنے کا۔ پھر اللہ نے ان کے ساتھ میرا جوڑ لکھا ہوا تھا۔"

* "کبھی دل نہیں چاہا کہ ہمارا بھی ایک بڑا سا بنگلا ہو؟"

☆ "نہیں نہیں..... ایسا کبھی دل نہیں چاہا..... ایسا دل ہوتا تو پھر خدمت کے کام نہ کر سکتا..... مجھے تو اپنے دو کمروں کے فلیٹ میں ہی سکون ملتا ہے کتنے ہی لوگ

ہیں جن کو یہ بھی میسر نہیں ہے ہمیں ان کی طرف دیکھنا چاہیے۔"

* "آپ ایک ہی لباس میں رہتے ہیں دل نہیں چاہتا اچھے کپڑے پہننے کو.....؟"

☆ "نہیں میرا ایک ہی جوڑا ہے رات کو اتار کر دھوتا ہوں اور صبح اٹھ کر اسے پہن لیتا ہوں..... بس خدا نے فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ کسی چیز کا شوق ہی نہیں ہے کہ یہ بنائیں یہ کریں۔ وہ کریں..... کبھی کسی بھی قسم کا لالچ دل میں نہیں آیا..... اور آپ کو بتاؤں کہ میں کسی کو پیسہ دے کر کپڑے دے کر مدد نہیں کرتا..... میں چھوٹے بچوں کو پڑھانے کا کہتا ہوں۔ ان کا خرچہ اٹھاتا ہوں۔ بے روزگاروں یا تو نوکری دلواتا ہوں یا کاروبار کے لیے پیسہ دیتا ہوں۔ اپنے پیروں پہ کھڑا کرنے والی امداد کرتا ہوں' دوسری امداد کو میں سلو پوائزن سمجھتا ہوں کیونکہ اس طرح لوگوں کی عادتیں خراب ہو جاتی ہیں..... اسکول بناؤ' سلائی کڑھائی کے اور تعلیم کے تاکہ لوگ اپنے پیروں پہ کھڑے ہو سکے۔ لڑکیاں بھی ہنر سیکھیں اور اپنی زندگی اپنی کمائی سے گزاریں۔ یہ کوئی لڑکی مانگنے آتی ہے یا کوئی لڑکا تو ہم کہتے ہیں کہ آؤ ہمارے سینٹرز میں آؤ کام کرو اور پیسہ کماؤ..... سب یہی سوچ رکھیں تو معاشرہ سدھر سکتا ہے۔"

* "ایدھی صاحب سنا ہے آپ غصے کے بہت تیز ہیں؟"

☆ "ہاں..... میں غصے کا تیز ہوں میں نے ہمیشہ قانون کو عزت دی ہے تو جب کوئی غلط کام کرتا ہے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے..... اکثر ہماری لائٹ صبح سے شام تک کے لیے چلی جاتی ہے۔ ارد گرد کے لوگ کنڈا ڈال کر لائٹ لے لیتے ہیں مگر میں ایسا نہیں کرتا..... اس بات پہ بھی غصہ آتا ہے۔"

* "ایدھی صاحب آپ کا کام خاصا مشکل ہے اور غصہ آپ کو زیادہ آتا ہے تو پھر کیا کرتے ہیں؟"

☆ "اس کام میں برداشت بہت کرنا پڑتا ہے۔ بلاوجہ غصہ نہیں کرتا ہوں سوشل ورک میں جب تک آپ میں برداشت کا مادہ نہیں ہوگا' آپ کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔"

* "آپ نے بہت ینگ ایج میں یہ کام شروع کیا۔ بلقیس صاحبہ نے آپ کا ساتھ دیا..... مزید لڑکیوں نے ویلفیئر کا کام کرنے کی پیش کش کی؟"

☆ "ویلفیئر سے زیادہ لڑکیوں نے مجھے اپنا آئیڈیل بنا لیا اور شادی کی آفرز دینا شروع کر دیں..... میں نے کہا کہ میری بیوی بہت اچھی ہے اور مجھے مزید شادی نہیں کرنی (ہنستے ہوئے) اتنی ایمان دار کہ اس کے سائن سے ایک کروڑ بھی نکل سکتے ہیں مگر اس نے کبھی امانت میں خیانت نہیں کی ہے۔ کبھی ہمارے سامنے کوئی حادثہ ہو جائے تو ہم حادثے کے شکار لوگوں کی چیزیں اور پیسہ امانت کر کے رکھ لیتے ہیں اور پھر ان کے وارثوں کو پہنچا دیتے ہیں..... ورنہ تو لوگ لوٹ مار کر کے چیزیں لے کر غائب ہو جاتے ہیں..... مجھے بہت خوف رہتا ہے اس بات کا کہ مجھ سے امانت پہنچانے میں دیر نہ ہو جائے یا خیانت نہ ہو جائے اور بلقیس کی یہ بات مجھے بہت پسند ہے کہ اس نے کبھی فرمائش نہیں کی کہ اس ہوٹل میں کھانا کھلانے لے جائیں یا اس میں..... ہم نے تو ہنی مون بھی نہیں منایا کہ مجھے یہ بات پسند

ہی نہیں ہیں۔ یہ سب غیر اسلامی رسمیں ہیں۔ مجھے سادگی پسند ہے اور بلقیس کو بھی۔۔۔ ہم نے اپنے بچوں کی تربیت بھی اسی انداز میں کی ہے ان کے دل میں بھی کوئی لالچ نہیں ہے اور میری بیوی میری آئیڈیل ہے۔۔۔ مجھے یاد ہے میری ماں کہتی تھی کہ شادی کرلو تو میں کہتا تھا کہ مجھے میری آئیڈیل ملے گی تو شادی کروں گا۔"

* "اگر بلقیس آپ کی زندگی میں نہ ہوتیں تو؟"

☆ "تو اس کے روپ میں کوئی اور ہوتی' نام دوسرا ہوتا مگر کام ایک ہی ہوتا۔۔۔ کیونکہ اللہ نے میری بیوی سے کام لینا تھا۔"

* "کبھی تنہا ہوتے ہیں تو کیا سوچتے ہیں اور فرصت کا وقت ملے تو کس طرح گزارتے ہیں؟"

☆ "نہ فرصت ملتی ہے' نہ تنہائی۔۔۔ میں تو رات کو اتنا تھکا ہوا آتا ہوں کہ آتے ہی بستر پر لیٹتے ہی سو جاتا ہوں اور پھر صبح جلدی بھی اٹھ جاتا ہوں۔ ویسے کبھی کبھی چلتے پھرتے پرانے گانے سن لیتا ہوں۔۔۔ جیسے "جب دل ہی ٹوٹ گیا" اس قسم کے پرانے گانے مجھے بہت پسند ہیں۔"

* "آپ کو قسمت پر محنت پر یا تعلیم پر یقین ہے یعنی پیسہ کے لیے کیا ضروری ہے؟"

☆ "میں قسمت اور تعلیم سے بھی زیادہ محنت پر یقین رکھتا ہوں جو شخص محنت اور ایمان داری سے کام کرے گا وہ بہت آگے تک جائے گا۔ مجھے یاد ہے کہ اپنی نوجوانی کے دور میں میں ایک میڈیکل اسٹور میں نوکری کے لیے گیا۔۔۔ میڈیکل اسٹور والے نے مجھے ایک سو پچیس (125 روپے) میں ملازمت دی تو میں نے کہا کہ مجھے 125 روپے نہیں چاہئیں مجھے 60 روپے میں نوکری کرنی ہے۔۔۔ پوچھا کیوں؟۔۔۔ میں نے کہا کہ مجھے 60 روپے کی ضرورت ہے میں 60 روپے ہی لوں گا۔۔۔ اور میری محنت کی وجہ سے اللہ نے مجھے اتنا دیا ہے کہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس لیے کہ مجھے اپنی محنت اور ایمان داری پر یقین تھا۔"

* "کیا جذبہ آپ کو فلاحی کاموں کی طرف لے کر آیا؟"

☆ "مجھے اس طرف ماں کی خدمت کا جذبہ لے کر آیا' میری ماں تھوڑی سی نفسیاتی تھیں۔ انہیں طلاق ہو گئی تھی اور مجھے احساس ہوا کہ اس معاشرے میں عورت بہت مظلوم ہے۔۔۔ میں اس وقت بھی ادارہ چلاتا تھا مگر میرے پاس زیادہ پیسے نہیں تھے تو سوچتا تھا کہ جب دوسروں کے پاس پیسے نہیں ہوتے ہوں گے تو ان کو کتنی مشکل ہوتی ہو گی۔ اس وقت سے پھر میں فری ڈسپنسری چلانے لگا۔۔۔ اس وقت 10 روپے دے کر ڈاکٹر کو دکھانا پڑتا تھا آج 10 روپے دو سو کے برابر ہیں۔ میں آٹھ آنے فی کلومیٹر کے حساب سے ایمبولینس چلا رہا تھا۔ اس میں بھی جو دے سکتے ہیں' وہ دیں کرایہ اور جو نہیں دے سکتے ان کے لیے فری ہے۔۔۔ اور اگر مجھے فنڈ زیادہ ملنے لگے تو میں بڑے پیمانے پر چلاؤں گا۔۔۔ مگر تعصبات ہماری راہ میں بڑی رکاوٹ ہے اور ہماری خدمت کو کوئی سمجھتا ہی نہیں تھا۔۔۔ مگر اب اللہ کا بہت کرم ہے۔۔۔ لیکن میں نے تعصب کی وجہ سے بہت تکالیف اٹھائیں جبکہ میں نے تو کبھی سوچا ہے نہیں کہ کون کس فرقے اور مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔"

* "نوجوانوں سے کچھ کہنا چاہیں گے؟"

☆ "میں یہ کہنا چاہوں گا کہ نوجوان تعلیم بھی حاصل کریں اور محنت اور ایمان داری سے کام کریں۔ اللہ ایسے لوگوں کا بہت ساتھ دیتا ہے۔ پھر جب شادی کریں تو بے شک اپنی پسند سے کریں مگر ماں باپ کو بتا کر اس لیے کہ آپ ماں باپ کی ذمہ داری ہو۔ پسند آپ کی مگر ساتھ والدین کا ہو آپ کے سر پر۔۔۔ اور ذات برادری کو نہ دیکھیں یہ دیکھیں کہ لڑکی اور لڑکا کیسے ہیں۔ بھلے مہاجر ہوں سندھی ہوں' پنجابی یا کسی اور زبان کے سب مسلمان ہیں چاہے سنی ہوں یا شیعہ۔۔۔ اس طرح طلاقیں بھی کم ہو جائیں گی۔"

ایدھی صاحب کی چند باتیں آپ کے ساتھ شیئر کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت میں اعلا درجے پہ فائز کرے۔ (آمین)

مقابل ہے آئینہ

غنوی اکرم

ادارہ

س : "آپ کا پورا نام۔۔۔ گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"

ج : "میرا پورا نام "غنوی محمد اکرم" ہے۔۔۔ پیار سے گھر میں گڑیا اور غنو کہتے ہیں اور پرنسس غنوی میرا قلمی نام ہے۔"

س : "کبھی آئینے نے آپ سے یا آپ نے آئینے سے کچھ کہا؟"

ج : "آئینہ ہمیشہ مجھ سے کہتا ہے کہ تم کہیں سے بھی BBA کی اسٹوڈنٹ نہیں لگتیں اور میں آئینہ سے کہتی ہوں کہ کبھی تو خوش ہونے کا موقعہ دے دیا کرو یہ کہہ کر کہ میں موٹی ہو گئی ہوں۔"

س : "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

ج : "میری فیملی' بچپن کی گڑیا۔۔۔ اور کتابیں (بھائی کا موبائل بھی۔۔۔)"

س : "اپنی زندگی کے دشوار لمحے بیان کریں؟"

ج : "میری زندگی کے دشوار ترین لمحات 11 نومبر 2012ء کی وہ طویل تاریک رات جب میرے بڑے بھائی معیز اکرم کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوا اور اچانک ان کی حادثاتی موت نے سب کو سکتے میں ڈال دیا۔۔۔ اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے ہم سب سے جدا ہو گئے۔"

س : "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"

ج : "محبت ایک قیمتی سرمایہ حیات ہے جو خالص اور سچے جذبے سے لبریز ہو۔ محبت کے معاملے میں' میں بہت امیر ہوں۔"

س : "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا ہے؟"

ج : "BBA کی چار سالہ تعلیم کو مکمل کر کے MBA کرنا اور اس کے بعد شاندار سی جاب کا حصول۔"

س : "پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کیا ہو؟"

ج : "BBA کے ہر سمسٹر میں اپنی شان دار کامیابی مسرور و مطمئن کرتی ہے۔"

س : "آپ اپنے گزرے کل' آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے بیان کریں گی؟"

ج : "بہترین۔۔۔ بہترین۔۔۔ بہترین ان شاء اللہ۔"

س : "اپنے آپ کو بیان کریں؟"

ج : "بہت سادہ مزاج ہوں' ہر ایک کو خوش دلی سے دوست بنا لیتی ہوں' بہت معصوم اور صاف دل کی مالک ہوں۔"

س : "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟"

ج : "کسی حادثاتی موت میں اپنے کسی پیارے کے بچھڑ جانے کا ڈر۔"

س : "آپ کی کمزوری۔۔۔ آپ کی طاقت کیا ہے؟"

ج : "کمزوری میری کتابیں۔۔۔ طاقت میری امی جان۔"

س : "آپ خوش گوار لمحات کس طرح گزارتی ہیں؟"

ج : "سب سے پہلے رب تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں' گھر والوں کے ساتھ آئس کریم انجوائے کرتی ہوں اور خوش گوار لمحات اپنے دوستوں کو پارٹی دے کر بھی

گزارتی ہوں۔"

س : "آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟"

ج : "دولت 'زندگی کا لازمی جز... اس کے بغیر زندگی گزارنا محال ہوتا ہے' مگر دولت کی ہوس معاشرے کا توازن خراب کر دیتی ہے۔ دولت کی زیادتی اکثر برائیوں کو جنم دیتی ہے۔"

س : "گھر آپ کی نظر میں؟"

ج : "گھر ایک مکمل تحفظ کا احساس' بھرپور سکون فراہم کرنے والی جگہ۔"

س : "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟"

ج : "جی بالکل معاف کر دیتی ہوں... اور ہر زیادتی کو بھی بھول جاتی ہوں۔"

س : "کامیابی کیا ہے' آپ کے لیے؟"

ج : "محنت کامیابی کی کنجی ہے اور ہر کامیابی کا انحصار آپ کی جدوجہد اور کوشش پہ ہوتا ہے اور بہترین کامیابی اللہ تعالیٰ کا انعام بھی ہوتی ہے۔"

س : "سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کر دیا ہے یا واقعی یہ ترقی ہے؟"

ج : "زندگی کے ہر شعبہ میں ہم مشینوں کے ہی محتاج ہو کر رہ گئے ہیں اور اس سے وقت کی بچت تو ضرور ہوتی ہے' مگر ہماری قوم سہل پسند بھی ہو گئی ہے۔"

س : "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"

ج : "میں خلفائے راشدین کے دور میں جاؤں اور ان کا طرز زندگی اختیار کروں۔ اے کاش...!"

س : "برکھا رت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

ج : "معیز بھائی کو بارش بہت پسند تھی' تو ہم سب بہن بھائی چھت پر بارش میں خوب نہاتے اور انجوائے کرتے تھے' مگر اب مجھے بارش بہت غمگین کر دیتی ہے' بارش مجھے بھائی کی بہت یاد دلاتی ہے۔ اب برکھا رت انجوائے کرنے کا جی نہیں چاہتا۔"

س : "آپ جو ہیں وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟"

ج : "اگر میں عنوی نہ ہوتی تو اپنے بابا جان کا بیٹا ہوتی' ان کا سہارا بنتی۔ بھائی کے جانے کے بعد میرے بابا بہت اکیلے ہو گئے ہیں۔"

س : "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟"

ج : "جب مجھے کسی مقصد میں کامیابی ملے اور میری کوئی نماز قضا نہ ہو۔ قرآن کی تلاوت بمعہ ترجمہ و تفسیر پڑھ کر بھی..."

س : "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

ج : "مجھے اچھے اور مہنگے والے موبائل... سبق آموز کہانیاں' کتابیں... بلند کردار کے حامل لوگ' باصلاحیت اور ذہین لوگ بہت انسپائر کرتے ہیں۔"

س : "آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟"

ج : "دوستوں کے ساتھ مقابلے کو انجوائے کرتی ہوں' مگر خود کبھی کسی مقابلے کا حصہ نہیں بنتی۔"

س : "متاثر کن کتاب' مصنف' مووی...؟"

ج : "عمیرہ احمد' قصص القرآن اور مزاحیہ مووی پسند ہیں۔"

س : "آپ کا غرور؟"

ج : "میرا بہترین تعلیمی کیریئر۔"

س : "کوئی ایسی شکست جو آج بھی اداس کر دیتی ہے؟"

ج : "جب بھی پاکستان انڈیا سے کرکٹ میچ ہارتا ہے تو پاکستان کی شکست دل کو بہت اداس کر دیتی ہے۔"

س : "کیا آپ نے زندگی میں وہ سب پا لیا جو آپ پانا چاہتی تھیں؟"

ج : "فی الحال تو کچھ خاص نہیں پایا...! لیکن ان شاءاللہ بہت جلد بہت کچھ پا لینے کی امید ہے۔"

س : "اپنی ایک خامی یا خوبی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟"

ج : "خوبی... بہت اچھے اخلاق کی مالک ہر ایک کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہوں' کم بولتی ہوں' ہر ایک کی حکم کی تعمیل کرتی ہوں' سب کے ساتھ بہت فرینڈلی بھی ہوں۔ خامی... میں کسی سے بھی بدتمیزی نہیں کرتی اور نہ ہی تیز آواز میں بات کرتی ہوں۔ خاموش مزاج ہوں اور غصہ کی بھی بالکل تیز نہیں ہوں (یہ سب بھی خامیاں ہی شمار ہوتی ہیں میری)۔"

س : "کوئی ایسا واقعہ جو آج بھی آپ کو شرمندہ کر دیتا ہوں؟"

ج : "کوئی ایسا واقعہ مجھے یاد نہیں پڑتا... جس سے کبھی شرمندگی ہوئی ہو۔"

س : "کوئی ایسی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے حسد میں مبتلا کیا ہو؟"

ج : "اللہ کا شکر ہے' مجھ میں حسد نام کی کوئی چیز نہیں۔ کامیابی تو نصیب کی بات ہوتی ہے۔"

س : "مطالعہ آپ کی نظر میں؟"

ج : "اچھے مطالعے سے ذہن اور دل وسیع ہوتے ہیں۔"

س : "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"

ج : "ملک ریاض... ملک و قوم کی بے لوث خدمت کرنے والا' ہر بے غرض پاکستانی۔"

س : "ہمارا پیارا ملک سارا کا سارا خوب صورت ہے؟ آپ کا پسندیدہ مقام؟"

ج : "مجھے اپنے شہر کراچی سے عشق ہے۔ کراچی کے ساحلی مقامات اور سرسبز پارکس میری کمزوری ہیں۔ ویسے مجھے پرانے مقامات کی سیر کا بہت شوق ہے۔"

تنزیلہ ریاض

مہر کو کہانیاں سننے کا بے حد شوق ہے۔ اسکول کے فینسی ڈریس شو میں وہ شہزادی راپنزل کا کردار ادا کر رہی ہے' اس لیے اس نے اپنے پاپا سے خاص طور پر شہزادی راپنزل کی کہانی سنانے کی فرمائش کی۔ کہانی سناتے ہوئے اسے کوئی یاد آجاتا ہے' جسے وہ راپنزل کہا کرتا تھا۔

نینا اپنے باپ سے ناراض رہتی ہے اور ان کو سلام کرنا بھی گوارا نہیں کرتی' وہ ابا سے جتنی نالاں اور متنفر رہتی' لیکن ایک بات حتمی تھی کہ ای سے اسے بہت محبت تھی' لیکن اسے محبت کا مظاہرہ کرنا نہیں آتا تھا۔ اس کی زبان ہمیشہ کڑوی ہی رہتی۔ نینا اپنے خرچے مختلف ٹیوشن پڑھا کر پورے کرتی ہے۔ اس کی بہن زری ٹیلی فون پر کسی لڑکے سے باتیں کرتی ہے۔

سلیم کے محلے میں چھوٹی سی دکان تھی۔ چند سال پہلے میٹرک کا رزلٹ پتا کر کے وہ خوشی خوشی گھر واپس آرہا تھا کہ ایک گاڑی سے اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے اور وہ ایک ٹانگ سے معذور ہو جاتا ہے۔ ذہنی بیمار ہونے کی وجہ سے اس کی ماں نے مثبت قدم اٹھاتے ہوئے محلے میں ایک چھوٹی سی دکان کھلوا دی' سلیم نے پرائیوٹ انٹر کر کے بی اے کا ارادہ کیا۔ سلیم کی غزل احمد علی کے نام سے ایک ادبی جریدے میں شائع ہو جاتی ہے' جو اس نے نینا کے ہاتھ بھجوائی تھی۔

صوفیہ کا تعلق ایک متوسط گھر سے تھا۔ وہ اپنی بہنوں میں قدرے دبی ہوئی رنگت کی مالک' لیکن سلیقہ شعاری میں سب سے آگے تھی۔ صوفیہ کی شادی جب کاشف نثار سے ہوئی تو پورے خاندان میں اسے خوش قسمتی کی علامتی مثال بنا دیا

گیا۔ کاشف نہ صرف چلتے ہوئے کاروبار کا اکلوتا وارث تھا' بلکہ وجاہت کا اعلا شاہکار بھی تھا۔ کاشف خاندان کی ہر لڑکی اور دوستوں کی بیویوں سے بہت بے تکلف ہو کر ملتا' جو صوفیہ کو بہت ناگوار گزرتا تھا۔ صوفیہ کو خاص کر اس کے دوست مجید کی بیوی حبیبہ بہت بری لگتی تھی۔ جو بہت خوب صورت اور ماڈرن تھی اور اس کی خاص توجہ کاشف کی طرف رہتی۔ حبیبہ کی وجہ سے کاشف اکثر صوفیہ سے کیے ہوئے وعدے بھول جاتا تھا۔ صوفیہ کے شک کرنے پر کاشف کا کہنا تھا کہ یہ اس کا کاروباری تقاضا ہے۔

بی بی جان' صوفیہ ـــــ کو کاشف سے جھگڑا کرنے سے منع کرتی ہیں' لیکن صوفیہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی اور اکثر و بیشتر کاشف سے بحث کرنے لگتی جو کاشف کو ناگوار محسوس ہوتا۔ صوفیہ پریگننٹ ہو جاتی ہے' اور بی بی جان کاشف سے صوفیہ کا خیال رکھنے کو کہتی ہیں۔

شہرین نے ضد کر کے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جا کر سمیع سے شادی تو کر لی' لیکن پچھتاوے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ حالانکہ سمیع اسے بہت چاہتا ہے' اس کے باوجود اسے اپنے گھر والے بہت یاد آتے ہیں اور وہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے اور زیادہ تر پلز لے کر اپنے بیڈ روم میں سوئی رہتی ہے۔ سمیع نے اپنی بیٹی ایمن کی دیکھ بھال کے لیے دور کی رشتہ دار اماں رضیہ کو بلا لیا جو گھر کا انتظام بھی سنبھالے ہوئے تھیں۔ سمیع اور شہرین دونوں ایمن کی طرف سے لاپروا ہیں اور ایمن اپنے والدین کی غفلت کا شکار ہو کر ملازموں کے ہاتھوں پل رہی ہے۔ اماں رضیہ کے احساس دلانے پر سمیع غصہ ہو جاتا ہے اور ان کو ڈانٹ دیتا ہے۔ شہرین کے بھائی بہن راستے میں ملتے ہیں اور سمیع کی بہت بے عزتی کرتی ہیں۔

سلیم' نبینا سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ نبینا صاف انکار کر دیتی ہے۔ سلیم کا دل ٹوٹ جاتا ہے' لیکن وہ نبینا سے ناراض نہیں ہوتا اور ان کی دوستی اسی طرح قائم رہتی ہے۔ نبینا کے ابا' بیوی سے' سلیم سے نبینا کی دوستی پر ناگواری ظاہر کرتے ہیں اور بیوی سے کہتے ہیں کہ اپنی آپا سے نبینا اور سلیم کے رشتے کی بات کریں۔

زری کے نمبر پر بار بار کسی کی کال آتی ہے۔ اور زری ماں سے چھپ کر اس سے باتیں کرتی ہے۔

نبینا کی اسٹوڈنٹ رانیہ اسے بتاتی ہے کہ ایک لڑکا اسے فیس بک اور واٹس اپ پر تنگ کر رہا ہے "آئی لو یو راپنزل" لکھ کر۔ نبینا' سلیم کو بتا کر رانیہ کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کہتی ہے۔

حبیبہ کے شوہر مجید کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا سارا پیسہ کاشف کے کاروبار میں انویسٹ کر دیتی ہے۔ اس کے اور کاشف کے تعلقات بہت بڑھ گئے ہیں۔ کاشف صوفیہ سے چھپ کر حبیبہ سے ملنے جاتا ہے اور صوفیہ کی آنکھوں پر اپنی محبت کی ایسی پٹی باندھ دیتا ہے کہ اسے اس کے پار کچھ نظر آنا ہی بند ہو جاتا ہے۔ حبیبہ کاشف پر شادی کے لیے دباؤ ڈالتی ہے۔ کاشف کے گریز اختیار کرنے پر اپنا روپیہ واپس مانگتی ہے اور یوں پہلی پُر فریب کہانی اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔ کاشف انکار کر دیتا ہے۔ حبیبہ غصے میں کاشف کے تھپڑ مار دیتی ہے۔

شہرین' اماں رضیہ کے توجہ دلانے پر ایمن کی سالگرہ جوش و خروش سے ارینج کرتی ہے۔ سالگرہ کا تھیم "راپنزل" رکھتی ہے۔ سالگرہ والے دن شہرین کی امی اور بہنوں کے کوسنے' طعنے اور بددعائیں سارے ماحول کو داغ دار کر دیتی ہیں۔ شہرین سر کے درد کی شدت سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔

سلیم کی بہن نوشین باجی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ نبینا کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیٹی مہر کو اپنے ساتھ گھر لے آئے' لیکن اس کی دادی ان لوگوں کو مہر سے ملنے سے منع کر دیتی ہیں۔

کاشف کے تعلقات رخشی سے بڑھنے لگتے ہیں جو ایک ناکام اداکارہ ہے۔ وہ کاشف کو فلم بنانے کے لیے آمادہ کر لیتی ہے اور اس چکر میں کاشف سے بہت سا پیسا وصول کر لیتی ہے۔ رخشی کے مزید رقم مانگنے پر کاشف کا رخشی سے بھی جھگڑا ہو جاتا ہے رخشی اخبار میں بیان دیتی ہے اور اس کی فوری گرفتاری کی اپیل کرتی ہے۔ اس خبر کو پڑھ کر صوفیہ کا بلڈ پریشر شوٹ کر جاتا ہے اور وہ ایک مردہ بچے کو جنم دیتی ہے۔

شہرین کو برین ٹیومر ہو جاتا ہے اور سمیع اس کی بیماری سے بہت پریشان ہے۔

اب آگے پڑھیے۔

تیرہویں قسط

"وہ تمہیں یاد ہے نا میں تمہیں راپنزل کہا کرتا تھا؟" وہ اس سے پوچھنے لگا تھا اور پھر اپنی نشست بھی درست کی تھی۔

"مجھے...؟" اس نے حیرت سے پوچھا تھا' پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔

"مجھے کیوں راپنزل کہتے تھے تم...؟" اس کا انداز سادہ تھا' لاتعلق' بے پروا اور لاچار...

"پتا نہیں... شاید تمہارے نام کی وجہ سے... یا پھر شاید تمہارا دنیا کے لیے لاتعلق رویہ اس کی وجہ ہو سکتا ہے... یا پھر تمہارے لمبے بال..." اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دوسری جانب سے چبھتی ہوئی آواز میں اس کی بات کاٹ دی گئی۔

"بند کرو اپنا جھوٹ کا پنڈورا باکس... میرے بال تو کبھی اتنے لمبے نہیں تھے۔"

"اچھا... شاید..." وہ ہنستے ہوئے بولا' پھر ایک ہاتھ سے سیل فون ایڈجسٹ کرتے ہوئے اٹھا تھا۔ مہر سو چکی تھی۔ اس نے اسے کروٹ دی۔

"دراصل تمہیں دیکھ کر' تم سے بات کر کے مجھے ہمیشہ ایک ایسی شہزادی کا خیال آتا تھا جو ایک بند قلعے میں رہتی ہے... اکیلی... بنا کسی روزن کے... تنہا... نا اس سے کوئی ملتا ہے... نا وہ کسی سے ملنا پسند کرتی ہے۔" وہ ابھی بھی سنجیدہ نہیں ہوا تھا' لیکن دوسری جانب سے جب کوئی آواز سنائی نا دی تو اسے احساس ہوا کہ شاید وہ کچھ غلط کہہ گیا ہے مگر ابھی اس نے مزید کچھ نہیں کہا تھا کہ دوسری جانب سے وہ بولی۔

"بند قلعے میں رہنے والی شہزادی... راپنزل... یعنی میں... کیا مذاق ہے؟" اس کی آواز میں کرب جھلک رہا تھا اور مہر کا لحاف درست کرتے ہوئے اسے اس کرب کی چبھن بہت شدت سے محسوس ہوئی۔

"کیا بات ہے... پریشان ہو کیا... کوئی بات ہوئی ہے...؟" وہ پوچھے بنا رہ نا سکا تھا۔

"نہیں... بات کیا ہونی ہے۔" اس کی آواز میں بے چینی مزید بڑھی تھی۔

"مجھ سے نہیں کہنا تو مت کہو... لیکن اس سے تو کہو جس سے کہنا چاہتی ہو... کب تک چپ رہو گی۔" یہ بات تو وہ اکثر اسے کہتا تھا۔

"کیسے کہوں... مجھ سے نہیں کہا جاتا اب... مجھے عادت ہی نہیں رہی اپنے دل کی بات کہنے کی۔" بے چارگی سے بولی تھی جبکہ وہ ہنسا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں تمہیں راپنزل... فرق صرف یہ ہے کہ راپنزل اینٹ گارے کے بنے قلعے میں قید تھی... جبکہ تم اپنی ہی ذات کے قلعے میں بند رہنے والی شہزادی ہو..." وہ پھر اسے چڑا رہا تھا۔ وہ چند لمحے چپ رہی' پھر جیسے بہت تھک کر بولی تھی۔

"میں یہ تو نہیں کہتی کہ میں شہزادی ہوں... لیکن یہ بات سچ ہے کہ میں اپنی ذات کے قلعے میں قید رہ کر تھک گئی ہوں... دل چاہتا ہے کہ بس اب اس قلعے سے کہیں باہر چلی جاؤں... کہیں دور... بہت دور... لیکن بس اس قلعے سے نکل جاؤں۔" وہ جیسے روئی تھی لیکن وہ فون پر دیکھ نہیں پایا تھا مگر اسے افسوس ہوا۔

"تو نکل جاؤ نا اس قلعے سے... کس نے مجبور کر رکھا ہے تمہیں..." اسے اس کے مسئلے کا حل بتا رہا تھا۔ وہ چپ رہی۔

محبت نے... اس نے کہا نہیں تھا صرف سوچا تھا۔

کہتی بھی تو کیسے... آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے جبکہ اسے رونے سے نفرت تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے بہت آہستگی سے دروازہ کھولا تھا اور کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ کمرے میں پھیلے ایئر فریشنر کی دھیمی

نئی مہک اس کی حسیات کو معطر کر گئی تھی۔ نیم تاریکی میں بھی کمرے کا انٹیریئر کتنا واضح تھا۔ کنگ سائز بیڈ کا بڑا سا سفید کراؤن' اس کے اوپر لگی دو درمیانے سائز کی پینٹنگز' سائڈ ٹیبل پر سنہرے رنگ کا ٹیبل لیمپ... بیڈ کی دائیں جانب بڑا سا ڈریسنگ... اس پر پڑے پرفیومز... میک اپ اور جیولری کے ضروری لوازمات... سائڈ پر قد آدم آئینہ... بائیں جانب ہلکے زرد سے رنگ کا کاؤچ جس کے ساتھ ایک چھوٹا کافی ٹیبل تھا اور سامنے فٹ ریسٹ تھا۔ کمرے کی چھت سے لٹکتا چھوٹا سا فانوس... جس کے اردگرد فینسی لائٹس... اسے اس کمرے میں کچھ بھی پسند نہیں تھا' کیونکہ کچھ بھی تو اس کی پسند کا نہیں تھا' اس کے باوجود یہ کمرہ اسی کا تھا۔ وہ جھکے ہوئے کندھے اور تھکا ہوا وجود لیے زرد کاؤچ پر آ بیٹھی۔ کمرے کا ماحول معطر بھی تھا اور پرسکون بھی' لیکن اسے اپنے اعصاب جلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے کاؤچ سے ٹیک لگالی اور اپنے پاؤں فٹ ریسٹ پر رکھ لیے۔

وہ نہیں چاہتی تھی لیکن کچھ معاملات میں انسان بے بس ہوتا ہے' سونا چاہتے ہوئے بھی اس کی نگاہیں بیڈ پر دراز ان دو نفوس پر پڑ گئی تھیں جن کا یہ کمرہ تھا۔ وہ چند لمحے ان ہی کی جانب دیکھتی رہی' پھر اسے شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے چاہا تھا وہ اس منظر سے آنکھیں ہٹالے' نگاہیں چرالے لیکن اس سے یہ بھی نہیں ہو پایا تھا... بیڈ پر ایک مرد گہری نیند سو رہا تھا جبکہ اس کے بازوؤں کے حلقے میں ایک عورت قید تھی اور ایسے قید تھی کہ اس کا پورا وجود ان بانہوں میں چھپا ہوا تھا۔ ایک نظر دیکھنے سے بھی احساس ہو جاتا تھا کہ ان بانہوں نے اس عورت کو کس قدر محبت سے اپنے حلقے میں لے رکھا تھا۔ اس نے بدقت اپنی نگاہیں اس منظر سے ہٹائیں۔ اس کی آنکھوں سے چند آنسو ایک ساتھ گالوں پر ٹپکے تھے' ایک منٹ میں ہی اس کے گال بالکل بھیگ گئے تھے۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔

اس کی نگاہوں کے سامنے جو تھا وہ محبت کا حصار تھا اور اسے اس حصار محبت سے تکلیف ہوتی تھی لیکن وہ یہاں سے اٹھ کر جاتی بھی تو کہاں جاتی۔ یہ اس کا کمرہ بھی تو تھا۔ وہ وہاں موجود تھی لیکن نہیں تھی۔ وہ دھیرے دھیرے سسکتے ہوئے محبت کا ماتم منا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک چھوٹی بچی ہی تو تھی... کیا یہ اس کا قصور تھا کہ وہ دنیا میں اس وقت آئی جب اس کی ماں اپنے شادی شدہ دور کے ایک مشکل وقت سے گزر رہی تھی اور اگر اس کے باپ نے اس کی ماں کو کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا کر رکھا تھا تو اس کی ذمہ دار وہ کب تھی۔

اور کیا اس کی غلطی تھی کہ اسے وقت سے پہلے دنیا میں آنا پڑا... کیا یہ اس کے اختیار میں تھا کہ وہ ماں' باپ کی خواہشات کے برعکس لڑکا نہیں لڑکی تھی۔

کیا یہ اس کا جرم تھا کہ وہ اپنے باپ کے خوب صورت نقوش لے کر پیدا ہونے کے بجائے اپنی ماں کے تیکھے نقوش اور سانولی رنگت لے کر دنیا میں آئی تھی... لیکن وہ اپنی ماں کے لیے ایک اگلی ڈکلنگ تھی... تو بس تھی...

دنیا میں آتے ہی ماں نے اسے بےزاری بھرے انداز میں خوش آمدید کہا تھا۔

ماں اسے جب بھی اٹھاتی تھی بےزاری بھرے انداز میں اٹھاتی تھی' ناگواری سے اس کے کام کرتی تھی' اس کی جانب محبت کی نگاہ ڈالتی تک نا تھی' اس کی جانب جب بھی دیکھتی تھی یہ سوچ کر افسوس کرتی کہ وہ بیٹی کی بجائے بیٹا بھی تو ہو سکتا تھا۔

ماں یہ بات منہ سے کم کہتی تھی لیکن کئی مرتبہ جب وہ اسے گود میں بھرتی تو یہی سوچ کر تاسف کا شکار ہوتی۔ اب اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ حقیقت ہے یا فسانہ لیکن کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی بیٹی دنیا میں آتی ہے تو اپنے ساتھ

ساتھ رحمتیں لے کر آتی ہے مگر جب دنیا اسے دیکھ کر اس کے بیٹی ہونے پر افسوس کرتی ہے اور شکوہ کناں ہوتی ہے تو پھر رحمتیں اسی وقت واپس پلٹ جاتی ہیں اور ایک رحمت اس ننھے وجود کے ساتھ دنیا میں رہ جاتی ہے اور وہ چھوٹی بچی تھی جو کچھ بول نہیں سکتی تھی' لیکن خدا نے اسے دل تو دیا ہی تھا جو دھڑکتا تھا محسوس کرتا تھا۔ ماں اس سے جتنا بےزار دکھائی دیتی تھی' اس کے دل میں بھی ماں کے لیے کوئی محبت نہیں جاگتی تھی۔ کوئی الفت... کوئی انس... کچھ بھی نہیں اس کے برعکس اسے اپنی خالہ اچھی لگتی تھی جو اسے اپنی گود میں اتنی محبت سے تھامتی کہ اسے سکون محسوس ہونے لگتا۔ وہ خالہ کی گود میں روتی بھی نہیں تھی' تنگ نہیں پڑتی تھی' بےزار نہیں ہوتی تھی' بلکہ ہمکتی تھی' مسرور رہتی تھی مطمئن رہتی تھی۔

اور پھر ایک عجیب بات ہوئی... ان ہی دنوں خالہ کے یہاں بھی ایک بچے نے جنم لیا... خالہ کو اس بچی سے اتنا پیار تھا کہ وہ جب اپنے بچے کو دودھ پلاتی تو پہلے اس کو گود میں لے کر اس کا شکم بھرتی' اس کو سیر کرتی اور پھر اپنے بچے کی جانب متوجہ ہوتی... خالہ اس کی ماں بن گئی اور خالہ کے گھر والے اس کے گھر والے ہو گئے۔ اس کے اپنے اس سے خوش نہیں تھے تو اس نے بھی ان کی جانب سے منہ موڑ لیا۔

☼ ☼ ☼

"تم کیا کر رہی ہو کچن میں..." زری نے اس سے پوچھا تھا۔

"میں کچھ سوچ رہی ہوں۔" نینا نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ وہ واقعی دروازے کے فریم سے ٹیک لگائے کچھ سوچ رہی تھی۔ امی' ابا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ ٹی وی پر کسی نیوز شو کی آتی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ابا ٹی وی دیکھنے میں مگن تھے۔ ان اوقات میں امی عموماً "اخبار جہاں" لے کر تین عورتیں' تین کہانیاں پڑھ رہی ہوتی تھیں۔ موسم بدل گیا تھا۔ سردی کی ہلکی سی لہر نے موسم کو خوش گوار کر دیا تھا۔ ابھی بھی ہلکی سی بوندا باندی ہوئی تھی تو سردی کچھ مزید بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ زری اور نینا دونوں ہی اپنے کمرے میں جانے کی بجائے لاؤنج میں آ بیٹھی تھیں۔ زری نے باہر لاؤنج کا ٹی وی آن کر دیا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" زری نے سوال کیا۔ بہت دیر سے اظفر نے بھی میسج کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے گیا ہوا تھا۔ اسی لیے زری کو بھی نینا سے بات کرنے کی فرصت مل گئی تھی۔

"میں سوچ رہی ہوں... کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ... جنہیں اس موسم میں کوئی اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلاتا ہے۔" نینا نے اس کے سوال کے بعد کچن کی دہلیز چھوڑ کر اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"ہاں... جیسے پہلے تو تم خود اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پیتی ہو... مجھے تو یاد بھی نہیں کہ تم نے آخری دفعہ پانی بھی کب خود اٹھ کر پیا تھا۔" زری نے کہا۔ یہ وہ طنز تھا جو وہ اکثر مذاق میں نینا کی کاہلی پر کر دیا کرتی تھی اور نینا کو ہر بات میں چیخنے کی عادت تھی لیکن کاہلی اور ہڈ حرامی کے طعنے وہ خوشی خوشی سہہ لیتی تھی' ابھی ابھی اس نے مصنوعی انگڑائی لی اور تساہل سے ٹانگیں دیوان پر پھیلا کر بولی۔

"خود اٹھ کر پانی پئیں میرے دشمن... جب اللہ نے اتنی اچھی سگھڑ اور سلیقہ مند ماں بہن دے رکھی ہوں تو مجھے کیا ضرورت ہے کچن میں خوار ہونے کی..." وہ ڈھیٹ بنتے ہوئے بولی تھی۔ زری ہنسی۔

"اس کے باوجود تم ہم سے جھگڑتی رہتی ہو نا... حالانکہ میں اور امی تمہارا اتنا خیال رکھتے ہیں۔" زری جتا نہیں رہی تھی لیکن نینا کے چہرے پر شرمندگی سے بھری مسکراہٹ چمکی۔

"ایسے تو مت کہو... جھگڑتی تو نہیں ہوں... دو تین لوگوں کی تو بہت قدر کرتی ہوں میں... تم نے اور امی نے تو

بہت محبت ہے مجھے۔۔۔" وہ اسی انداز میں بولی تھی۔
"اچھا۔۔۔ اور سلیم سے۔۔۔ اس سے محبت نہیں ہے؟" زری نے بغور اس کی جانب دیکھا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اب کی بار وہ ضرور تنک کر جواب دے گی لیکن وہ ہنسی۔
"ارے اس کی تو بات ہی نا کرو۔۔۔ وہ تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔۔۔ اس کے بغیر تو زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی میں۔۔۔" وہ بھی ہنستے ہوئے بولی تھی۔ زری کو اس کا جواب سن کر مزا آیا۔ وہ جتانا چاہتی تھی کہ جیسے سلیم تمہارے لیے اہم ہے اظفر میرے لیے اہم ہے لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔
"اب باتیں ہی کرتی رہو گی یا اٹھ کر چائے بھی بناؤ گی۔۔۔ دیکھو تو کتنا سہانا موسم ہے۔۔۔ دل چاہتا ہے کوئی اچھی سی چائے بنا کر پلا دے۔" نہنا نے اسے خاموش دیکھ کر کہا تھا۔
"نہنا کبھی کبھی تم بھی چائے بنا لیا کرو۔۔۔" زری ٹس سے مس نا ہوئی۔
"ارے یار۔۔۔ میں چائے بنا تو لوں لیکن مجھے اچھی چائے بنانی نہیں آتی۔۔۔ اور اس وقت دل صرف اچھی چائے پینے کو چاہ رہا ہے۔" وہ بھی بہت ہی کاہل واقع ہوئی تھی۔
"کبھی اپنے ہاتھ سے بناؤ تو ہمیں پتا چلے ناکہ اچھی بناتی ہو یا بری۔۔۔ کبھی بنائی تو ہے نہیں تم نے۔۔۔" زری نے ناک چڑھا کر کہا مگر ساتھ ہی اٹھ بھی گئی تھی کیونکہ جانتی تھی نہنا اس سے چائے بنوا کر ہی دم لے گی۔
"ارے بنا لوں گی چائے بھی۔۔۔ چائے بنانے میں کون سی صدیاں لگتی ہیں۔۔۔ جب تمہارے ہاتھ پیلے ہو جائیں گے تو میں خود ہی بنایا کروں گی۔۔۔ اتنی بدتمیز بھی نہیں ہوں کہ امی سے چائے بنوانے لگ جاؤں۔۔۔ امی سے بس کپڑے دھلوایا کروں گی۔۔۔ کھانا بنوایا کروں گی۔۔۔ روٹی بنواؤں گی اور ہاں چلو اپنے کمرے کی صفائی بھی کروالیا کروں گی۔۔۔ لیکن باقی سب کام تو میں خود ہی کیا کروں گی نا۔۔۔" وہ وہیں لیٹے لیٹے بولی تھی۔
"بڑا احسان ہوگا تمہارا یہ بھی کہ باقی کام خود کرلو گی۔" زری نے کچن سے طنز کا تیر مارا تھا۔
"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بھئی فکر نا کرو۔۔۔ اپنے کپڑے آئرن کرنا۔۔۔ جوتے پالش کرنا۔۔۔ اپنے لیے اوون میں کھانا گرم کرنا۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ زری نے اس کی بات کاٹی۔
"ہاں۔۔۔ اور ریموٹ سے چینل تبدیل کرنا۔۔۔ چائے کے کپ سے ملائی کی براؤن تہ ہٹانا۔۔۔ کھانا کھاتے ہوئے سلاد میں لیموں نچوڑنا۔۔۔ رات کو سوتے ہوئے خود پر بلینکٹ لینا۔۔۔ یہ سب تم خود کرلیا کرنا۔" وہ مذاق کر رہی تھی۔ نہنا نے سنجیدگی بھرے انداز میں سر ہلایا۔
"ہاں تو اور کیا۔۔۔ سارے مشکل کام تو میرے حصے میں ہی آئیں گے نا۔۔۔ چلو خیر کرلوں گی میں یہ سب کام بھی۔۔۔ آخر کرنے ہی پڑتے ہیں لڑکیوں کو۔۔۔ جب بڑی بہنوں کی شادیاں ہو جاتی ہیں لیکن تم میری فکر میں ہلکان مت ہو۔۔۔ اور اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔" مجال ہے اس پر اثر ہوا ہو۔ زری کو ہی اس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر ہنسی آگئی تھی۔
"شرم تو نہیں آتی نا ایسے کہتے ہوئے۔۔۔ میں تو سوچتی ہوں جب شادی کے بعد جب میں آیا کروں گی تو تم کچھ پکا کر بھی کھلاؤ گی یا نہیں۔۔۔ کچھ تو پکانا سیکھ لو۔" وہ اسے سمجھا رہی تھی۔
"ارے اتنی فکر کیوں کر رہی ہو۔۔۔ مجھے بہت اچھی اچھی چیزیں بنانی آتی ہیں یار۔۔۔ ایسی ایسی اسپیشل چیزیں بنایا کروں گی کہ یاد کرو گی تم۔۔۔" نہنا نے گویا اطلاع دی تھی۔
"مثلاً۔۔۔" زری نے مصنوعی طنزیہ انداز میں اسے دیکھا۔
"ارے کیا ساری باتیں آج ہی کرلو گی۔۔۔ بھلا بتاؤ ایک چائے کا کپ بنانا ہی مشکل ہو جاتا ہے آج کل کی لڑکیوں کے لیے۔۔۔ ارے بی بی جلدی جلدی کام کیا کرو۔۔۔ اگلے گھر جا کر ہمارا ناک نا کٹوا دینا۔" نہنا نے دوبدو جواب

دیا تھا۔ وہ پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتی تھی اور یہ بات زری بھی جانتی تھی۔ وہ اٹھی تھی اور چند سنٹ کے بعد کپوں میں چائے نکال لائی تھی۔
"تم نے امی کو اظفر کے متعلق بتایا؟" زری نے کپ اسے دیتے ہوئے دھیمی سی آواز میں پوچھا تھا۔ نہنا کا مزاج خوش گوار ہو رہا تھا۔ زری کو یہ وقت اس موضوع کے لیے بڑا مناسب لگا۔ نہنا نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا پھر کپ پکڑتے ہوئے بولی۔
"ارے یار مجھے یاد ہی نہیں رہا۔۔۔ امی کو زبانی کلامی بتا دیا ہے میں نے۔۔۔ لیکن اظفر کا تعارف نہیں کروایا ابھی۔۔۔ میں ذرا اس بندے کے متعلق کچھ معلومات اکٹھی کرلوں، پھر بتاؤں گی امی کو۔۔۔ میں نے کہا تھا نا تم نے۔۔۔" زری کو بے حد برا لگا۔
"نہنا تم کیا ایک ہی بات کو لے کر بیٹھ گئی ہو۔۔۔ میں نے کہا تو تھا کہ مجھے کوئی معلومات نہیں چاہئیں۔۔۔ مجھے پتا ہے سب کچھ۔۔۔ تم بس امی کو بتاؤ۔" وہ ناک چڑھا کر بولی لیکن نہنا نے اس کے انداز پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔
"ارے تمہیں کچھ نہیں پتا۔ تم گھر میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو کیا خبر۔۔۔ زمانے میں کیا کیا ہو رہا ہے۔۔۔ کیسے کیسے شاطر اور گھاگ لوگ آگئے ہیں مارکیٹ میں۔۔۔ اور تم میری اکلوتی بہن ہو۔۔۔ ہاں ٹھیک ہے کہ تم بھی بہت شاطر چالاک اور گھنی میسنی ہو لیکن تمہیں کنویں میں دھکا تو نہیں دے سکتے نا۔" وہ نیم سنجیدہ لہجے میں بولی تھی۔ زری کو بے پناہ غصہ آیا مگر وہ چپ رہی تھی۔
"اچھا میں ذرا سلیم سے دو باتیں کر کے آتی ہوں۔۔۔ بہت دن ہوئے اس سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔۔۔ دل بہت اداس ہے۔" وہ اسی بے تکے انداز میں بولی اور پھر دوپٹا کندھے پر ڈال کر امی، ابا کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف چل دی، ساتھ ہی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر زری کو باور کروا دیا کہ امی، ابا کو پتا نہ چلے۔
"اونہہ۔۔۔ ساری اخلاقیات بس دوسروں کے لیے ہے۔ خود جب جی چاہتا ہے منہ اٹھا کر اس لنگور سے باتیں کرنے چلی جاتی ہے اور مجھے نصیحتیں کرتی رہتی ہے۔" زری کو بہت غصہ آرہا تھا۔ اسے نہنا کے رویے سے الجھن ہونے لگی تھی۔ زری کو ایسے لگتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر تاخیر کر رہی ہے اور یہ خدشہ الگ ستا رہا تھا کہ امی اظفر والے رشتے کو مثبت جواب نا دے دیں۔ اس کے دل میں بدگمانی بڑھنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اچھی خبر یہ ہے کہ تمہارا ویزا لگ گیا ہے۔" کاشف نے عام سے لہجے میں اسے بتایا تھا لیکن وہ تو خوشی سے اچھل پڑی۔
"واقعی۔۔۔" اسے یقین نہیں آیا تھا۔ کومین چار مہینے کی ہو چکی تھی اور صوفیہ ابھی تک اپنی بہن کے گھر ہی ٹکی ہوئی تھی، حالانکہ ایک بار ابو کے علاوہ بڑے بھائی بھی آئے تھے اور اسے منانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے خودسری کے زعم میں یہ شرط رکھ دی تھی کہ دونوں بھابھیاں بھی آئیں اور اس سے معافی مانگیں جس پر اس کے بھائی مزید خفا ہو گئے تھے۔ دوسری جانب مہینہ بھر پہلے باجی کے یہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ خاندان والے بچے کو دیکھنے کے لیے آتے جاتے رہے تھے۔
اس سے جب بہن کے گھر مستقل رہائش کی وجہ پوچھی جاتی تو وہ یہ کہنے کے بجائے کہ میں خود رہ رہی ہوں یہاں، یہ تاثر دیتی رہی کہ اسے بھائیوں نے گھر سے نکالا ہے اور ہٹ دھرمی سے یہ کہتی رہی کہ بھائی بھابھیاں مجھے برداشت نہیں کر سکتے، سو مجبوری میں پڑی ہوں بہن کے گھر۔۔۔ اس شکوے کے باعث صوفیہ کے بھائیوں کی کافی بے عزتی ہو رہی تھی کہ وہ کچھ مہینے بہن کو نا سنبھال سکے۔

ان کے یہاں دولت تو بہت زیادہ نہیں تھی' لیکن وضع داری اور اسے نبھانے کا سلیقہ خوب تھا' سو جب سارے خاندان میں صوفیہ کے بھائیوں کے متعلق ایسی چہ میگوئیاں شروع ہوئیں تو صوفیہ کے ابو نے کاشف سے دو ٹوک بات کی تھی کہ اگر وہ صوفیہ کو اپنے پاس بلوانے کا ارادہ نہیں رکھتا تو پھر خود واپس آئے' اس لیے کاشف کو ایک بار پھر صوفیہ کو دبئی بلوانے کا فیصلہ کرنا پڑا' لیکن یہ فیصلہ اس نے کافی چالاکی سے کیا تھا۔ وہ گیند کو صوفیہ کی جانب اچھالنے کے لیے مکمل طور پر تیار ہو کر میدان میں اترا تھا۔

"ہاں... ویزا تو لگ گیا ہے صوفیہ... لیکن ایک بڑا مسئلہ ہو گیا۔" وہ لہجے میں سنسنی پیدا کر کے بولا تھا۔ صوفیہ تو ہواؤں میں اڑ رہی تھی' سر جھٹک کر بولی۔

"جہاں اللہ نے سب مسئلے ختم کیے وہاں جو مسئلے باقی رہ گئے ہیں وہ بھی ختم کر دے گا۔ ان شاء اللہ... آپ اب کوئی فکر نہ کریں... بس ہماری ٹکٹ کراویں اور ہمیں بلوالیں۔ نہیں رہا جاتا اب یہاں..." وہ ہٹ دھرمی سے بولی تھی۔ باجی کے گھر فون کی سہولت نہیں تھی۔ کاشف کا فون ان کی ہمسائی کے گھر آتا تھا۔

"بات تو سن لو... دراصل میں نے چند مہینے پہلے ویزا اپلائی کیا تھا... یہ خیال ہی نہیں آیا کہ گھر میں ایک نئے فرد کا اضافہ ہونے والا ہے... اب تم دونوں کا ویزا تو ہے' لیکن کونین کا نہیں ہے... اب اگر اس بات کا انتظار کروں گا کہ کونین کا ویزا لگے تو ظاہر ہے پہلے اس کا پاسپورٹ وغیرہ بنوانا پڑے گا... جب تک اس کے کاغذات مکمل ہوں گے تم دونوں کے یعنی تمہارے اور زرمین کے ویزے کی معیاد ختم ہو جائے گی... بہت مسئلہ ہو گیا صوفیہ..." وہ لہجے میں لاچاری بھر کر بولا تھا۔ صوفیہ کا منہ بھی لٹک گیا۔

"آئے ہائے... آپ کیسے بھول گئے کونین کو... اب کیا ہو گا کاشف..." اس کی ساری توانائی ختم ہونے لگی تھی۔

"کونین کے کاغذات دوبارہ سے جمع کروانے پڑیں گے۔" کاشف کے پاس مسئلے کا حل تھا۔

"تو کروا دیں نا جمع... کس کا انتظار کر رہے ہیں؟" وہ ناراضی بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"پاسپورٹ کا... وہ تمہیں بنوانا پڑے گا... وہاں لاہور سے..." کاشف نے اسے سمجھایا تھا۔

"اب پاسپورٹ بنوانے میں کتنے دن لگیں گے؟" صوفیہ کی خوشی ماند پڑ گئی تھی۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں... امید تو یہ ہی ہے کہ مہینہ بھر لگے گا... اب یہ ہی ہو سکتا ہے کہ تم جلد از جلد اس کا پاسپورٹ بنواؤ اور پھر مجھے سب کاغذات ارجنٹ میل سے بھجواؤ... لیکن اس کام میں کافی دن لگ جائیں گے۔ آپا کے گھر مزید رہنا مناسب نہیں لگتا۔ میری مانو تو جب تک دوبارہ ویزے کے کاغذات جمع نہیں ہو جاتے... تب تک تم ہمارے آبائی گھر میں شفٹ ہو جاؤ... وہاں رنگ روغن وغیرہ کروالو... جو جو سامان چاہیے ضرورت کا... وہ سب ڈلواؤ اور آپا کے گھر سے ادھر منتقل ہو جاؤ۔" کاشف مشورہ دے رہا تھا لیکن صوفیہ نے دو ٹوک لہجے میں انکار کر دیا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ... اتنے پیسے اس گھر پر خرچ کروں جہاں مجھے رہنا ہی دو مہینے ہے۔ میں نہیں رہوں گی وہاں... مجھے بس آپ کے پاس آنا ہے۔ اللہ اللہ کر کے تو ایک اچھی خبر ملی ہے۔ آپ کو کیا پتا میں نے کتنے نفلوں کی منتیں مانگی ہوئی ہیں آپ کے پاس آنے کی... میں اس موقع کو ضائع نہیں کر سکتی۔ مجھے ہر حال میں آپ کے پاس آنا ہے۔ سارے خاندان کو وضاحتیں دے دے کر تھک گئی ہوں۔ اب اس گھر میں شفٹ ہو جاؤں گی تو کتنی باتیں بنیں گی کہ شوہر کے پاس کیوں نہیں گئی۔" وہ چڑچڑے سے لہجے میں بولی تھی۔ کاشف کا ردعمل بھی ایسا ہی تھا۔

"کہہ تو رہا ہوں کہ چند مہینے پہلے اپلائی کیا تھا ویزا... ذہن میں یہ ہی خیال تھا کہ کونین کے پیدا ہونے سے پہلے

بلوالوں گا... اب کونین جلدی آ گئی دنیا میں تو میرا کیا قصور ہے۔"

"مجھے نہیں پتا بس... میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اس موقع کو ضائع نہیں کروں گی۔"

"کونین کا کیا کرو گی..." کاشف نے پوچھا تھا۔

"سارے مسئلوں کی جڑ کونین ہی ہے... بھلا بتاؤ ان محترمہ کو دنیا میں آنے کی زیادہ جلدی تھی۔ مجال ہے طبیعت میں تھوڑا سا بھی صبر ہو... عجیب بے صبری اولاد ہے آپ کی کاشف..." وہ غرا غرا کر بول رہی تھی۔ کاشف اس کے انداز پر ہنسا۔

"میری اولاد بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔ تم بھی تو بے صبری ہو رہی ہو میرے پاس آنے کے لیے۔"

"کاشف آپ کو پتا ہے مجھے کتنے مہینے ہو گئے ہیں پاکستان آئے ہوئے۔ کتنی اداس ہوں میں... اور زرمین بھی... آپ کا دل تو پتھر کا بنا ہے... آپ کو تو ہماری یاد بھی نہیں آتی۔" وہ شکوہ کر رہی تھی۔ کاشف کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

"بس اب لگا دو یہ الزام... تمہیں کیا پتا... کیسے گزر رہے ہیں میرے دن رات... میرا بس چلے تو آج ہی تم لوگوں کے پاس آ جاؤں... لیکن میری جان سمجھنے کی کوشش کرو... پردیس میں خود پر جبر کیے بغیر زندگی گزر ہی نہیں سکتی۔"

"آپ کو کیا پتا جبر کیا ہوتا ہے کاشف صاحب... آپ تو مزے سے حبیبہ کے ساتھ وقت گزار رہے ہیں۔" صوفیہ کی گفتگو اس کے ذکر کے بغیر مکمل ہوتی ہی نہیں تھی۔ وہ کاشف کے ہر فون پر ٹوہ لینے والے انداز میں اس کا ذکر ضرور کرتی تھی۔

"دفع کرو اسے یار... ہمارے پاس کیا اپنی باتیں ختم ہو گئی ہیں۔ جو ہم اس کا ذکر کریں۔" کاشف نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی تھی۔

"آپ ہی اس کو درمیان میں لے آتے ہیں۔ ورنہ مجھے تو شروع سے ایک آنکھ نہیں بھاتی وہ۔ میرا بس چلے تو اس کی شکل نا دیکھوں کبھی۔" صوفیہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔

"ارے یار ایسا غضب مت کرنا... وہ میری انویسٹر ہے۔ اس کے ساتھ اچھے تعلقات میری مجبوری ہیں اور تم بھی اس بات کا خیال رکھنا کہ اسے ہمارے درمیان ہی رہنا ہے' کیونکہ ہمارے بزنس ٹرمز ہیں... اب تمہیں خوش کرنے کے لیے بزنس ٹرمز ختم کر دوں تو بتاؤ کھائیں گے کہاں سے..." وہ سابقہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"اس کا مطلب یہ کہ وہ ہمارے درمیان ہمیشہ رہے گی؟" صوفیہ نے ٹوٹے دل کے ساتھ سوال کیا تھا۔

"ساری صورت حال تمہارے سامنے ہے صوفیہ... چند سال تو اس کے ساتھ بنا کر رکھنی پڑے گی۔ میرا اپنا کاروبار تو بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ اب حبیبہ کی مدد سے کچھ سنبھال پایا ہوں۔ وقت تو لگتا ہے نا کاروبار میں... پھر تمہارے مطالبات کہ یہاں دبئی بلوالو... دبئی بلوالو... وہاں پاکستان میں بیٹھ کر سننے میں بہت اچھا لگتا ہے کہ درہم کما رہے ہیں... لیکن یہاں آ کر جب درہم ہی خرچنے پڑتے ہیں تو لگ پتا جاتا ہے۔"

"اچھا اچھا... بہت سن لی ہے میں نے یہ کہانی... دبئی ہے... کالا پانی نہیں ہے کہ آپ ہمیں ڈراتے رہیں... آپ فکر نا کریں... بس مجھے بلوالیں... میں کپڑے سی کر آپ کی مالی مدد کر دیا کروں گی۔" اس نے اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔

"اوہو... اب اتنی بری صورت حال بھی نہیں ہے کہ کاشف نثار کو اپنی بیوی کو درزن بنانا پڑے۔" وہ ہنسا۔

"تو بس ٹھیک ہے... آپ ہماری ٹکٹ کروائیں جلد از جلد..." صوفیہ نے لاڈ بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"دیکھو میری بے صبری اولاد کی بے صبری ماں... کونین کا پاسپورٹ تو بنوالو..." کاشف نے ٹوکا تھا۔

"لو۔۔۔ ان محترمہ کو تو بھول ہی گئی تھی میں۔۔۔ پہلے اس قسمت ماری کا پاسپورٹ تو بنوالوں۔۔۔" وہ زچ ہو کر بولی۔
"ہاں پہلے پاسپورٹ ہوا ہے۔۔۔" کاشف کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس نے ساری منصوبہ بندی کی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ کیا بنا لیا امی۔۔۔" اس نے آلو کی سادہ سبزی کو دیکھ کر ناک چڑھائی تھی۔ حالانکہ امی نے سلاد اور رائتہ تازہ بنایا تھا اور ساتھ ہی گرم گرم روٹی اتار کر اس پر دیسی گھی بھی لگایا تھا اپنی جانب سے اس کے کھانے کو بہت پرلطف بنانے کی کوشش کی تھی لیکن عادت کے مطابق اس نے واویلا مچانا شروع کر دیا تھا۔
"ابھی یہ کھالو۔۔۔ شام کی چائے پر اہتمام ہوگا۔۔۔ باقی تب کھالینا۔" امی عجلت بھرے انداز میں بولی تھیں۔ نمنا نے نوالہ بنانے کے لیے روٹی کا ٹکڑا توڑ لیا تھا ان کی بات سن کر ذرا حیران ہوئی۔
"کوئی آرہا ہے شام کی چائے پہ۔۔۔؟"
"ہاں۔۔۔ اسی لیے تو کہا ہے کہ تھوڑی بھوک بچا کر رکھو۔۔۔ کباب اور فروٹ چاٹ بنائی ہے۔ تمہارے ابا بیکری سے بھی لائیں گے کچھ۔۔۔" امی کافی عجلت میں دکھائی دیتی تھیں۔ وہ جب سے یونیورسٹی سے آئی تھی' زری نظر نہیں آئی تھی لیکن گھر کافی چمک دمک رہا تھا' لگتا تھا روٹین سے ہٹ کر محنت کی گئی تھی۔ امی ابھی بھی کاؤچ کے کشن کور زبدلنے میں مصروف تھیں۔
"میرے اور اس کاؤچ کے نصیب ایک ساتھ جاگ اٹھے ہیں۔ شکر ہے آپ کو ان کے کور زبدلنے کا بھی خیال آیا۔ آنکھیں تھک گئی تھیں گھٹا پیلا رنگ دیکھتے دیکھتے۔" وہ امی کو چڑاتے ہوئے بولی تھی۔
"اوہو۔۔۔ ایک تو تمہیں اپنے ابا کی طرح کوئی چیز پسند نہیں آتی۔ اتنے اچھے سورج مکھی کے پھول ہیں۔ سنہرا سنہرا رنگ آنکھوں کو اتنا بھلا لگتا ہے۔ پورا لاؤنج سج سا جاتا ہے۔ میلے ہو رہے تھے' ورنہ میں اب بھی نا بدلتی۔۔۔ مہمان پر اچھا امپریشن پڑتا ہے جب گھر میں کھلے کھلے رنگوں کے پردے' چادریں ہوں تو۔۔۔" امی مصنوعی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے بولی تھیں۔ انہیں جو رنگ پسند آتے تھے عام طور سے نمنا کو وہ ذرا بھی نہیں بھاتے تھے۔
"آپ کی پسند کے تو صدقے جاؤں میں لیکن آپ کا قصور نہیں ہے۔ آپ پاکستان بننے سے چار پانچ سال پہلے پیدا ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں لوگوں کو ایسے ہی رنگ پسند آیا کرتے تھے۔"
"وہ کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ امی کو بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھی۔ امی نے اس کی بات پر ہاتھ روک کر اسے گھور کر دیکھا' پھر ناک چڑھا کر بولیں۔"
"غضب خدا کا نمنا۔۔۔ اتنا پرانا مال نہیں ہوں میں۔۔۔" انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ نمنا نے ان کی بات کاٹ دی۔
"اچھا اچھا۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔ پاکستان بننے سے پہلے نہیں۔۔۔ پاکستان بننے کے چار پانچ سال بعد پیدا ہوئی تھیں آپ۔۔۔ اب تو خوش ہیں نا۔۔۔"
"جی نہیں۔۔۔ میری تو امی بھی پیدا نہیں ہوئی ہوں گی تب۔۔۔" نمنا نے پھر ان کی بات کاٹی۔
"اللہ اللہ۔۔۔ چلیں مان لیا بھئی۔۔۔ بہت چنی منی ہیں' آپ۔۔۔" بھوک لگی ہوئی تھی' سو وہ باتیں کرنے کے ساتھ بڑے بڑے لقمے بنا رہی تھی۔
"مہربانی تمہاری۔۔۔" امی نے آخری کور لگا کر دونوں ہاتھوں سے اسے تھپتھپایا تھا۔
"اچھا اب تو بتا دیں کہ کون آرہا ہے؟" اس کی روٹی ختم ہو گئی تھی' سو اب وہ بچ جانے والی سلاد کو ختم کر رہی تھی۔

"ارے وہی جس کا بتایا تھا تم نے۔۔۔ بلایا ہے اس کو آج۔۔۔" امی نے سارے میلے کورز اٹھائے اور باہر صحن کی طرف چل دیں۔ نمنا نے آنکھیں سکیڑ کر اور کھانے کا سلسلہ روک کر ان کی پشت کی جانب حیرانی سے دیکھا۔ وہ تو مر کر بھی کبھی کسی کو گھر نا بلانے کے مقولے پر یقین رکھتی تھی۔ اس کی بداخلاقی کے اتنے چرچے تھے کہ اس کے جاننے والوں نے بھی اس کے گھر آنے میں دلچسپی لی ہی نہیں تھی۔
"امی جی۔۔۔ بتائیں نا کون آرہا ہے۔۔۔ میں نے تو کسی کو نہیں بلایا۔" وہ حیران بھی تھی اس لیے امی کے واپس آنے سے پہلے ہی بلند آواز میں سوال کیا تھا۔ امی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید ان تک آواز ہی نہیں پہنچی تھی۔ باہر کی جانب کافی بڑا صحن تھا جس کے ایک کونے میں غسل خانہ تھا جہاں واشنگ مشین وغیرہ رکھی ہوئی تھی۔ امی یقیناً" اسی طرف گئی تھیں۔ نمنا نے برتن اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی' بلکہ ایسے ہی سب چھوڑ چھاڑ وہ بھی صحن کی جانب آگئی۔
"اب بتا بھی دیں کون آرہا ہے؟" اسے کافی بے چینی ہونے لگی تھی۔
"ارے وہی جو زری کا رشتہ بتایا تھا تم نے۔۔۔ اس لڑکے کو بلایا ہے۔۔۔ تمہارے ابا ایک بار مل لیں باقی کے معاملات اس کے بعد طے کریں گے کون ہے۔ کیا کرتا ہے۔۔۔ کیسا ہے۔۔۔ زری کے لیے مناسب ہے بھی یا نہیں۔۔۔ سب کچھ دیکھ بھال کر ہی کریں گے نا۔۔۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ بس تم نے بتا دیا اور سب فیصلے ہو گئے۔" امی کافی مطمئن لگنے لگی تھیں۔ نمنا کی تو آنکھیں پھٹنے والی ہو گئیں۔
"رشتہ میں نے نہیں بتایا تھا۔ میں نے آپ سے کہا تھا زری اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے زینب خالہ والوں کو ایک دم سے ہاں مت کریں۔۔۔ رشتہ وشتہ تو کوئی نہیں بتایا میں نے۔۔۔"
"ہاں ہاں۔۔۔ وہی۔۔۔ تم تو الفاظ ہی پکڑ لیتی ہو۔" امی چونکہ عجلت میں تھیں اس لیے چڑ کر بولی تھیں۔
"لگی تو کبھی پکڑنے دی نہیں آپ نے۔۔۔ اب الفاظ تو پکڑ لینے دیں۔" وہ عادت کے مطابق ان سے بھی زیادہ چڑ کر بولی تھی۔ امی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ ان کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی تھی۔
"اچھا میری ماں۔۔۔ جاؤ جو مرضی کرو۔۔۔ ایک تو اتنے کام پڑے ہیں نپٹانے والے۔۔۔ اور تمہارا بحث کا شوق ہی ختم نہیں ہو رہا۔" ان کی بات پر نمنا زچ ہوئی۔
"میں کب بحث کر رہی ہوں۔۔۔ صرف پوچھ رہی ہوں کہ کون آرہا ہے۔"
"بتایا تو ہے وہ لڑکا آرہا ہے۔۔۔ جس کا تم نے بتایا تھا۔۔۔ کیا بھلا سا نام ہے۔۔۔ نہیں یاد آرہا ہے مجھے۔۔۔" امی غسل خانے سے باہر آئی تھیں۔ نمنا نا صرف حیران ہوئی تھی' بلکہ پریشان بھی ہو گئی تھی۔ "اظفر۔۔۔ اظفر آرہا ہے؟" اس نے تو ہڑا کر پوچھا تھا۔
"ہاں۔۔۔ وہی۔۔۔ زری نے مجھے۔۔۔" اس نے امی کی مکمل بات بھی نہیں سنی تھی۔ دھپ دھپ کرتی وہ اندر کی طرف آئی تھی اور اسی انداز میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ زری تک سک سے تیار آئینے کے سامنے کھڑی اپنے سنہرے لمبے بال برش کرنے میں مگن تھی۔ اسے دیکھ کر مسکرائی اور ایسے مسکرائی کہ نمنا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔
"یہ کیا کیا تم نے زری۔۔۔ اظفر کو گھر بلا لیا۔۔۔ تمہیں کیا کہا تھا میں نے۔۔۔؟" وہ اسے کھا جانے والے انداز میں دیکھ رہی تھی۔
"تمہارے کہنے سے ہی تو ڈر لگتا ہے مجھے۔۔۔ پتا نہیں تم اب اپنے کیا کہہ دیتی۔۔۔ اور امی کو جانے کیا کیا الٹا سیدھا بتاتی رہتی ہو اظفر کے بارے میں۔۔۔ مجھ سے سخت غلطی ہوئی جو تم سے مدد مانگی میں نے۔۔۔ اسی لیے میں نے سوچا باقی کی گیم میں اکیلے کھیلوں گی۔۔۔ میں نے ابا کو اپنے منہ سے بتا دیا سب کچھ۔۔۔ انہوں نے خود اظفر کو بلایا ہے

اور وہ آ بھی رہا ہے۔۔۔ جبکہ تم کیا کہتی تھیں۔۔۔ وہ شادی کرے گا بھی یا نہیں۔۔۔" زری طنزیہ انداز میں کہتی ہوئی آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

"تم نے اچھا نہیں کیا زری۔۔۔ تم صبر تو کرتیں۔۔۔ میں تمہاری مدد ہی تو کرنا چاہ رہی تھی۔" نینا کو اندازہ نہیں تھا کہ زری ایسی چالاکی بھی کر سکتی ہے۔

"معاف کرو بہن۔۔۔ نہیں چاہیے تمہاری مدد۔۔۔ میں خود ہینڈل کرلوں گی سب۔۔۔" زری ناک چڑھا کر بولی تھی اور اس کی جانب دیکھے بنا باہر نکل گئی تھی۔ نینا تھکے ہوئے انداز میں پلنگ پر بیٹھ گئی تھی۔ اسے نا صرف زری کے رویے پر دکھ ہو رہا تھا بلکہ غصہ بھی آرہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیسی ہو۔۔۔" سمیع نے سرخ سرخ گلابوں کا بکے اسے تھمایا تھا۔ اسے اسپتال میں یہ پھول لے جاتے ہوئے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ روٹین میں بھی شہرین کے لیے اکثر پھول لایا کرتا تھا لیکن اسے ان پھولوں سے چڑ ہوتی تھی جو کسی مریض کی عیادت کے لیے لائے جاتے تھے۔ شہرین نے پھول تھام لیے تھے۔

"میں تو بے حد خوب صورت ہوں۔" شہرین مسکرائی۔ وہ ہاسپٹلائزڈ تو تھی لیکن پھر بھی بہتر محسوس کرتی تھی۔ زیادہ غنودگی کی دوائیاں کھانے کے باعث اس کی بڑی بڑی آنکھیں سوجی رہتی تھیں۔

"اس میں تو کوئی شک نہیں۔۔۔" سمیع نے کرسی گھسیٹ کر اس کے بیڈ کے قریب کی تھی اور پھر مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ شہرین بھی مسکرائی۔

"اب مریضوں سے بھی مذاق کرنے لگے ہیں لوگ۔۔۔" وہ مزید مسکرائی تھی۔

"میں لوگ نہیں ہوں۔۔۔ لوگ تو بیگانے ہوتے ہیں۔۔۔ میں تو تمہارا اپنا ہوں۔۔۔ اور اپنے ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا تھا۔

"واقعی۔۔۔؟" شہرین نے بے ساختہ کہا تھا۔ سمیع نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ کیا وہ اسے جتانا چاہتی تھی کہ وہ اس سے جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ جب سے ہاسپٹلائزڈ ہوئی تھی۔ سمیع اسے یہ ہی باور کروا رہا تھا کہ اس کی سرجری ایک بہت ہی معمولی سرجری ہے۔

"ایمن کیسی ہے۔۔۔ اسے لے آتے۔۔۔ میرا دل چاہ رہا تھا اسے دیکھنے کو۔۔۔" شہرین نے خود ہی اسے تذبذب میں دیکھ کر بات پلٹی تھی۔

"کبھی مجھے دیکھنے کو دل چاہا۔۔۔ مجھے تو کبھی نہیں کہا تم نے کہ سمیع تمہیں دیکھنے کو دل چاہ رہا ہے۔" وہ بھی بات پلٹنے کی خاطر اسے چڑاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"اب اس سوال کا جواب تو بہت فلمی ہو سکتا ہے کہ تم تو ہمیشہ میری نظروں کے سامنے ہوتے ہو۔۔۔ مجھے اپنے ساتھ محسوس ہوتے ہو۔۔۔ میرے دل میں رہتے ہو۔۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سمیع نے اس کی بات کاٹی۔

"ہاں میں تو چھلاوا ہوں نا۔۔۔ انسان تو ہوں نہیں۔۔۔" شہرین ہنسی۔

"کوئی چھلاوا اتنا ہینڈسم بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ میری عقل تسلیم نہیں کرتی۔"

"ہاں۔۔۔ اب کی ہے نا تم نے دل خوش کرنے والی بات۔۔۔ چلو میری تعریف میں اچھے اچھے چند جملے بولو۔۔۔" وہ اس کے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ شہرین مسکرائی، پھر بولی۔

"نہیں کرہی نا دوں تعریف۔۔۔"

"ارے تو کردو نا۔۔۔ کون سا پیسے لگ رہے ہیں تمہارے۔۔۔ کنجوس۔۔۔"

"بات پیسے کی نہیں ہے۔۔۔ میرے مرشد شوہر کی غیر ضروری تعریف سے منع فرماتے ہیں۔۔۔ وہ کہتے ہیں شوہر کی زیادہ تعریف کرو تو وہ سر چڑھ جاتے ہیں۔" وہ مزید ہنسی تھی اور سمیع کو بس اس ہنسی کے سامنے ہر چیز حقیر لگتی تھی۔ اس نے شہرین کو ہنستا دیکھ کر نہ جانے کتنی مرتبہ دل ہی دل میں ماشاءاللہ کہا تھا۔

"ارے ایسے کی تیسی آپ کے مرشد کی۔۔۔ ہم نہیں مانتے کسی مرشد کو۔۔۔" وہ اسے آنکھ مار رہا تھا۔ شہرین نے قہقہہ لگایا۔

"اللہ اللہ۔۔۔ مرشد ناراض ہو جائیں گے۔"

"ارے ہوتے ہیں تو۔۔۔ ہماری بلا سے۔۔۔ ہمارے لیے تو محبوب کی خوشی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔" وہ سابقہ انداز میں بولا تھا اور اس کے ہاتھ کو دبایا تھا۔

"اچھا چلو ہو گیا محبوب خوش۔۔۔ اب ذرا مہذب ہو کر بیٹھ جاؤ۔۔۔ نرسیں آتی جاتی رہتی ہیں کمرے میں۔ کیا سوچیں گی کہ ان کو رومانس کے لیے ہاسپٹل کا کمرہ ملا تھا۔" وہ دروازہ کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ سمیع نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

"ہماری بلا سے۔۔۔ جس کو جو سمجھنا ہے۔۔۔ ہمارے پاس لائسنس ہے رومانس کا۔۔۔" سمیع نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ شہرین پھر ہنسی تھی۔ سمیع مسلسل اس کا چہرہ دیکھنے میں مگن تھا۔ وہ بہت خوب صورت عورت تھی۔ اس کا ساتھ پا کر کبھی کبھی سمیع خود کو بے حد مغرور محسوس کرتا تھا اور اب چاہے وہ ہنس رہی تھی لیکن علیل تھی تو سمیع کا دل بے چین تھا اور اس بے چینی کو چھپا کر اسے ہنسانا اسے بے حد مشکل لگتا تھا لیکن وہ اس کے سامنے آتے ہوئے کمزور نا پڑنے کا تہیہ کر کے ہی آتا تھا۔

"پتا ہے سمیع ادے کیا کہا کرتی تھیں مجھے۔۔۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ شہرین اس بندے نے ڈائیلاگ بول بول کر تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔" شہرین نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں ڈائیلاگ بول رہا ہوں۔" وہ مصنوعی ناراضی سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ میں تو تمہیں ادے کی بات بتا رہی تھی۔۔۔ وہ کہا کرتی تھیں ایسے۔۔۔ جب میں نے گھر میں ہنگامہ مچایا ہوا تھا کہ مجھے تم سے ہی شادی کرنی ہے تو وہ اکثر یہ بات کہا کرتی تھیں۔"

اپنی ادے کا ذکر کرتے ہوئے وہ کچھ الجھی ہوئی سی لگنے لگی تھی۔

"یہ وقت بھی لکھا تھا نصیبوں میں کہ ہماری سچی باتوں کو لوگ ڈائیلاگ کہا کریں گے اب۔۔۔" سمیع نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کے متعلق سوچے اور پھر پریشان ہو۔ اسی لیے اس نے بات پلٹنے کی کوشش کی تھی لیکن شہرین ان ہی کا ذکر کرنا چاہتی تھی۔

"ادے کی اور بابا کی لڑائی پتا ہے کس بات پر ہوتی تھی۔۔۔ بابا بات کو بتاتے ہوئے ذرا وضاحت سے بتانے کے عادی تھے لیکن ادے چڑ جاتی تھیں کہ گھما پھرا کر بات کیوں کرتے ہو۔۔۔ مختصر بات کیا کرو۔۔۔ اور بڑی بھابھی سے بھی ان کا یہ ہی شکوہ رہتا تھا کہ منافقت نا کیا کرو۔۔۔ جو دل میں ہے صاف صاف کہہ دیا کرو۔۔۔ یہ لمبے لمبے جملے بول کر وقت کیوں ضائع کرتی ہو۔۔۔ دراصل ان کا بچپن بہت مشکل تھا۔۔۔ ماں سگی بھی تھی۔۔۔ تو میری نانی کروشیے کے سوئٹر اور شالز وغیرہ بنایا کرتی تھیں۔ تو ادے کو گھر کی ساری ذمہ داری سنبھالنی پڑتی تھی۔ کئی کام نپٹانے ہوتے تھے۔۔۔ پڑھائی۔۔۔ چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال۔۔۔"

شہرین اپنے ہی خیال میں گم اپنی ادے کے متعلق بتا رہی تھی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ سمیع کو ان باتوں میں دلچسپی ہے یا نہیں۔ اور تب ہی سمیع کو احساس ہوا تھا کہ وہ بہت شدت سے اپنے گھر والوں کو یاد کر رہی تھی۔ بالخصوص اپنی ادے کو۔۔۔ بیماری کے اوقات میں اللہ کے بعد ماں ہی تو ہوتی ہے جو شدت سے یاد آتی ہے۔ شہرین

یقیناً" ان سے ملنا چاہتی تھی۔ سمیع گہری سانس لیتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کونین کا پاسپورٹ بنا یا نہیں...." یہ دس دن بعد کی بات تھی جب کاشف نے دوبارہ فون کیا اور ظاہر ہے ابھی تو کاغذات جمع ہوئے تھے۔ وہ بھی ایک دن پہلے کیونکہ صوفیہ اکیلی کہاں کہاں جاتی.... بہنوئی کو کہہ کر کام کروانا پڑتے تھے اور وہ بھی ملازمت پیشہ انسان تھے' اپنی سہولت دیکھ کر ہی دفتر سے نکل پاتے تھے۔ اتنی جلدی تو یہ سب کام نہیں ہو سکتے تھے مگر صوفیہ کا جواب نفی میں سن کر کاشف نے سخت ناراضی کا اظہار کیا۔

"تمہیں کوئی احساس بھی ہے کہ میں نے کتنے پیسے لگا کر تمہارا ویزا لگوایا ہے۔ تم لوگوں کے لیے پھر سے ایک فلیٹ کا بندوبست کیا ہے۔ تمہیں کوئی پروا نہیں ہے کہ ویزا ایکسپائر ہو جائے گا.... اگر ہوتا تو تم ہر کام جلدی جلدی کرواتی۔ ویسے تم نے میرا جینا دو بھر کر رکھا تھا کہ مجھے بلوالو' ورنہ میں مر جاؤں گی اور اب جب ویزا لگ گیا ہے تو بلاوجہ کے تاخیری حربے آزما رہی ہو.... تم سے ایک چھوٹی بچی کا پاسپورٹ نہیں بنوایا گیا اب تک.... ایک ہفتے بعد ویزا ایکسپائر ہو جائے گا' مگر تمہاری بلا سے...." وہ کافی خفا تھا۔

"میں نے کاغذات جمع کروا دیے ہیں۔ ایک مہینہ بعد پاسپورٹ بن جائے گا.... آپ خود بتائیں میں اکیلی عورت' کہاں کہاں خوار ہوتی پھروں.... دوسروں کی محتاج ہوں.... ترلے منتیں کر کے کام کروانے پڑتے ہیں۔" صوفیہ نے شرمندہ ہوتے ہوئے وضاحت کی تھی۔

"ایک مہینہ بعد....؟" کاشف چلایا۔ "میں نے دس دن بعد کی ٹکٹیں کروالی ہیں' کیونکہ پندرہ دن بعد ویزا ایکسپائر ہو جائے گا.... اور تم مجھے بتا رہی ہو کہ پاسپورٹ ایک مہینے بعد ملے گا.... تم ارجنٹ نہیں بنوا سکتی تھیں۔ تھوڑی سی رقم نہیں خرچ جا سکتی تھی تم سے.... تم چاہتی کیا ہو آخر...." وہ ایک ایک لفظ کو جیسے چباتے ہوئے بول رہا تھا۔ صوفیہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"اچھا میں دولہا بھائی سے بات کروں گی۔ ان کے کافی تعلقات ہیں پاسپورٹ آفس میں.... آپ فکر نا کریں۔" اس نے لرزتے کانپتے دل سے کاشف کو تسلی دی تھی۔

"ہاں ہاں بھئی.... اس غریب ٹٹ پونجیے کے تعلقات وزیراعظم ہاؤس تک بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کو بولو تمہیں کسی ذاتی جیٹ میں بٹھا کر ڈائریکٹ دبئی ہی پہنچا دے۔" کاشف کے لہجے میں انتہائی حقارت تھی۔ صوفیہ کا دل ٹوٹ گیا۔

"ایسے تو نا کہیں.... آپ تو میرا حوصلہ بھی ختم کر دیں گے.... دعا کریں بس جلدی جلدی ہو جائے سارا کام....؟" اس نے پھر منمناتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

"ہاں بس تم وہاں بیٹھی دعائیں منتیں کرتی رہو.... میں یہاں خوار ہوتا رہتا ہوں۔" وہ غرا کر بولا تھا اور ٹھک کر کے فون بند کر دیا تھا۔ صوفیہ کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ٹپک کر گالوں تک آ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ایسا نہیں ہوتا بہن صوفیہ.... کاشف صاحب نے مذاق میں کہہ دیا ہو گا۔" دولہا بھائی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا جس نے کاشف کی کال سننے کے بعد سے یہ شور مچا رکھا تھا کہ کسی بھی طرح کچھ کر کے کونین کا پاسپورٹ جتنی جلدی ممکن ہو بنوا دیا جائے۔ دولہا بھائی بے چارے اسے سمجھا رہے تھے کہ یہ ممکن نہیں رہا تھا۔

"پورے گلف میں ایسا نہیں ہوتا۔ ویزے کی معیاد تین مہینے ہوتی ہے۔ تین مہینے کے بعد ہی ویزا ایکسپائر ہوتا ہے.... اور چلیں فرض کر بھی لیں کہ ویزا ایکسپائر نہیں ہوتا تب بھی آپ کو اس کا فائدہ نہیں ہو گا.... کیونکہ

نیناپٹی کا ویزا تو نئے سرے سے ہی اپلائی ہوتا ہے۔۔۔ میری مانیں آپ کچھ دیر صبر کریں۔۔۔ جب سب کاغذات تیار ہو جائیں تو پھر سے اپلائی کریں۔" وہ بہت کم گفتگو کرتے تھے۔ حالانکہ وہ ان کے دور پار کے کزن ہی تھے لیکن رشتے کی نوعیت ایسی تھی کہ صوفیہ زیادہ بے تکلف نہیں تھی۔ اس لیے ان کے سمجھانے پر تو وہ کچھ نہیں بولی لیکن شام کو رو رو کر باجی کی منتیں کرتی رہی۔

"باجی میں کیا کروں۔ آپ کو اندازہ نہیں کاشف نے کتنے غصے سے فون بند کیا ہے۔۔۔ ہائے کتنی آس سے ہمارے آنے کے دن گن رہے ہوں گے وہ اور یہاں اس منحوس کا پاسپورٹ نہیں بن کر دے رہا۔۔۔ ہائے ہائے یہ اولاد بھی کبھی کبھی ماں' باپ کے لیے کتنی مشکل کر دیتی ہے۔۔۔ کیا تھا اگر یہ تین مہینے مزید ٹھہر کر دنیا میں آجاتی۔" صوفیہ کی ساری جھنجلاہٹ اس چھوٹی سی بچی پر ہی اترتی تھی۔ اس کے دل میں کہیں نا کہیں یہ آس تھی کہ بیٹا ہوگا تو کاشف خوشی خوشی پاکستان آئے گا اور انہیں بھی ساتھ لے جائے گا لیکن یہاں معاملہ الٹا ہو گیا تھا۔

"یا خدا۔۔۔ صوفیہ تم کیا ہر وقت اس بے چاری کو ہی کوستی رہتی ہو۔۔۔ کتنی بار کہا ہے اپنی اولاد کو اس طرح نہیں کہتے۔۔۔ ناشکری بھی ہے اور اللہ کی نعمت کی ناقدری بھی۔۔۔" باجی نے گھرک کر ٹوکا تھا۔ وہ بہن سے زچ آچکی تھیں۔ اس کا روز' روز کا ایک ہی واویلا انہیں غصہ دلانے لگا تھا۔

"آپ کو کیا پتا میری زندگی میں کتنے مسئلے ہیں۔۔۔ اب اگر اس کا پاسپورٹ وقت پر نا ملا۔۔۔ اور ہم نا جا سکے تو کاشف نے دوبارہ ہمیں بلانا ہی نہیں ہے۔۔۔ وہ ایسے ہی ہیں۔۔۔ ضدی۔۔۔ غصہ آجائے جس بات پہ۔۔۔ اسے کبھی نہیں دہراتے۔۔۔" وہ ذرا سا شرمندہ ہو کر بولی۔

"میں تمہاری بات سے انکار نہیں کر رہی۔۔۔ لیکن بتاؤ اس میں تمہاری یا کسی کی بھی کیا غلطی ہے۔ کاغذات بننے میں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔۔۔ اصل غلطی تو اس کی ہے۔۔۔ جس نے کاغذات جمع کرواتے وقت یہ تک نا سوچا کہ اس کے خاندان میں ایک نئے فرد کا اضافہ ہوا ہے۔۔۔ اچھا چلو ہو جاتی ہے انسان سے بھول چوک۔۔۔ ہو گئی غلطی۔۔۔ لیکن اب اپنی اس غلطی کو وہ تمہارے سر تھوپنے کی کوشش تو نا کرے۔۔۔" باجی کافی سے زیادہ خفا ہو رہی تھیں۔ صوفیہ نے آنسوؤں سے تر گال ہاتھوں کی پشت سے صاف کیے۔

"تو پھر وہ کیا کریں۔۔۔ میں یہاں آپ کے گھر ناداروں کی طرح پڑی ہوں۔۔۔ ان کے لیے کتنی شرمندگی والی بات ہے۔۔۔ انہیں بھی احساس ہے کہ میں اور ان کی اولاد آپ پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔۔۔ ابو نے انہیں فون کر کے بے نقط سنائی ہیں۔۔۔ وہ تو کسی کو بھی پریشان نہیں دیکھ سکتے۔ نا مجھے اور نا آپ لوگوں کو۔۔۔ اسی لیے تو جلدی جلدی کے چکر میں غلطی کر بیٹھے۔۔۔ لیکن مجھے بتائیں میں اب کیا کروں۔۔۔ اتنے غصے سے فون بند کیا ہے ایسے جیسے میرے منہ پر دے مارا ہو۔۔۔"

وہ پھر چکوں پھکوں رونے لگی تھی۔ باجی کو اس کے انداز سے الجھن تو ہو رہی تھی لیکن ساتھ ساتھ اس پر ترس بھی آیا۔ ان کی یہ بہن شادی سے پہلے کتنی مضبوط اور سمجھ دار ہوا کرتی تھی۔ سارے خاندان میں چرچا تھا ایسی سمجھ دار لڑکی تو سسرال میں حکمرانی کرے گی اور وہ بے چاروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ ہر وقت کا رونا' چڑچڑا پن' بے زاری' اکتاہٹ یہ ہی چار اجزا اس کی مضبوط شخصیت کی ہریت کو اتار کر اپنے گھیراؤ میں لے چکے تھے۔ یہ وہ والی صوفیہ تو تھی ہی نہیں جوان کے بابل کے آنگن میں راج کرتی تھی۔ یہ تو کوئی اور صوفیہ تھی جس کے پاس زیادہ دیر بیٹھنے کے بعد دوبارہ بیٹھنے کا دل تک نا کرتا تھا کیونکہ وہ ہر وقت شکوے شکایات کا پنڈورا باکس کھول کر بیٹھی رہتی تھی۔

"میں کاشف سے خود بات کر کے دیکھوں؟" باجی نے اس کے رونے سے عاجز آکر سوال کیا تھا۔ اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں باجی۔۔۔ برا مان جائیں گے۔۔۔ جو رہ گئی ہے وہ بات بھی بگڑ جائے گی۔"

"اچھا بہن تمہاری مرضی' جو مرضی کرو لیکن میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتانا۔" باجی اس کے پاس سے ہی اٹھ گئی تھیں لیکن ابھی کمرے کے دروازے تک بھی نا پہنچی تھیں کہ صوفیہ کے پاس بیڈ پر لیٹی کونین نے سسکی بھری تھی اور بلاوجہ رونے لگی۔ صوفیہ نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا۔

"اونہہ۔۔۔ اس کو کس بات کا رونا آنے لگا۔۔۔ فساد کی جڑ' نا ہو تو۔۔۔ ستوانسی ہونے سے بہتر تھا۔۔۔ مردہ پیدا ہو جاتی۔" اس نے اسے ایک ہلکی سی دھپ لگائی تھی بالکل جیسے کسی چیز کو تھپتھپایا جاتا ہے لیکن کونین نے یک دم ہی زور' زور سے بلکنا شروع کر دیا۔ اب کی بار صوفیہ نے اسے ذرا زور کا تھپڑ لگایا۔

"رونا دیکھو اس کا جیسے اس کی ماں مر گئی ہو۔۔۔ منحوس۔۔۔ بدبخت۔۔۔ مرن جوگی۔" وہ نخوت' حقارت' غصے اور بے بسی کے ملے جلے جذبات میں گھر کر بولی۔ باجی دہل کر پلٹی تھیں اور اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"دفع دور صوفیہ۔۔۔ ایسی بھی کیا جہالت۔۔۔ اولاد ہے تمہاری۔۔۔ بچی ہے صرف چار مہینے کی۔۔۔ اس پر کس بات کا غصہ نکال رہی ہو۔۔۔ ارے میرا بچہ۔۔۔ معاف کر دے اپنی ماں کو۔۔۔ اسے کچھ سمجھ نہیں۔۔۔ پاگل ہو گئی ہے یہ۔۔۔" باجی کو اتنا غصہ آیا کہ دل چاہا صوفیہ کو دو تھپڑ ہی جڑ دیں۔

"پاگل ہی تو ہو گئی ہوں۔۔۔ پاگل خانے چھوڑ دیں مجھے سب مل جل کر۔۔۔ اللہ نے بھی کیسی زندگی بنائی ہے میری۔۔۔ سب عاجز ہیں مجھ سے۔۔۔ ماں' باپ' بہن' بھائی اور شوہر بھی۔۔۔ موت ہی آجائے' لیکن وہ بھی مانگنے سے کب مل جاتی ہے۔" اس نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا تھا۔ باجی اسے کوئی تسلی دیے بنا باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

"سلیم ایک مسئلہ ہے۔" وہ تھک ہار کر اس کی دکان پر آبیٹھی تھی۔ زری نے اسے ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ اس کے اندر نہ جانے کیسے اتنی ہمت آگئی تھی کہ اس نے ابا سے اظفر کے متعلق خود ہی بات کر لی تھی اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی تھی کہ امی' ابا نے اس ایکس وائی زیڈ لڑکے کو گھر بھی بلا لیا تھا۔ نینا کے لیے تو یہ بات بھی بہت پریشان کن تھی کہ وہ آ بھی رہا تھا۔ جب اسے کچھ سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ کیا کرے تو وہ سیڑھیاں اتر کر سلیم کے پاس آگئی تھی۔ چند دن پہلے وہ رات کو بھی آئی تھی لیکن تب خالہ بھی آکر بیٹھ گئی تھیں اور کوئی بات ہو ہی نہیں پائی تھی۔

"تم تو ہو ہی مسئلوں کا اٹیچی کیس۔۔۔ جب بھی آتی ہو کوئی نہ کوئی مسئلہ لے کر ہی آتی ہو اور میں سوچ رہا تھا کہ تم آؤ گی تو تمہیں ایک اچھی خبر سناؤں گا۔"

سلیم نے چڑانا چاہا تھا۔ وہ خود آج کل کافی خوش تھا۔ اس کے لکھنے لکھانے کا سلسلہ کافی ترقی کر رہا تھا۔ اسے متعلقہ حلقوں میں پذیرائی مل رہی تھی۔ اس نے اپنا ایک فیس بک پیج بنایا تھا جس پر اس کے پڑھنے والے اچھے رسپانس دے رہے تھے اور اس نے ابھی تک یہ سب نینا کو نہیں بتایا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ نینا کسی روز فرصت سے ان کے گھر آئے تو وہ یہ سب اس کے گوش گزار کرے۔

"سلیم تمہاری اچھی خبریں بعد میں سن لوں گی۔ پہلے میرا مسئلہ سن لو اور دیکھو پلیز میری نیت پر شک نہ کرنا۔۔۔ میں یہ بات تم سے کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میرا مقصد تمہیں کسی سے متنفر کرنا نہیں لیکن تمہارے علاوہ میں یہ بات کسی سے کر بھی نہیں سکتی۔ ابا سے میری زیادہ بات چیت ہے نہیں اور امی میری بات سنیں گی نہیں۔ وہ مجھے ہی قصوروار سمجھیں گی۔" نینا نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے براہ راست اپنا مسئلہ بیان کرنا چاہا تھا۔

"اب یہ مت کہنا کہ میں خالہ اور خالو کو اس بات کے لیے آمادہ کروں کہ وہ تمہاری شادی مجھ سے کر دیں۔۔۔

کہیں اس کو "ہاں" تو نہیں کہہ آئی ہو۔" سلیم نے اس کے انداز و الفاظ کی سنجیدگی کو خاطر میں لائے بنا کہا تھا۔

"سلیم زری کا رشتہ آیا ہے۔" نینا نے جیسے اس کی بات سنی ہی نا ہو۔ وہ اپنی ہی پریشانی میں گم بولی تھی۔ سلیم جو اس کے چہرے کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا' اس کی بات سن کر مسکراہٹ اس کے چہرے سے غائب ہوئی تھی۔

"اب اس مسئلے کا حل تو نہیں ہے میرے پاس... اللہ ہی پوچھے گا کہ خالہ زینب کو جنہیں خاندان بھر کی بیاہنے کے لائق لڑکیاں تو نظر آتی ہیں... ایک تم اور میں ہی نظر نہیں آتے۔ بتاؤ قطر سے میرے لیے رشتہ بھی تو لا سکتی تھیں۔" وہ لہجے کو حتی الامکان نیم سنجیدہ رکھتے ہوئے بولا تھا۔

"سلیم یہ خالہ زینب والا رشتہ نہیں ہے۔ زری کسی اور لڑکے کو پسند کرتی ہے۔" نینا نے بڑے بجھے ہوئے لہجے میں انکشاف کیا تھا۔ سلیم کے چہرے کا رنگ بدلا تھا لیکن نینا کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ فی الوقت وہ اسے کوئی دلاسا دے سکتی۔

"سلیم تمہیں پتا ہے وہ لڑکا کون ہے... وہ وہی لڑکا ہے جس کا نمبر میں نے تمہیں دیا تھا۔ وہی لڑکا جو رانیہ کو تنگ کرتا تھا... آیا یاد۔" نینا نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

"وہ لوفر... واقعی... زری کیسے جانتی ہے اسے..." سلیم شاکڈ رہ گیا تھا۔

"اس کا افیئر چل رہا ہے اس کے ساتھ... فیس بک کے ذریعے دوستی... پھر واٹس ایپ پر رات رات بھر باتیں... وہی فضول ٹیپکل کہانی..." نینا کو اپنی ہی بہن کے متعلق سب بتاتے ہوئے شرمندگی بھی ہو رہی تھی اور تاسف بھی۔ خاندان بھر میں اس قسم کے افیئر کی پہلے کوئی مثال تھی ہی نہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی۔ ایک گاہک آگیا تھا۔ سلیم نے بجھے ہوئے انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

"سلیم بھائی۔ گھی کا ایک پیکٹ دے دیں۔"

"نہیں ہے... ختم ہو گیا... سب ختم..." سلیم نے جیسے جان چھڑوائی تھی۔

"تم نے زری کو بتایا اس لڑکے کے متعلق... تمہیں بتانا چاہیے تھا نینا... وہ اچھا نہیں ہے... بڑا حرامی قسم کا لڑکا ہے... فیس بک پر لڑکیوں سے دوستی... پھر بلیک میلنگ اس کا مشغلہ ہے... میں نے اپنے ایک دوست کو اس کا نمبر دیا تھا... میرا وہ دوست اس سے لڑکی بن کر باتیں کرتا ہے اور وہ بتا رہا تھا کہ وہ کردار کا اچھا لڑکا نہیں ہے۔" وہ اس گاہک کے پلٹتے ہی نینا کی جانب متوجہ ہوا۔

"یہ ہی تو مسئلہ ہے... میں نے زری کو بتایا تھا... لیکن اس کی آنکھوں پر عشق کی کالی سیاہ پٹی اتنی زور سے بندھی ہے کہ اسے اپنی بہن ہی اپنی دشمن نظر آرہی ہے۔ میں نے سوچا تھا میں اس کو ثبوت فراہم کروں گی اور پھر اس سے مزید تفصیل سے بات کروں گی۔ میں رانیہ کے گھر گئی بھی تھی کہ شاید اس کے پاس کوئی چیٹنگ ریکارڈ' کوئی چیز محفوظ ہو... مگر وہ گھر پر ملی نہیں... سچی بات یہ ہے کہ میرا دماغ بالکل ماؤف ہوا جا رہا ہے کہ کیا کرنا چاہیے اور یہاں زری کی پھرتی ملاحظہ ہو... اس نے ابا سے بات کر کے اس لڑکے کو آج گھر پر بلا لیا ہے تاکہ ابا اس سے مل لیں۔" نینا نے انگلیاں مسلتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

"وہ تم لوگوں کے گھر آرہا ہے؟" سلیم نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔ نینا نے اسے گھور کر دیکھا۔

"نہیں... ہم لوگوں کے گھر نہیں آرہا... وہ پچھلی گلی میں جو شوکت صاحب رہتے ہیں نا ان کے گھر آرہا ہے۔" نینا کا انداز طنزیہ تھا۔

"یہ مذاق کا وقت نہیں ہے نینا... زری بہت مشکل میں گرفتار ہو جائے گی۔ اس لڑکے کا بیک گراؤنڈ بھی اچھا نہیں ہے... مجھے حیرانی اس بات کی ہے کہ وہ خالو سے ملنے گھر آرہا ہے۔" سلیم کافی پریشان ہو گیا تھا۔

"اب جانے کیا چال چلنے کا ارادہ ہو اس کا... مگر یہ بات حتمی ہے کہ زری گھاٹے کا سودا کر رہی ہے۔" نینا کے ہر عضو سے تاسف جھلک رہا تھا اور سلیم کے تو پورے وجود پر سناٹا چھا گیا تھا۔

"تم مجھے پہلے بتاتیں تو سہی..." اس نے نینا سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا تھا۔

"اسی لیے تو اس دن پوچھا تھا تم سے لیکن تم نے میری بات نہیں سنی اور اپنے مشورے دینے شروع کر دیے۔" نینا نے اسے جتا کر کہا تھا۔

"تم دوبارہ بات تو کرتیں... ہم کچھ نہ کچھ کر ہی لیتے۔" سلیم اسی انداز میں بولا تھا۔

"میرا نہیں خیال کہ زری کچھ سمجھے گی۔ وہ بہت خود سر ہو گئی ہے... میں تو حیران ہوں اس کی ہمت پہ... اس نے اتنی بڑی بات ابا سے کی کیسے ہو گی... یہ مسئلہ سلجھتا نظر نہیں آرہا مجھے سلیم... میں بہت پریشان ہوں۔" نینا واقعی بہت پریشان تھی۔

"تم کہو تو میں بات کروں زری سے... اسے سمجھاؤں؟" سلیم نے پوچھا۔

"تم کہاں کے ڈپٹی نذیر احمد ہو کہ تمہاری بات سمجھ لے گی وہ... جب وہ میری بات نہیں سن رہی تو تمہاری کیسے سنے گی۔" نینا نے اس کی تجویز رد کر دی تھی۔

"ایک دفعہ بات تو کرنے دو..." سلیم نے اصرار کیا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ اب کسی کی بھی سنے گی۔" نینا کے لہجے میں تاسف گھر آیا تھا اور یہ ہی حال سلیم کا تھا۔

"پھر بھی مجھے ایک بار بات کرنے دو..." نینا کچھ نہیں بولی تھی۔

"تم بات کرو گے تو وہ مجھ سے ناراض ہو گی کہ میں نے اس کا سیکرٹ سب کو بتا دیا... اور تم اس سے بات کرو گے کیسے... تم لوگوں کے گھر خالہ ہوں گی... ہمارے گھر امی' ابا موجود ہوں گے... مجھے تو ایسے..." سلیم نے نینا کو جملہ مکمل نہیں کرنے دیا تھا۔

"تم مجھے اپنی سی کوشش کرنے دو... بس ایک کام کرنا... جب خالو اور خالہ سو جائیں تو مجھے واٹس ایپ کر دینا... میں آجاؤں گا... تم دروازہ کھول دو گی نا..." وہ اصرار بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ نینا نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میری کل شام کی فلائٹ ہے۔ چند ضروری کام ہیں... وہ نپٹا کر شام تک آجاؤں گا واپس..." سمیع نے کہا۔ اماں رضیہ نے سر ہلایا۔ وہ اسے پورچ تک خدا حافظ کہنے آئی تھیں۔ شیریں کی سرجری کا وقت نزدیک آرہا تھا۔ بے چینی اور تفکر کا درجہ حرارت مزید بڑھ گیا تھا۔ اماں' رضیہ ایک دن پہلے کراچی سے یہاں آئی تھیں اور آج سمیع جا رہا تھا۔ کئی ایک معاملات تھے جو نپٹانے تھے اور دل تھا کہ ڈوبتا جاتا تھا۔ وہ بہت بے چین دل کے ساتھ کراچی جا رہا تھا۔ کراچی والا گھر اس نے فی الحال نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا مگر رانی سمیت تمام ملازمین فارغ کرنے تھے۔ ایک چوکیدار تھا جو مالک مکان کا ملازم تھا۔ چابی وغیرہ اسی کے حوالے کرنے کا ارادہ تھا۔ سمیع کو یہ ہی سب معاملات دیکھنے تھے آفس میں بھی کئی چیزیں نپٹانے والی تھیں۔ اسی لیے وہ جا رہا تھا۔

دو دن بعد صبح شیریں کی سرجری تھی اور یہ سمیع کے حواسوں کا بہت بڑا امتحان تھا۔ اماں رضیہ کے آجانے سے اسے کافی ڈھارس ہوئی تھی۔ وہ شیریں کو حوصلہ دینے کے ساتھ ساتھ ایمن کی بھی ذمہ داری مکمل طور پر سنبھال لی تھیں۔ شوکت بھائی نے اسے سرجری تک اپنے یہاں ہی رہنے کی پیش کش کی تھی۔ وہ اپنے گھر کے اوپر والے پورشن میں کچھ مرمت وغیرہ کروا رہے تھے۔ انہوں نے سمیع کو اسی کو کرائے پر لینے کی پیش کش بھی کی

تھی اور سمیع اس کے لیے رضامند بھی تھا۔

"شہرین کا خیال رکھیے گا اماں۔۔۔" اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے انہیں تاکید کی تھی۔ اسی دوران ایمن بھی لاؤنج سے اٹھ کر ان کے پاس آگئی تھی اور ان کی انگلی پکڑ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ اس کی نگاہیں سمیع کو ہی دیکھنے میں مگن تھیں۔ اس رات کے بعد سے سمیع کی اور اس کی دوبارہ بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ وہ سارا دن رانیہ کے ساتھ رہتی تھی، پھر رات کو اس کے آنے سے پہلے سو چکی ہوتی تھی۔

"تم بھی اپنا خیال رکھنا بیٹا۔۔۔ بابا کو سلام کرو ایمن!" اماں رضیہ نے سمیع کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ایمن کو اشارہ کیا تھا کہ وہ باپ کو ہاتھ ہلائے۔ ایسا کبھی پہلے انہوں نے اسے اپنے گھر کراچی میں کرنے کو نہیں بولا تھا۔ ایمن نے بھی باپ کو خدا حافظ کہنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ویسے بھی کچھ دیر پہلے ہی سو کر اٹھی تھی ابھی اس پر کچھ سستی غالب تھی۔

"ہاتھ ہلاؤ بیٹا۔۔۔" اماں رضیہ نے ایمن کو خاموش دیکھ کر پھر سے کہا تھا لیکن وہ ہلی بھی نہیں تھی بلکہ ان کے پہلو میں منہ چھپانے لگی تھی۔ اسی لمحے نہ جانے سمیع کے دل میں کیا سمائی۔ وہ دوبارہ گاڑی سے اتر آیا تھا اور پھر ایمن کے پاس آکر اس نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کیا تھا۔ وہ جانے سے پہلے بیٹی سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا۔ اماں رضیہ کو اس کا یہ انداز دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ ان کے ہونٹ مسکراہٹ کے انداز میں بالکل پھیل سے گئے۔ یہ پیار بھرے انداز اس بچی کے حصے میں پہلے کب آئے تھے۔ ایمن نے باپ کے اس انداز کو زیادہ خوش آمدید نہیں کہا تھا، بلکہ وہ ایسے ہی ساکت کھڑی رہی تھی۔ اماں رضیہ نے ہی اسے ٹہوکا دیا۔

"بابا سے ہاتھ ملاؤ بیٹا۔" اس نے ان کے کہنے پر اپنا ہاتھ آگے کیا تھا۔ سمیع نے اس کے ہاتھ کو تھاما، چوما اور پھر چھوڑ دیا۔

"اپنا خیال رکھنا۔۔۔" اس نے کہا تھا۔ اب اس کے انداز میں کوئی ایسی محبت بھی نہیں تھی کہ ایمن کو اس کی حرارت پہنچتی لیکن اماں رضیہ کی باچھیں چر گئی تھیں۔

"ان شاء اللہ۔۔۔" اماں رضیہ خوش ہوتے ہوئے بولی تھیں۔ سمیع پلٹا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی گیٹ سے باہر نکال لی تھی تب اماں نے ایمن کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی جانب چل دیں۔

"آپ کو پتا ہے ان کی فیورٹ آئس کریم کون سی ہے۔" اندر کی جانب جاتے ہوئے اس نے اماں رضیہ سے عام سے انداز میں سوال کیا تھا۔ اماں رضیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"کریم کیریمل۔۔۔" ایمن نے اپنی جانب سے بہت اہم معلومات شیئر کی تھیں، پھر وہ چلتے چلتے رکی تھی۔

"آپ کو پتا ہے کہ کریم کیریمل کون سی والی آئس کریم ہوتی ہے۔" اماں رضیہ کو تو کبھی رنگوں کے نام انگریزی میں یاد نہ ہوتے تھے انہیں آئس کریم کا نام کہاں یاد رہنا تھا۔ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ جس میں براؤن شوگر کا جوس۔۔۔ (سیرپ) ہوتا ہے نہ۔۔۔ میٹھا میٹھا۔۔۔" اس نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔ اماں رضیہ نے سر ہلایا۔ انہیں نام بھول جاتے تھے لیکن فلیور یاد رہتے تھے، کیونکہ ایمن کو آئس کریم کھلانے تو وہ اکثر لے جایا کرتی تھیں اور ایمن کی وجہ سے ہی راشن وغیرہ لاتے ہوئے آئس کریم بھی ضرور آتی تھی۔

"اچھا اچھا۔۔۔ تمہارے بابا کو وہ آئس کریم پسند ہے۔۔۔ تمہیں کیسے پتا؟" انہوں نے دو سوال ایک ساتھ کیے تھے۔ ایمن باپ سے متعلق بات کر رہی تھی، انہیں یہ بات کافی اچھی لگ رہی تھی، ورنہ وہ کافی کم گو سی بچی تھی۔

"جی۔۔۔ ان کو وہی آئس کریم پسند ہے۔۔۔ میں نے ان کو لے کر دی تھی ایک دن۔۔۔ جب یہ میرے ساتھ آئس کریم کھانے گئے تھے۔" وہ جیسے اس دن کو یاد کرتے ہوئے خود ہی مسکرائی تھی۔ اس کے چہرے پر بہت میٹھی سی مسکراہٹ تھی اور یہ مسکراہٹ باپ کو یاد کر کے چہرے پر نہیں آئی تھی، بلکہ یہ مسکراہٹ آئس کریم کو یاد کرنے

سے چہرے پر چمکنے لگی تھی، پھر بھی اماں رضیہ کو اچھا لگا۔

"تم ان کے ساتھ آئس کریم کے لیے گئی تھی؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔ انداز میں تجسس نہیں تھا، فقط اطمینان تھا کہ باپ بیٹی میں کچھ تو روابط بڑھ رہے تھے۔

"جی۔۔۔ میں ان کو لے کر گئی تھی نا۔۔۔ ان کو بہت درد تھا۔۔۔ میں نے ان کو بولا کہ آئس کریم سے درد چلا جاتا ہے۔۔۔ پھر وہ بولے آئس کریم کھاتے ہیں۔" وہ تفصیل بتانے لگی تھی۔

"اچھی بات ہے نا۔۔۔ تمہیں اچھا لگا نا اپنے بابا کے ساتھ آئس کریم (پارلر) پر جا کر۔۔۔" انہوں نے اس سے پوچھا تھا۔

"آئس کریم اچھی تھی اماں۔۔۔" اس نے سر ہلایا گویا ان کے سوال کا یہی جواب ہو۔ اماں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہ کچھ نہیں بولی تھیں۔ ایمن کو باپ کی شفقت کو سمجھنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔

☼ ☼ ☼

"زری۔۔۔ میری بات کا برا نہ منانا۔۔۔ لیکن نہنا سچ کہہ رہی ہے۔۔۔ وہ لڑکا اچھا نہیں ہے۔" سلیم نے بہت دھیمے لہجے میں زری سے کہا تھا۔ وہ بہت مشکل سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تھا۔ بارہ ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ نہنا نے ہی 'ابا' کے سو جانے کے بعد اسے واٹس ایپ کر دیا تھا اور اس کے کہنے کے مطابق دروازہ پہلے ہی کھول دیا تھا سو نہنا ہی اسے اپنے کمرے تک لائی تھی۔ زری پہلے تو اسے دیکھ کر حیران ہوئی تھی، پھر جب سلیم نے یہ بات شروع کی تو اس کا چہرہ بالکل سرخ ہو گیا تھا۔ بلاشبہ اسے سلیم کی مداخلت بہت بری لگی تھی۔

"نہنا مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔۔۔ تم اس قدر گھٹیا بھی ہو سکتی ہو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔" وہ نہنا کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ نہنا کو اتنا برا لگا لیکن وہ خود پر جبر کر کے خاموش رہی تھی۔ وہ بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا مقصد صرف زری کو سمجھانا تھا۔ اسے موہوم سی امید تھی کہ شاید سلیم زری کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا پائے گا۔

"زری تم پلیز نہنا کو کچھ مت کہو۔۔۔ وہ اس لڑکے کو نہیں جانتی۔۔۔ میں جانتا ہوں۔۔۔ دراصل۔۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ زری نے غرا کر اس کی بات کاٹی۔

"سلیم تم تو چپ ہی رہو۔۔۔ تم میں اگر ذرا بھی لحاظ ہوتا تو تم یہاں آتے ہوئے کئی مرتبہ سوچتے۔۔۔ اور اگر میری اس بہن میں غیرت کی ذرا سی بھی رمق ہوتی تو وہ تمہیں یہاں بلاتی ہی نہیں۔۔۔ ایسا بھی کیا ہو گیا ہے کہ تم لوگ اظفر کے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔ پہلے نہنا صاحبہ اس کے متعلق الٹی سیدھی باتیں کرتی رہی ہیں اور اب تم آ گئے ہو۔۔۔ حالانکہ وہ آج ابا سے ملا ہے اور ابا کو وہ پسند بھی آیا ہے۔۔۔ تم خواہ مخواہ ہی کوتوال بن کر آ گئے۔۔۔ تم ہوتے کون ہو ہمارے گھر کے انتہائی ذاتی معاملے میں بولنے والے۔۔۔" اس کا لہجہ بے حد جارحانہ تھا۔ نہنا کو اس کے انداز پر اتنا غصہ آیا۔۔۔ اس نے پہلے تو سلیم کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"زری تمہیں بھی کوئی حق نہیں ہے سلیم سے اس انداز میں بات کرنے کا۔۔۔ ایک تو وہ اتنی مشکل سے سیڑھیاں چڑھ کر تمہیں سمجھانے آیا ہے اور تم اسی کی نیت پر شک کر رہی ہو۔" نہنا برا مان کر بولی تھی۔

"میں کیوں شک کروں گی۔۔۔ یہ بیماری تو تمہیں ہے۔" زری نے منہ کا زاویہ مزید بگاڑ لیا تھا۔

"دیکھو زری بات صرف اتنی سی ہے کہ وہ لڑکا اچھا نہیں ہے۔۔۔ اور۔۔۔" نہنا نے اتنا ہی کہا تھا کہ زری نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہیں آج تک اچھا لگا کون ہے نہنا۔۔۔ جس شخص سے ملتی ہو۔۔۔ اسی میں کیڑے نکالنے لگتی ہو۔۔۔ تمہیں تو

اپانہ اچھے لگے ساری زندگی۔۔۔ تمہیں کوئی اور کون کیسے اچھا لگ سکتا ہے۔ تمہارے لیے تو بس یہ شہزادہ سلیم ہی دنیا کا واحد اچھا انسان ہے۔" زری کا انداز جارحانہ ہونے کے ساتھ ساتھ اب طنزیہ بھی ہو گیا تھا۔ نینا نے مڑ کر سلیم کی طرف دیکھا۔ وہ بے چارہ شرمندہ ہو رہا تھا۔

"اس لیے کہ سلیم واقعی ایک اچھا انسان ہے۔۔۔ سارے محلے میں کوئی ایسا شخص ڈھونڈ کر دکھاؤ جو اس کی عزت نہ کرتا ہو۔۔۔ کام بھی کرتا ہے۔۔۔ پڑھتا بھی ہے۔۔۔ اور ایک بات، جو میرے علاوہ کسی کو بھی نہیں پتا کہ یہ شاعر اور ادیب بھی ہے۔ اس جیسا اچھا انسان تو ہمارے خاندان میں کوئی نہیں ہو گا۔" نینا اپنی جانب سے سلیم کی ہونے والی شرمندگی کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ زری کو اس کی خصوصیات بھی بتانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہاہاہا۔۔۔" زری نے طنزیہ انداز میں مصنوعی قہقہہ لگایا۔

"اس کے علاوہ بھی ایک ایڈیشنل خوبی ہے کہ یہ اپنی گرل فرینڈ کے کہنے پر لوگوں کی جاسوسی بھی کرتا ہے۔ اور رات کو منہ اٹھا کر اس کے گھر بھی آ جاتا ہے۔۔۔ واہ بھئی۔۔۔ ایسا اچھا انسان۔۔۔" زری کا لہجہ مزید طنزیہ ہوا تھا جبکہ نینا کے تو ایک ہی لفظ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔

"گرل فرینڈ۔۔۔؟ کون گرل فرینڈ۔۔۔؟" نینا اپنی جگہ سے اٹھ کر زری کے بستر کے قریب آئی تھی۔ ابھی تک وہ بہت مدھم لہجے میں بات کر رہی تھی لیکن اب کی بار اس کا لہجہ بھی اونچا ہوا تھا۔ "نینا پلیز مجھے بات کرنے دو۔۔۔" سلیم نے دہائی دینے والے انداز میں کہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ زری اتنی بدتمیزی سے بھی ری ایکٹ کر سکتی ہے۔

"میری بات سنو تم دونوں۔۔۔ مجھے کسی سے بھی بات نہیں کرنی۔۔۔ میں نے کہا تھا نا نینا! میں باقی کی گیم اب اکیلے کھیلوں گی۔۔۔ میں تمہارے کسی معاملے میں کبھی نہیں بولی۔۔۔ اب تم بھی میرے کسی معاملے میں نہ بولو تو ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔" نینا نے زچ ہو کر اپنے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

"او اللہ کی بندی۔۔۔ جسے تم اپنا معاملہ اپنا معاملہ کہہ کر مجھ سے جھگڑ رہی ہو نا۔۔۔ دراصل تم سے پہلے وہ اور بھی بہت سی معصوم لڑکیوں کا معاملہ رہ چکا ہے۔۔۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ وہ ایک فراڈ شخص ہے۔۔۔ نہ جانے کتنی لڑکیوں کو بلیک میل کرتا رہا ہے۔۔۔ وہ تمہارے لائق نہیں ہے زری۔۔۔ ہوش کی دوا کرو۔۔۔" زری نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا۔

"نینا۔۔۔ میں دودھ پیتی بچی نہیں ہوں۔۔۔ اپنا اچھا برا سمجھ سکتی ہوں۔۔۔ اظفر اگر میرے حق میں اچھا نہ ہوتا تو کبھی اس طرح میرے گھر میرے ماں باپ سے ملنے نہ آتا۔۔۔ وہ میرے گھر تک آ گیا۔۔۔ میرے ماں باپ سے مل لیا اور کتنا جانچوں پرکھوں میں اب اسے۔۔۔ وہ کم از کم اس سلیم سے تو اچھا ہے جو تمہارے ماں باپ کے سامنے سر اٹھا کر بات نہیں کر سکتا۔۔۔ لیکن تنہائی میں آئی لو یو آئی لو یو بول سکتا ہے۔"

نینا اس کی بات پر حیران ہوئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ زری ایک بار ان کی گفتگو سن چکی ہے۔ اس نے سلیم کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی لاچاری اور ناسمجھی کے تاثرات ایک ساتھ در آئے تھے۔

"زری تم سنو تو سہی۔۔۔" سلیم ابھی بھی اسی لاچاری بھرے انداز میں بولا تھا جسے دیکھ دیکھ کر نینا کو غصہ آ رہا تھا۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو زری۔۔۔ کیا چل رہا ہے تمہارے ذہن میں۔۔۔ یہ بار بار سلیم کا ذکر کس خوشی میں کر رہی ہو تم۔۔۔ وہ تمہاری بھلائی کی خاطر اگر۔۔۔" زری نے مزید نڈر ہو کر اس کی بات کاٹی۔

"میری بھلائی کے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ مہربانی۔۔۔ میرے ماں باپ زندہ ہیں ابھی جو میرے متعلق تم لوگوں سے زیادہ بہتر سوچ سکتے ہیں۔" اس نے ہاتھ جوڑے تھے، پھر تلخی سے بولی۔

"مجھے سمجھانے آگئے ہو... ارے پہلے اپنی فکر تو کرلو... میں کیا جانتی نہیں ہوں کہ تم منہ اٹھا کر اس پھٹیچر شخص کی ماچس کی ڈبی جتنی دکان میں بار بار کیوں جاتی ہو... ہر بار گھر میں کچھ بھی اچھا بننے پر اس کا حصہ پہلے سے کیوں نکلوا کر رکھتی ہو ای سے... خالہ کے گھر کی فکر تمہیں ہمیشہ اپنے گھر سے زیادہ رہتی ہے۔ کیوں... کوئی تو خاص وجہ ہوگی نا..." زری نے نینا کے بالکل سامنے آکر سینے پر ہاتھ باندھ کر طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ نینا کے دماغ کا تو جیسے فیوز اڑا تھا۔

"تم صاف صاف بات کرو زری... تمہارے خالی دماغ میں جو کھچڑی سڑ سڑ کر کالی ہوگئی ہے۔ اسے اگل دو تو ہی بہتر ہے۔" نینا کو بے حد دکھ ہو رہا تھا لیکن غصہ دکھ سے بھی زیادہ آرہا تھا اور جھنجلاہٹ الگ ہونے لگی تھی۔

"صاف صاف بات تمہیں پسند نہیں آئے گی... جب سے اظفر کا جتایا ہے تمہیں... مجھے ایسے دیکھ رہی ہو جیسے پتا نہیں میں کتنا بڑا گناہ کر رہی ہوں اور خود تم نہ جانے کیا کیا کرتی رہتی ہو... ابا کی ناک میں دم کر رکھا ہے تم نے... اور مجھے نصیحتیں کرنے آگئی ہو' حالانکہ میں سب جانتی ہوں کہ تم اور سلیم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو... بلکہ میں ہی نہیں ای اور ابا بھی جانتے ہیں کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔" اس نے وہی کہا جو اس کا اندازہ ہی نہیں یقین بھی تھا۔ نینا کے سر پر تو جیسے آسمان گر پڑا تھا۔ دوسری جانب سلیم بھی کچھ کم پریشان نہیں ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ سے بیساکھی نیچے گری تھی جسے اس نے بہت ہونق ہو کر دوبارہ اٹھائی تھی۔

"احمق ہو تم... زری تم بالکل احمق ہو... پاگل ہو... میں سلیم کو پسند کرتی ہوں... اس میں تو کوئی دو رائے ہے ہی نہیں... مجھے اس سے زیادہ شاید ہی کوئی عزیز ہو لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اس سے..." وہ بات نامکمل چھوڑ کر ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر سلیم کا چہرہ دیکھنے لگی تھی جو بالکل ہکا بکا بیٹھا تھا۔

"تم بھی تو کچھ بولو... منہ میں انگلیاں ڈال کر کیوں بیٹھے ہو... تم زری کو سمجھانے کی خاطر اتنی سیڑھیاں چڑھ کر آئے ہو اور اب ایسے بیٹھے ہو یہاں جیسے پڑوسیوں کے درخت سے امرود توڑتے پکڑے گئے ہو... اتنی بے چاری شکل بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے بتاتے کیوں نہیں کہ اصل بات کیا ہے۔" وہ چلائی تھی اور اسی دوران کسی نے باہر سے دروازہ کھولا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے... اور تم کیسے آگئے یہاں..." یہ ابا کی آواز تھی۔ نینا کا دل اچھلا تھا۔ ایک عرصہ ہوا اس نے ابا سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا لیکن اس لمحے اسے ابا سے خوف آیا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی وضاحت دیتی زری تمسخرانہ انداز میں بولی تھی۔

"یہ خود نہیں آیا... نینا لے کر آئی ہے اسے یہاں..." اس کا انداز اس قدر آگ لگانے والا تھا کہ ابا دو قدم بھر کر کمرے کے اندر آگئے تھے۔ ان کی نگاہوں میں ایسا کچھ تھا کہ نینا کا تیز تیز دھڑکتا دل جیسے رکنے لگا تھا۔

"ابا میں نے..." اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ابا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اس کی کوئی بات نہیں سننا چاہتے تھے۔ ان کی توجہ کا دوسرا مستحق سلیم تھا جو لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔

"ذلیل انسان..." ابا نے اسے گریبان سے پکڑا تھا۔ اونچے قد کاٹھ کے ابا کے سامنے منحنی سا سلیم مزید دبلا پتلا لگنے لگا تھا۔

"بات تو سن لیں پوری میری... یہ اس لیے آیا..." نینا نے ہمت مجتمع کر کے آگے ہو کر انہیں اصل بات بتانی چاہی تھی لیکن ابا نے بائیں ہاتھ کا ایک زوردار چانٹا اس کے گالوں پر رسید کیا تھا۔ سسکنا اسے چاہیے تھا لیکن چیخ زری کے منہ سے نکلی تھی۔ اسے شاید ابا کے اتنے شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ ای بھی شور کی آواز سن کر کمرے میں آگئی تھیں اور آتے ہی انہوں نے سب سے پہلے سلیم کو ابا کی گرفت سے چھڑوایا تھا۔

"یا اللہ... کیا ہوگیا... کیا ہوگیا..." وہ ہانپتی ہوئیں سلیم کو چھڑواتے ہوئے حیران پریشان سوال کر رہی تھیں۔

"اسے کہو یہاں سے چلے جائے ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔" ابا غرائے تھے۔

☆ ☆ ☆

"تم یہاں کیسے آگئے۔" شہرین کی امی نے اسے دیکھ کر پہلے حیران اور پھر غضب ناک ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر کی دہلیز پار کرنے کی۔" وہ چلائی تھیں' حالانکہ سمیع گیٹ پر ہی کھڑا تھا۔ اس نے ایک قدم بھی اندر رکھنے کی جرات نہیں کی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ معاملات خراب بھی ہوسکتے ہیں۔ وہ لوگ پہلے بھی ایک بار اس پر ریوالور تان چکے تھے۔ کوئی بھروسا نہ تھا کہ اب کی بار فائر ہی کھول دیتے اس پر...

اس کے باوجود وہ چاہتا تھا کہ شہرین کے گھر والوں کو اس کی بیماری کے متعلق بتا دے۔ برین ٹیومر کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔ وہ جتنا مرضی اپنی ہمت کو مجتمع رکھنے کی خاطر سوچ کو مثبت رخ پر رکھتا لیکن یہ بات بھی طے تھی کہ اس بیماری کا نام ہی ڈرا دینے کو کافی تھا۔ وہ چاہتا شہرین سرجری سے پہلے اپنے ماں' باپ سے ایک دفعہ ضرور مل لے۔ اسی لیے وہ بالخصوص کراچی آیا تھا۔

"میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ آپ بس ایک منٹ دے دیں مجھے..." اس نے ملتجی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ایک منٹ... ارے تم جیسے بدذات کو تو میں ایک سیکنڈ بھی نابرداشت کروں... تمہارا سایہ میرے آنگن پر پڑ گیا تو نہ جانے کون کون سی نحوستیں ظاہر ہونے لگیں... اور شکر کرو... اس وقت سارے مرد کام پر گئے ہوئے ہیں۔ ورنہ تمہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑسکتے تھے۔" وہ اسے دھتکار رہی تھیں۔ سمیع نے گہری سانس بھری۔

"آپ بڑی ہیں مجھ سے... رشتہ بھی احترام والا ہے۔ اب کیا کہوں آپ سے... میں آپ سے ریکویسٹ کر رہا ہوں... خود چل کر آپ کے گھر تک آیا ہوں... آپ معاملے کی سنجیدہ نوعیت پر غور نہیں فرما رہیں... الٹا مجھے دھتکار رہی ہیں... اچھا چلیں ٹھیک ہے... آپ کرلیں اپنا شوق پورا..."

اس نے اتنا کہہ کر گیٹ کو پوری طاقت سے دھکیلا تھا۔ وہ اندر کی جانب کھڑی تھیں' یک دم پیچھے ہٹیں۔ سمیع اندر داخل ہوگیا تھا۔

"یہ لیں... بیٹھا ہوں میں یہاں پر... بلوالیں جسے بلوانا ہے۔ ماردیں جو گولیاں مارنی ہیں مجھے... میں بھی تو دیکھوں کیا کرسکتے ہیں آپ لوگ... اتنی بھی کیا اندھیر نگری ہے۔ جائیں کریں جسے فون کرنا ہے۔" پورچ میں پڑی چوکیدار کی کرسی پر اکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ شہرین کی امی کی آنکھیں حیرانی سے پھٹنے والی ہوگئی تھیں۔ انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"زیادہ مولاجٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری بیٹی کے شوہر نا ہوتے تو ابھی تک اندر بھی نا بیٹھے ہوتے... تمہیں اتنی عزت بھی راس نہیں آتی... اٹھو اور نکلو یہاں سے..." وہ چلا کر بولی تھیں۔ سمیع نے ان کا چہرہ بغور دیکھا۔

"بڑی مہربانی آپ کی' آپ نے عزت دی۔ لیکن میری بات بھی لکھ لیں... میں اپنی بات کہے بنا یہاں سے نہیں جاؤں گا... آپ بلوائیں اپنے بیٹوں کو... اپنے بھائیوں کو... جسے مرضی بلوائیں... اگر آپ کو اس بات سے خوشی ملتی ہے تو کردیں مجھے ختم... آر یا پار' لیکن یہ ٹینشن تو ختم ہو... کوئی تو سکون سے رہے... ورنہ اس بے سکونی نے تو ہماری زندگیاں برباد کر کے رکھ دی ہیں۔" وہ نہایت تحمل سے بولا تھا۔ شہرین کی امی کی بے چینی اور جھنجلاہٹ بھی ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی۔

"داماد صاحب... میں ان سب باتوں سے متاثر ہونے والی نہیں ہوں۔ مجھے پتا ہے تم لوگ ڈرامے کرنے کے

ماہر ہو۔۔۔ لیکن مجھ پر یہ ہنر مت آزماؤ۔۔۔ میری بیٹی تو بے وقوف تھی جو تمہاری باتوں میں آگئی۔۔۔ میں نہیں آسکتی۔"

وہ ناک چڑھا کر بولی تھیں اور اسے عقب میں بھی دیکھا تھا۔ اس وقت گھر کے مرد تو موجود نہیں تھے، لیکن ملازم ضرور موجود تھے جو گھر کی باتیں گھر کے مردوں تک پہنچا سکتے تھے۔ ان کو سمیع کی تو کوئی فکر نہیں تھی لیکن اس بات کا خدشہ ضرور تھا کہ اس شخص کو تکلیف پہنچنے سے ان کی بیٹی کو تکلیف ہو سکتی تھی۔

"ارے چھوڑیں اوے۔۔۔ باتیں مت کریں۔۔۔ لائیں کہاں ہے وہ ریوالور۔۔۔ جس کی دھمکی دے رہی تھیں آپ مجھے۔۔۔ کریں فائر مجھ پر۔۔۔ یقین کریں مرنے کی تکلیف اس تکلیف سے کہیں کم ہی ہوگی جو آپ سب لوگوں کو اس طرح ناراض دیکھ کر ہوتی ہے۔" وہ محسوس کر رہا تھا کہ اوے نرم پڑ رہی ہیں' اس لیے نفسیاتی طور پر وہ ان کو زیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اوے نے انتہائی ناگواری والی سانس بھری۔

"میں اکثر سوچتی ہوں کہ شیرین نے کیا دیکھا ہوگا تم میں۔۔۔ ناشکل' ناعقل۔۔۔ لیکن اب اندازہ ہو رہا ہے کہ باتوں کے خوب ماہر ہو۔۔۔ بس باتیں کر کے ہی میری بیٹی کو اپنے چنگل میں پھنسا لیا۔۔۔ کہو کیا کہنا ہے۔۔۔ اپنی بات کہو اور بس جاؤ۔۔۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے شوہر اور بیٹے تمہیں یہاں دیکھیں۔" وہ واقعی نرم پڑ چکی تھیں۔ سمیع نے گہری سانس بھری۔

"شیرین آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کی امی نے غصے سے ناک پھلایا۔ سمیع نے ہاتھ سے انہیں متحمل رہنے کا اشارہ کیا تھا' پھر بولا۔

"میں جانتا ہوں آپ کہیں گی کہ اتنا ہی یاد کرتی ہے تو آئی کیوں نہیں۔۔۔ اس کے پاؤں میں چھالے پڑے ہیں کیا۔۔۔ اوے وہ نہیں آسکتی۔۔۔ ہاسپٹلائزڈ ہے۔۔۔ سرجری ہے پرسوں اس کی۔۔۔ بہت تکلیف میں ہے۔۔۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔۔۔ ایک بار اس سے مل لیں۔۔۔ جیسے ماں اپنی اولاد سے ملتی ہے۔ کسی طنز' کسی خفگی کے بغیر۔۔۔ کوئی طعنہ دیے بنا ایک بار گلے لگا لیں اسے۔۔۔ کیا پتا۔۔۔ کیا پتا اوے۔۔۔ وقت کا کوئی بھروسا نہیں اوے۔" اس سے مزید کہا نہیں گیا تھا۔ وہ آج کل اتنا زود رنج ہو رہا تھا کہ کہیں بھی آنکھیں بھیگنے لگتی تھیں۔ شیرین کی امی کا چہرہ بالکل اتر گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے میری بچی کو۔۔۔ کیا کر دیا تم نے اسے۔" آواز ان کے حلق سے پھنس پھنس کر نکلی تھی۔

☼ ☼ ☼

"باجی! اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔" صوفیہ نے فیصلہ کر لیا تھا۔ باجی صحن میں بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں۔ پاس ہی چارپائی بچھا رکھی تھی جس پر کونین اور ان کا نوزائیدہ بیٹا سلیم لیٹے تھے۔ پائنتی کے قریب صوفیہ بیٹھی تھی۔ آنکھیں سوج کر سرخ ہوئی ہوئی تھیں۔ ایک ہفتہ ہو چلا تھا لیکن پاسپورٹ ملا تھا نہ ہی کاشف نے دوبارہ کال کی تھی۔ صوفیہ کا دل تھا کہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ ان چند دنوں میں وہ مزید لاغر اور بیمار دکھائی دینے لگی تھی۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں خود ٹکٹ لے کر دبئی چلی جاتی ہوں۔۔۔ ویزے کی معیاد ختم ہونے سے پہلے ہمارا وہاں پہنچنا ضروری ہے۔۔۔ اگر ہم نہیں جائیں گے تو کاشف ناراض ہو جائیں گے اور پھر وہ خود آئیں گے نا مجھے بلوانے گے۔" وہ سر جھکائے ہوئے کہہ رہی تھی۔ باجی نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں' جبکہ باجی نے پیاز کاٹنے کی بجائے پہلے گاجریں چھیلنی شروع کی تھیں کہ بچوں اور صوفیہ کی آنکھوں میں پیاز سے جلن ہوگی۔

"باجی عورت کے لیے اس کا گھر بعض اوقات اس کی اولاد سے بھی اہم ہو جاتا ہے۔ گھر بس جائے تو اولاد خود

بخود مل جاتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔

"اچھی بات ہے صوفیہ۔" باجی نے تیز تیز ہاتھ چلاتے ہوئے اتنا ہی کہا۔ وہ بہت ہی متحرک قسم کی خاتون تھیں۔ باتوں سے زیادہ ہمیشہ کام کرنے کی پالیسی پر یقین رکھتی تھیں۔ ان کا ایک ہی اصول تھا کہ بڑی باتیں کرنے سے تو وقت ہی ضائع ہوتا ہے' اس لیے بہتر ہے کہ باتیں کرنے کی بجائے کام پر لگ جاؤ۔ صوفیہ اٹھی اور پھر ان کے پاس زمین پر آبیٹھی۔

"باجی۔۔۔ آپ نے اب تک میرا بہت ساتھ دیا ہے۔۔۔ میری بہت مدد کی ہے۔۔۔ جب میرے بھائی اور ماں' باپ بھی میری مدد کرنے سے منکر ہو گئے تو بھی آپ نے میرا ساتھ دیا۔ اتنی مہنگائی کے دور میں اتنے مہینے کسی کو اس کے بال بچوں سمیت پالنا آسان نہیں ہوتا۔ آپ اور دولہا بھائی کا میں جتنا شکریہ ادا کروں کم ہے۔" وہ احسان مندی سے چور لہجے میں بول رہی تھی۔ باجی نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"صوفیہ۔۔۔ بہن بھائی ایک دوسرے کی مدد کیا ہی کرتے ہیں۔۔۔ اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور خدارا بھائیوں کے لیے اپنے دل سے یہ بغض نکال دو۔۔۔ بے چارے بھی بہت اچھے ہیں۔ اتنی بار آئے ہیں تمہیں منانے کے لیے لیکن تم نے ان سے صلح صفائی نہیں کی۔ اب جبکہ تم کچھ عرصہ بعد یہاں سے چلی جاؤ گی تو میرا مشورہ ہے ان سے مل کر اپنے دل کو ہر قسم کی عداوت سے پاک کر کے جاؤ تمہارے بھلے کو کہہ رہی ہوں۔ اب تمہاری مرضی ہے مانو یا نا مانو۔" انہوں نے اب آلو چھیلنے شروع کر دیے تھے۔ صوفیہ نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

"باجی جہاں اتنی مدد کی ہے میری وہاں ایک آخری بار میرا ساتھ دے دیں۔۔۔ میں آپ کی احسان مند رہوں گی۔" وہ تمہید باندھ رہی تھی۔ باجی کو کتابی باتوں سے بڑی چڑ ہوتی تھی۔ باجی نے سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھا۔

"باجی اصل مسئلہ یہ ہے نا تو کونین کا ویزا لگا ہے نا پاسپورٹ بنا ہے۔۔۔ میرا اور زرمین کا ویزا آچکا ہے۔۔۔ ہمارے کاغذات پورے ہیں۔۔۔ آپ ایک آخری مہربانی کریں۔۔۔ کونین کو آپ رکھ لیں۔" اس نے بنا جھجکے کہا تھا جیسے یہ کوئی عام سی بات ہو۔ باجی کو اس کی ہمت پر رشک آیا۔

"صوفیہ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔۔۔ وہ تمہاری اولاد ہے۔۔۔ اسے تمہاری ضرورت ہے۔۔۔ بھلا اپنی اولاد کو ایسے غیروں کے حوالے کرتا ہے کوئی۔" باجی کو بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

"باجی بس سال دو سال کی بات ہے۔ آپ اسے اپنے پاس رکھ لیں۔۔۔ میں جب دوبارہ آؤں گی تو اس کے کاغذات پورے کر کے لاؤں گی۔۔۔ پھر ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔۔۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے وہاں پہنچنے کے بعد اس کے کاغذات پورے ہوں تو کاشف اس کو آکر لے جائیں۔" اس نے باجی کے ہر سوال کا جواب پہلے سے تیار کر کے رکھا ہوا تھا۔

"نہیں صوفیہ۔۔۔ میں ایسی کسی بے وقوفی میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔۔۔ یہ خود غرضی ہے۔۔۔ جہاں اتنا انتظار کیا ہے۔۔۔ وہاں تھوڑا انتظار اور کر لو۔۔۔ بڑی مشکل سے ملتی ہے اولاد۔۔۔ اسے خود سے جدا کر کے اس قیمتی تحفے کی ناقدری مت کرو۔۔۔ اور مجھے غلط مت سمجھنا کہ میں اتنی سی بچی کو پالنے سے ڈرتی ہوں جہاں میرے بچے پلیں گے وہاں یہ بھی پل جائیں گی۔۔۔ لیکن سارے خاندان کی تھو تھو کون سنے گا۔۔۔ بھائی بھابھیاں پہلے ہی اتنی باتیں کرتے ہیں انہیں مزید موقع مل جائے گا تمہیں خود غرض کہنے کا۔" باجی بہت تحمل سے اسے سمجھا رہی تھیں۔ صوفیہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"مجھے کسی کی پروا نہیں ہے باجی۔۔۔ یہ خاندان والے۔۔۔ بھائی بھابھیاں سب کے سب چڑھتے سورج کے پجاری کوئی کسی کی مشکل میں مدد تو نہیں کر سکتا۔۔۔ ہاں باتیں ضرور کر لیتا ہے۔۔۔ دو نوالے نہیں دے سکتا کوئی۔۔۔

لیکن طعنے ضرور دے دیتا ہے... میری طرف سے ایسا خاندان بھاڑ میں جائے... میں تو بس آپ سے مدد کی درخواست کر سکتی ہوں... آپ میری بچی کو رکھ لیں... آپ تو بہت چاہتی ہیں اسے..." وہ التجائیہ انداز میں بولی تھی۔ باجی بے بس ہوئی جا رہی تھیں۔

"تم نے کاشف سے مشورہ کیا ہے اس کو بتایا ہے اپنی اس تجویز کے بارے میں؟" باجی کو یقین تھا کہ یہ فیصلہ اس نے تنہا کیا ہے۔ کاشف کے ذکر پر صوفیہ نے بے چارگی سے سر ہلایا۔

"ان کا رویہ بھی آپ کے سامنے ہی ہے... انہیں کوئی پروا نہیں ہے۔ وہ وہاں مزے سے آزاد زندگی گزار رہے ہیں... وہ بھی دل سے نہیں چاہتے کہ ہم ان کے ساتھ رہیں... روک ٹوک کرتی بیوی سے تو سب ہی جان چھڑواتے ہیں... یہی حال کاشف کا بھی ہے... انہیں ہماری غیر موجودگی میں رنگ رلیاں منانے کی پوری آزادی ملی ہوئی ہے... اور پھر سے اللہ نے شکل و صورت ایسی دی ہوئی ہے کہ جہاں جاتے ہیں... کئی عورتوں کو اپنا اسیر بنا آتے ہیں... وہ کیوں چاہیں گے کہ ہم وہاں ان کے پاس موجود ہوں۔

اب اپنے منہ سے کیا کہوں باجی... آپ کو بھی نظر آتا ہی ہے... اپنا دامن اٹھاؤ تو اپنا بدن ہی عریاں ہوتا ہے مجھے اپنا گھر بچتا نظر نہیں آتا۔ میری شادی شدہ زندگی داؤ پر لگی ہے باجی اوپر سے میں دو بیٹیوں کی ماں کوئی بیٹا ہوتا تو اصرار کرتی اچھی بھی لگتی۔ اب کس بنیاد پر دباؤ ڈالوں... میرا آخری سہارا تو آپ ہی ہیں آپ بھی انکار کر دیں گی تو کس سے کہوں گی میں...."

وہ بات کرتے کرتے رو ہی پڑی تھی۔ اس نے پہلے کبھی کاشف کے متعلق ایسی کوئی بات اپنے منہ سے نہیں کہی تھی۔ اپنے گھر والوں کے سامنے تو ہمیشہ ہی کاشف کو اچھا انسان بنا کر پیش کرتی آئی تھی اگرچہ رخشی والے واقعہ کے بعد بہت سے لوگ کاشف کی حقیقت جان چکے تھے لیکن صوفیہ کے سامنے اپنے منہ سے کوئی بھی کچھ نہیں کہتا تھا۔ باجی کا بھی دل پسیج گیا۔

"میں اس بات کے حق میں نہیں ہوں کہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی بچہ لاوارثوں کی طرح پلے بڑھے لیکن پھر بھی تمہاری آسانی اور سہولت اگر اسی میں ہے تو چھوڑ دو تم بچی کو میرے پاس... مجھے تو ویسے بھی بہت عزیز ہو چکی ہے یہ..." آپا بالآخر مان گئی تھیں۔ صوفیہ نے احسان مندی کے جذبے سے مغلوب ہو کر انہیں گلے لگا لیا تھا۔

☆☆☆

"نینا اٹھ گئی..." امی نے زری کو ناشتے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں آتے دیکھا تو پہلا سوال یہی کیا تھا۔ ان کا چہرہ زرد سا ہو رہا تھا اور وہ کافی بیمار سی لگ رہی تھیں۔ رات جو کچھ ہوا تھا' وہ ان کے گمان سے بھی بڑھ کر تھا۔ نینا کی بدتمیزیوں پر ابا کا خفا ہونا تو کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا لیکن اس طرح سے ان کا جوان بچی پر ہاتھ اٹھانا بہت بڑی بات تھی حالانکہ ابا نے کمرے میں آجانے کے بعد تمام تفصیل ان کو بتائی تھی کہ نینا نے سلیم کو گھر بلوایا تھا۔

امی نینا کی خود سری سے خائف رہتی تھیں لیکن ایک بات کا انہیں بھروسا تھا وہ کبھی بھی کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی تھی جس سے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے۔ وہ کبھی کبھی انصاف سے جائزہ لیتیں تو نینا کے معاملے خود کو بھی ذمہ دار تصور کرتی تھیں۔ ان سے کافی کوتاہیاں ہوئی تھیں لیکن بدمزگی سے بچنے کے لیے وہ اپنے شوہر کو بھی نہیں ٹوک سکتی تھیں' دوسری جانب نینا کا رویہ انہیں تکلیف تو دیتا تھا۔ رات کے اس وقت ان کی بیٹیوں کے کمرے میں ان ہی کے بھانجے کی موجودگی کوئی چھوٹی بات تو نہیں تھی لیکن پھر بھی ان کا دل کہہ رہا تھا کہ ان کے شوہر کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔

"وہ تو چلی گئی ہے۔" زری نے ٹرے تپائی پر رکھی تھی۔ امی نے دہل کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"کہاں چلی گئی...؟" ان کے اس طرح پریشان ہونے پر زری نے بغور ان کا چہرہ دیکھا۔

"اوہو... یونیورسٹی ہی گئی ہوگی... آپ پریشان مت ہوں۔" اس نے اپنا چائے والا کپ اپنے سامنے کیا تھا۔ اس کا رویہ بالکل نارمل تھا۔

"پریشان کیسے نہ ہوں... رات جو کچھ بھی ہوا اچھا نہیں ہوا... اور وہ تو ہے بھی الٹی کھوپڑی کی... کچھ کر ہی نا بیٹھے..." امی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ زری نے ناک چڑھائی۔

"آپ اتنا بھی جذباتی نا ہوں اب... کچھ نہیں کرتی وہ... اسے بس دوسروں کے راستے میں کانٹے بچھانے میں مزا آتا ہے... اپنی راہیں ہمیشہ سیدھی رکھتی ہے وہ..." اس کا نخوت بھرا انداز بھی امی کو اچھا نہیں لگا تھا۔

"تم بھی اپنے ابا کی زبان مت بولو زری... ایسی نہیں ہے میری بچی... میں مانتی ہوں خود سر ہے لیکن..." انہوں نے لمبی سانس بھری تھی۔ انہیں اپنے کانوں میں اپنے ہی پھیپھڑوں سے اٹک اٹک کر گزرتی سانس کی باقاعدہ آوازیں آرہی تھیں۔ ان کی پریشانی ہر چیز سے بڑھ کر تھی۔ رات بھی نیند نہیں آئی تھی اور اب بھی دل بے چین ہوا جا رہا تھا۔

"اس کو فون کرو زری... میں ذرا ایک بار بات کرلوں... میرا دل گھبرا رہا ہے... غصے کی بڑی تیز ہے... اپنے آپ کو کوئی نقصان نا پہنچا لے... فون کرو اس کو۔" امی واقعی بولا سی گئی تھیں جبکہ زری کو ان کا انداز بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"امی کچھ نہیں کرتی وہ... آپ فکر مت کریں۔"

"تمہارا کیا جاتا ہے... تم فون کرلو... میری تسلی ہو جائے گی۔" امی نے نہایت برا مان کر اسے دیکھا تھا۔ ایک تو پہلے ہی ان کا دل بہت بے چین تھا اور زری انہیں مزید تاؤ دلا رہی تھی۔ زری اٹھ کر باہر چلی گئی تھی اور پھر چند منٹ بعد فون اٹھائے اندر آئی۔ وہ اس کا نہیں نینا کا سیل فون تھا۔

"وہ سیل فون لے کر ہی نہیں گئی امی۔" اس نے اپنی جانب سے اطلاع دی تھی اور نینا کا فون ان کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ نینا اکثر ہی اپنا سیل فون نہیں لے جاتی تھی لیکن امی مزید پریشان ہوئیں۔

"بس اب کیا کہوں میں... ماں چاہے پریشانی سے مر جائے لیکن ان کو سمجھ نہیں آئے گی... بتاؤ اگر لے جانا نہیں ہوتا تو اس سوغات کو لینے کا فائدہ کیا ہے؟" اب ان کی نگاہوں کا مرکز نینا کا سیل فون تھا۔

"اچھا... آپ اپنا بلڈ پریشر ہائی نا کریں... ناشتا کریں آجائے گی وہ" زری نے کہا تھا۔

"اب کیا اترے گا میرے حلق سے... نہیں کھایا جائے گا کچھ... ذرا دیکھو اس بچے نے دکان کھولی ہے کہ نہیں... اس بے چارے کو بھی ذلیل کر کے رکھ دیا تمہارے باپ نے۔" وہ بہت افسردہ تھیں۔ زری کو برا لگا۔

"اچھا کیا ابا نے جو بھی کیا۔ یہی ہونا چاہیے تھا ان دونوں کے ساتھ" وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔ امی نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تم یہ بتاؤ زری... ہوا کیا تھا... یہ سلیم کرنے کیا آیا تھا... تم تو وہاں ہی موجود تھی" وہ بجھے ہوئے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

"یہ تو آپ نینا سے ہی پوچھیے گا... اسی نے بلایا تھا" وہ اپنے رات والے موقف پر ہی ڈٹی ہوئی تھی۔

"تمہیں بتاتے کیا موت پڑتی ہے... آخر مجھے بھی تو پتا چلے کہ کیا مسئلہ تھا... کیا پتا تمہارے ابا کو غلط فہمی ہوئی ہو... تمہارے ابا بھی بہت جلد باز انسان ہیں... نا کوئی سوال نا جواب... لے کر تھپڑ مار دیا بے چاری کو... ارے

ایسے ہاتھ اٹھاتا ہے کوئی جوان بچوں پر۔۔۔ وہ اب کوئی چھوٹی بچی تھوڑی ہے کہ جب دل چاہا دھنک کر رکھ دیا۔" امی کو زری کے انداز پر بھی غصہ آیا تھا۔

"امی آپ کے لیے یہ معمولی بات ہے کہ سلیم منہ اٹھا کر رات کے وقت ہمارے گھر آگیا۔ اپنے بھانجے کے لیے اتنا سافٹ کارنر ہے آپ کے دل میں۔" زری کو بھی ان کا انداز اچھا نہیں لگا۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ امی کے ساتھ مل کر نینا کو جی بھر کر کوسے گی۔

"اب تم میرا منہ مت کھلواؤ زری۔۔۔ رات بھر کسی غیر لڑکے سے فون پر باتیں کرنا کون سا ٹھیک ہے۔ جو تم ایک اس بچے کے آجانے پر اتنا تپ رہی ہو۔۔۔ گھر کا بچہ ہے اور پھر کیا میں جانتی نہیں ہوں اسے۔۔۔ اب اگر وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آہی گیا تھا تو کیا یہ تمہارے ابا کا فرض نہیں تھا کہ پوچھتے کہ کیوں آیا ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے کوئی پریشانی ہو۔ کوئی بات پوچھنے آیا ہو۔ کوئی چیز مانگنے آیا ہو۔۔۔ کیا پتا آپا نے بھیجا ہو۔ آخر یہ (نینا) بھی تو جب دل چاہے منہ اٹھا کر اس کی دکان پر چلی ہی جاتی ہے۔ خواہ مخواہ میں ذلیل کر کے رکھ دیا۔" امی بہت ناراض ہو رہی تھیں۔

"امی میری تو ہر بات پر ناراض ہو جاتی ہیں آپ۔۔۔ جبکہ نینا کی ساری غلطیوں پر پردے ڈال دیتی ہیں۔۔۔ نینا کو آپ نے کبھی نہیں ٹوکا۔۔۔ وہ جب دل چاہتا ہے سلیم کی دکان پر چلی جاتی ہے۔ حالانکہ آپ جانتی ہیں ابا اس بات کا برا مانتے ہیں۔۔۔ مگر پھر بھی وہ آپ کا بھانجا ہے نا۔۔۔ آپ کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ ہے جب کہ مجھے آپ نے طعنہ دے دیا" وہ بھی ناراض ہوئی تھی۔ امی نے اسے گھور کر دیکھا۔

"کہاں کی داستان کہاں ملا دی۔۔۔ تمہارا قصہ ہی اور ہے بی بی۔۔۔ بس اب میرا منہ نا کھلواؤ۔۔۔ نینا نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی کبھی۔"

امی کہنا نہیں چاہتی تھیں۔ جوان بچیوں کو طعنے کون دیتا ہے لیکن وہ خود بہت مجبور تھیں۔ دل پریشان تھا اور پریشانی میں کہہ گئی تھیں۔ زری نے نہایت افسوس ناک نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"امی۔۔۔ آپ کو کچھ نہیں پتا۔۔۔ نینا محبت کرتی ہے سلیم سے۔۔۔ میں نے خود سنا ہے۔۔۔ وہ اپنے منہ سے بھی کہتی ہے کہ وہ سلیم سے محبت کرتی ہے۔"

"یہ بات وہ اب نہیں کہتی۔۔۔ بچپن سے کہتی چلی آرہی ہے۔۔۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ وہ سلیم سے محبت کرتی ہے" انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔ زری حیران ہوئی۔

"امی یہی بات اگر میں کہوں کسی اور کے بارے میں تو میں گناہ گار ہوں۔ لیکن نینا چونکہ آپ کے بھانجے کے بارے میں کہہ رہی ہے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہے آپ کو۔۔۔" وہ طعنہ زنی پر اتر آئی تھی۔ امی نے سر پر ہاتھ مارا۔

"اوہ الٹی کھوپڑی۔۔۔ کیا باتیں کر رہی ہو۔۔۔ کیوں میرا دماغ کھا رہی ہو۔۔۔ تمہارا معاملہ اور ہے۔۔۔ نینا اور سلیم کا معاملہ اور ہے۔"

"ہاں جی۔۔۔ وہ آپ کا بھانجا ہے۔۔۔ اور اظفر غیر ہے۔ بس یہی فرق ہے نا؟" وہ چڑ کر بولی تھی۔ امی نے اسے گھور کر دیکھا۔

"زری۔۔۔ تم نے دیکھا ہے نینا کو سلیم کے علاوہ کبھی کسی اور سے بے تکلف ہوتے ہوئے۔۔۔ اس کے علاوہ کسی اور سے اس طرح بات کرتی ہو جیسے اس سے کرتی ہے۔۔۔ جانتی ہو اس کی وجہ کیا ہے؟" امی اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے سوال کر رہی تھیں۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں آپ سے۔۔۔ کہ آخر اس سے ہی کیوں بے تکلف ہوتی ہے۔۔۔ کوئی تو بات ہو گی۔۔۔ لیکن آپ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہیں" اس نے کہا تھا۔ امی کی نگاہوں میں طنز بڑھا تھا۔

"اوہ بی بی۔۔۔ نینا کی شادی نہیں ہو سکتی سلیم کے ساتھ۔۔۔ نینا نے دودھ پیا ہے اس کی ماں کا۔۔۔ رضاعی بھائی ہے وہ اس کا۔۔۔

اور یہ بات نینا بھی جانتی ہے اور سلیم بھی۔۔۔ میں نے اسے کبھی کیوں سختی سے نہیں روکا سلیم کی دکان پر جانے سے اس لیے کہ ایک ہی تو شخص ہے جس سے دکھ سکھ کہہ لیتی ہے وہ۔۔۔ بھائی سمجھتی ہے وہ اسے۔۔۔ اب بتاؤ کیسے شک کروں اپنی ہی بچی پر۔۔۔"

امی جتا کر بولی تھیں۔ زری کے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ بات اسے تو کبھی کسی نے نہیں بتائی تھی۔ اسے شرمندگی بھی ہوئی۔ اس نے تو رات کو ابا کے سامنے خود ہی رنگین سی داستان کہہ ڈالی تھی۔ ابھی وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ دن کے وقت بعض اوقات وہ دروازے کی چٹخنی نہیں بھی لگاتے تھے۔

"صوفیہ۔۔۔ کہاں ہو باہر آؤ۔" یہ خالہ کی آواز تھی اور آواز میں کچھ ایسا درد تھا کہ امی بے چین ہو کر اٹھیں۔

"صوفیہ، سلیم ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ ہائے میرا بچہ۔" خالہ بلکتی ہوئی بولی تھیں۔

"کیا ہوا آپا۔۔۔ کیا ہو گیا۔" امی کے پاؤں تلے سے زمین نکلی تھی۔

"مجھے نہیں پتا۔۔۔ بس ایسے جیسے ختم ہو گیا ہو۔ اسپتال لے کر گئے ہیں علیم اور وہ سامنے والوں کا اختر۔۔۔ تمہارے بھائی اور باقی لوگ تو کام پر جا چکے ہیں۔۔۔ گھر میں کوئی تھا ہی نہیں۔۔۔ علیم کو بھی فون کر کے بلایا ہے۔۔۔ ہائے کیا ہو گیا میرے بچے کو۔۔۔" وہ بے دم ہی ہو کر دیوان پر گرتے ہوئے بولی تھیں۔ الفاظ بھی ٹوٹ ٹوٹ کر منہ سے نکل رہے تھے۔ امی نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔

"صبح سے سویا ہوا تھا۔۔۔ میں نے کہا اللہ جانے کیوں نہیں اٹھ رہا۔ جگانے گئی تو نیلا ہوا پڑا تھا۔۔۔ منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔۔۔ خدا جانے کیا ہو گیا۔۔۔ بس دعا کرو میرا دل قابو میں نہیں۔۔۔ آؤ ذرا رکشے میں میرے ساتھ۔۔۔ اسپتال جانا ہے' مجھے اسپتال لے جاؤ۔ میرا دل بہت بے چین ہے صوفیہ۔۔۔ مجھے لے چلو۔" خالہ دہائی دے رہی تھیں۔ زری اور امی نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

☼ ☼ ☼

"جانے کس کی نظر کھا گئی میرے بیٹے کو۔۔۔ مجال ہے کبھی شادی کے بعد جو خوشی کا منہ دیکھا ہو۔۔۔ ہماری مرضی کے برخلاف شادی کی تھی۔۔۔ نا میری سنی۔۔۔ نا اپنے ابوجی کی خوشی کا خیال رکھا۔" نینا نے اس خاتون کی بات کو بے زار کن انداز میں سنا اور پھر ہضم کیا تھا۔ وہ ایک بار پھر رانیہ کے گھر آئی تھی۔ اسے زری کی رات والی حرکت پر ابا کے تھپڑ پر، سلیم کی بزدلی پر۔۔۔ ہر چیز پر غصہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ زری کی مدد کے لیے ایک آخری کوشش کرنا چاہتی تھی۔ اس کے نزدیک ایک بدکردار آدمی گناہ گار ترین آدمی تھا۔

اسے اپنے ابا سے زندگی میں کبھی انسیت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ زری کی نسبت جو مرد ایک نئے رشتے کے روپ میں ان کے گھر آتا' وہ اس کے لیے ناپسندیدہ ٹھہرتا۔ اس کی ایک ہی تو بہن تھی۔ جب سلیم نے اسے بتایا تھا کہ وہ زری کو پسند کرتا ہے تب اس کا بھی دل چاہا تھا کہ ان دونوں کی ہی شادی ہو جائے لیکن اس نے کبھی سلیم کو حوصلہ نہیں دیا تھا کیونکہ وہ جانتی زری کبھی بھی سلیم سے شادی نہیں کرے گی اور سلیم جب جب بھی اپنے کم مائیگی کے احساس میں گھر کر افسردہ ہوتا تو وہ چاہتے ہوئے بھی تسلی نہیں دے پاتی تھی جبکہ زری نجانے کیا سمجھ رہی تھی لیکن پھر بھی نینا زری کی زندگی کے اتنے اہم معاملے سے خود کو لاتعلق نہیں رکھ پا رہی تھی۔

وہ منہ سے نا بھی کہتی لیکن اسے اس کی پروا تھی۔ وہ اسے کنویں میں چھلانگ لگاتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ رانیہ کے گھر آتو گئی لیکن یہاں ان کے مہمان ابھی تک موجود تھے۔ یہ خاتون جو اس کے سامنے آ بیٹھی تھیں وہ جانے کون تھیں لیکن وہ مسلسل کسی کی برائیوں کا ذکر کرنے میں مصروف تھیں۔

"نئی سے نئی مشکل مصیبت سامنے کھڑی ہوتی ہے... یہ لڑکی ایسی منحوس بن کر آئی ہے سمیع کی زندگی میں کہ میرا بچہ مرجھا کر رہ گیا ہے۔" اس خاتون نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے مزید کہا تھا۔ یہ دراصل ایمن کی دادی تھیں جو فیصل آباد سے آئی تھیں۔ یہ اسی روز دوپہر کی بات تھی جب سمیع کراچی کے لیے نکلا۔ اماں رضیہ اور رانیہ کی امی ایمن کو رانیہ کے پاس چھوڑ کر شہرین کے پاس ہسپتال چلے گئے تھے تبھی ایمن کی دادی چلی آئیں۔ انہیں کسی رشتہ دار کے ذریعے پتا چل گیا تھا کہ سمیع اور اس کی فیملی علاج کے لیے عارضی طور پر لاہور شفٹ ہو گئے ہیں۔ شہرین کے لیے ان کے دل میں ابھی بھی کوئی جگہ نہ بن پائی تھی اور وہ اپنے کیا غیر کیا۔ ہر ایک کے سامنے بہو کو کوسنے کی بری عادت میں مبتلا تھیں۔

"مجال ہے کسی خوشی کا منہ دیکھا ہو۔ ایک ہی لڑکی پیدا کی... وہ بھی لڑکی... ہم نے تو جب بھی دیکھا... منہ لٹکا ہوا ہی دیکھا۔ ایسی نحوست ہے میرے بیٹے کی زندگی میں اس کی... اچھا چلو جو ہو گیا سو ہو گیا... اب اللہ صحت تندرستی دے اسے... میں دشمن نہیں ہوں کسی کی... اب تو میرے خاندان کا حصہ ہے بے چاری... میری پوتی کی ماں ہے... میں نے تو کبھی کوئی برا لفظ بھی نہیں نکالا اس کے لیے..."

وہ نینا کے سامنے شہرین کا ذکر کر رہی تھیں۔ رانیہ کی امی ان کے دور پار کے کزن ہی کی بیٹی تھیں جبکہ نینا ہوں ہاں کیے بغیر عدم دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ رانیہ کے متعلق ملازمہ سے پتا چلا تھا کہ وہ باتھ روم میں نہانے کی غرض سے گھسی تھی اور اسی لیے نینا ایک بار پھر انتظار کی کوفت سہ رہی تھی۔

"اپنی ہی کی ہوئی آگے آ رہی ہے... جب کسی کا دل دکھا کر اپنی خوشی کی خاطر نئے بندھن بنائے جاتے ہیں نا تو وہ ایسی ہی مشکلات کا باعث بنتے ہیں... میں تو کبھی دل سے اس شادی کے حق میں نہیں تھی، ہوتی بھی کیسے... میرا ہیروں جیسا بیٹا اس ایک دو کوڑی کی لڑکی کی خاطر مجھے چھوڑ، سارے خاندان سے منہ موڑ کر اتنی دور کراچی جا بسا... کوئی میرے دل سے پوچھے کہ جب وہ نظر نہیں آتا تو کیسی گزرتی تھی دل پر... خون کے آنسو رلائے ہیں اس لڑکی نے مجھے... بس اب آگے آ رہی ہے اس کے... کوئی کیا کر سکتا ہے... اللہ کی مرضی... میں نے تو کبھی کوئی بد دعا نہیں دی بھائی... ہاں بے خیالی میں کچھ نکل گیا ہو منہ سے تو پتا نہیں... اب ظاہر ہے سوئی چبھتی ہے۔ تو خون نکلتا ہی ہے... درد ہوتا ہے... تو انسان کراہتا ہی ہے... بس اللہ نے سن لی ہوگی دکھی دل کی کوئی آہ... ہائے ہائے ... خیر اللہ نگہبان... صحت دے اسے... مگر سنا تو یہی ہے... کوئی بچتا نہیں ہے اس بیماری سے... مر جاتا ہے۔" انہوں نے دل کی بھڑاس نکال لینے کے بعد اس کا بغور جائزہ لیا۔

"مرتو سب نے ہی جانا ہے آنٹی... آپ کے پاس کون سا ایسا پرمٹ ہے جس پر بڑا بڑا لکھا ہو کہ آپ سدا زندہ رہیں گے" اس سے زیادہ وہ اپنی زبان کو لگام دے نہیں سکتی تھی سو کہہ دیا۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا پھر صورت حال کو سمجھ کر سر ہلایا۔

"رانیہ کو پڑھاتی ہو تم... تم کیا پڑھاتی ہو گی... خود اتنی چھوٹی سی لگ رہی ہو... کیا سکھاتی بتاتی ہوگی اسے" یہ طنز نہیں تھا... بس ان کی گفتگو کا انداز ہی یہ تھا۔

"جی بس... سوئی میں دھاگا ڈالنا سکھا دیتی ہوں... کبھی کبھی اٹھک بیٹھک کروا دیتی ہوں... کوئی نئی فلم دیکھی ہو تو اس کی اسٹوری بھی سنا دیتی ہوں" نینا کو کون روک سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی بہت اکتایا ہوا بے زار دل لے کر آئی تھی۔ اب اس خاتون کی باتوں نے دماغ کو بالکل ہی الجھا دیا تھا۔ وہ اتنا تو سمجھ گئی تھی رانیہ کی امی نے جس لڑکی کا ذکر کیا تھا کہ اسے برین ٹیومر ہے، قیمتی کپڑوں اور سونے کے زیورات سے سجی یہ خاتون اس لڑکی کی ساس تھیں اور اپنی بہو سے سخت ناخوش تھیں۔ انہوں نے تنقیدی نگاہ سے اسے دیکھا۔

"اچھی کہی... آج کل کی لڑکیاں بس یہی کر سکتی ہیں۔" انہوں نے بھی ناک بھوں چڑھا کر کہا تھا۔ وہ تو اسے رشتے دار سمجھ کر کچھ عزت دینے کے چکر میں اس کے پاس بیٹھ گئی تھیں لیکن وہ اس کی مستحق نہیں لگ رہی تھی۔ نینا نے سر ہلایا۔

"ارے نہیں آنٹی... اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں... آپ کہیں تو اس دیوار پر پنجوں کے بل چڑھ کر چھت کے ساتھ الٹا لٹک کر دکھاؤں...؟" نینا بدتمیز نہیں تھی لیکن وہ لوگ جو اسے پسند نہیں آتے تھے ان کے لیے وہ بدتمیز، بدلحاظ اور بدتہذیب سب کچھ بن جاتی تھی۔ ایمن کی دادی نے اسے ایسے دیکھا جیسے کھا ہی جائیں گی۔ نینا کو کون سی پروا تھی، اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور مزید کچھ کہے بنا باہر نکل گئی۔

✲ ✲ ✲

وہ بے زار کن انداز میں اپنی گلی میں مڑی تھی۔ دل چاہتا تھا گھر کی بجائے کہیں اور ہی چلی جائے لیکن جاتی بھی تو کہاں... گھر تو آنا ہی تھا۔ چند قدم چلی تو احساس ہوا کہ جیسے کچھ شور سا ہے... بھنبھناہٹ سی جس کی اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس نے حیران ہو کر دیکھا تھا اور پھر ذرا تیز قدم لیے تھے۔ یہ گلی ذرا آگے جا کر دائیں جانب مڑتی تھی تو سامنے ہی سلیم کی دکان نظر آ جاتی تھی۔ وہ جیسے ہی دائیں جانب مڑی دل جیسے ایک لمحے کے لیے ڈوبا تھا۔ سلیم کی دکان بند تھی اور خالہ کے گھر کا دروازہ مکمل طور پر کھلا ہوا تھا۔ یہ اتنی حیرانی والی بات نہیں تھی۔ یہ دروازہ اکثر کھلا ہی رہتا تھا لیکن دکان تو کبھی بند نہیں ہوئی تھی اور وہاں سے آوازیں کیوں آ رہی تھیں۔ وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی آگے بڑھی تھی۔ دروازے کے قریب ہی اسے برکت نظر آیا جو اندر سے نکل کر آ رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے یہاں کیا مٹھائی بٹ رہی ہے۔" اس نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا تھا۔ برکت نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"سلیم بھائی نے زہر کھا لیا۔" اس نے بجھے ہوئے انداز میں بتایا تھا۔ نینا نے حیرانی سے اسے دیکھا پھر جیسے بات مکمل طور پر سمجھ میں آئی تھی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو...؟" اس نے برکت کو دھکیلا تھا اور اندر داخل ہوئی تھی۔ محلے کی چند عورتوں کے درمیان اس کی امی اور خالہ بیٹھی تھیں۔ خالہ نے اسے دیکھتے ہی روتے ہوئے کہا تھا۔

"نینا... چلا گیا سلیم... تیرا بھائی چلا گیا نینا..." نینا کو لگا اس کی روح اس کے جسم سے نکلنے لگی ہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑے تھے۔

"کدھر... خالہ... کہاں چلا گیا... کیوں... کیوں چلا گیا۔" الفاظ منہ سے پھسل پھسل کر نکلے تھے۔ امی اٹھ کر اس کے قریب آئی تھیں اور اسے اپنے بازوؤں میں بھرنے کی کوشش کی تھی۔

"سلیم کا انتقال ہو گیا نینا..." امی رو رہی تھیں۔ اس نے ان کے بازو جھٹک دیے تھے اور لپک کر خالہ کی جانب بڑھی تھی۔

"کدھر ہے سلیم... خالہ بولیں نا... کدھر ہے۔" خالہ نے بلکتے ہوئے اسے گلے لگا لیا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

✲ ✲

نادیہ خان

"عاشی نی او عاشی۔۔۔ جان چھوڑ دے اس موبائل کی۔ دیکھ سورج سر پہ آگیا ہے اور تجھ سے ابھی تک ایک کمرے کی صفائی بھی نہیں ہوئی' ابھی تو اور کام بھی باقی ہیں۔" رضیہ بیگم بکھرا کمرہ اور بیٹی کے ایک ہاتھ میں صفائی کے بہانے جھاڑو اور دوسرے میں موبائل دیکھ کر غصے سے آگ بگولا ہوگئیں۔ مگر عاشی تو موبائل میں ایسے کھوئی تھی جیسے برج خلیفہ پہ وہ بھینس باندھ رہی ہو اور اسے ڈر ہو ذرا سی بھول چوک ہوئی تو اس کی ساری محنت کا ستیاناس' اسے تو رضیہ بیگم کے کمرے میں آنے کا بھی پتا نہ چلا' جب رضیہ بیگم نے اس کے ہاتھ سے موبائل چھیننا چاہا' تب کہیں جاکے اسے ہوش آیا۔

"اماں کر تو رہی ہوں صفائی' ابھی موبائل اٹھایا تھا۔ آج گروپ کی ایک ایکٹو ممبر کی برتھ ڈے تھی تو اسے وش کرنے کے لیے پوسٹ کررہی تھی۔ اماں بس دو منٹ' ابھی تجھے پورا کمرہ چمکتا ہوا ملے گا۔ بس تو باہر جا۔" عاشی پھر سے دو منٹ کا کہہ کر رضیہ بیگم کو بہلانے لگی۔

"صفائی تو تب ہوگی نہ' جب تجھے تیری اس فساد بک سے فرصت ملے۔ صبح سے تو کمرے میں ہے اور یہی چلائے جارہی ہے 'بس دو منٹ' اس دو منٹ کے چکر میں دو گھنٹے گزر گئے ہیں' مجال ہے جو تو نے ایک چیز کو ہاتھ لگایا ہو۔ پھوہڑ لڑکی' رکھ اس نگوڑے موبائل نوں۔" عاشی نے جھٹ سے موبائل رکھا اور صفائی کرنے لگ گئی' تاکہ مزید عزت افزائی سے بچ سکے۔ مگر فرض سمجھ کے' ساتھ ساتھ فساد بک کا تعارف کراونا بھی شروع کردیا۔

"اماں دیکھ میں کام کررہی ہوں' پر تو آئندہ اسے فساد بک نہ کہا کر۔ کتنی بار بتایا ہے فیس بک ہے یہ اور تو جو مجھے پھوہڑ لڑکی کہتی ہے نا وہ بھی تو غلط کہتی ہے۔ تجھے پتا ہے اماں میں پانچ گروپس کی ایڈمن ہوں۔ ہر گروپ میں پندرہ ہزار سے اوپر ممبر ہیں۔ سب بہت تعریف کرتے ہیں تیری بیٹی کی اور تین پیجز کی بھی اکلوتی ایڈمن ہوں۔ ایک تجھے میں نکمی لگتی ہوں۔" عاشی اپنی فیس بک مصروفیات ایسے بتانے لگی جیسے وہ دنیا کا اعلا ترین کارنامہ انجام دیتی ہو۔ جیسے ہر روز اونٹ کو رکشا میں بٹھاتی ہو اور اب اسے ماں کی طرف سے اس انوکھے کارنامے پہ اعزازی میڈل چاہیے۔

"تو وقت پہ صفائی کرلے نہ' میرے لیے یہی بہت ہے۔ تجھے پھوہڑ نہ کہوں تو کیا تیری بلائیں اتاروں' دیکھ اب پھر سے موبائل مت اٹھالینا۔ میں ذرا سبزی کاٹ لوں تو پھر آکے سالن بنادے۔" رضیہ بیگم کام چور عاشی کو ایک اور کام سونپ کے کچن میں چل دیں۔ عاشی کا دل چاہا وہ اپنا سر پیٹ لے۔ عادت سے مجبور ہوکے فوراً" سے پہلے فیلنگ سیڈ کا اسٹیٹس دے مارا۔

تو آؤ جھاڑو دے جاؤ۔

تو آؤ سالن بناؤ۔

کھانا بنانے کے دوران وہ مسلسل اپنا دکھ فیس بک پہ شیئر کرتی رہی' مگر کسی کو اس پہ ترس نہ آیا۔ ابھی وہ کھانا بنا کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ رشتے کرانے والی خالہ' خالہ فریدہ آگئی۔

"تو اب ان کے لیے چائے وہ بھی دودھ پتی بنانی پڑے گی۔" عاشی نے صورت حال بھانپتے ہوئے چائے کی دیگچی چولہے پہ رکھ دی اور کچن میں کھڑے ہوکے دور سے سلام کیا۔

"خالہ فریدہ کیسی ہو؟ جانا مت چائے بنا رہی ہوں۔" "کیونکہ آپ کا پیٹرول تو یہی ہے ابھی نہ پلائی تو شام کا کھانا بھی کھلانا پڑے گا۔ عاشی نے چہرے پہ جھوٹی مسکان سجائے آہستہ سے منہ میں بڑبڑاتے ہوئے دل کی بات کہہ ڈالی۔ فریدہ خالہ مسکرائی اور کہنے لگی۔
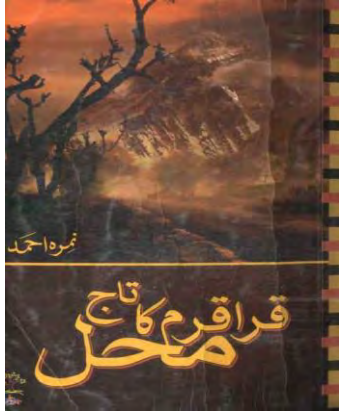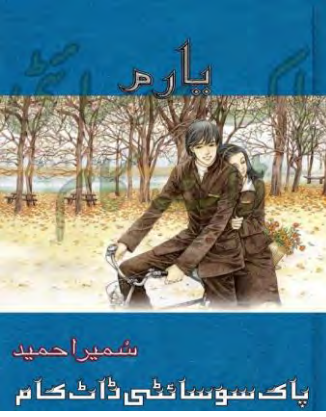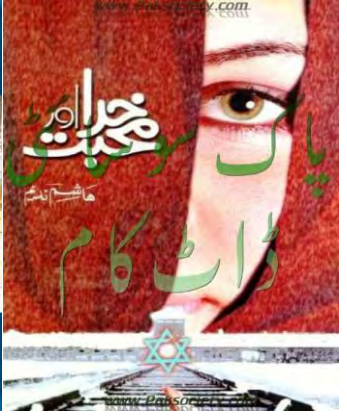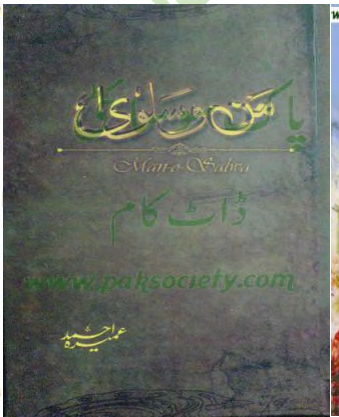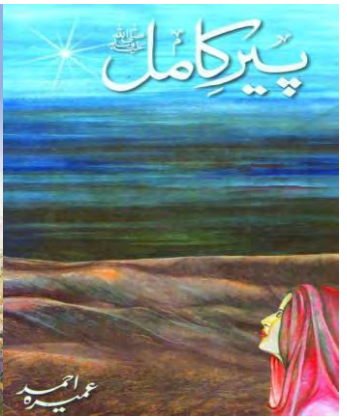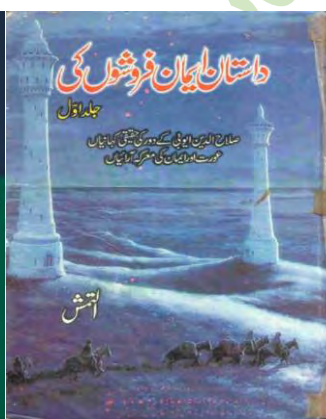
"صدقے جاواں ساتھ بسکٹ اور منہ میٹھا کرنے کے لیے بھی کچھ لیتی آنا۔ آج تیرے لیے بہت ہی اچھا رشتہ لائی ہوں۔" عاشی کا تو ایسے دھچکا لگا رشتے کا سن کے جیسے کسی نے اس کا فیس بک اکاؤنٹ ہیک کرلیا ہو۔ اس سے پہلے وہ جواب میں کچھ کہہ پاتی' رضیہ بیگم نے بھی خالہ فریدہ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے عاشی کو کچن میں پڑی مٹھائی لانے کا بھی کہہ دیا۔ عاشی کا دل

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

چاہا چائے میں شکر کے بجائے ڈھیر ساری مرچیں ملا دے۔

"اور کوئی کام نہیں اسے... آجاتی ہے روز رشتہ لے کر' وہ بھی اپنے جیسا۔ منہ نہ متھا جن پہاڑوں لتھا۔" عاشی خود سے ہم کلامی کرنے لگ گئی۔ جب چائے بن گئی کسی فیک اکاؤنٹ کی طرح عاشی بھی چہرے پر ہلکی سی فیک (جھوٹی) مسکان سجائے مگروں میں کالی ساری بھر اس لیے چائے لے کر پہنچ گئی اور پلیٹ میں دو لڈو بھی رکھ لیے۔ عاشی کے ناز و انداز کو دیکھ کر رضیہ بیگم نے اسے اشارتاً" چائے تعظیم سے پیش کرنے کو کہا اور ساتھ تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا تمہاری خالہ تمہارے لیے رشتہ لائی ہے' بہت اچھا رشتہ ہے' اپنی دکان ہے کریانے کی' حبیب بینک کے سامنے۔" عاشی تو غصے سے لال پیلی ہو کر کمرے میں چل دی' پیچھے رضیہ بیگم' خالہ فریدہ کو کہنے لگی۔

"تم لڑکے والوں سے بات کرو ذرا چھان بین کرو' میں تمہیں عاشی کے والد سے پوچھ کر بتاؤں گی۔ یہ تو بچی ہے' شاید شرما گئی۔" خالہ فریدہ اثبات میں سر ہلانے کے بعد چائے کی چسکیاں لینے لگ گئی جو عاشی کو بند کمرے میں بھی سنائی دے رہیں تھی۔ عاشی اپنا سر تکیہ میں دیے بس رو دینے کو تھی اور سوچ رہی تھی کیسے امی کو بتاؤں حمزہ کے بارے میں' جسے وہ فیس بک پہ ہی ملی تھی کسی گروپ میں اور پھر ان باکس میں بات کرنے کے بعد پہلے دوستی اور اب محبت کا رشتہ جڑ چلا تھا۔ دونوں کو اب ایک دوجے کا ایک منٹ بھی آف لائن ہونا گوارہ نہیں تھا۔ ایسے بے چین ہو جاتے جیسے بن نسوار کے پٹھان... دونوں نے ایک دوسرے کو بہت خواب دکھائے تھے۔ بقول حمزہ کے وہ بہت امیر تھا۔ سائیں خاندان کا اکلوتا چشم و چراغ اور لاڈلا... کئی مربع اس کی زمین تھی گاؤں میں۔ وہ عاشی کو شادی کے بعد اپنے محل نما گھر کی رانی بنا کے رکھے گا اور اس گھر کی تصویریں بھی اس نے فیس بک پر عاشی کو دکھا دیں تھیں۔ عاشی نے تو بن ملے بغیر کچھ جانے اسے اپنا شہزادہ مان لیا تھا۔ اس کے سنگ زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ اسی کی خاطر ہی تو وہ اپنی ہر پوسٹ کرتی۔ پیج وغیرہ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر شاعری پوسٹ کرتی اور وہ بھی اپنی محبت کا ثبوت دینے کے لیے ساری پوسٹ لائیک اور کمنٹ کرتا۔ ہر روز نئے نئے عہد و پیمان ہوتے ان دونوں کے بیچ۔ یوں یہ تعلق کافی مضبوط بھی ہو گیا تھا۔

اور عاشی اپنے فیس بک اکاؤنٹ کے نام کی طرح خود کو اصل میں ہی پرنسس سمجھنے لگ گئی تھی۔ وہ بھی سائیں حمزہ کی پرنسس۔ اس لیے عاشی سے خالہ فریدہ کا کریانہ والے لڑکے کے لیے رشتہ لانا برداشت نہ ہوا۔ ابھی وہ ان سوچوں میں گم تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ عاشی نے بھانپ لیا تھا کہ اب اس کی خیر نہیں۔ کئی سوالوں کے جواب دینے ہوں گے اب۔ یہ ضرور رضیہ بیگم ہی تھیں۔ عاشی نے اپنی اجڑی ہوئی شکل کو ٹھیک کرنے کی نیت سے بالوں پہ ہاتھ پھیر کے دوپٹا سیٹ کرنا ہی چاہا کہ رضیہ بیگم پھٹ پڑیں۔

"یہ تم نے کیا کیا؟ کیوں اندر ایسے بھاگ آئی؟ کیا اعتراض ہے تمہیں اس رشتے پہ؟ اتنا اچھا تو لڑکا ہے۔ اپنی دکان ہے اس کی۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں اور تمہیں کیا چاہیے؟ بہت خوش رکھے گا تمہیں۔"

"امی ایک بات بتائے دیتی ہوں' چاہے آپ مجھے ماریں یا ٹانگیں توڑ دیں' مجھے نہیں کرنی کسی کریانہ والے سے شادی۔ میں کسی امیر سے شادی کروں گی۔ پرنسس ہوں میں۔ میرے لیے تو کوئی امیر ہی آئے گا۔" عاشی نے ڈرتے ڈرتے مگر ہمت کر کے اشارتاً" اپنی بات کہہ ہی ڈالی۔ آخری لفظ تھوڑے شرما کر کہے۔ رضیہ بیگم بھی ماں تھیں۔ کیسے نہ سمجھتیں بیٹی کی بات کا مطلب۔ خوب سمجھ گئیں کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔

"کم بخت میں پہلے ہی جانتی تھی کہ ضرور کوئی بات ہے جو تو ہر وقت اس آفت مارے موبائل میں لگی رہتی ہے۔ نی دس میں نوں کون ہے وہ؟" رضیہ بیگم لفظوں کی گولیاں چلاتے اپنے ہاتھوں کو آلہ قتل بنائے

عاشی کی طرف لپکیں۔ عاشی نے جھٹ سے تکیہ آگے کیا مگر اس کے بال رضیہ بیگم کے ہاتھوں میں آگئے۔ عاشی چلانے لگی۔

"امی بال تو چھوڑیں۔ درد ہو رہا ہے۔"

"بتا مجھے کون ہے وہ؟ کیسے جانتی ہے؟ کہاں ملی اسے؟"

"فیس بک پہ بات ہوئی ہے' ملی نہیں ہوں۔ بہت امیر ہے وہ۔" عاشی ابھی رام کتھا سنا ہی رہی تھی' رضیہ بیگم نے اس کے بال چھوڑ کر ساتھ ہی بیڈ پہ پڑا موبائل اٹھا لیا۔

"یہ ہی ہے ناسب فساد کی جڑ۔ دیکھ اب میں اس کے ساتھ کرتی کیا ہوں۔ اب ہاتھ مت لگانا اسے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے تجھے موبائل رکھنے کی۔" ابھی رضیہ بیگم عاشی کا عرس پڑھ ہی رہی تھیں کہ صحن میں خالہ فریدہ کی آواز آئی۔

"رضیہ نی او رضیہ میں یہاں اپنا شاپر بھول گئی تھی' کہاں رکھا تو نے؟"

"آئی..." رضیہ نے لہجہ بدلتے ہوئے وہیں سے فریدہ کو جواب دیا۔ رضیہ بیگم کے باہر جانے کے بعد عاشی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ ایک تو محبت کا غم اوپر سے موبائل چھن جانے کا غم۔ دونوں غموں نے مل کر جہاں عاشی کی آنکھوں کو برسنے پر مجبور کیا تھا وہیں اس کی تو تے جیسی لمبی ناک بھی رونے کی وجہ سے بہنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے پہلے تو ہاتھ کی مدد سے آنسو صاف کیے ساتھ دوپٹے کا پلو ہاتھ میں لے کر شوں کر کے ناک صاف کیا۔ پچھلے پندرہ منٹ اس پہ ایسے گزرے جیسے کسی امریکن کو لائٹ کے بنا گزارنے پڑ جائیں۔

دو دن تک یہ سب یوں ہی چلتا رہا۔ عاشی نے موبائل کے بنا دو دن ایسے گزارے جیسے نیٹ ورک کے بنا موبائل ہے۔

حمزہ کے لیے امی کو منانا اور امی سے واپس موبائل لینا اسے رکشا میں اونٹ بٹھانے سے بھی کہیں زیادہ مشکل لگ رہا تھا۔

آخر اس نے آیت الکرسی پڑھ کے گلے میں پھونک مار کے ٹھان ہی لیا کہ امی سے بات کرتی ہوں اور ساتھ معقول بہانہ بھی سوچ لیا موبائل مانگنے کا۔

"امی..." عاشی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہاں بولو موبائل چاہیے؟" رضیہ بیگم بیٹی کے تیور دیکھ کر فوراً" سمجھ گئیں۔

"نہیں امی۔ بس ایک کال کرنی تھی سعدیہ کو... کہ وہ آکر اپنے کپڑے لے جائے' میں نے سلائی کر دیے ہیں۔"

"تو رہنے دے عاشی... میں سب سمجھتی ہوں۔ اگر ضروری ہوئے تو وہ خود آکر لے جائے گی۔" رضیہ بیگم نے غصے سے جواب دیا۔ عاشی سمجھ گئی کہ اب بہانے بازی نہیں چلے گی۔ وہ کسی بیمار مرغی کے جیسا منہ بنا کے اندر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

رات کو کھانے کے بعد رضیہ بیگم نے حفیظ صاحب یعنی کہ عاشی کے والد صاحب سے آنے والے رشتے کا تذکرہ کیا تو حفیظ صاحب کہنے لگے۔

"ہاں رشتہ تو بھلا ہے' مگر عاشی سے پہلے اس کی پسند پوچھ لینا زندگی تو اس نے گزارنی ہے نا۔ اس سے پوچھے بنا کوئی فیصلہ مت کرنا۔ وہ اگر ہاں کرے تب ہی انہیں گھر بلانا۔" حفیظ صاحب یہ بات کہہ کر سونے چلے گئے' مگر رضیہ بیگم کو سوچوں میں الجھا گئے۔ رضیہ بیگم سوچنے لگیں کہ اب کیا کروں عاشی تو راضی ہی نہیں۔ وہ تو کہیں اور شادی کا کہتی ہے۔ کیسے بتاؤں حفیظ صاحب کو... کون جانے وہ کیسے لوگ ہوں۔ بس حفیظ صاحب کو کہہ دوں گی عاشی کو کوئی اعتراض نہیں۔ مگر اصل سوال تو عاشی کی خوشی کا ہے۔ ان کے ضمیر نے انہیں ملامت کی۔ آخر انہوں نے خود کو سمجھاتے ہوئے عاشی کی خوشی کی خاطر فیصلہ کر ہی لیا۔ اگلی صبح ناشتے کے بعد برتن دھوتے ہوئے رضیہ بیگم نے عاشی کو کچن میں بلایا۔

"عاشی بی عاشی... ذرا کچن میں آؤ۔"

"اچھا امی آئی۔" عاشی نے بہت بے دلی سے یہ جواب دیا اور پاؤں زمین پہ پٹختی کچن میں چلی گئی۔

روتی شکل کیوں بنا رکھی ہے؟ ماں ہوں تیری۔ اگر ڈانٹ بھی دیا تو کیا برا کیا۔ ماں باپ کبھی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔" عاشی نے سر جھکا لیا۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ مگر شکوے کے تاثرات اس کے چہرے سے عیاں تھے۔

"رات میں نے تمہارے ابو سے تمہارے رشتے کی بات کی۔ انہوں نے کہا ہے میں پہلے تمہاری مرضی جان لوں' پھر کوئی فیصلہ کروں اور تیری مرضی تو مجھے پتا ہے۔ یہ لے فون اور کر اسے کال۔ وہ اگر تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو رشتہ بھیجے۔ میں تیرے ابو کو خود سنبھال لوں گی۔ دیکھ دو دن ہیں تیرے پاس۔ جمعہ کو وہ رشتہ لے کر آجائیں۔ ورنہ میں تیرا اسی کے ساتھ رشتہ پکا کردوں گی جو خالہ فریدہ لائی ہیں۔" رضیہ بیگم نے ایک ہی سانس میں اپنا فیصلہ سنا کے عاشی کی کھوئی ہوئی مسکان واپس لٹا دی۔ عاشی مینڈک کی طرح خوشی سے اچھلتی اپنے کمرے میں آئی اور جھٹ سے موبائل آن کیا اور سب سے پہلے حمزہ کو کال کی۔ دو دن نمبر بند رہنے کی وجہ بتائی۔ پھر ایک دم اسے خوشی کی خبر سنائی۔

"حمزہ میرے پرنس... میں نے امی کو سب بتا دیا' بس اب تم دو دن تک اپنی فیملی کو لے کر میرے گھر آجاؤ۔" دوسری طرف گہری خاموشی تھی۔

"حمزہ تم میری بات سن رہے ہو نا۔" دوسری طرف سے سوچوں میں گم حمزہ کی صرف ہاں کی آواز آئی۔ "پتا ہے میرے لیے ایک کریانہ والے کا رشتہ آیا۔ مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے تمہارے بارے میں سب سچ سچ بتا دیا امی کو اور پھر کوششوں سے امی مان بھی گئیں اور امی نے کہا وہ ابو کو بھی منا لیں گی اور اگر تم لوگ دو دن میں رشتہ لے کر نہ آئے تو امی میرا اسی غریب کریانہ والے سے رشتہ کر دیں گی... بس تم جلدی کچھ کرو۔ تم نے بتایا تھا نہ تمہاری فیملی ایسی نہیں' وہ کبھی اس رشتے پر انکار نہیں کریں گے' تو تمہارے لیے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ بس تم جمعہ تک آجاؤ۔"

"کیا ہوا' کچھ بولو نا۔ کہاں گم ہو۔" عاشی سے حمزہ کی مزید خاموشی برداشت نہ ہوئی تو بہت بے چین ہو کر بولی۔

"ہاں آجائیں گے۔ مگر مجھے ڈر ہے' تم مجھے دیکھ کر انکار نہ کر دو۔" "بس یہ ہی سوچ رہا تھا۔"

"او نہیں یار... میں نے تمہارے دل سے پیار کیا ہے۔ تمہاری صورت سے نہیں۔ اور نہ ہی مجھے تمہاری دولت سے مطلب ہے۔" عاشی نے بات بنانے کے لیے جھوٹ بھی ساتھ بول دیا۔ کچھ باتوں کے بعد کال کٹ گئی۔ اگلے چار دن عاشی نے جیسے تیسے کرکے گزارے پانچویں دن بروز اتوار حمزہ اپنی دو بہنوں اور والدہ کو ساتھ لے کر عاشی کے گھر پہنچ گیا۔

☼ ☼ ☼

دروازے پر دستک ہوئی تو رضیہ بیگم نے عاشی کو کہا جاؤ۔

"دیکھو کون ہے دروازے پہ۔" عاشی بھاگ کے گئی' کیونکہ وہ جانتی تھی حمزہ اور اس کی فیملی ہوگی۔ اس نے کسی چڑیا کی طرح چہکتے ہوئے دروازہ کھولا۔ مگر ایک دم اس کی ہنسی کہیں غائب ہوگئی۔ دروازے پر تو تین عورتیں کھڑی تھیں۔ تیل سے اٹے بال' ستاروں والے شوخ رنگ کے بھڑکیلے کپڑے۔ ساتھ شوخ رنگ کی 1960ء کی ہیروئنوں کی طرح لپ اسٹک۔ عاشی کا تو دیکھ کے ہی دل کھٹا ہو گیا۔ خود کو سمجھانے لگی' یہ حمزہ کی فیملی نہیں' کوئی اور لوگ ہیں اور ادھر وہ تینوں عورتیں عاشی کو دیکھ کر ایک دوسرے سے آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرنے لگیں۔ ان میں سے ایک عورت نے کہا۔

"تُو ہمارے حمزہ کی عائشہ ہے نا؟ ہم صحیح گھر آئے ہیں نا؟" عاشی نے مرے ہوئے لہجے میں بس جی ہی کہا۔ اس کا جواب سن کے ایک عورت نے اسے گلے لگا لیا جو یقیناً" حمزہ کی والدہ ہی تھی اور لگی چومنے چاٹنے۔ عاشی کا تو پورا منہ سرخ لپ اسٹک سے ہی بھر گیا۔ ابھی اس محترمہ نے چھوڑا نہیں تھا ساتھ کھڑی

دوسری عورت نے جو انتہائی موٹی تھی۔ عاشی کا ایک بازو پکڑ کر اپنی طرف کیا۔
"اماں خود ہی پیار کرتی رہے گی اپنے بہو کو۔ یا ہمیں بھی دیکھنے دے گی۔" اور پھر اس عورت نے عاشی کو گلے لگالیا۔
"بہت سونہڑی اے میرے حمزہ دی کڑی۔" حمزہ کی ماں نے یہ کہہ کر پھر سے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ عاشی کا تو بس نہیں چل رہا تھا' کیسے جان چھڑوا کے بھاگے۔ ابھی یہ پیار کا سلسلہ جاری تھا۔ رضیہ بیگم نے عاشی کو آواز دی۔
"کون ہے دروازے پہ....؟"
"امی مہمان ہیں۔" عاشی نے یہ کہہ کر اس نند محترمہ کے بازوؤں کے شکنجے سے خود کو چھڑوایا اور کہا۔
"آپ اندر چلیں میں گیٹ بند کر کے آتی ہوں۔" دل دل میں شکر بھی ادا کیا کہ تیسری کے گلے لگنے کے عذاب سے بچ گئی۔ ابھی اس نے گیٹ بند کیا ہی تھا۔ حمزہ کی بڑی بہن کہنے لگی۔
"ذرا ٹھہرو حمزہ ٹیکسی والے کو کرایہ دینے گیا ہے آتا ہی ہوگا۔" اس نے گیٹ سے سر باہر نکال کے ادھر ادھر دیکھا' تاکہ حمزہ کو اصل میں دیکھ سکے۔ مگر اسے کہیں اپنا ہیرو نظر نہ آیا۔ پر تھوڑا دور کھڑا ایک پینڈو ضرور نظر آیا۔ جسے کپڑے پہننے کا بالکل ڈھنگ نہیں تھا۔ ایسے لگتا تھا لنڈا بازار سے جو ملا پہن لیا اور اوپر سن گلاسز ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی نے بکرے کو پہنا دیے ہوں۔ عاشی کے دل میں ایک ہلکا سا خیال آیا' کہیں یہ حمزہ نہ ہو۔ کیونکہ اس کی فیملی بھی تو ایسی ہے۔ مگر اس نے فورا" سے پہلے خود ہی جھٹلا دیا کہ یہ تو حمزہ نہیں ہو سکتا۔ حمزہ نے جو فیس بک پہ پکس بھیجیں' وہ تو کسی ہیرو سے کم نہیں تھا۔ کہاں یہ کہاں وہ.... اور پھر گیٹ بند کر کے اندر آگئی۔ ان تین خواتین میں سے ایک نے عاشی کو اکیلا آتا دیکھ کر سوال داغا۔
"حمزہ کتھے اے؟ اندر نہیں آیا وہ؟" عاشی خاموش رہی۔
حمزہ کی اماں نے پوچھا۔ "یہ گھر آپ کا اپنا ہے نا۔"
"جی جی اپنا ہے۔" رضیہ بیگم نے خوش ہو کر بتایا۔
"عائشہ کے والد نظر نہیں آرہے کہاں ہیں وہ؟ کیا کرتے ہیں؟"
"جی وہ دکان پہ گئے ہیں۔ اپنی کپڑوں کی دکان ہے۔ بس ابھی آتے ہی ہوں گے۔ عاشی انہیں کال کر کے آپ لوگوں کا بتا چکی ہوگی۔"
"او اچھا اکلوتی بیٹی ہے؟" ایک اور سوال۔
"جی... بڑے نازوں سے پالا ہے۔ اس کے علاوہ ہے کون ہمارا؟" رضیہ بیگم نے کافی حساس ہو کر کہا۔
"نہیں.... نہیں.... ایسا نہ کہیں ہمارا حمزہ بھی تو آپ کا بیٹا ہے نا....
عاشی آپ کی اکلوتی بیٹی ہے' تب ہی ہم سوچ رہے تھے حمزہ شادی کے بعد یہیں اسی گھر میں رہے گا۔ ہمارا کیا ہے۔ ویسے بھی تو ہمارے ساتھ نہیں رہتا وہ۔ یہیں ملک صدیق کے گھر پڑا رہتا ہے' اس کے گھر کے سرونٹ کوارٹر میں...." حمزہ کی والدہ نے آخر اصلیت کھول ہی دی۔
"سرونٹ کوارٹر؟ آپ لوگوں کی تو اپنی زمینیں ہیں؟ پھر سرونٹ کوارٹر کیوں؟" رضیہ بیگم نے چونک کر پوچھا۔
"ہماری زمینیں؟ بہن ہم تو خود لوگوں کے گھروں میں کام کرتے ہیں۔ حمزہ صدیق صاحب ارے وہ جنگ گروپ والے ان کے ہاں گارڈ ہے۔ وہیں سرونٹ کوارٹر میں رہتا ہے۔ ہم کام کر کے واپس گھر چلے جاتے ہیں۔ حمزہ نے آپ لوگوں کو نہیں بتایا؟ عائشہ کو تو بتایا ہی ہوگا۔" حمزہ کی والدہ نے ادھر ادھر دیکھ کے رضیہ بیگم کو اپنے بارے میں مزید تفصیلات سے آگاہ کیا۔ عاشی کچن کے دروازے سے کان لگائے ساری باتیں سن رہی تھی۔ رضیہ بیگم نے غصیلی نظروں سے عاشی کو گھور کر دیکھا۔ عاشی کے ہاتھوں کے تو جیسے طوطے' مرغیاں چڑیاں سب ایک ساتھ اڑ گئے۔ اسی لمحے پھر سے دروازے پر دستک ہوئی۔ حمزہ کی والدہ صاحبہ نے عاشی کو آواز دی۔
"عائشہ بیٹا باہر تو آؤ' دیکھو حمزہ ہوگا۔" اس سے پہلے کہ عاشی جواب دیتی یا باہر نکلتی رضیہ بیگم نے کہا۔
"نہیں خود دیکھتی ہوں۔" رضیہ بیگم نے گیٹ کھولا تو سامنے وہی لڑکا کھڑا تھا جسے عاشی نے دیکھا تھا۔
"جی بیٹا کون؟ کیا کام ہے؟" ابھی حمزہ بولنے کے لیے الفاظ جوڑ ہی رہا تھا حمزہ کی چھوٹی بہن وہیں گیٹ پہ آپہنچی۔
"ارے خالہ اپنے ہونے والے داماد کو گیٹ پہ ہی کھڑا رکھو گی؟ یہ حمزہ ہے' پہچانا نہیں؟ جسے آپ کی بیٹی نے پسند کیا ہے۔" رضیہ بیگم ابھی حیرانی سے سب کچھ دیکھ ہی رہی تھیں کہ اس لڑکی نے حمزہ کا بازو کھینچ کے اندر بلا لیا۔ رضیہ بیگم ہکا بکا رہ گئیں۔ وہ تو اسے کچھ اور سمجھیں تھیں۔ عاشی نے مردانہ آواز سن کر بہت بے چین ہو کر دیکھا' مگر اس کے ارمان ٹوٹنے میں جو کسر باقی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔ یہ حمزہ پرنس تو کہیں سے نہیں لگ رہا تھا اور اگر تھا بھی ضرور ویسٹ انڈیز کا شہزادہ ہوگا۔ عاشی کے ارمانوں پہ تو جیسے جھاڑو پھر گئی۔ عاشی کے موبائل کی لائٹ چمکی تو اس نے آٹھ آٹھ آنسو نہیں بلکہ سولہ سولہ آنسو بہاتے ہوئے موبائل اٹھایا اور میسج پڑھا۔
"عاشی میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ مگر میری محبت پہ کبھی شک مت کرنا۔ جھوٹ میں نے اس لیے بولا تھا کہ تم مجھے چھوڑ نہ دو۔ میرے پیار کا ثبوت یہ ہے میں تمہارے گھر تمہارے ساتھ رہوں گا۔ میری پہلی بیوی کو بھی اس بات پہ کوئی اعتراض نہیں۔ سامنے تو آؤ ایک بار شکل تو دکھاؤ۔" ابھی عاشی یہ میسج پڑھ ہی رہی تھی صحن سے شور کی آواز آئی۔ اس نے جلدی سے موبائل رکھا اور دیکھنے لگ گئی کہ اب کیا ہوا۔ اسے اس شور میں بس رضیہ بیگم کی ہی آواز سنائی دی۔
"نکلو میرے گھر سے شادی کرے گا' گھر داماد بنے گا' پہلے سے بھی ایک بیوی ہے۔ حفیظ صاحب کا کاروبار سنبھالے گا۔ بتاتی ہوں تجھے تو ذرا کو ذرا...." حمزہ' اس کی دو بہنیں اور اس کی ماں چادریں سنبھالتی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئیں۔ رضیہ بیگم کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا' زور سے ان کے منہ پر گیٹ بند کیا اور گیٹ کے ساتھ پڑا جھاڑو ہاتھ میں لیا اور عاشی کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ عاشی نے خطرے کو بھانپ لیا اور جلدی سے اپنا فیس بک اکاؤنٹ ڈی ایکٹیویٹ کیا' ساتھ درود پاک اور آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اب آگے کیا ہونا ہے۔

☼ ☼

حنا بشریٰ

"جی امی جان، ہم جلد پہنچنے کی کوشش کریں گے!" ابو کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔

"کیا ہوا ابو کیا کوئی خاص خبر ہے!" میں رہ نہ سکا تو پوچھ بیٹھا۔

"ہاں... ہاں تمہارے چچا کی شادی ہے ہمیں جلد آنے کی تاکید کی گئی ہے!" ابو ابھی تک نہال تھے تقسیم ہند کے بعد ہم پاکستان آ گئے تھے۔ ابو کے والدین اور بھائی وہیں رہ گئے تھے۔ انہوں نے اپنا گھربار چھوڑنا مناسب نہ سمجھا مگر ابو کو تو پاکستان جانے کی لگن لگی تھی وہ نہ رہ سکے۔ اب دادی کا فون سننے کے بعد تو ابو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ پر لگے اور وہ اڑتے ہوئے اپنوں سے جا ملیں۔ بھارتی حکومت کی وجہ سے ویزے کے سلسلے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ مجھے بھی سب سے ملنے کی شدید بے چینی تھی سارے راستے سوچتا رہا کہ سب کیسے ہوں گے۔ ہماری حویلی، میرے دوست، بچپن کی یادیں۔

بارڈر پر ہماری سخت چیکنگ ہوئی۔ کیونکہ سنا تھا کہ دو ہفتے پہلے دونوں سرحدوں سے فائرنگ کا شدید تبادلہ ہوا ہے۔ جس میں کچھ بے گناہ مارے گئے ہیں۔

☆ ☆ ☆

اتنے عرصے بعد ہم جا رہے تھے۔ ابو نے سوچا راستے سے مٹھائی لے لیتے ہیں۔ ایک دکان پر رکے۔ دکان دار ہندو تھا۔ ابو کو پہچان گیا بہت خوش دلی سے ملا چلتے چلتے ابو کو ایک مٹھائی کا ڈبا پکڑاتے ہوئے کہا۔

"بابو جی بہت سالوں بعد آئے ہو۔ یہ میری طرف سے تحفہ!" وہ خوش دلی سے بولا۔ میں حیران بھی ہوا اور متاثر۔ سارے راستے سوچتا رہا کہ بھارتی عوام کے دلوں میں اتنی نفرت نہیں ہے جتنا بھارتی حکومت کینہ و کدورت رکھتی ہے۔

اللہ اللہ کر کے ہم حویلی پہنچے۔ سب ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ دادا، دادی، دونوں چچا اور پھپھو وغیرہ سب آپس میں مل کر بہت خوش ہوئے۔ ابو تو اپنوں میں جا کر خوشی سے نہال تھے۔ حویلی میں بہت سے ہندو ملازم بھی تھے جو ہمیں اپنے انداز میں ہاتھ جوڑ کر سلام کر رہے تھے اور خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے مجھے تو خوب نیند آئی۔ شام کے وقت سب کھانے پر موجود تھے۔ ہماری وجہ سے خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانا بہت خوش گوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ باتوں باتوں میں مجھے علم ہوا کہ "دولہا میاں" کسی بات پر ضد لگا کر بیٹھے ہیں اور سب انہیں منا رہے تھے...

آخر ہمت کر کے میں نے امی سے پوچھا جو بات انہوں نے بتائی مجھے حیرت ہوئی۔ دراصل دولہے میاں کی ضد تھی کہ نکاح دہلی کی جامع مسجد کے امام مولوی عبدالهادی سے ہی پڑھواؤں گا۔

سب گھر والے سمجھا رہے تھے کہ مولوی صاحب بیمار ہیں۔ یہ کیسی بچوں والی ضد لگا رکھی ہے۔ مگر دولہے میاں بضد تھے کہ خواہ تاریخ آگے ہوتی ہے تو ہو جائے نکاح تو مولوی عبدالهادی ہی پڑھائیں گے... آخر سب دولہے میاں کی ضد کے سامنے خاموش ہو گئے۔ مجھے شدید بے چینی تھی کہ یہ ضد آخر کیوں... اس کا جواب تو چچا جان ہی دے سکتے تھے۔ میں ان کے کمرے میں گیا۔

"آؤ میاں آؤ تو تم تک بھی خبر پہنچ ہی گئی!"

"جی۔" میں صاف گوئی سے بولا۔

"بھئی جمال... یہ ضد میں نے خواہ مخواہ ہی نہیں لگائی۔ وہ بہت زبردست شخصیت کے مالک ہیں۔ ان سے نکاح پڑھوانا تو میرے لیے سعادت کی بات ہے۔ مولوی عبدالهادی پہلے "ہندو" تھے۔ وہ بھی اس قدر جنونی اور شدت پسند کہ مسلمانوں کا جینا حرام کر رکھا تھا... مگر پھر اسلام کی شمع نے ان کے دل کو منور کر دیا۔ ان کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ آج بھی لوگوں کی زبان پر ہے!" چچا جان کی آواز میں عقیدت کے رنگ نمایاں تھے۔

"مجھے بھی سنائیں نا!" میں نے اصرار کیا۔

"ہاں... ہاں سناؤں گا مگر ابھی نہیں... یہ ذرا شادی
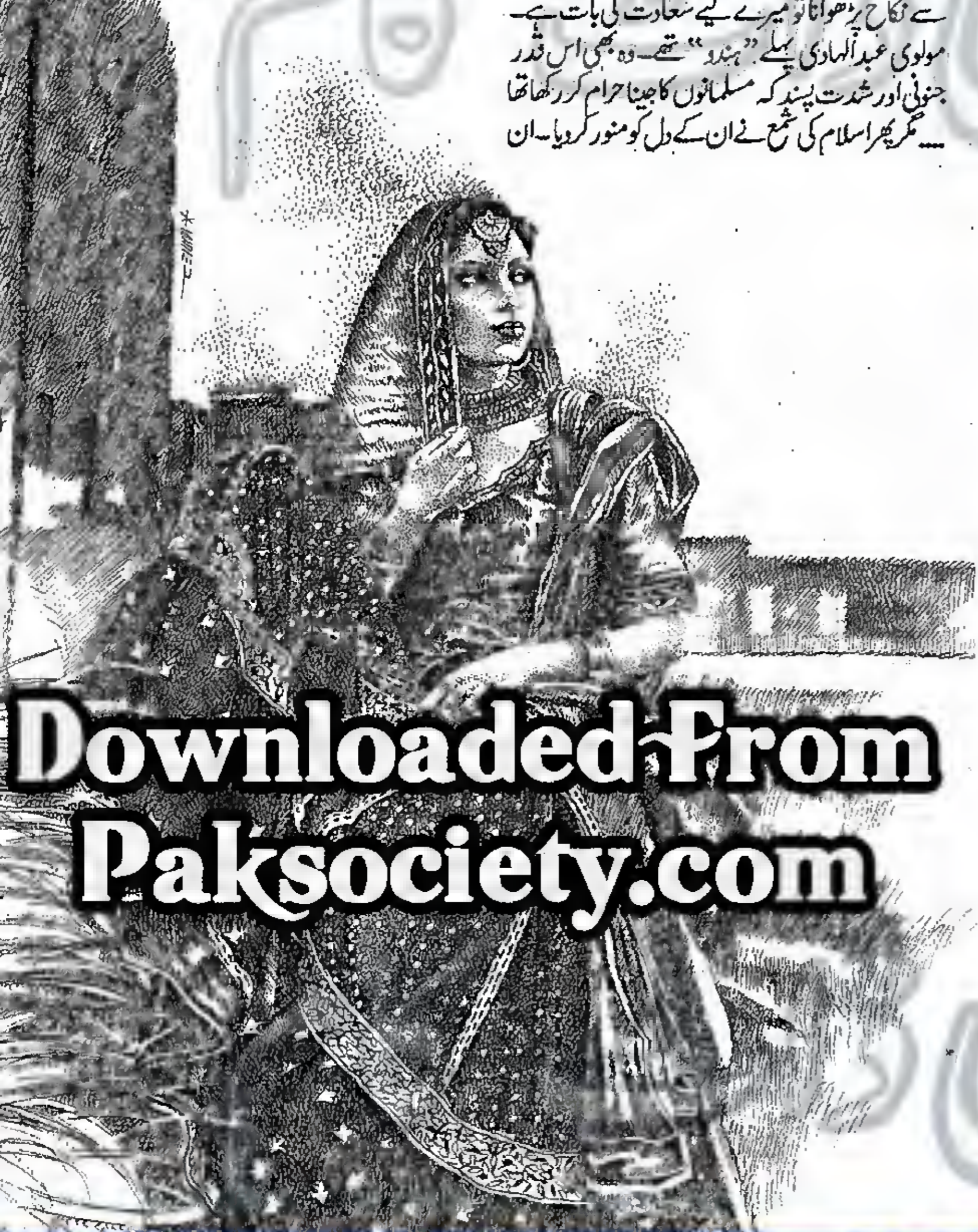
کے جھمیلوں سے فارغ ہو جائیں۔ تو پھر تسلی سے سناؤں گا!" چچا جان میرے اصرار پر بولے۔

اب مجھے مولوی صاحب کی آمد کا انتظار تھا۔ بلکہ ان سے ملنے کا اشتیاق تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن نکاح تھا۔ گھر میں بے حد گہما گہمی تھی۔ حویلی کی رونق عروج پر تھی۔ سب بے حد مصروف تھے۔ مجھے مولوی صاحب کی آمد کا بے چینی سے انتظار تھا۔ عصر کی نماز کے بعد وہ تشریف لائے۔ ان کی عمر 60 سال ہو گی۔ انتہائی نورانی چہرہ، لمبی داڑھی، سفید شلوار قمیص پہنے ہوئے سر پر سیاہ رنگ کا عمامہ باندھے ہوئے تھے۔

میں ان کو دیکھ کر یہی سوچتا رہا کہ یہ ہندو تھے مگر ان میں یہ بدلاؤ کیسے آیا، کس چیز نے ان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ ابو نے ان کو شلوار قمیص کا تحفہ دیا مگر انہوں نے وہیں کسی غریب ملازم کو دے دیا۔ ان کی شخصیت میں بہت عجز و انکساری تھی۔ سب گھر والے کھانے کے لیے اصرار کرتے رہے اور وہ طبیعت کی ناسازی کے باعث معذرت کرتے رہے.... جو ان کو دیکھتا ان کا گرویدہ ہو جاتا....

اگلے دن ولیمہ تھا۔ دادا جان نے کہا کہ چار دیگیں مسجد میں دے آؤں۔ میرا دل خوشی سے اچھل پڑا کہ مولوی صاحب کو پھر سے قریب دیکھنے کا موقع ملے گا۔ میں چند ملازموں کے ساتھ مسجد پہنچا۔ انہوں نے ساری دیگیں غریبوں میں تقسیم کروا دیں۔ میں ان کی ایک ایک ادا سے متاثر ہو رہا تھا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو آپ سے ایک بات پوچھوں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"میرا قبول اسلام کا واقعہ جاننا چاہتے ہو؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"جی جی بالکل میں یہی کہہ رہا تھا!" میں تابعداری سے بولا۔

"اچھا.... تم کل عشا کے بعد آنا۔ اس وقت میں فارغ ہوتا ہوں۔ پھر سناؤں گا تفصیل سے!" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اگلے دن عشا کی نماز پڑھ کر میں ان کے انتظار میں بیٹھ گیا وہ تشریف لائے میں ان کے بولنے کا منتظر تھا.... انہوں نے بولنا شروع کیا۔

"میرے بابو جی پنڈت نارائن راجہ کے دربار میں بہت اہم مقام رکھتے تھے۔ وہ راجہ کے بہت چہیتے پنڈت تھے۔ میں بہت منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا۔ راجہ نے ہی میرا نام رکھا.... روشن۔ میرا زیادہ وقت دربار میں ہی گزرتا میری تربیت بھی زیادہ راجہ کے ہاتھوں میں ہی ہوئی۔ راجہ چونکہ خود ایک ظالم انسان تھا۔ اس لیے میری شخصیت میں بہت سی منفی خصوصیات پیدا ہو گئیں۔ مسلمانوں سے نفرت تو میرے خون میں شامل تھی۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ تمام مسلمانوں کو ختم کر دوں۔ میں 17 سال کا ہو گیا تھا، اونچا لمبا قد، سرخ و سفید رنگت، میری آواز بہت مضبوط اور کرخت تھی۔ اپنے وقت کا انتہائی بگڑا ہوا گھمنڈی نوجوان....

اذان فجر سے میری آنکھ کھلی نفرت سے میرے خون میں زہر شامل ہو گیا۔ میں نے تکیہ سر پر رکھ لیا مگر آواز پھر بھی آتی رہی۔ میں نے روئی کانوں میں ٹھونس لی۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ میں نے موذن کو دل ہی دل میں گالیاں دینا شروع کر دیں۔

"بھگوان کرے کوئی وبا پھوٹے اور سارے مسلے مر جائیں۔ پھر نہ اذان ہو گی اور نہ ہی کوئی مسجد؟" کروٹیں بدل بدل کر میرا برا حال ہو گیا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ خنجر لے کر جاؤں اور عین اذان کے وقت موذن کے حلق میں گاڑ دوں۔ تاکہ آئندہ خوف سے کوئی اذان دینے کی جرات نہ کر سکے۔ نیند تو میری برباد ہو چکی تھی مگر میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح راجہ سے بات کر کے اذان پہ پابندی لگواؤں گا۔

☼ ☼ ☼

صبح میں غصے سے تن فن کرتا، پیر پٹختا دربار پہنچا۔ بابو جی بھی دربار میں موجود تھے۔

"آج ہمارے شہزادے کا مزاج بگڑا ہوا معلوم ہوتا ہے!" راجہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی میں نے فوراً دل کی بات گوش گزار کر دی۔

"بس راجہ جی! اذان پر پابندی لگ جائے تو آپ کی بڑی کرپا ہو گی!" میں نے کہتے ہوئے نفرت بھری نگاہ مسلمان درباریوں پر ڈالی۔

میری بات سن کر بہت سے مسلمان درباری بلبلا اٹھے۔ مجھے ان کی حالت دیکھ کر بے پناہ سکون مل رہا تھا۔ مگر راجہ نے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے میری بات کو اہمیت دی اور اذان پر پابندی لگا دی۔ میرا خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ بابو جی بھی میری خوشی میں خوش تھے۔ مسلمانوں کی تکلیف پر میں خوشی سے نہال ہو جاتا تھا۔

میرے اس عمل پر مسلمان شدید غصے میں آگئے۔ خاص کر مولوی حضرات مجھے دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا۔ مگر وہ میرا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ میرے ساتھ ذرا سی بدتمیزی ان کے اپنے ہی گلے پڑ جاتی۔ راجہ انہیں جیل میں بند کروا دیتا۔ اس لیے وہ سب خاموش رہتے۔ مگر مولوی جمیل صاحب جو بہت بہادر اور باکردار انسان تھے۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ملا کر میری ہر منفی حرکت کا جواب دیتے۔ میرے چہرے پر پھیلا فخر و غرور دیکھ کر اکثر دیکھتے اور کہتے....

"خدا تجھے غارت کرے!" مجھے ان سے مقابلہ کر کے خوب مزا آتا۔ کیونکہ مقابلہ ٹکر کا ہوتا۔

مولوی جمیل کی کوششوں سے تین ماہ بعد اذان پر پابندی ختم ہو گئی۔ میرا دماغ غصے سے پاگل ہو گیا میں نے انفرادی طور پر انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں۔ اذان کے وقت لڑکوں کے ساتھ خوب شور کرتا، سیٹیاں بجاتا، تالیاں پیٹتا.... آگ جلاتا، نمازیوں پر پتھر برساتا، مسلمان دریا پر نہانے جاتے تو ان کے کپڑے چھپا دیتا۔

کبھی مسجد کی سیڑھیوں پر گائے کا گوبر پھینک دیتا، کبھی مسجد میں کتا چھوڑ دیتا، جو اندر گندگی پھیلا آتا بعد میں مولوی جمیل ساری مسجد کو دھو کر پاک کر رہے ہوتے اور ساتھ ہی آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر میرے لیے بددعا کر رہے ہوتے۔ مجھے ان کی بے بسی پر بہت خوشی ہوتی۔

☼ ☼ ☼

میں بہت تنگ نظر بے رحم ہندو تھا۔ اپنا ہر تہوار ڈنکے کی چوٹ پر مناتا، کسی کی جرات نہ ہوتی کہ کوئی مجھے روک سکتا۔ اگر کوئی میری شدت پسندیوں کو روکنے کی کوشش کرتا تو اس کو منہ کی کھانی پڑتی۔ ہندوؤں کا مذہبی تہوار "ہولی" قریب تھا۔ ہندوؤں کا جوش و خروش قابل دید تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ ہندوؤں کی تنگ نظری کے باوجود مسلمان کبھی بھی شر پسندی نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی بدلہ لینے کی کوشش کرتا بھی تو میں کہاں مات کھانے والا تھا۔

"تیاری" تو میں نے بھی کر رکھی تھی مولوی جمیل کو ستانے کی۔ ہم نے ہولی کو منانے کا انتظام مسجد کے سامنے کیا تھا یہ بھی میری چال تھی تاکہ مولوی جمیل کی جان جل جائے۔ سب لڑکے ایک دوسرے پر رنگ پھینک رہے تھے۔ شور و غل عروج پر تھا۔ ساتھ ہی ڈھول بھی بجائے جا رہے تھے۔

"روشن! وہ دیکھو مولوی جمیل تشریف لا رہے ہیں۔" ایک لڑکے نے مجھے اشارہ کر کے بتایا۔

"اب مزا آئے گا ہولی منانے کا!" میں نے قہقہہ لگایا۔

وہ انتہائی ناگواری سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سیاہ رنگ ان پر پھینک دیا۔ وہ سر سے لے کر پیر تک سیاہ ہو گئے ہمارا ہنسی سے برا حال ہو گیا۔

"مولوی صاحب آپ تو دشمنان اسلام کا منہ کالا ہونے کی بددعا کرتے تھے، مگر آج تو آپ سر سے پیر تک خود ہی کالے ہو گئے!" میری بات پر بہت سے قہقہے بلند ہوئے۔

مولوی جمیل کی حالت مجھے بہت مزا دے رہی

تھی۔ ان کی بے بسی پر میری ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ یکایک مولوی جمیل میرے سامنے آکر کھڑے ہوگئے وہ میری طرف کھا جانے والی نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ میں جو اپنی فتح کے نشے میں چور تھا چند لمحے گزرے اور مولوی جمیل کا زوردار طمانچہ میرے چہرے پر پڑا۔

ماحول میں سناٹا چھا گیا۔ کسی کی جرأت نہیں تھی کہ کوئی مجھے ہاتھ لگاتا۔ مولوی جمیل کی یہ جرأت کہ بھرے مجمع میں میرے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ میرا دماغ غصے سے پھٹنے والا ہو گیا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مولوی جمیل بہادری سے اپنی جگہ پر ڈٹے تھے۔ ان کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی خوف نہ تھا۔ آج مجھے مولوی جمیل کے قتل سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میں نے دیوانوں کی طرح خنجر ڈھونڈا اور ان پر حملے کے لیے دوڑا۔ بہت سے لوگوں نے مجھے روکا۔ کچھ لڑکے میرے گھر کی طرف دوڑے تاکہ بابو جی کو بلایا جائے۔ میرے سر پر خون سوار تھا میں نے خنجر سے زوردار حملہ کر دیا جو مولوی صاحب کے بازو میں جا لگا۔ خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ مجھے ابھی بھی تسلی نہ ہوئی تھی میں خنجر ان کے سینے میں اتارنے والا تھا کہ بابو جی نے مجھے روک لیا۔

"بابو جی مجھے نہ روکیں۔ گاؤ ماتا کی سوگند کہ آج یہ میرے ہاتھ سے نہیں بچے گا!" میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دھیرج رکھ دھیرج۔ یہ پاپی مسلے برباد ہوں گے!" بابو جی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مار کمینے مار رک کیوں گیا۔ میرے لیے فخر کی بات ہو گی کہ تجھ جیسے بدبخت کے ہاتھوں سے مر کر جام شہادت نوش کر جاؤں اور تو ان شاء اللہ کتے کی موت مرے گا!"

مولوی جمیل شیر کی طرح دھاڑ رہے تھے۔ خون ان کے بازو سے مسلسل بہہ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

میری شدت پسندیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ جمعے کے دن مسلمانوں کو ستانے کا بہت مزا آتا تھا۔ انہیں جمعہ کی جلدی ہوتی۔ اضطراب ان کے چہرے سے عیاں ہو رہا ہوتا تھا۔ جس کو دیکھ کر مجھے دلی سکون ملتا... عین جمعے کے وقت ڈھول بجانا شروع کر دیتا۔ لوگ مجھ سے ڈرتے تھے۔ اس لیے کوئی جوابی کارروائی نہ کرتا۔ مولوی جمیل کی مسجد کے پاس شور شرابے کا تو الگ ہی مزا ہوتا تھا۔ وہ پہلے تو کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے پھر دعا کے وقت یہ دعا مانگ کر جوابی حملہ کرتے۔

"اے اللہ دشمنان اسلام کو نیست و نابود کر، ان کا منہ کالا کر، ان کو خاک میں ملا دے!"

یہ الفاظ میرے کانوں میں اترتے تو دماغ میں ایک دھماکا سا ہو جاتا... میں نفرت سے مندر کی گھنٹیاں بجانا شروع کر دیتا۔ اس وقت تک بجاتا رہتا جب تک خطبہ ختم نہ ہو جاتا۔ کئی دفعہ تو اس شدت سے گھنٹیاں بجاتا کہ میرے ہاتھ خون و خون ہو جاتے۔ مگر مسلمانوں کے لیے نفرت کا سیلاب رکنے کا نام نہ لیتا...

بابو جی میرے ہاتھوں سے خون بہتا ہوا دیکھتے تو تڑپ جاتے اور کہتے "روشن کا ہے کو خود کو جوکھوں میں ڈالتا ہے۔ کیوں اپنا لہو بہاتا ہے لہو تو ان پاپی مسلوں کا بہنا چاہیے۔ بھگوان کی کرپا سے یہ برباد ہوں گے تو دیکھنا کیسے ہندوستان کے گلی کوچوں میں ان کا خون بہے گا تو چنتا نہ کر!" بابو جی میری نفرت کو جانتے تھے۔

☆ ☆ ☆

میری شرپسندیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ مسلمانوں کا کوئی مذہبی تہوار تھا۔ عید کا سماں تھا۔ گلی کوچوں اور مسجدوں کو دلہن کی طرح سجایا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ محفل میلاد کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ میرے وہ دن بہت عذاب میں گزر رہے تھے۔ جگہ جگہ دیواروں پر رنگین کاغذات لگائے جا رہے تھے۔ گلیوں، بازاروں میں لگی ہوئی سجاوٹ کی چیزوں کو میں توڑ پھوڑ دیتا۔ دیواروں پر لگے مقدس اوراق پر روشنائی پھینک دیتا۔ ایک دن ایسے ہی دیواروں پر سے کاغذ پھاڑ پھاڑ کر

پھینک رہا تھا کہ "محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" لکھا ہوا نظر آیا۔ میں نہ تو نام جانتا تھا نہ ہی ان کی شان۔ میں نے پھاڑنے کا ارادہ کیا تھا کہ میرے ہاتھ کانپنا شروع ہو گئے۔ دل پہ عجیب سی وحشت طاری ہو گئی میں گھبراہٹ کے عالم میں وہیں زمین پر بیٹھ گیا... میرا ایک ساتھی بھی میرے ساتھ مصروف تھا۔ میں نے اسے اشارے سے منع کر دیا کہ اس نام کو نہ پھاڑے، مگر وہ شاید میری بات صحیح طور پر سمجھ نہ سکا وہ پھاڑنے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ میں نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا۔ وہ حیران ہو کر مجھے دیکھتا رہ گیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا؟

مسلمانوں کا مذہبی تہوار "عید قربان" کا موقع تھا۔ اس پر تو ہندوؤں کی کینہ پروریاں مذہبی تنگ نظری عروج پر ہوتی تھی۔ راجہ کے دربار میں ہر پل بحث مباحثہ جاری رہتا کہ مسلمانوں پر پابندی لگوائی جائے کہ وہ گائے کی قربانی نہ کریں میں بھی اس احتجاج میں پیش پیش تھا۔

مسلمانوں نے بہت احتجاج کیا اس پابندی کے خلاف مگر ان کی ایک نہ چلی۔ میں گلیوں، بازاروں میں پھر رہا تھا۔ مسلمانوں کی بے بسی سے خوب مزا لے رہا تھا کہ میری نظر مولوی جمیل پر پڑی وہ بہت رعب سے قربانی کے لیے گائے لے کر مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ گائے کی قربانی پر پابندی کے باوجود مولوی جمیل کی یہ جرأت مجھے برداشت نہ ہوئی میں خنجر لے کر ان کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

"خبردار اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو گاؤ ماتا کی قسم! تیرے شریر کے اتنے ٹکڑے کروں گا کہ تمام مسلے گائے کی قربانی سے خوف کھائیں گے!"

"تو کون ہوتا ہے مجھے روکنے والا میرا مذہب اس کی قربانی کی اجازت دیتا ہے۔ تو کیا سارا ہندوستان بھی میرے خلاف اکٹھا ہو جائے تب بھی میں اس کی قربانی ضرور دوں گا۔" مولوی جمیل مضبوط لہجے میں بولے۔ میں ابھی ان کی ہٹ دھرمی پر تاؤ کھا رہا تھا کہ مجمع سے زوردار نعرہ بلند ہوا "نعرہ رسالت"

میرے دل پر عجیب سی وحشت طاری ہو گئی۔ دماغ ماؤف ہو گیا۔ اور ہاتھ کانپنے لگا کہ خنجر میرے ہاتھ سے گر گیا۔ پتا نہیں کیوں میں اس نعرے کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا کہ میرا ضدی، جنونی ہندو کچھ نہیں کر پاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

میرے شب و روز اسی طرح مسلمانوں کے ساتھ شرپسندیوں میں گزر رہے تھے۔ راجہ کی مجھے مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ ایک دن فجر کی اذان کے وقت میری آنکھ کھل گئی۔ مولوی جمیل بہت سرور سے اذان دے رہے تھے۔ مجھے مولوی کی گائے والی ہٹ دھرمی یاد آ گئی...

یکایک مجھے مولوی جمیل پر سخت غصہ آیا میں چھلانگ مار کر بستر سے اترا اس کا کام تمام کر کے آؤں گا!"

میں غصے سے کھولتا ہوا مسجد کی جانب بڑھا، میرے ہاتھ میں خنجر تھا۔ مسجد کے ساتھ مولوی جمیل کا گھر بھی تھا۔ غصے کے مارے میرا دماغ کھول رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو رہی تھی میں نے دروازے پر زوردار دستک دی۔ مگر کسی نے دروازہ نہ کھولا اب کی بار میں نے اتنی زور سے دستک دی کہ لگتا تھا کہ دروازہ ہی ٹوٹ جائے گا کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور جو منظر میں نے دیکھا پھر اس کے بعد کچھ دیکھنے کی خواہش نہیں رہی تھی۔

دروازہ جس لڑکی نے کھولا تھا وہ چاند کا ٹکڑا تھی۔ میں اسے مبہوت تکے جا رہا تھا۔ وہ پری چہرہ جس کی ستارہ آنکھیں کاجل سے سجی تھیں۔ سیاہ رنگ کے لباس میں اس کی سرخ و سفید رنگت دمک رہی تھی۔ اس نے سیاہ آنچل سے چہرہ چھپا رکھا تھا۔ جیسے بدلی میں چھپا چاند۔ کلائیوں میں سجی چوڑیاں جیسے ناز کر رہی تھیں کہ وہ کس کی کلائی میں ہیں۔ میں اس پری پیکر کو دیکھ کر ہوش کھو بیٹھا تھا۔

"کون ہے؟" وہ دروازے کی اوٹ میں سے بولی۔

میں کیا جواب دیتا میں تو اس کی دلکش آواز کے سحر میں قید ہو گیا تھا۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟" وہ پری پیکر میری خاموشی پر پھر بولی۔

"اوئے بدبخت تو یہاں کیوں کھڑا ہے؟" مولوی جمیل کی تیز آواز پر سارا سحر ٹوٹ گیا تھا۔ میری زبان پر تو جیسے تالا لگ گیا تھا۔ خنجر تو میرے ہاتھ سے کب کا گر چکا تھا۔

"سارا دن شرپسندی سے پیٹ نہیں بھرتا جو منہ اندھیرے بھی چلا آیا ہے!" مولوی جمیل نے نفرت سے کہا۔ مولوی جمیل نے مجھے یوں بت بنے دیکھا تو مجھے بازو سے پکڑ کر دھکا دیا۔ وہ بھی میری غیر معمولی خاموشی پر حیران تھے۔

"قمرالنساء! دروازہ کھولو!" مولوی جمیل نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہی پری پیکر پھر دروازے پر تھی۔ میں نڈھال سا گھر لوٹ آیا۔ وہ لڑکی تو میرے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ میں تو بہت بددماغ تھا مگر پھر بھی کسی عورت کی طرف نظر نہ اٹھا کر دیکھتا خواہ وہ کسی بھی مذہب کی ہوتی۔ مگر اب یہ حال تھا کہ وہ لڑکی ہی صرف میرے خیالات میں تھی۔ باقی سب پس منظر میں چلا گیا تھا۔

صبح گھومتا پھرتا مسجد کی جانب چل دیا۔ یہی سوچ کر کہ شاید اس کا دیدار پھر نصیب ہو جائے۔ میں گم صم سا پھر رہا تھا۔ کہ مولوی جمیل میرے قریب سے گزرے وہ میری خاموشی پر چوٹ کرتے ہوئے بولے۔

"کتے کی دم سیدھی ہوتی دیکھی تو نہیں!"

میں ان کی بات پر بالکل خاموش رہا تھا نا جانے آج مجھے غصہ کیوں نہیں آیا تھا۔ شام کو اس کے دیدار سے محروم بوجھل دل اور شکستہ قدموں کے ساتھ گھر آ گیا۔

"روشن! کیا ہوا ہے؟" بابو جی میری حالت پر تشویش بھری آواز میں بولے میں چپ رہا تھا نہیں کیا بتاتا۔

"کچھ کھایا پیا بھی نہیں سارا دن کہاں رہے ہو؟" بابو جی ہنوز پریشان تھے۔

"مجھے بھوک نہیں ہے آپ چنتا نہ کریں!" میں کہہ کر باہر آ گیا۔

باہر آ کر صحن میں لیٹ گیا۔ ہر سو چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں چاند کو تکے جا رہا تھا۔ وہ چاند سے بھی زیادہ حسین تھی۔ اس کا نام "قمرالنساء" بالکل صحیح رکھا تھا۔

وہ چہرہ میری نگاہوں کے سامنے بار بار آ جاتا تھا۔ بہت بار کوشش کرتا کہ اس کو بھلا کر آنکھیں بند کر لوں مگر سونے کی کوشش ناکام ہو جاتی نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ فجر کی اذان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ آج مولوی جمیل کی آواز پر غصہ نہیں آ رہا تھا۔ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنی حالت پہ مجھے رونا آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

دو دن اسی طرح آوارہ گلیوں میں پھرتا رہا۔ وہ مجھے پھر نہیں نظر آئی تھی۔ میں بے چین سا رہنے لگا تھا۔ پاگلوں کی طرح مسجد کے ارد گرد پھرتا رہتا تھا۔ اس رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ میرا دل گھر میں بالکل نہیں لگ رہا تھا۔

"روشن! بیٹا کیا بات ہے؟" بابو جی جانے کب سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"کک... کچھ نہیں...!" میں ایک دم گھبرا گیا۔

"پھر... یوں کیوں بیٹھا ہے؟" وہ پریشان سے تھے۔

"بس بابو جی... میں باہر جا رہا ہوں؟" میں ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے کھوج رہے تھے۔ میرے من کی بات جاننا چاہتے تھے۔ جو میں انہیں نہیں بتا سکتا تھا کہ مجھے ایک مسلے کی بیٹی سے پیار ہو گیا ہے۔ وہ مسلے جن کے ہم خون کے پیاسے تھے۔ راستے میں ہی ہلکی سی بارش شروع ہو گئی۔ میرے قدم بے خودی میں قمرالنساء کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ بارش میں بھیگتا میں اس کے گھر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے گھر کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں ذرا فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ کھڑکی میں کوئی کھڑا تھا۔ وہ ـــ وہ قمرالنساء ہی تھی۔ وہ بھی بارش سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ قمرالنساء کو دیکھ کر میری جان میں جان آ گئی تھی۔ وہ اپنا مہندی سے سجا ہاتھ باہر نکالتی اور پھر بارش کے قطروں سے لطف اٹھاتی۔ اس کے حسین چہرے پر انتہائی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ اس کے بالوں کی شریر لٹ بار بار اس کے چاند سے چہرے کو چھوتی... وہ بہت نزاکت سے اس کو ہٹاتی۔

پھر اچانک ہی کسی کی آواز آئی تھی اور اس نے مجھ پر نگاہ ڈالی شاید کسی نے اسے میری موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی بند کر لی۔ اس کی ایک نظر سے ہی میں خوشی سے نہال ہو گیا تھا جیسے ایک نظر کی تمنا ہی تو تھی۔

اب تو میری زندگی کے شب و روز قمرالنساء کی یاد میں گزرتے تھے۔ کئی دفعہ مجھے اپنے آپ پر بے حد غصہ آتا کہ محبت ہوئی بھی تو کس سے مولوی جمیل کی بیٹی سے۔ بہت دفعہ قمرالنساء کے سحر سے نکلنے کی کوشش بھی کرتا مگر ہار جاتا۔

"روشن تجھے مولوی جمیل کو ستانے کی سزا ملی ہے۔" دل مجھے سرزنش کرتا۔

"روشن تجھے مولوی کی بددعا لگ گئی ہے...!" دل دہائی دیتا۔

مگر محبت کے سامنے کس کا بس چلتا ہے... میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں اپنا دکھ بھی کسی کو بتا نہیں سکتا تھا کہ مجھے کسی مسلمان لڑکی سے محبت ہو گئی ہے اور وہ بھی مولوی جمیل کی بیٹی سے...

میں اپنی خاموش محبت کو دل میں چھپائے قمرالنساء کے گلی کوچوں میں پھرتا رہتا۔ بہت دفعہ کوشش کرتا کہ پہلے جیسا روشن بن جاؤں "آزاد" لاپروا... اور محبت کی قید سے چھٹکارہ حاصل کر لوں۔ مگر یہ صرف میری غلط فہمی تھی "محبت اپنی قیدی کو اتنی آسانی سے کہاں آزاد کرتی ہے..."

یہ سوچ کر دوبارہ سے محبت کے عمیق گڑھے میں گر جاتا...

میرے دوست اور بابو جی ماتا جی سب میرے بدلاؤ کو محسوس کر چکے تھے۔ وہ مجھے اکثر جوش دلاتے کہ روشن چل آ مولوی جمیل کے ساتھ کوئی شرارت کریں بھگوان کی کرپا سے جل بھن جائے گا مگر میں ٹال جاتا۔

ایک دن میں بازار میں مولوی جمیل کو دیکھا وہ سودا سلف اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ مجھے ان کی مدد کرنی چاہیے۔ میں آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ سے سامان لینے لگا تھا کہ انہوں نے مجھے دھکا دے کر دور ہٹایا۔

"دور رہ بدبخت میں تو مر کے بھی تیرا احسان لینا پسند نہ کروں!"

میں خاموشی سے پلٹ آیا تھا۔ قمرالنساء کو دیکھے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ میری بے چینی عروج پر تھی۔ میں ادھر ادھر بلا مقصد پھر رہا تھا کہ میری نظر اپنے دوست پر پڑی جو مٹھائی کے ٹوکرے لے کر جا رہا تھا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ بہن کی شادی ہے۔ مولوی جمیل کے گھر مٹھائی دینے جا رہا ہوں۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا میں بھی اس کے ساتھ چل پڑا دروازہ قمرالنساء نے ہی کھولا تھا۔ چہرہ آنچل میں چھپائے وہ اس قدر عمدہ اخلاق سے بات کر رہی تھی کہ میں تو اس کا اور دیوانہ ہو گیا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی اس کی نظروں میں میرے لیے غصہ اور نفرت تھی۔

اس کی نفرت حق پر تھی میں اس کے باپ کو ستاتا تھا ان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ پھر کیسے اس کی نظروں میں میرے لیے محبت ہوتی...

دوست کی بہن کی شادی تھی میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں شرکت کروں مگر اس کے گھر والوں نے بہت اصرار کیا جسے میں ٹال نہ سکا تھا۔ میں گھر کے مختلف کاموں میں مدد کروا رہا تھا کہ لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز آئی نظر اٹھی تو سامنے "قمرالنساء" کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ میری موجودگی سے بے خبر تھی۔ آج اس کے چہرے پر نقاب نہیں تھا۔ وہ بے پناہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ سبز رنگ کے لباس میں اس کی دودھیا رنگت دمک رہی تھی۔ وہ مسکراتی تو یوں لگتا کہ جیسے

بہار آگئی ہو۔

اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کے چہرے پر ناگواری آ گئی اس نے فوراً" اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور شکایت کی کہ

"روشن سے کہو کہ سامنے سے ہٹ جائے!" میں سامنے سے ہٹ گیا مگر بہانے سے اسی کے قریب رہا۔

باورچی خانے سے اس کی باتوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ مہمانوں کو کھانا دینے میں مصروف تھی۔ میں بہانے سے باورچی خانے میں چلا گیا۔ میری اچانک آمد پہ اس نے گھبرا کر منہ دوسری طرف کر لیا۔

"روشن بھائی! کچھ چاہیے؟" قریب کھڑی لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں... وہ پانی مل جائے گا!" میری نظریں قمرالنساء پر تھیں۔

"قمرالنساء! روشن بھائی کو پانی دے دو!" وہ لڑکی بولی۔

قمرالنساء نے گھبراہٹ میں بنا دیکھے خالی گلاس میری جانب بڑھا دیا۔

اس کی اس حرکت پر میری ہنسی بے اختیار تھی۔ خوف سے اس کا ہاتھ تو پہلے ہی کانپ رہا تھا۔ میری ہنسی کی آواز سن کر گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"روشن بھائی آپ نے تو بے چاری کو ڈرا ہی دیا ہے!" وہ لڑکی پھر بولی۔ قمرالنساء گھبرا کے باورچی خانے سے بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

خوف زدہ تو اس نے مجھ سے ہونا ہی تھا۔ مولوی جمیل سے دن رات میرے ہنگاموں کے قصے جو سنتی ہو گی...

☼ ☼ ☼

رات کافی بیت چکی تھی۔ میری نظر قمرالنساء پر پڑی تو وہ پریشان کھڑی تھی۔ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ کیا مسئلہ ہے؟

"روشن بیٹا! اگر ہو سکے تو قمرالنساء کو اس کے گھر چھوڑ آؤ مولوی صاحب پریشان ہو رہے ہوں گے۔ گھر پر اس وقت کوئی اور موجود نہیں!" میرے دوست کی والدہ عاجزی سے بولیں قمرالنساء نے یہ سنا تو فوراً" انکار کر دیا۔

"ماں جی آپ فکر نہ کریں میں چلی جاؤں گی!" قمرالنساء کے لہجے میں واضح انکار تھا۔

"نہ بیٹا نہ میں یوں اکیلے نہ جانے دوں گی رات کا وقت ہے کوئی مسئلہ ہو گیا تو تمہارے باپ کو کیا جواب دوں گی۔ میری بات مان تو روشن کے ساتھ چلی جا!" ماں جی نے اصرار کیا میرا دل جو اس کے انکار پر بجھ سا گیا تھا۔ ماں جی کے اصرار پر کھل اٹھا۔ ماں جی کے اصرار پر وہ شدید ناگواری سے چل پڑی...

وہ مجھ سے چند قدم آگے آگے چل رہی تھی۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ بہت دفعہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی مگر ہمت نہ ہوئی۔ وہ میرے ساتھ آتو گئی تھی مگر مجھ سے خوف زدہ لگ رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں جتنا مرضی برا انسان ہوں مگر عورت کا احترام کرنا جانتا تھا پھر قمرالنساء تو میری محبت اور میرا عشق تھی۔ میں اس کے بارے میں برا کیسے سوچ سکتا تھا۔ اس کے لیے تو میری جان بھی حاضر تھی وہ اور میں خاموشی سے چل رہے تھے کہ اس کے پاؤں کی ایک پازیب کھل کے گر گئی۔ وہ بالکل بے خبر رہی تھی۔ میں نے جھک کر وہ پازیب اٹھالی پہلے سوچا کہ اسے دے دوں پھر خیال آیا کہ شاید یہی دوسری ملاقات کا بہانہ بن جائے۔ میں نے مسکرا کر وہ جیب میں ڈال لی۔ گھر پہنچ کر وہ چند لمحوں کے لیے رکی اور پلٹ کر مجھے دیکھا۔

"شکریہ!" اس کے لبوں سے سن کر میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔

میں گھر آیا تو رات کافی ہو چکی تھی۔ مگر میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اور پھر نیند کس کم بخت کو آتی تھی۔ آنکھیں بند کرتا تو اس کا چاند چہرہ میری نگاہوں میں سما جاتا۔ اس کی ایک ایک ادا دلنشین تھی۔ وہ پری پیکر جس کی ناگواری بھی مجھے عزیز تھی۔

اس کا خیال مجھے ایک انوکھا احساس بخش رہا تھا۔ میں نے جیب سے پازیب نکالی اور اسے دیکھتا رہا... اسے دیکھتے دیکھتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ صبح بابو جی کی آواز پر میری آنکھ کھلی۔

"اچھا تو میرے لاڈلے کی اداسی اور خاموشی کے پیچھے یہ راز تھا!" وہ محبت بھری مسکراہٹ سے بولے۔ میں حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ انہوں نے "پازیب" میری نظروں کے سامنے کر دی۔

"ارے بھئی شانتی سنتی ہو!" بابو جی نے ماتا جی کو پکارا۔

"کیا ہوا؟" وہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

بھئی اپنے لاڈلے کو محبت ہو گئی ہے!" بابو جی کے لہجے میں شرارت تھی۔ ماتا جی کی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ ان کی نگاہوں میں محبت تھی۔ میں نے خاموشی سے سر جھکا لیا تھا۔

"کون ہے وہ اپنی ماتا کو نہیں بتاؤ گے؟" ماتا جی میرے بال سہلاتے ہوئے بولیں۔ ان کے سوال پر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں ان دونوں کو کیا بتاتا کہ وہ لڑکی مولوی جمیل کی بیٹی ہے اور پنڈت نارائن کے لاڈلے سپوت کو ایک مسلمان لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔

میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ گھبرا گئے۔

"وہ جو کوئی بھی ہے میرے بیٹے کو پسند ہے تو مجھے بھی پسند ہے اس کے ماتا پتا کے بارے میں مجھے بتاؤ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں!" بابو جی نے کہتے ہوئے مجھے گلے لگا لیا۔

☼ ☼ ☼

شام کو پازیب جیب میں ڈالی اور اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ دل میں اسے ایک نظر دیکھنے کی خواہش مچل رہی تھی۔ مولوی جمیل کو دیکھا وہ کسی کام سے باہر جا رہے تھے مجھے سکون ملا اور دل میں ارادہ کیا کہ آج تو اس سے اپنے من کی بات کر کے رہوں گا۔ دروازے پر دستک دی دروازہ اسی نے کھولا۔

سفید لباس میں وہ کوئی حور لگ رہی تھی۔ میں اسے بے خودی سے دیکھتا جا رہا تھا۔

"کوئی کام ہے؟" وہ میری محویت پر ناگواری سے بولی۔

"نہیں... وہ... میں یہ پازیب دینے آیا تھا۔ کل رات راستے میں گر گئی تھی۔" اس کی نظروں میں حیرانی ابھری اور اس نے وہ پکڑ لی۔ دروازہ بند کر کے وہ جانے لگی تھی کہ اس کے یاقوتی لب بول اٹھے۔

"روشن آپ کا بہت شکریہ!" اس کے بولنے پر میں دم بخود رہ گیا تھا اس نے میرا نام لیا تھا۔ مجھے پکارا تھا۔ اس کی نگاہوں میں میرے لیے نفرت نہیں ممنونیت تھی۔ میں خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ خوشی سے بھاگتا ہوا مندر جا پہنچا۔ بہت دیر تک مندر کی گھنٹیاں بجاتا بھگوان کے سامنے سر جھکائے اپنی محبت کو پانے کی دعائیں مانگتا رہا۔

میں چاہتے ہوئے بھی اس کے سامنے اظہار محبت نہیں کر پا رہا تھا۔ اکثر یہ سوچ کر دل دہل جاتا کہ کہیں وہ کسی اور کی نہ ہو جائے۔ ایک دن دیوانوں کی طرح بازار میں پھر رہا تھا کہ کسی سے ٹکرا گیا غور کیا تو وہ لڑکی قمرالنساء تھی میں مبہوت دیکھتا رہ گیا۔

"اندھے ہو دکھائی نہیں دیتا!" میری محویت پر وہ غصے سے بولی۔

غصے میں بھی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔

"کیا کروں اب تو آپ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا!" میں بے خودی سے بولا۔

اسے توقع نہیں تھی کہ میں ایسی کوئی بات کروں گا میری بات پر وہ گھبرا کر جانے لگی تھی۔ کہ میں نے راستہ روک لیا۔

"قمرالنساء اگر آج بھی آپ نے میری بات نہ سنی تو میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گا!" میں اٹل لہجے میں بولا۔

میری بات پر وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ نقاب کے باوجود اس کی نگاہوں میں اضطراب ہلکورے لینے لگا تھا۔

"روشن! یہ کیا تماشا ہے اگر یہ ابا کے ساتھ کوئی

انتقامی کاروائی ہے تو تمہیں شرم آنی چاہیے!" کہتے ہوئے اس کی آواز بھیگ گئی۔

"نہیں نہیں قمرالنساء مجھے غلط نہ سمجھنے میں آپ سے محبت کرنے لگا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں۔" میں اس کے آنسوؤں پر تڑپ سا گیا۔

وہ چند لمحوں کے لیے بے یقینی سے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر نظریں چرا کر چلی گئی۔ میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایک دن تپتی دوپہر میں اس کے کوچے میں پھر رہا تھا کہ قمرالنساء اپنی گھر والوں کے ساتھ تانگے پر کہیں جا رہی تھی۔ میرے دل کو اندیشوں نے گھیر لیا وہ شہر چھوڑ کر جا رہی ہے کیا اس نے مولوی جمیل کو میرے بارے میں بتا دیا ہے کیا وہ یہاں سے دور جا رہے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں زہر کھا لوں گا میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی میں قمرالنساء کی پیر کی جوتی گر گئی تو تانگہ روکنا پڑا میں بھاگتا ہوا گیا جوتی یوں اٹھائی جیسے وہ میرے لیے متاع جاں ہو۔ قمرالنساء کی نگاہیں بھی مجھ پر تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں اسے پکڑاتا 'مولوی جمیل نے وہ میرے ہاتھوں سے چھین لیں۔

"بھئی کیا بات ہے کہ تم لوگ اپنی چیزیں بھی سنبھال نہیں سکتی خواہ مخواہ اس بدذات کا احسان لینا پڑا ہے!" وہ مجھے گھورتے ہوئے تنفر سے بولے۔

وہ جا چکی تھی۔ میں وہیں اس کے نقش پا دیکھتا رہ گیا تھا۔

پاس سے ایک بچہ گزرا میں نے اس سے پوچھا۔

سنو! یہ مولوی جمیل اور ان کے گھر والے کہیں جا رہے ہیں؟" میں اپنی بے چینی پر قابو نہیں پا سکا تھا۔

"نہیں.... وہ سب درگاہ پر گئے ہیں۔ شام تک واپس آجائیں گے۔" وہ بچہ کہہ کر چلا گیا۔ یہ سن کر میری جان میں جان آئی۔

شام تک وہیں بھوکا پیاسا اس کی راہ تکتا رہا۔ شام کو وہ لوگ واپس آئے۔ قمرالنساء نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ آج اس کی نظر میں غصہ اور نفرت نہیں تھی۔ بلکہ ہمدردی تھی۔ شاید اسے میری حالت پر ترس آگیا تھا۔ میرے لیے یہی بہت تھا کہ اس کی نگاہوں میں میرے لیے ہمدردی تو نظر آئی....

مولوی جمیل میرے قریب سے گزرے تو انتہائی ناگواری سے میری طرف دیکھا اور بڑبڑانے لگے۔

"پتا نہیں اب سازشی کے دماغ میں کیا چل رہا ہے جو یہاں دھرنا دیے بیٹھا ہے!"

ان کی اس بات پر میرا دل بھر آیا۔ اپنی بے بسی پر میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ دل تو چاہتا تھا کہ ہر بات کو نظرانداز کر کے یہاں سے چلا جاؤں مگر قمرالنساء کی محبت میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی۔ میں وہیں نڈھال سا بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد ایک بچہ آیا جس کے ہاتھ میں کھانا تھا۔ اس نے مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"قمر باجی کہہ رہی ہیں کہ کھانا کھائیں اور گھر چلے جائیں۔"

اپنے گھر میں شہزادوں کی طرح رہنے والا روشن جس کے آگے پیچھے باندیاں ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھیں۔ آج وہ قمرالنساء کے کوچے میں یوں بھکاریوں کی طرح بیٹھا محبت محبت پکار رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
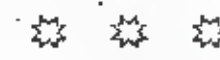
اس کے بعد وہ کافی دنوں تک مجھے دکھائی نہ دی۔ میری حالت پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ کسی ذریعے سے بھی اس سے مل نہیں سکتا تھا۔ مسلمان تو تھا نہیں کہ کسی نذر نیاز کے بہانے سے چلا جاتا۔ میں ہر روز اس کے گھر کے باہر کھڑا منتظر رہتا کہ کبھی تو وہ کھڑکی سے دیکھے گی....

ایک رات بہت طوفانی بارش ہو رہی تھی۔ میں اس کے گھر کے سامنے بیٹھا اس کی ایک جھلک کا منتظر تھا۔ بارش ہلکی ہوئی تو اس کے گھر کا دروازہ کھلا وہ قمرالنساء ہی تھی۔ اس کا رخ میری جانب تھا۔ میں اسے آتا دیکھ کر کھڑا ہو گیا وہ میرے قریب کھڑی تھی۔

قمرالنساء!" میرے لبوں نے اسے پکارا۔

"روشن یہ کیا پاگل پن ہے؟" وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"محبت پاگل پن کا ہی تو دوسرا نام ہے!" میں مسکرا کر آہستگی سے بولا۔

کیوں خود کو سزا دے رہے ہو۔ لوٹ جاؤ اپنی دنیا میں۔" قمرالنساء کی خوب صورت آنکھوں میں ہمدردی اُمڈ آئی۔

"قمرالنساء! میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے مگر محبت کے سامنے ہار گیا ہوں!" میں بے بسی سے بولا۔

"جانتے بھی ہو کہ تمہارے اور میرے درمیان کتنی دیواریں حائل ہیں!" قمرالنساء نے کہتے ہوئے رخ موڑ لیا۔

"میں تمہاری خاطر ہر دیوار گرا دوں۔" میرے لہجے میں مضبوطی تھی۔

مذہب کی دیوار گرا سکتے ہو؟" قمرالنساء نے ایک دم سوال کر ڈالا۔

میں چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گیا تھا۔

"مذہب....؟"

"تم ہندو ہو اور میں مسلمان۔" قمرالنساء کی ستارہ آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔

"میں مر تو سکتی ہوں مگر اپنے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتی۔" قمرالنساء کے لہجے میں چٹانوں کی سی مضبوطی تھی۔

"مذہب۔" میں اسی لفظ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ جب نظر اٹھائی تو وہ جا چکی تھی۔ قمرالنساء آج مجھے ایک نئی الجھن میں ڈال گئی تھی۔

میرا دھرم میرا سب کچھ تھا مگر قمرالنساء اس کے بارے میں سوچ کر مجھے سب کچھ بھول جاتا تھا۔ ساری رات اسی الجھن میں رہا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ساری رات سوچتا رہا کہ فجر کی اذانوں کا وقت ہو گیا.... میں بستر سے اٹھا اور مسجد کی طرف چل پڑا۔ مولوی جمیل مسجد کی صفائی کر رہے تھے۔

میں اپنی سوچوں میں گم مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑا ہو گیا۔

"اوئے دفع ہو یہاں سے 'بھاگ یہاں سے 'نجس نہ ہو تو 'نظر نہیں آرہا کہ میں اللہ کے گھر کو دھو رہا ہوں۔" مولوی جمیل حقارت سے بولے۔

"میں نجس ہوں تو آپ کر دیں مجھے پاک!" میں نے گھمبیر لہجے میں بولا۔

مولوی جمیل کی نظروں میں حیرت اور بے یقینی تھی۔

"کیا آپ کریں گے مجھے پاک؟" میں ان کی خاموشی پر پھر سے بولا۔

"جوتے اتار کر اندر آجاؤ!" میری بات پر ان کے چہرے اور آواز میں نرمی کی آمیزش تھی میں اندر چلا گیا۔

انہوں نے مجھے شلوار قمیص دی اور نہانے کا کہا۔ میں فارغ ہو کر آیا تو وہ میرے منتظر تھے۔

"مولوی صاحب! میں.... مسلمان ہونا چاہتا.... ہوں!" میں ہچکچایا۔

میری بات پر ان کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا۔ مجھے ان کی فراخ دلی اور اپنی تنگ نظریوں پر بے حد شرمندگی ہوئی۔ میری شرپسندیوں کے باوجود وہ مجھے دائرہ اسلام میں داخل کر رہے تھے۔ میرا یقین اسلام کی طاقت پر اور بڑھ گیا۔ جو کسی کو بھی دھتکارتا نہیں ہے بلکہ اپنی مہربان آغوش میں لے کر انسان کو پاک و صاف کر دیتا ہے۔

"تو پھر پڑھو.... "لا الہ الا اللہ....!" وہ جذب سے بولے۔

میں نے بھی ان کے پیچھے دہرایا۔

"محمد"!.... وہ مزید بولنے لگے تھے کہ میں بول پڑا۔

میری آنکھوں میں آنسو آگئے یہ نام۔

"ٹھہریے مولوی صاحب...."

یہ "محمد" کون ہیں؟" میں رہ نہ سکا تو پوچھ بیٹھا۔

یہی تو ہیں افضل البشر 'تمام انسانیت کی جان 'وجہ کون و مکاں 'رحمتہ العالمین 'محبوب خدا....! مولوی

جمیل کا جوش و خروش قابل دید تھا۔

"جیسے ہمارے رام جی؟" میں نے پوچھا۔

"ارے نہیں نہیں... ان جیسا دوسرا کوئی نہیں اور نہ ہی قیامت تک کوئی ان جیسا ہوگا یہ تمام انسانوں' انبیاء سے افضل ہیں۔ اخلاق' کردار اعمال میں ان جیسا کوئی نہیں اور اگر کوئی ان سے افضل ہونے کا دعوا کرے تو وہ جہنمی ہے۔"

محمد خدا نہیں
مگر خدا سے جدا بھی نہیں

مولوی جمیل جذب و سرور کی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں عقیدت و محبت سے آنسو آ گئے۔ میں دل و نظر کی عجیب کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اپنے پیدائشی مذہب کو چھوڑ کر جو میرے ماتا پتا کا مذہب تھا۔ اسے چھوڑ کر میں ایک نئے مذہب میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور پورے دل و جان سے کلمہ پڑھا۔ میرے کلمہ پڑھتے ہی مسجد میں نعرہ تکبیر اور نعرہ رسالت بلند ہوا۔

مولوی جمیل نے مجھے گلے لگالیا اور بولے۔

"روشن! آج سے تمہارا نام "عبدالہادی" ہے۔

"میں تمہارے قبول اسلام سے اس قدر خوش ہوں کہ بتا نہیں سکتا۔ اللہ تمہیں دین محمدی پر رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)"

میں دل میں اطمینان و سرور کو محسوس کر رہا تھا۔ دین اسلام کی سچائی میرے قلب پر اپنا اثر ڈال چکی تھی۔ میں کفر کے اندھیروں میں بھٹک رہا تھا۔

"ایک بات پوچھوں عبدالہادی اگر برا نہ مانو؟" مولوی جمیل کی آواز مجھے ہوش میں لے آئی تھی۔

"جی...!" میں ادب سے بولا۔

"آخر کس چیز نے تمہیں قبول اسلام پر مجبور کر دیا۔ تم تو اپنے مذہب میں بہت شدید تھے؟" میں پوری توجہ سے ان کی بات سن رہا تھا۔

میری نظر سامنے اٹھی قمرالنساء پردے میں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"مولوی صاحب! کسی کو اپنی محبت کا یقین دلانا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان مذہب کی دیوار حائل تھی۔ جو گرائے بغیر میں اپنی محبت کی سچائی نہیں ثابت کر سکتا تھا۔" میں نے کہتے ہوئے قمرالنساء پر دوبارہ نگاہ ڈالی۔

ان کے چہرے پر خوشی اور آنکھوں میں حیرت بھی تھی۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ میں اس کی محبت کی خاطر اپنا دھرم بھی چھوڑ دوں گا...

"میں اپنے قبول اسلام کی خبر تو پھیلانا چاہ رہا تھا' مگر مولوی جمیل کی ہدایت پر خفیہ رکھنا پڑا۔ اب میں رات کو مولوی جمیل کے ساتھ مسجد میں رہتا۔ قرآن و نماز سیکھتا' مسجد کی صفائی کرتا' وضو کے لیے پانی بھر کر رکھتا' مولوی جمیل کی خدمت کرتا' سب کاموں سے فارغ ہو کر رات دیر تک میں اور قمرالنساء باتیں کرتے رہتے ...پھر صبح کی نماز پڑھ کر گھر آجاتا...

☆ ☆ ☆

ایک شام مسجد جانے کے لیے نکلا تو راستے میں چوڑیوں کی دکان پر نظر پڑی۔ سرخ چوڑیاں قمرالنساء کی سفید کلائیوں میں بہت جچتی تھیں۔ سرخ رنگ تو جیسے قمرالنساء کے لیے بنا ہو۔ میں نے چوڑیاں چھپا لیں اور کرتے کی جیب میں چھپالیں۔ مسجد جا کر مولوی جمیل کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ رات کو جب قمرالنساء سے ملاقات ہوئی تو چوڑیوں کا خیال آیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو تڑپ کر باہر نکال لیا۔ سارا دن کام کے دوران چوڑیاں جانے کب ٹوٹ گئیں مجھے خبر نہ ہوئی تھی۔ کانچ انگلیوں میں چبھا تو خون بہہ نکلا۔ قمرالنساء میری حالت دیکھ کر بے چین ہوگئی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ فوراً" اپنے آنچل کا کونا پھاڑ کر میرے ہاتھ پر باندھنے لگی۔

اس کی نگاہوں میں میرے لیے محبت تھی۔ میری تکلیف پہ وہ تڑپ اٹھی تھی۔ میری لیے یہ احساس بہت خوش کن تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی تھی ...

کہاں اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے گھنٹوں مسجد

کے باہر بیٹھا رہتا۔ اب وہ ہر وقت میرے آس پاس رہتی تھی۔ وہ ایک باکردار اور نیک فطرت لڑکی تھی۔ وہ صورت اور سیرت میں باکمال تھی۔

گھر میں اسی ہندووانہ حلیے میں رہتا تاکہ کسی کو شک نہ ہو سکے۔ چھپ کے نماز پڑھتا۔ ماتا جی اور پتا جی میری تبدیلیوں کو محسوس کر رہے تھے مگر خاموش تھے۔

"ماتا جی! ایک بات پوچھوں!" میں ان سے لاڈ کرتے ہوئے بولا۔

"ارے آج تو اپنی ماتا پر بڑا پیار آ رہا ہے!" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

"اگر... مجھے کسی مسلمان لڑکی سے محبت ہو جائے تو کیا آپ اسے اپنی بہو سویکار کرلیں گی!" میں نے بڑی امید سے انہیں دیکھا۔

"روشن... یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟" ماتا جی میری بات پر دم بخود رہ گئیں۔

"ماتا جی... میں!" روشن کی آواز پر میں چپ ہو گیا۔

"روشن تو نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تیرا بیاہ کسی مسلے کی بیٹی سے کروں گا!" بابو جی نا جانے کب آئے تھے۔

"میں مر تو سکتا ہوں لیکن یہ گوارا نہیں کروں گا کہ میری بہو مسلمان لڑکی ہو!" بابو جی آگ بگولا ہوگئے۔

"پنڈت جی دھیرج رکھیے ابھی بچہ ہے سمجھ جائے گا۔" ماتا جی میری حمایت میں بولیں۔

"اسے اپنی زبان میں سمجھا دو شانتی کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" بابو جی کہہ کر چلے گئے میں بے حد نڈھال ہوا تھا۔ قمرالنساء کو پانے کے لیے ابھی اور کتنی منزلیں طے کرنا پڑیں گی۔ ایک دن کھانا کھا رہے تھے۔ میرے دل میں صرف قمرالنساء سے ملنے کی تمنا تھی۔ مجھے بھوک نہیں تھی میں الجھے ہوئے انداز میں بیٹھ گیا۔ اور بھولے سے "بسم اللہ" پڑھ کر منہ میں لقمہ ڈالا۔

"روشن!" بابو جی دھاڑے۔

"کک... کیا ہوا؟" میں ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگا۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں؟" بابو جی مجھے گھور رہے تھے۔

ان کے چیخنے پر مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کیا بھول ہوئی ہے۔

"روشن! بیٹا یہ تو کن کاموں میں پڑ گیا ہے؟" ماتا جی دل گیر لہجے میں بولیں۔

"کچھ نہیں ماتا جی وہ تو بس ایسے ہی...!" میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

مگر بابو جی مجھے غضب ناک نگاہوں سے گھور رہے تھے اس کے بعد انہیں مجھ پر شک ہوگیا تھا۔ وہ میری ہر حرکت پر نظر رکھنے لگے تھے۔

راجہ کے دربار میں جب بھی "دین محمدی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم" کے بارے میں گستاخانہ الفاظ استعمال ہوتے تو میں مضطرب ہو جاتا اور خاموشی سے اٹھ کر چلا جاتا... بابو جی میری ہر حرکت کا جائزہ لے رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

مولوی جمیل میری خدمت و فرماں برداری سے بہت خوش تھے۔ میں ان سے اکثر اپنے سابقہ رویے کی معافی مانگتا رہتا۔ وہ بہت اعلا ظرف انسان تھے۔ کبھی مجھے میرے ماضی کا طعنہ نہ دیتے۔ قمرالنساء کا شام کا معمول تھا وہ مسجد میں روشنی کے لیے چراغ تیار کر کے رکھ دیتی اور میں آ کر ان کو مسجد میں بنے طاقچوں میں رکھ آتا۔ اس شام بھی وہ چراغ تیار کر رہی تھی۔ میں موقع پا کر اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

چراغوں کی روشنی میں اس کا حسین چہرہ دمک رہا تھا ... باتوں کے دوران میری نظر اس کے آنچل پر پڑی۔ جس نے قریب ہی رکھے چراغ سے آگ پکڑلی تھی۔ میں نے اس کا آنچل دونوں ہاتھوں میں لے کر آگ بجھانے کی کوشش کی آگ تو بجھ گئی مگر دونوں ہتھیلیاں بری طرح جھلس گئیں۔ قمرالنساء خوف کے مارے روئے جا رہی تھی۔ مولوی جمیل کو خبر ملی تو انہوں نے محبت سے مجھے گلے لگالیا اور کہنے لگے۔

"عبدالہادی! تم نے میری بیٹی کی جان بچائی۔ میں

تمہارا احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔" میں گھر آگیا تکلیف تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔ مگر دل میں سکون بھی تھا کہ قمرالنساء محفوظ رہی تھی۔ میں خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا مگر تکلیف سے نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ میں بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتا۔

"کیا ہوا روشن سب ٹھیک تو ہے نا؟" ماتا جی میری بے چینی دیکھ کر اٹھ بیٹھیں۔

"کچھ نہیں... بس وہ...!" میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"کیا ہوا ہے تجھے نیند کیوں نہیں آرہی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تیری!" ماتا جی پریشان ہو اٹھیں۔

"کک... کچھ نہیں... آپ سو جائیں۔" میں نے تکلیف چھپانے کی بھرپور کوشش کی۔

"ارے یہ تیرے ہاتھ پر کیا ہوا... ہائے رام یہ تو چھالے ہیں۔" ماتا جی نے میرے ہاتھ تھام لیے مولوی جمیل نے مجھے جھوٹ بولنے سے منع کیا تھا۔ اس لیے میں نے صاف صاف بتا دیا کہ میں جس لڑکی سے محبت کرتا ہوں اس کو بچاتے ہوئے میرے ہاتھ جل گئے۔

ماتا جی نے میرے دونوں ہاتھ تھام کر چوم لیے اور کہنے لگیں۔

"روشن! اتنی محبت کرنے لگا ہے اس لڑکی سے کہ اپنے ہاتھ ہی جلا لیے۔" ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اگلے دن قمرالنساء سے ملاقات ہوئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ میرے ہاتھوں پر مرہم لگاتے ہوئے بولی۔

"عبدالہادی یہ کیا کیا تم نے میری تکلیف اپنے اوپر لے لی۔"

"قمرالنساء! میرے ہوتے ہوئے کوئی تکلیف تمہیں چھو کر بھی نہیں گزر سکتی۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔" میں عزم سے بولا۔

کچھ دنوں تک زخم بالکل ٹھیک ہو گئے۔ ایک دن ملاقات کے دوران قمرالنساء اداس سی تھی۔

"کیا ہوا تم خاموش کیوں ہو؟" میں نے پوچھا۔

میرے پوچھنے پر وہ رونے لگی۔

"کیا ہوا تم بولتی کیوں نہیں کوئی پریشانی ہے؟" میں فکرمندی سے بولا۔

"عبدالہادی... وہ دراصل کچھ لوگ مجھے دیکھنے کے لیے آرہے ہیں۔" اس نے بمشکل اپنی بات مکمل کی۔

میں اس کی بات تو سمجھ گیا مگر خاموش رہا تھا۔

"عبدالہادی... تم ابا سے شادی کی بات کرو نا... کہیں دیر نہ ہو جائے۔" قمرالنساء بھیگے لہجے میں بولی۔

"تم کس سے شادی کرنا چاہتی ہو۔" میں شرارت سے بولا۔

میرے سوال پر وہ میری طرف حیرانگی سے دیکھنے لگی۔ میری آنکھوں میں شرارت اور لبوں پر ہنسی تھی۔

"اچھا تو میری جان پر بنی ہے اور تمہیں ہنسی آرہی ہے جاؤ میں تم سے اب کوئی بات نہیں کروں گی۔" قمرالنساء اٹھ کر جانے لگی تھی کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

"اچھا ٹھہرو تو سہی... میرے ہنسنے کی وجہ نہیں پوچھو گی۔" میں ہنستے ہوئے بولا۔

وہ رک تو گئی مگر ناراضی کی وجہ سے میری طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔ غصے میں وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی۔

"اصل میں قمرالنساء! محبت کا اظہار ہمیشہ میری طرف سے ہوا تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ میرا جذبہ یکطرفہ تو نہیں آج پہلی بار تم نے اظہار کیا تو میں خوشی پر قابو نہ پا سکا۔" میں آہستگی سے بولا۔

قمرالنساء! یاد رکھنا تم صرف میری ہو۔ میرے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر سجدوں میں تمہیں رب سے مانگا ہے۔ میں جلد ہی موقع دیکھ کر مولوی صاحب سے بات کروں گا۔" میں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

اس نے میری طرف دیکھا تھا اب اس کی نگاہوں میں اطمینان جھلک رہا تھا۔

میں ان کی خوشی کے لیے کچھ بھی کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"عبدالہادی! میں تم سے بہت خوش ہوں تمہاری عبادت اور خدمت سے۔ عبدالہادی میں تمہارے لیے اپنے دل میں بے پناہ محبت رکھتا ہوں۔ عبدالہادی تم میرے بیٹے کی طرح ہو میں تم سے اس قدر خوش ہوں کہ تم جو مانگو گے میں دوں گا۔" مولوی جمیل مجھے گلے لگاتے ہوئے بولے۔

"مولوی صاحب! میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے آپ جیسا استاد ملا... اگر آپ...!" میں بات مکمل نہیں کر پایا تھا۔

"کیا ہوا بولو... میں تمہارے باپ جیسا ہوں۔" مولوی صاحب آبدیدہ ہو گئے۔

"تو پھر آپ مجھے اپنا بیٹا بنا لیں تاکہ میں ساری زندگی آپ کے قدموں میں رہوں!" میں دل کی بات زبان پر لے آیا۔

"تم میرے بیٹے ہی ہو عبدالہادی!" مولوی جمیل محبت سے بولے۔

"دراصل... وہ... میں" میں جھجکا۔

"گھبراؤ نہیں... کیا خواہش ہے تمہاری...!" مولوی جمیل نے تسلی دی۔

"مولوی صاحب... آپ میرا اور قمرالنساء کا نکاح کروا دیں میں ہمیشہ آپ کا ممنون رہوں گا۔" میں نے بالآخر دل کی بات کہہ ڈالی۔

مولوی صاحب کی آنکھوں میں چند لمحوں کے لیے حیرانگی ابھری اور پھر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

میں ان کی خاموشی پر اضطراب کا شکار ہو گیا قمرالنساء کا گلاب چہرہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ اگر مولوی صاحب نے انکار کر دیا یا قمرالنساء کی شادی کہیں اور کر دی تو کیا ہوگا۔ اندیشوں نے سکون برباد کر ڈالا تھا۔

☼ ☼ ☼

"روشن!" بابو جی کی تیز آواز پر میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کک... کیا ہوا؟" میں ناسمجھی سے بولا۔

"یہ کیا ہے؟" انہوں نے سوال کے جواب میں سوال کر ڈالا۔

میں نے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو سمجھ گیا وہ قرآن پاک دیکھ چکے تھے۔

"یہ سب کیا ہے روشن؟" وہ ابھی قہر آلود نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ میں جواب میں خاموش رہا تھا۔

"روشن! جو خطرہ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہیں وہ درست تو نہیں؟" بابو جی غصے سے دھاڑے۔

پہلے تو میرے دل میں خیال آیا کہ بتا دوں کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور میں اس کو ترک نہیں کروں گا۔ میں نے کون سا گناہ کیا ہے جو ڈروں یا چھپاؤں میں نے تو حق کا راستہ چنا ہے... مگر میں سر جھکائے ان کا بھاشن سنتا رہا۔

"روشن! اپنے پرکھوں کے مان اور مریادا سے بغاوت کرنے کی کبھی کوشش نہ کرنا۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو بھگوان کی سوگند میں بھول جاؤں گا کہ تم میرے اکلوتے بیٹے اور وارث ہو!" بابو جی غصے سے کہہ کر جا چکے تھے۔

☼ ☼ ☼

میں نے ساری بات جا کر مولوی جمیل کے گوش گزار دی۔ انہوں نے میری بات غور سے سنی اور بولے۔

"عبدالہادی! میں تمہاری شادی قمرالنساء سے کروانے کو تیار ہوں مگر تم دونوں کو یہ شہر چھوڑنا پڑے گا۔ قمرالنساء کو کوئی تکلیف پہنچے میں یہ برداشت نہیں کر پاؤں گا۔" مولوی جمیل سنجیدگی سے بولے۔

میں جو گم صم تھا۔ ان کی رضامندی کا جان کر خوش ہو گیا انہوں نے میرے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ میں اپنے خدا کا بے حد شکر گزار تھا۔

نکاح سے ایک رات قبل میں اور قمرالنساء بہت دیر

تک باتیں کرتے رہے۔ وہ بہت فسوں خیز رات تھی۔ چاند کی روشنی میں قمرالنساء کا حسن جگمگا رہا تھا۔ اس کی ستارہ آنکھیں مسکرا رہی تھی۔ لبوں پر خوشی اور اطمینان تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں منزل کے اتنا قریب پہنچ گیا ہوں۔ عشق لاحاصل ہوتا ہے مگر میں خوش نصیب تھا۔ جسے اپنا عشق حاصل ہو گیا تھا۔ قمرالنساء کی خوشی اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔

عصر کے وقت ہمارا نکاح تھا۔ میں دن میں بھی مسجد میں داخل نہیں ہوا تھا۔ ہمیشہ رات کے اندھیرے میں آتا تھا۔ شاید یہی غلطی میرا سب کچھ چھین کر لے گئی تھی۔

میں بہت خوش تھا۔ مولوی جمیل نے مسجد کا دروازہ بند کروا دیا تھا کہ تمام کام مکمل رازداری سے ہو۔ قمرالنساء دلہن بنی میرے پاس بیٹھی تھی۔ نکاح پڑھایا جا چکا تھا۔ مولوی جمیل نے ہمیں ڈھیروں دعائیں دیں۔

"عبدالهادی! بیٹا آج رات عشاء کی نماز کے بعد تم دونوں اس شہر سے چلے جانا کیونکہ یہاں تم دونوں کو خطرہ ہے۔" مولوی جمیل کو دھڑکا لگا تھا۔

مسجد کے باہر شور شرابے کی آوازیں بلند ہوئی تھیں۔ مولوی جمیل کے انداز میں اضطراب نمایاں تھا۔ مسجد کا دروازہ ڈنڈوں سے توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ قمرالنساء کی نگاہوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ میں نے اسے تسلی دی۔ شاید میرا راز کھل چکا تھا۔ مجھے مسجد میں آتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کر پاتا بہت سے ہندوؤں نے مسجد کا دروازہ توڑ دیا تھا۔ وہ بڑی تعداد میں اندر داخل ہو رہے تھے۔ ان کے پاس ڈنڈے اور ہتھیار بھی تھے۔

میں قمرالنساء کا ہاتھ پکڑ کر بھاگنے ہی لگا تھا کہ کسی بے رحم نے گولی چلا دی جو قمرالنساء کو لگی تھی۔ وہ خون میں لت پت میرے بازوؤں میں جھول گئی میں قمرالنساء کو جی بھر کر دیکھ بھی نہیں سکا تھا۔ اس کی کھلی آنکھیں میری طرف اٹھی تھیں۔ جدائی ہمارا مقدر تھی اور میں اس پر ابھی ماتم بھی نہ کر سکا تھا کہ زوردار ڈنڈا میرے سر پر لگا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔

اللہ اکبر... کی صدائیں فضا میں بلند ہو رہی تھیں۔ میری سماعت میں اذان کی آواز اتری تو میری آنکھ کھل گئی۔ میرے سر سے خون نکل رہا تھا اور درد کی شدت نے نڈھال کر دیا تھا۔ ہر طرف خون ہی خون بکھرا ہوا تھا۔ مولوی صاحب کے سب گھر والوں کو شہید کر دیا گیا تھا۔ قمرالنساء کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی۔ اس کا سرخ جوڑا اس کے خون سے آلودہ ہو چکا تھا۔ میں بھاگ کر مولوی جمیل کے پاس گیا ان میں کچھ جان باقی تھی وہ آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ میں نے اپنا کان ان کے منہ کے قریب کر دیا۔

"عبدالهادی! اللہ... کے... گھر کو... ویران... نہ ہونے دینا!" مولوی جمیل جام شہادت نوش کر چکے تھے۔

میرے محسن بھی مجھے چھوڑ کر جا چکے تھے۔

مجھے مسجد کی چھت پر شور شرابا محسوس ہوا۔ میں گرتا پڑتا اوپر گیا تو دیکھا ایک ہندو مسجد کا گنبد توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے خنجر کا وار کر کے اسے ختم کر دیا۔

میں نے با آواز بلند یہ اعلان کر دیا کہ میں نے دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم قبول کر لیا ہے اگر ہے کسی میں ہمت تو اس مسجد کو گرا کے دکھائے۔ میں نے وضو کیا اور اذان دی۔

قمرالنساء کا خون میں لت پت چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا میرے دل غم سے پھٹنے لگا۔ دل چاہا سب کچھ چھوڑ کر بھاگ جاؤں، خود کو ختم کر لوں۔ اس زندگی کا کیا فائدہ جس میں قمرالنساء نہیں تھی۔ مگر جب محمد رسول اللہ... پہ پہنچا تو آنسوؤں کا سیلاب تھا جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اذان دے کر میں وہیں بیٹھ کر رونے لگا۔ میرا دل غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ مجھے مولوی جمیل کا وہ شعر یاد آنے لگا۔ جو وہ اکثر پڑھا کرتے تھے۔

گر جیتا ہے عشق میں تو لازم یہ شرط ہے
کھیلو اگر یہ بازی تو ہر چیز ہار دو

مولوی عبدالهادی خاموش ہو چکے تھے۔ آنسوؤں سے ان کا چہرہ تر تھا۔ روشن سے لے کر عبدالهادی تک کا سفر اس قدر حیرت انگیز تھا۔ عشق و محبت کی بے شمار منزلیں تھیں۔ عشق مجازی نے عشق حقیقی کا سفر اپنی جان دے کر طے کیا تھا۔

میں نے اب سمجھا... چچا کی ضد کو "نکاح عبدالهادی سے پڑھواؤں گا" مجھے اس کا جواب مل چکا تھا۔

"ایک بات پوچھوں اگر آپ برا نہ مانیں تو؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں پوچھو!" عبدالهادی کی آنکھیں ابھی تک بھیگی تھیں۔

"آپ نے دوبارہ شادی کیوں نہیں کی؟" میں بولا۔

"نہیں... مجھے پھر اس کی طلب ہی نہیں ہوئی... ویسے بھی انسان محبت زندگی میں کئی بار کر لیتا ہے۔ مگر عشق تو ایک بار ہی ہوتا ہے۔ اور جس طرح قمرالنساء مجھ سے بچھڑی تھی میں تو تصور میں بھی اس کی جگہ کسی کو نہیں دے سکتا...

میرا عشق مجازی مجھے عشق حقیقی کا پتا بتا گیا تھا۔ تو پھر میں کیوں بھٹکتا پھرتا ادھر ادھر۔ میں ان خوش نصیبوں میں سے ہوں جنہیں موت سے پہلے حقیقی منزل کا پتا مل گیا ہے۔ اپنے حبیب کے صدقے میں اس ذات پاک نے میرے اندھے دل کو روشن کر دیا تھا۔ پہلے تو صرف میں نام کا "روشن" تھا۔ مگر اصل روشنی میں تو اب آیا ہوں۔ اس عشق حقیقی کی منزل کو طے کر کے۔ کفر کے اندھیروں سے نکل کر اسلام کی روشنی سے میرا وجود منور ہو گیا ہے۔

☆ ☆

مکمل ناول

بعض اوقات انسان جانتے بوجھتے اپنے پیروں پہ خود کلہاڑی مارلیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن جانے میں نہیں انجانے میں۔ اپنے ہاتھوں وہ اپنی زندگی کھو بیٹھا تھا۔ عجب یہ ہوا کہ اپنے ہی سامنے اپنی زندگی کو گھٹتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ سسکتا دیکھ رہا تھا۔

راکنگ چیئر پہ بیٹھا وہ چین اسموکنگ کر رہا تھا۔ پوری رات اس کی ان ہی خیالوں میں گزر گئی تھی۔ باہر گرج چمک کے ساتھ دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ساری رات اسموکنگ سے کالے پڑ چکے تھے۔ اس کا ذہن الجھنوں کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔

موبائل کی ٹون پر اس کی سرخ نگاہیں گھڑی کی طرف گئیں رات کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھایا۔ ڈاکٹر اکبر کالنگ لکھا آ رہا تھا۔

"ہیلو..." اسے اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی سنائی دی۔ ڈاکٹر اکبر نے اسے زندگی کی نوید سنائی... وہ جو ڈگمگا رہا تھا۔ یک دم ہی اک فیصلے پر تھم گیا اس نے پرسکون ہو کر گہری سانس لی گاڑی کی چابی اٹھائی اور کمرے سے نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"واو... نائس وہ دونوں لائبریری میں بیٹھی ایک دوسرے کی ڈائیگرام پر تبصرے کر رہی تھیں۔ "روشانے مجھے بھوک لگی ہے بس اب بند کردو یہ۔"

امایہ نے اپنی گلابی مخروطی انگلیوں سے کنپٹیاں دبائیں اور سر کو دائیں بائیں ہلایا۔

"اوکے چلو۔" روشانے کتابیں سمیٹتی کھڑی ہوئی تو وہ بھی کرسی گھسیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"سر احمر کو آمنہ کی اتنی انسلٹ نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"اس کی حرکتیں بھی تو دیکھو آوٹ آف کنٹرول ہوتی جا رہی تھیں' اگر ایک استاد اگنور کر رہا ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ بندہ سر ہی چڑھ جائے۔" دونوں باتیں کرتی کینٹین آگئیں۔

"بہرحال مجھے بہت دکھ ہوا۔" امایہ کہتی ہوئی کرسی پر بیٹھی۔

"تم تو ویسے ہی ہر بات کو دل پہ لے لیتی ہو امایہ چڑیا جتنا دل ہے تمہارا۔ تمہاری اسی بزدلی کی وجہ سے تمہاری تائی جان تمہیں دباتی ہیں۔" روشانے نے آرڈر دینے کے ساتھ ہی اس کی کلاس بھی لی۔

"کیا کروں یار میرے حالات نے مجھے ایسا بنا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے ماما آج زندہ ہوتیں تو میں ایسی نہ ہوتی" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بول رہی تھی۔ "رات میں تائی جان کے بھائی پھر واپس آگئے ہیں اور تمہیں معلوم ہے نا ان کی نظریں... تائی جان نے پھر ان کے کمرے میں دودھ لے جانے کا کہا۔ میں نے اگنور کر دیا۔ صبح انہوں نے ناشتے کی ٹیبل پر سب کے سامنے میری کلاس لی..." اس کے آنسو چہرہ بھگونے لگے۔

روشانے کو افسوس ہوا اس نے یہ موضوع چھیڑا ہی کیوں۔

"ریلیکس یار" اس نے امایہ کا ہاتھ دبایا "ہمیشہ وقت ایک جیسا نہیں رہتا اور تم جیسی معصوم اور پاکیزہ لڑکی کے لیے دیکھنا بہت سارے خوشیوں کے دروازہ کھلیں گے۔"

"آمین" امایہ نے دل سے کہا اور آنسو پونچھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"روہان بیٹا یہ کوفتے تو لیے نہیں آپ نے....." مرینہ آنٹی نے ڈاکٹر روہان کے آگے ڈش کی۔

"ماما' روہان ہیوی ڈائٹ نہیں لیتے یہ تو پھر بھی انہوں نے آپ کے اصرار پہ اتنا چکھ لے لیا۔ کیوں روہان ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔" ڈاکٹر دلنشین نے ایک ادا سے اپنے بال جھٹکتے ہوئے کہا۔

"آں ۔۔۔ ہاں۔" ڈاکٹر روہان نے نیپکن سے چہرہ صاف کیا۔

"میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔"

"ارے چائے پی کے چلتے ہیں مما کے کک بہت اچھی چائے بناتے ہیں۔

آئیں وہاں چل کے بیٹھتے ہیں۔ "امان کی کیا کنڈیشن ہے اب۔"

ناٹ گڈ اس کے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس کی شادی کر دی جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ سیٹ ہو جائے لیکن میرے نزدیک یہ آنے والی لڑکی پہ ظلم ہو گا۔" ڈاکٹر روہان اس کے ہاتھ سے چائے کا مگ تھامتے ہوئے بولے۔

"بٹ روہان غریب طبقے میں ایسی لڑکیاں مل جائیں گی جو انہیں سنبھال لے۔"

"لیکن آنے والے کے بھی تو کچھ جذبات احساسات ہوں گے لڑکی تو لڑکی ہی ہوتی ہے نا..... امیر ہو یا غریب نازک احساسات رکھنے والی....." دلنشین کو اس کا لڑکیوں کو فیور دینا سخت زہر لگ رہا تھا۔

"پھر بھی نچلے طبقات میں ایسی ہزاروں لڑکیاں ہوتی ہیں جو کہ صرف ہر پیسے پر پیسے کو اہمیت دیتی ہیں۔ آپ ڈاکٹرز کی بات کو اگنور نہ کریں۔"

"رسک ہو گا یہ۔"

"رسک لینا پڑے گا یہ روہان۔ اس کے بنا کوئی چارہ بھی نہیں۔"

"ہوں ۔۔۔ دیکھتے ہیں۔ ماما سے بات کرتا ہوں۔" وہ کہتا ہوا کھڑا ہوا تو دلنشین بھی اپنا شولڈر بیگ لٹکاتی اس کے پیچھے چل دی۔

☆ ☆ ☆

"تائی امی ڈرائیور فارغ ہے..... مجھے روشانے کے گھر جانا ہے؟" امایہ نے جھجکتے ہوئے طوبیٰ بیگم سے پوچھا۔

حالانکہ بابا بڑے بابا کو آدھا خرچا بھجواتے تھے لیکن ہر چیز پہ قبضہ طوبیٰ بیگم کا تھا۔ ہر ہر چیز کو استعمال کرنے کے لیے طوبیٰ بیگم سے اجازت لینی پڑتی۔

"بی بی اپنے لچھن درست کر لو۔ دوستوں کے گھر' کبھی سیر سپاٹے' کبھی یونیورسٹی کے نام پہ گھومنے پھرنے جانا۔ میری فرح کو دیکھا ہے مجال ہے جو بھی بلا وجہ گھر سے نکلی ہو؟" طوبیٰ بیگم نے مبالغہ آرائی کی حد ہی تو کر دی تھی۔

امایہ تو صرف آنکھوں میں سرمہ ڈالے رکھتی تھی جبکہ تائی امی کی فرح فل میک اپ کر کے الٹے سیدھے فیشن کر کے باہر نکلتی تھی۔ نہ جانے کیسے وہ تائی امی کی آنکھوں میں دھول جھونکتی تھی یا تائی امی سامنے دیکھنے کے باوجود آنکھیں بند کیے رکھتیں۔ شاپنگ کے نام پر ہوٹلنگ۔ سہیلیوں کے نام پر دوست اور بھی نہ جانے کیا کیا.....

تائی امی کے خاموش ہوتے ہی وہ آنسو پیتے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

اظہار احمد اور ابرار احمد دو ہی بھائی تھے۔ کرنل افتخار منان کے بیٹے۔ کرنل افتخار منان کے بہت ہی ارمانوں سے بنائے بیت السکون میں رہتے تھے۔ اظہار احمد کے چار بچے دو بیٹے نبیل' عدیل اور فرح اور دعا دو بیٹیاں تھیں۔ جبکہ ابرار احمد کی ہمسفر فرجین ان کے ساتھ زندگی کے سفر میں بہت کم ساتھ دے سکیں امایہ محض تین برس کی تھی اچانک برین ٹیومر میں انہیں داغ مفارقت دے گئیں۔

فرجین کی یادیں ابرار احمد کو چین نہ لینے دیتیں وہ امایہ کو طوبیٰ بیگم کے حوالے کر کے اپنے دوست کے پاس فرانس شفٹ ہو گئے۔ امایہ کو اپنی ماں کی شبیہہ یاد نہ تھی۔ کبھی یاد کرنے کی کوشش بھی کرتی تو طوبیٰ بیگم کی خوفناک شبیہہ نظر آ جاتی۔

وہ کیسے بزدل نہ ہوتی۔ اسے جب چوٹ لگتی تو اسے سینے سے لگانے والا کوئی نہ تھا۔ تیز بارشوں میں جب ہوائیں چلتیں اسے لگتا کہ چڑیلیں چیخ رہی ہیں۔ وہ ڈر کر کمبل میں منہ چھپا لیتی۔

رات بے رات جب نیند نہیں آتی کوئی اسے تھپک کر لوری دینے والا نہ تھا۔ تائی امی تین وقت کا کھانا انالی کے ہاتھ رکھوا دیتیں۔ روز کمرے میں دودھ بھجوا دیتیں۔ پر یہ نا دیکھتیں کہ دودھ کا گلاس کبھی انہیں خالی نہ ملا۔ جیسا بھیجتیں ویسا ہی بھرا ملتا۔ اس کی اسکول کی کتابیں ہر سال نئی مل جاتیں۔ تین چار سال بعد کسی عید پر باپ کی شکل بھی دیکھنے کو مل جاتی۔ لیکن وہ وقت ہوتا بہت حسین تھا۔ جب تائی امی اس کے آگے پیچھے پھرا کرتیں اس کے نخرے اٹھاتیں۔ اور لازمی تھا کہ باپ کے آتے ہی وہ بیمار پڑ جاتی۔ شاید یہ قدرت کی طرف سے تھا کہ عام دنوں میں اگر بیمار پڑتی تو خدمت کرنے والا کون ہوتا۔ زندگی کے اٹھارہ برس اسی طرح گزر گئے۔ اسکول' اسکول سے کالج اور اب یونیورسٹی آ گئی تھی۔

نبیل بھائی اور عدیل بھائی اکثر اس کی حمایت میں بول جاتے پھر تائی امی سے لمبا سا لیکچر سننے کو ملتا۔

اور فرح..... اس سے چند مہینے بڑی تھی اس ایسی پرخاش تھی۔ جیسے نہ جانے امایہ نے کیا جرم کر ڈالا ہو۔ جرم تو واقعی اس کا بڑا تھا۔ جوں جوں جیسے دونوں جوان ہوتی جا رہی تھیں۔ امایہ کے چہرے پہ معصومیت پاکیزگی بڑھتی جا رہی تھی گلابی کلی کی طرح دکھتی۔ جبکہ فرح کے ناک نقش اس کی زبان کی طرح تلخی لیے ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"کب کا ٹائم دیا ہے ڈاکٹر نے ماما ۔۔۔؟" ناشتے کی ٹیبل پہ بیٹھے روہان نے فرحت بیگم سے پوچھا۔

"ون ویک ۔۔۔"

"ون ویک کیوں ۔۔۔؟ بہت زیادہ لمبا ٹائم نہیں ہو گیا ہے ۔۔۔؟" روہان نے آئی برو اچکائی۔

"لندن جا رہے ہیں وہ ۔۔۔ روہان کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں بھی اپنا توازن کھو بیٹھوں گی۔ جوان اولاد کا دکھ کم تو نہیں ہوتا۔ کل بھی اس نے تین بار سرنج استعمال کی ہے میرے سامنے میرا بچہ اپنے اندر زہر انڈیل رہا ہے میں روک بھی نہیں سکتی تھی کتنی بے بس ہوں میں۔" انیسہ بیگم آخر میں رو دیں۔ تو روہان چیئر سے اٹھا اور ان کے پاس جا کر انہیں اپنے سے لگا لیا اور دھیرے دھیرے تھپکنے لگا۔

جبران صاحب دو جڑواں بیٹے امان اور روہان اور اپنی

شریک حیات انیسہ بیگم کے ساتھ پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن کچھ سال پہلے امان کی زندگی میں آئی زوباریہ نے ان کے گھر کا سکھ چین سب کچھ تہس نہس کردیا تھا۔

زوباریہ امان کی یونیورسٹی فیلو تھی۔ امان کی مردانہ وجاہت سے بھرپور پرسنالٹی پر ہر لڑکی مرتی تھی۔ زوباریہ بھی انہی میں سے ایک تھی۔ اس کے حد سے زیادہ آگے بڑھنے پر امان کب تک پیچھے ہٹتا۔ آخر کار امان بھی اس کی اداؤں کے جال میں پھنستا چلا گیا۔ یونیورسٹی میں ہر جگہ ان دونوں کا نام ساتھ لیا جانے لگا۔ دونوں اس بات سے بے خبر کہ لوگ ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں ایک دوسرے میں مگن تھے۔ یونیورسٹی کے پچھلے حصے میں نہر کے کنارے بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کرتے فیوچر پلاننگ کرتے۔ کبھی آؤٹنگ، کبھی ہوٹلنگ کرتے۔ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن گئے۔ امان اسے ڈھیروں ڈھیر شاپنگ کراتا۔ زوباریہ اس کی سنگت میں حسین تر ہوتی جارہی تھی۔ مسکراہٹ، جگمگاہٹ اس کے چہرے پر ہردم روشن رہنے لگی تھی۔

لیکن زوباریہ کو امان کا جلد غصہ میں آجانا انتہائی ناگوار گزرتا تھا۔ وہ جب غصے میں ہوتا تو بنا سوچے سمجھے جو اس کے منہ میں آتا بول دیتا۔ اگرچہ ان کی منگنی ہوچکی تھی پھر بھی امان اس پر ہر وقت شک کرتا رہتا تھا۔ ایک دن وہ حماد جو اس کا کلاس فیلو تھا اس سے کچھ نوٹس مانگ رہی تھی، امان نے دیکھ لیا اور غصے میں اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر دور لے گیا۔

"تم اس سے کیا بات کررہی تھیں؟" اس نے زوباریہ کو جھنجوڑ کر پوچھا زوباریہ نے پلٹ کر کہا۔

"میری مرضی میں جس سے چاہوں بات کروں میرا تم سے ابھی کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے کہ تم مجھ پر حکم چلا رہے ہو۔ میں تمہاری پابند نہیں ہوں۔"

پھر زوباریہ امان کو سبق سکھانے کے لیے اس سے کھنچی کھنچی رہنے لگی۔ وہ بات کرنے کی کوشش بھی کرتا تو زیادہ تر ... حماد کے گرد نظر آتی۔ اس نے زوباریہ کو ایک مرتبہ حماد کے ساتھ ہوٹلنگ کرتے دیکھا اور ایک بار مال میں دیکھ کر تو وہ حواسوں میں نہیں رہا۔ تیزی سے بھاگتا ہوا ان تک پہنچا۔

"ایکسکیوزمی مجھے زوباریہ سے کچھ بات کرنی ہے۔ وہ اسے گھسیٹتا ہوا ایک سائیڈ لے گیا۔

"کیا ڈرامہ کررہی ہو تم میرے ساتھ...؟"

"میں نے ... میں نے کیا ہے تمہارے ساتھ ڈرامہ...؟ ڈرامے تم کررہے ہو امان... میں نہیں۔" وہ اس کے جواب میں پھنکاری۔

"میرے ساتھ چلو..." وہ اسے پارکنگ کی طرف گھسیٹ کر لے جانے لگا۔

"تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں شور مچادوں گی۔" بازو چھڑا اس سے دور ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ دور سے حماد آتا دکھائی دیا تو امان اسے تنفر سے دیکھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا پارکنگ کی جانب چلا گیا۔

اس کی انا کو شدید ٹھیس پہنچی تھی۔ پھر اس نے ایک فیصلہ کیا اور اس نے گاڑی کا رخ زوباریہ کے گھر کی طرف کرلیا۔

"آنٹی میں کل بابا اور چند لوگوں کے ساتھ آؤں گا۔ آپ جس کو بلانا ہے بلا لیجیے میں کل ہی نکاح کرنا چاہتا ہوں۔" وہ کسی روٹھے ہوئے بچے کی طرح بولا۔

"ارے بیٹا... اچانک... کیسے ہوگا سب" وہ اس کے مطالبے پر گڑبڑا گئیں گو کہ وہ اس کی ضدی طبیعت سے واقف تھیں لیکن شادی بیاہ کوئی گڈے گڑیا کا کھیل تو تھا نہیں۔

"لوگ کیا کہیں گے کہ ایسی کیا ایمرجنسی ہوگئی بیٹا ... ٹھنڈے دل سے سوچو..."

"مجھے لوگوں کی پروا نہیں ہے۔ بس آپ کل کی تیاری کرلیں ہم آئیں گے اگر آپ کو کوئی اعتراض ہے یا کسی کو بھی... تو کل بھی بتاسکتی ہیں ہم واپس لوٹ جائیں گے..."

وہ دوٹوک لہجے میں کہتا دروازہ پار کر گیا۔

گھر جاکر اس نے فرحت بیگم کے سر پر بم ہی پھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے فوراً" روہان کو کال کرکے بلایا۔ اس کے لاکھ سمجھانے پر بھی وہ اپنی بات سے ایک انچ ہٹنے پر بھی تیار نہ ہوا۔ ناچار فرحت بیگم کو ریڈی میڈ تیاری کے لیے بازار کی طرف نکلنا پڑا۔

روہان نے فوراً" امان کا کمرہ سجایا۔

☼ ☼ ☼

حجلہ عروسی میں داخل ہوتے وقت اس کی چال کسی فاتح کی سی تھی۔ لیکن بیڈ پہ زوباریہ کو نہ پاکر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

تیزی سے ڈریسنگ کا دروازہ کھولا وہ اپنے بالوں سے کھینچ کھینچ کر پن نکال رہی تھی۔ ہزاروں کا برائیڈل دوپٹا اس کے پیروں میں رل رہا تھا۔ آئینے میں امان کے عکس پر نظر پڑتے ہی چند پل کو ہاتھ تھمے پھر سے وہ زور آزمائی میں لگ گئی۔

امان تو بس یک ٹک اس کے دو آتشہ روپ کو تکے جارہا تھا۔ اب وہ گلے کا ہار کھول رہی تھی جو کہ اس سے کھل نہیں رہا تھا۔ امان نے ہاتھ بڑھا کر ہار کھول دیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اس کا رخ کمرے کی جانب تھا۔

"ہاتھ مت لگاؤ مجھے..." وہ کسمسائی۔

"کیوں... اب بھی کوئی رشتہ نہیں تم سے۔" اس نے کان میں سرگوشی کی۔

اس کی لاکھ مزاحمت کے باوجود بھی وہ اپنے حقوق لے چکا تھا۔ ولیمہ تین دن بعد طے ہوا تھا۔

"سنو میں تمہاری منہ دکھائی تو لایا نہیں... ایسا کرو ابھی میرے ساتھ چل کر اپنی پسند سے جیولر سے کچھ لے لو..." وہ صبح آئینے کے سامنے بیٹھی گیلے بالوں میں برش کررہی تھی جب وہ اس کے عقب میں آکھڑا ہوا۔

پرفیوم کی بوتل اٹھا کر اس پر چھڑکاؤ شروع کردیا۔

"سوری مجھے تم سے منہ دکھائی لینے کا کوئی شوق نہیں ہے... تم..." وہ اٹھ کر پلٹی اور انگلی اٹھا کر اس سے بات کررہی تھی کہ اس نے زوباریہ کی اٹھی انگلی مروڑ دی۔

"آج کے بعد انگلی اٹھائے بنا بات کرنا۔ ورنہ توڑنے

میں دیر نہیں لگے گی۔۔۔“ وہ سی کر کے رہ گئی۔

”تم بے حس ہو امان۔۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی اور بیڈ پر بیٹھ کر رونے لگی۔ وہ دروازہ بند کر کے کمرے سے باہر نکلا پھر گھر سے بھی نکلتا چلا گیا۔ رسم کے مطابق زوباریہ کے گھر والے اسے میکے لے گئے۔ امان شام میں تھک ہار کر گھر لوٹا۔۔۔ زوباریہ کو گھر میں نا پا کر اس کا دماغ گھوم گیا۔ فرحت بیگم کے لاکھ سمجھانے پر بھی گاڑی لے کر زوباریہ کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے گھر پہنچنے پر اسے اپنی جلد بازی پہ افسوس ہوا۔۔۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ کم از کم فرحت بیگم کو ہی ساتھ لے آتا۔

اسے VIP پروٹوکول دیا جا رہا تھا۔ جو مہمان کل ان کے گھر آنے سے رہ گئے تھے ان کی دعوت کا اہتمام تھا۔ خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔۔۔ وہ آنٹی سے اجازت لے کر زوباریہ کو گھر لے آیا۔

”سنو۔۔۔“ وہ کپڑے تبدیل کر کے لیٹی تو امان نے اس کا کاندھا ہلایا۔

”کیا چاہتے ہو تم۔۔۔“ وہ چیخی ”تمہیں نہیں معلوم میں کیا چاہتا ہوں۔۔۔“ وہ اسے وارفتہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”نہیں معلوم۔۔۔“ اس نے کروٹ بدلی۔۔ اس نے پھر سے اس کا رخ اپنی طرف کر لیا۔

”سوری۔۔“ وہ اس کے بالوں کی لٹ پکڑ کر بولا۔

”وعدہ کرو آئندہ نہیں لڑو گے۔۔۔؟“

”وعدہ۔۔۔“ زوباریہ نے امان کے وعدہ کرنے پر اس کے کندھے پہ سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ لیکن یہ وعدہ زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکا۔

☼ ☼ ☼

ولیمہ میں تمام کلاس فیلوز کو انوائٹ کیا تھا۔ سب ہی چھیڑ رہے تھے یوں اچانک شادی پر۔۔۔ لیکن حماد کے کہے الفاظ اسے پگھلے ہوئے سیسے کی مانند لگے۔۔۔ اسے تو حماد کی نظریں جب جب زوباریہ پہ محسوس ہوئیں اس کا دل چاہ رہا تھا یا تو حماد کو اٹھا کر پٹخ دے یا زوباریہ کو کہیں غائب کر دے۔ اس کا غصہ گھر آ کر زوباریہ پہ نکالا۔

”تم نفسیاتی ہو امان اور کچھ بھی نہیں۔۔۔“ ساری رات کے جھگڑے کے بعد آخر میں زوباریہ نے یہ کہا اور سوٹ کیس اٹھا کر اپنے کپڑے اور چیزیں ٹھونسنے لگی۔

اسے کپڑے رکھتے دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے قریب آیا۔

”تم کہیں نہیں جاؤ گی۔“ اس نے سوٹ کیس بند کیا۔

”میں جا رہی ہوں مجھے مت روکو۔۔۔ تمہارے ساتھ رہی تو میں بھی پاگل ہو جاؤں گی۔“

اس نے امان کا ہاتھ ہٹایا۔۔۔ اور آخری سوٹ رکھ کر سوٹ کیس کالاک لگایا۔

وہ کمرے کے دروازے تک پہنچی تھی کہ امان کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

”اگر کمرے سے قدم نکالو گی تو یہ سوچ لینا کہ آج کے بعد یہاں کے دروازے تم پہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔“

”سوچ لیا۔۔۔“ بنا سوچے سمجھے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے فقط دس منٹ بعد ہی کمرے میں موبائل فون بجا۔ وہ اپنا موبائل یہیں بھول گئی تھی۔

اس نے موبائل اٹھایا تو حماد کالنگ لکھا آ رہا تھا۔ اس نے آف کر کے سائڈ پر ڈال دیا۔

حماد شروع ہی سے امان سے جیلس تھا۔ اگر امان خوب صورتی میں ایک تھا تو حماد بھی کم نہ تھا لیکن اس کی چھچھوری حرکتوں کی وجہ سے کوئی بھی لڑکی اس کے قریب نہ آتی تھی۔۔۔ ہاں اپنے بوائے فرینڈ کو چڑانا ہو تو اکثر لڑکیاں اس سے بات کرتی نظر آتیں کیونکہ اس کے انداز میں مرچنا ہوتا اور کون یہ برداشت کرتا۔ اس سے یوں اچانک زوباریہ کا امان کا ہو جانا ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

امان کا جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے کئی کالز کیں زوباریہ کو۔۔۔ لیکن اس نے بات کرنے سے ہر بار انکار کر دیا۔

اور اب جب امان تھک گیا تھا۔۔۔ ٹوٹ گیا تھا تو اس کے موبائل پر دو مہینے کے بعد زوباریہ کالنگ لکھا آ رہا تھا۔ اس نے اپنا موبائل دیوار پہ دے مارا۔ چھناکے سے موبائل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دور جا گرا۔

زوباریہ اب پی ٹی سی ایل پر کال کر رہی تھی۔ اس نے کہلوا دیا کہ وہ بات نہیں کرنا چاہتا۔ تین دن تک یہی آنکھ مچولی چلتی رہی۔ آخر کار زوباریہ گھر آ گئی۔ کمرے میں جانا اس کی انا نے گوارا نہ کیا وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی انگلیاں چٹخا رہی تھی جبھی وہ براؤن کھدر کے سوٹ میں بڑھے ہوئے شیو اور سوجی آنکھوں سے اندر داخل ہوا۔

”کیوں آئی ہو یہاں۔۔؟“ وہ بیٹھا نہیں تھا۔ ڈرائنگ کے بیچوں بیچ کھڑا اس سے سوال کر رہا تھا۔

”میری رپورٹ پازیٹو آئی ہے امان۔۔۔“ وہ اس کے بالمقابل آ کھڑی ہوئی۔

”میرا اس سے تعلق۔۔۔؟“ وہ اپنے سینے پہ ہاتھ باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔

”امان۔۔۔ تمہارا تعلق۔۔۔“ وہ آنکھیں پھاڑے اس سنگدل کو دیکھ رہی تھی۔

”ہاں۔۔۔ میرا تعلق یا حماد کا۔۔۔؟“ وہ اسی طرح سرد لہجے میں بولا۔ دھڑ دھڑ دھڑ۔

زوباریہ کو لگا ڈرائنگ روم کی چھت فانوس سمیت اس کے سر پہ آ گری ہو۔ اس نے تو صرف امان کو اس کی غلطی کا احساس دلانے کے لیے حماد والا حربہ آزمایا تھا اسے کیا خبر تھی کہ اس کی بازی الٹ جائے گی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی اور اس کا گریبان تھام لیا۔

”گالی مت دو امان۔۔۔ گالی مت دو۔۔۔ جب یہ دنیا میں آئے گا تو خود بتائے گا کہ اس کا باپ کون ہے۔“ زوباریہ کے آنسو اس کے گریبان کو بھگو رہے تھے۔ چند پل وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ امان نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے گریبان سے ہٹایا۔ اور لب بھینچ لیے۔ اس کی انا اسے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے پلٹی اور تیزی سے دروازہ عبور کر گئی۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

”تم کو کہا بھی تھا یہ اپنی ادائیں اپنے کمرے تک رکھا کرو باہر آئے گئے کو مت دکھایا کرو مگر تا جی یہ آج کل کی لڑکیاں نہیں فتنہ ہیں فتنہ۔“ وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے ان کی پھٹکار سن رہی تھی۔

آج کچھ لوگ فرح کو دیکھنے آئے تھے ساتھ ہی اوکے کا سگنل بھی دے دیا تھا۔ امایہ نے اسی وقت یونیورسٹی سے گھر میں قدم رکھا۔ عمیر کی والدہ نے اس کے متعلق پوچھ ڈالا۔ اسی وقت سے تائی امی غضب و قہر کی مثال بنی تھیں۔

کیوں ڈامتی ہو طوبٰی آپا۔۔۔ وہ بے چاری کیا گھر میں بھی نہ آتی اسے کون سی خبر تھی کہ وہ لوگ آئے بیٹھے ہیں۔“

اسی وقت تائی امی کے بھائی نے انٹری دی۔ امایہ نے ان کو ایسے گھورا جیسے سارا غصہ ان پر نکال دینا چاہتی ہو۔ تائی امی کی توپوں کا رخ ان کی جانب ہو گیا۔ اس نے شکر کا کلمہ پڑھا اور اپنے کمرے کی جانب دوڑی۔

تائی امی کے بھائی کی بھی عجیب کہانی تھی۔ سنا تھا جوانی میں کسی کوٹھے والی سے عشق فرما بیٹھے تھے۔ ماں نے گھر سے نکال دیا تو لاہور میں اپنا فلیٹ لے کر الگ رہنے لگے تھے۔ کچھ عرصے بعد بہن کو کل کی بہن کے خون نے جوش مارا تو بھائی کو اپنے گھر بلا لیا۔ مہینے میں دس دن (بقول تائی امی کے کبھی کبھی) یہیں رہتے تھے۔ جب وہ گھر آتے امایہ کی زندگی عذاب بن جاتی تائی امی ان کے کام جان بوجھ کر اس سے کرواتیں۔ وہ ان کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش میں تائی امی کی حکم عدولی کرتی۔ تو وہ سب کے سامنے اس کے لتے لینے لگ جاتیں۔

”امایہ کہاں ہے نظر نہیں آ رہی دو دن سے۔“

رات کو جب وہ کھانے کی ٹیبل پہ منظور انکل (تائی کے بھائی) کی وجہ سے نہ آئی تو تایا جی نے فرح کی طرف نظر کر کے پوچھا۔

"ارے بچی کے امتحان ہو رہے ہیں۔ یہاں آئے گی سب کی ساتھ بیٹھے گی تو کھانے میں بھی وقت لگے گا۔ میں نے کمرے میں ہی بھجوا دیا۔" جواب تائی کی طرف سے آیا۔

"ہوں... ابرار کی کال آئی تھی کل... کہہ رہا ہے کچھ دنوں میں آئے گا پاکستان... امایہ کی شادی کے بارے میں فکر مند ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کوئی رشتہ ہو تو نظر میں رکھوں... میں نے سوچا کہہ دوں نظر میں رکھنے کی کیا بات... گھر میں دو لڑکے موجود ہیں تو... گھر کی بچی گھر میں ہی رہی گی۔"

اظہار احمد بہت سوچ سوچ کر نپے تلے انداز میں بول رہے تھے۔ سب کے چہروں کے ایکسپریشن دیکھتے ہوئے۔

فرح ٹیڑھے میڑھے منہ بنا رہی تھی۔ طوبیٰ بیگم کا منہ کھلا ہوا تھا اور نوالے والا ہاتھ ہوا میں معلق تھا۔ جبکہ عدیل نے تیزی سے پانی کا گلاس منہ کو لگایا اور نبیل بے تاثر چہرے کے ساتھ کرسی گھسیٹتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"کم از کم پاپا مجھے تو دور ہی رکھیں وہ میرے آئیڈیل کے مطابق نہیں ہے۔" انہوں نے ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد عدیل کو دیکھا۔ جس کا پانی ختم ہی نہیں ہونے کو آ رہا تھا۔

"عدیل..."

ان کی گرج دار آواز پہ عدیل کے ہاتھ سے گلاس چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ لیکن اسے بھی بروقت بہانہ سوجھ ہی گیا۔

"پاپا... وہ... پاپا میں نے اسے ہمیشہ فرح اور دعا کی طرح سمجھا ہے ایسا تو کبھی سوچا ہی نہیں۔" اس نے جلدی جلدی گڑبڑا کر جواب دیا۔

"اچھی بات ہے شریف بچے ایسے ہی ہوتے ہیں سوچا نہیں ہے تو اب سوچ لو... زیادہ ٹائم نہیں ہے تمہارے پاس... ابرار چاہتا ہے وہ اب کے آئے تو کم از کم نکاح تو کر کے ہی جائے۔"

وہ اگلی بات سنے بنا ہاتھ پونچھتے کھڑے ہوئے اور اسٹڈی میں چلے گئے۔ عدیل کی نگاہوں میں منال کے لمبے لمبے ناخنوں والے ہاتھ گھومنے لگے۔ وہ جو کہتی ہے۔

"کبھی مجھے چھوڑا تو گلا دبا دوں گی۔" طوبیٰ بیگم کے ہاتھوں سے نوالہ کب کا چھوٹ کر گر چکا تھا۔ ان کا دماغ الگ ہی سوچوں کا جال بن رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے نہیں لگتا امایہ کہ تمہاری تائی جیسے خطرناک لوگ بلا مقصد اپنا رویہ نرم کریں۔ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔" روشانے اور امایہ فری پیریڈ میں کالج کی عمارت کے سامنے بنے لان میں بیٹھی تھیں۔ امایہ پریشان تھی کہ تائی امی نے اس کے ساتھ رویہ بہتر کر لیا تھا اور یہی وہ روشانے سے ڈسکس کر رہی تھی۔

"مجھے خود کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا۔ اس قدر جان نچھاور کر رہی ہیں اور تو اور فرح نے بھی کل مجھے اپنی بالکل نیو شرٹس گفٹ کیں۔"

"اور بھی کیا ہو رہا ہے...؟" ان کی کلاس فیلو سنبل دھپ سے کتابیں گھاس پہ پھینک کے وہیں ڈھیر ہو گئی۔

"کچھ خاص نہیں۔" امایہ رجسٹر پہ لکھے اپنے نام پہ انگلی پھیر رہی تھی۔

"کیا یہ تم لوگ بوڑھی روحوں کی طرح کبھی لائبریری میں بیٹھی رہتی ہو۔ فری پیریڈ میں بھی کتابیں کھولی ہو۔

زندگی کو انجوائے کرو یار نہ جانے کیوں تم لوگوں نے زندگی کو اتنا بور بنایا ہوا ہے۔" سنبل روشانے کی ٹانگ پہ سر رکھ کر وہیں دراز ہو گئی۔

"وقت اور حالات اگر زندگی کو انجوائے نہ کرنے دیں تو سنبل... پھر کیا کیا جائے؟" امایہ ابھی بھی اسی پوز میں بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا امایہ اتنی مایوس کن بات کیوں...؟" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

"بس..." امایہ نے گہری سانس لیتے ہوئے بوڑھے برگد کو دیکھا جس پر چڑیا تنکا تنکا جوڑ کر اپنا آشیانہ بنا رہی تھی۔ سنبل نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ چڑیا کے منہ سے تنکا نیچے گر گیا تھا۔ اب وہ پریشان ادھر ادھر پھدک رہی تھی۔

"بی ریلیکسڈ یار" سنبل نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"یہ دیکھو اس نے اپنی کلائی پہ سے آستین ہٹائی اس کی کلائی پہ جگہ جگہ آبلے سے بنے ہوئے تھے۔

"یہ کیسے ہوا سنبل؟" روشانے نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی تھامی۔ امایہ تو اس کا ہاتھ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔

"میری سوتیلی ماں کی طرف سے دیا گیا تحفہ... زندگی میں ہزاروں لوگ اس طرح ملیں گے۔ اپنے آپ کو تنہا مظلوم نہ سمجھو۔ قدم قدم پہ ایسی دکھ بھری ظلم کی داستانیں بکھری ہیں ڈیئر۔" سنبل نے اپنی آستین ٹھیک کرتے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ امایہ کے آنسو ہی بہنے لگے۔

"اوہو... میں نے بھی تمہیں کن باتوں میں لگا دیا۔ چلو کینٹین چلتے ہیں آؤ کچھ پیٹ پوجا ہو جائے آگے تو ساری کلاسز ہی کلاسز ہیں آف ہونے تک..."

سنبل نم آنکھوں سے مسکرائی اور کپڑے جھاڑتی کھڑی ہو گئی تو وہ دونوں بھی دل میں اسے شاباشی دیتی کھڑی ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

طوبیٰ بیگم قریبی اسٹور تک کچھ چیزیں لینے نکلی تھیں کہ اچانک کسی سے ٹکرا گئیں۔

"سنبھل کے... ارے مرینہ آپ؟ کیسی ہیں... یہاں کیسے؟" طوبیٰ بیگم اپنی پرانی پڑوسن کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"ہم یہیں قریب میں ہی شفٹ ہو گئے ہیں بھابھی آیئے گا نا آپ... ہمارا گھر یہاں سے صرف پانچ منٹ کی واکنگ ڈسٹینس پر ہے ضرور آیئے گا۔ بلکہ ساتھ ہی چلیے میرے۔"

"آں... آج تو نہیں لیکن اسی ہفتے ضرور آؤں گی۔ اور دلنشین بیٹی کیسی ہیں۔ ان کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے۔ اب تک تو ڈاکٹر بھی بن گئی ہوں گی...؟" طوبیٰ بیگم نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"جی الحمد للہ ڈاکٹر بن گئی ہے دلنشین۔ آپ سنائیں۔ عدیل، نبیل، فرح اور دعا کیسی ہیں...؟"

"سب ٹھیک ہیں فرح کی بات طے کر دی ہے شادی بھی جلد ہی مانگ رہے ہیں۔ آپ کو بلاؤں گی شادی پہ... بلکہ ابھی سے انویٹیشن دے رہی ہوں آنا ہے آپ نے لازمی۔"

"جی ضرور۔" ایڈریس اور فون نمبر کے تبادلے کے بعد ایک دوسرے کو رخصت کیا۔

☼ ☼ ☼

"دل تمہیں طوبیٰ آنٹی یاد ہیں... ہماری پہلے والے گھر کے بی بلاک میں رہتی ہیں...؟"

"آں... یاد ہیں پھر...؟" وہ لیپ ٹاپ بند کر کے ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسے پتا تھا مما بات مکمل کیے بنا جان نہیں چھوڑیں گی۔

اس سنڈے کو اپنی کوئی مصروفیت مت رکھنا۔ وہ شاید اسی ویک آئیں۔" وہ بات ختم کر کے کھڑی ہو گئیں۔

"ایکسکیوزمی مما... آپ مجھے اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے وہ میرا پرپوزل لا رہی ہوں۔"

"لا نہیں رہیں... لیکن لا بھی سکتی ہیں... نبیل نے اپنے باپ کا مکمل بزنس سنبھالا ہوا ہے۔" وہ اس کی بات سن کر وہیں ٹھہر گئی تھیں۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ... آپ کو معلوم ہے میں روہان میں انٹرسٹڈ ہوں پھر بھی...؟" وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مائنڈ یو مائی ڈارلنگ روہان میں آپ انٹرسٹڈ ہو۔

روہان آپ میں نہیں... آپ کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر دیے ٹمٹماتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں مگر آپ کو دیکھ کر نہیں۔
وہ تمہیں بالکل نارمل لیتا ہے... ہم نے اتنی عمر گزاری بندے کو اشارے میں جانچ لیتے ہیں۔ وہ سراب ہے اس کے پیچھے بھاگنا فضول ہے۔" وہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھے سمجھا رہی تھیں۔
"بات صرف یہ ہے کہ آپ مجھے خوش دیکھنا نہیں چاہتیں۔ جبھی اپنے فلسفے پیش کر رہی ہیں کیا ہوا وہ آج انٹرسٹڈ نہیں ہے کل ہو ہی جائے گا..." وہ ان کا ہاتھ انتہائی بدتمیزی سے جھڑک کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
"اپنی خوش فہمی سے نکل آؤ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تمہاری اداؤں کے وقت اس کے انداز میں بےزاری..." وہ اس کے پیچھے اسی کے انداز میں چیخیں۔
"دیکھا جائے گا..." دلنشین ریلنگ تھام کے چیلنج کے سے انداز میں بولی اور دھپ دھپ کر کے سیڑھیاں چڑھ گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو ڈاکٹر روہان اسپیکنگ..."
"کتنی دیر کے لیے اسپیکنگ ابھی اگلی بات سنتے ہی کرنٹ لگے گا اور اسپیکنگ بند۔"
"واٹ ڈو یو مین کمینے۔" اگلی طرف سے جان دار قہقہہ سنائی دیا۔
"میں ہاسپٹل آ رہا ہوں دس منٹ میں... میرا ویڈنگ ڈریس پسند کروا دو چل کے..."
"کیا پہنو گے عمیر شادی کے دن شرارہ یا ساڑھی...؟ بھئی ابھی سے مائنڈ بنالوں نا... کہ کون سی مارکیٹ جانا ہے..." ڈاکٹر روہان اس وقت ریلیکس انداز میں شوز اتارے اپنے چیئر پہ ہلکے ہلکے جھولا لے رہا تھا۔ ساتھ ہی امان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ عمیر کی کال سے ذہن ہلکا ہو گیا۔
"یہ تو وہیں جا کی ڈیسائڈ کریں گے... بہرحال تم تیار رہو میں آ رہا ہوں۔"
"ارے سنو تو..." لیکن عمیر کال ڈراپ کر چکا تھا۔ دل ہی دل میں اسے گالیاں دیتا اپنا سامان سمیٹنے لگا۔
"کدھر چلنا ہے..." عمیر نے اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی سوال کیا۔
"جامع کلاتھ چلو وہاں شرارے کی اچھی ورائٹی ہوتی ہے۔" ڈاکٹر روہان نے شرارت سے جواب دیا۔
عمیر نے اسے مکا مارتے ہوئے گاڑی طارق روڈ کی جانب موڑ لی۔
"نہیں روشانے یہ بہت ہیوی ہو جائے گا۔"
عمیر شیروانی کے ریٹ عورتوں کی طرح لڑ لڑ کر کم کرا رہا تھا۔ روہان کو عجیب لگا تو شاپ سے باہر نکل آیا۔ چند قدم آگے بڑھا تو اسے نسوانی آواز نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ جو بھی تھی مکمل حسن لیے ہوئے پیشانی پہ بل ڈالے الجھن کا شکار تھی۔ روہان مبہوت رہ گیا۔ حسن اس نے بہت دیکھے تھے۔ لیکن لاپروا حسن... اس کی لاپروائی نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔ اس کا دل چاہا آگے بڑھ کر ڈریس لینے میں اس کی مدد کرے۔ ہو سکتا ہے اسے اچھا نہ لگے۔ لیکن اس دل کا کیا کرتا جو اسے خود سے آگے بڑھ کر پنک فراک کی طرف متوجہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے شاپ کیپر کے سے انداز میں فراک اٹھائی۔
"میڈم یہ دیکھیں کیسا رہے گا۔ یہ پنک گھیردار فراک اس کی گلابی رنگت سے میچ کرتی، جگہ جگہ سلور اسٹونز دامن میں نازک سا سلور کام سوٹ کو بہت دلکش بنا رہا تھا۔
"دکھایئے گا بھائی..." اس کے ساتھ والی لڑکی نے اس کے ہاتھ سے فراک لی... یہ لو تمہارے مطلب کی مل گئی۔" اس دشمن جان کی آنکھوں میں بھی ستائش ابھری۔
"ہوں... یہ ٹھیک رہے گی۔" اس ادائے بے

نیازی پر وہ قربان ہوا جا رہا تھا۔ اب ہاتھ باندھے بس اسے تک رہا تھا۔ جو اپنے سے فراک لگائے ناپ دیکھ رہی تھی۔
"اس کے پرائس...؟" اس کے ساتھ والی نے اسے چونکا دیا۔
"ٹھیک لگا ہے اس پہ میم۔" اس نے ہوا میں تیر چلایا جو ٹھیک نشانے پہ بیٹھا۔ انہوں نے کاؤنٹر پہ جا کر پے منٹ کی... وہ وہیں کھڑا انہیں جاتا دیکھتا رہا۔ عمیر نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔
"کہاں ہو بھائی...؟" وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔
"ہوں... ہاں۔" وہ گہری سانس لیتا ہوا اس سے آگے چلنے لگا۔
"بھائی کہاں گم تھے کس کو دیکھ لیا تھا... ڈاکٹر دلنشین کو تو نہیں دیکھا...؟"
"ڈاکٹر دلنشین کی یہاں کیا بات...؟" وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔
"کیوں اس کے نام پر تمہارا دل نہیں دھڑکتا...؟ سانسیں نہیں رکتیں...؟" عمیر نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔
"نہیں مجھے کبھی وہ پسند نہیں آئی بلکہ مجھے تو ہر وہ لڑکی اٹریکٹ نہیں کرتی جو تھالی میں رکھ کر خود کو پیش کرنے والی ہو۔ عورت کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے یار... مرد بھی اسی عورت کی عزت کرتا ہے جو اپنی عزت کرانا جانتی ہو..." وہ اپنا سر سیٹ کی بیک سے لگاتا ہوا بولا۔
"یو مین تمہارا اور ڈاکٹر دلنشین کا ایسا کوئی ریلشن شپ نہیں ہے۔" وہ موڑ کاٹتا ہوا بولا۔
"نہیں..."
"اوکے... تمہیں گھر چھوڑوں یا اسپتال...؟"
"گاڑی میری پارکنگ میں ہی ہے۔" روہان نے جواب دیا۔
"ہوں..." عمیر نے گاڑی اسپتال کے روڈ کی طرف چھوڑ دی۔

☆ ☆ ☆

فضا میں عجیب اداسی رچی بسی تھی۔ وہ ٹیرس پہ دونوں ہاتھوں سے گرل تھامے ارد گرد سے بےنیاز کھڑا تھا۔ رات تاروں بھری شال اوڑھے پرسکون تھی۔ دور کہیں جھینگر کی آواز ماحول کو پراسرار بنا رہی تھی۔ اس کی پیشانی پہ کئی بل تھے۔ وہ بہت زیادہ ذہنی اذیت سے گزر رہا تھا۔ ہاسپٹل سے گاڑی لے کر جب وہ گھر پہنچا تو امان نے پورا گھر سر پہ اٹھایا ہوا تھا۔ ماما نے اس کی سرنج ڈسٹ بن میں پھینک دی تھی۔ روہان نے بھی روتی ماں کو تسلی دینے کے بجائے ان پر غصہ کیا اور الٹے قدموں لوٹا اسے ڈوز دے کر پرسکون کیا ماما سے نظریں ملائے بنا جب سے اپنے کمرے میں بند تھا۔ اس کی طبیعت میں عجیب بےزاری ہونے لگی اس نے سائڈ پاکٹ سے سگریٹ نکال کر اسے شعلہ دکھایا۔
اسے یاد تھا کہ اس نے امان کو کتنا سمجھایا تھا کہ زوباریہ کو واپس بلا لے لیکن وہ ضدی انا پرست تھا۔ اس کی انا نے تین زندگیاں برباد کر دیں وہ شاید زوباریہ کے آخری ماہ تھے وہ ایک بار پھر امان کے پاس آئی تھی۔
"امان... اب تو مان جاؤ میں تھکنے لگی ہوں... وہ روتی بلکتی امان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ وہ جھکا اور اسے کاندھوں سے پکڑ کر کھڑا کیا۔
"کیا چاہتی ہو... بولو...؟" زوباریہ کی آنکھوں میں ڈھیروں حیرت اتر آئی۔
"تمہیں نہیں معلوم امان... میں کیا چاہتی ہوں؟"
لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے ادا ہوئے۔
"نہیں۔" اسے امان پتھر کی چٹان کی مانند معلوم ہوا۔ امان کے اندر اس کی محبت کرلائی... محبت نے نفرت سے تنی ہوئی انا کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔
"نہیں... نہیں۔" وہ اپنے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھے نفی میں گردن ہلاتی الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہی تھی۔
"تمہیں واقعی نہیں معلوم...؟" وہ ایک بار پھر اپنے آنسو پونچھ کر اپنے اندر ہمت جمع کر کے بولی۔
"نہیں... نہیں نہ معلوم ہے نا معلوم کرنا چاہوں گا۔" وہ کہہ کر پلٹا اور ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا کر

تیز تیز قدموں سے اندر کی جانب چلا گیا۔

روہان جو باہر کھڑا جالی کے پردے سے دیکھ رہا تھا یکدم سائڈ میں ہوا اور امان کے اندر چلے جانے کے بعد اندر زوباریہ کے پاس آیا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی سر جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔

روہان نے زوباریہ کے سر پہ ہاتھ رکھا تو جیسے اس کے آنسو تھم گئے۔ وہ سر اٹھائے اسے دیکھنے لگی۔ وہ وہیں اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"میں سمجھاؤں گا اسے.... جو ہوا غلط ہوا.... لیکن اس کی انا آنے والے وقت کو مزید غلط کر سکتی ہے۔ پریشان نہ ہو۔ ریلیکس اطمینان رکھو۔" اس کے لہجے کے یقین سے اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ روہان اب سارا معاملہ سنبھال لے گا۔

"پھر کیا ہوا...." سوچ کر بھی روہان کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے۔ شعلہ اس کے ہاتھ سے مس ہوا تو اس نے یکدم سگریٹ چھوڑ دیا۔ رات بہت بیت گئی تھی ٹھنڈک بڑھی تو وہ کمرے میں آکر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ آج کا سارا دن پوری جزئیات کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔ اس کے ماتھے کی شکنوں کے جال دھیرے دھیرے ختم ہونے لگے۔ تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔ لبوں پر دھیمی مسکراہٹ نے جگہ لے لی۔ اپنی حرکت پہ خود بھی حیران تھا۔ کیسے اس کے ذہن نے تیزی سے کام کیا اور اس نے اپنی پسندیدہ فراک اسے دلوائی تھی.... اسے یاد آیا وہ دکان سے باہر کیوں آیا تھا.... عمیر عورتوں کی طرح لڑ لڑ کر شیروانی کی قیمت کم کرا رہا تھا.... لیکن وہ بھی تو عورتیں ہی تھیں۔ انہوں نے تو کم نہیں کرائی قیمت جو ٹیگ پہ لکھی تھی ٹیے منٹ کی اور باہر چلی گئیں۔ حد ہے خواہ مخواہ میں عورتیں بدنام ہیں۔ اس نے سائڈ لیمپ آف کیا اور مسکراتے ہوئے کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

اسے ہمیشہ سے زیادہ لوگوں میں گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ آج فرح کی مایوں تھی۔ اس نے تائی امی سے اجازت لے کر روشانے کو بلا لیا تھا۔ املیہ کے لاکھ منع کرنے کے باوجود روشانے نے اس کے مہندی اور میرون فل گھیر دار کلر کے ڈریس کے مطابق ڈارک میک اپ کر دیا۔ اس نے جب میرون جھمکے پہن کر خود کو آئینے میں دیکھا تو پہچان نہیں پائی۔

کھلے ہوئے بال ایک طرف ڈال کر اس پر موتیا کی لڑیاں اس انداز سے لگائیں کہ اس کا حسن دو آتشہ ہو گیا۔

زبردستی اسے کھینچ کے نیچے لان میں لے آئی۔

اس کے چمکتے ہوئے دلکش حسن کو دیکھ کر کئی لوگوں کی توجہ فرح کی طرف سے ہٹ کر اس کی طرف ہو گئیں۔

وہ بہت زیادہ گھبرا رہی تھی۔ روشانے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ رہی تھی۔ تائی امی کی نظر جیسے ہی املیہ پہ پڑی تو نظریں جیسے ٹھہری گئیں۔

تیز تیز قدم اٹھاتی اس تک پہنچنے میں ان کا سانس تیز چلنے لگا۔ ان کے تیور دیکھ کر امایہ کی تو جان ہی نکل گئی۔ کچھ لمحے انہوں نے خود کو کمپوز کیا۔

"بی بی ہمارے ہاں یہ لچھن نہیں ہوتے جاؤ جا کر منہ دھو کر آؤ۔" امایہ کو لگا وہ ابھی یہ کہہ دیں گی۔ لیکن جب انہوں نے کہا تو مطلب یہی تھا بس انداز دوسرا تھا۔

"بیٹا ہمارے ہاں اتنا سج دھج کر شدہ والی لڑکیاں رہتی ہیں، جاؤ میک اپ ہلکا کر کے آجاؤ۔"

وہ تو شکر تھا آس پاس کسی نے سنا نہیں ورنہ امایہ کی حالت بس رو دینے والی تھی شاید تائی امی اور بھی کچھ کہتیں لیکن مہمان آنے کا شور اٹھا تو وہ استقبالیہ میں چلی گئیں۔

عمیر آف وائٹ کرتا اور براؤن پاجامہ پہنے، گلے میں براؤن آف وائٹ ہی پٹکا ڈالے ہوئے جبکہ اس کے برابر میں مردانہ وجاہت کا بھرپور شاہکار ڈاکٹر روہان سفید کڑکڑاتے کرتے شلوار میں ملبوس گلے میں گرین اینڈ گولڈن پٹکا ڈالے عمیر کے ساتھ ہم قدم تھا۔

روہان کی نظریں ایک لمحے کے لیے دور تک گئیں۔ پلٹتی ہوئی امایہ.... اس کے دل پہ بجلی گرا گئی.... اوہ تو یہ روئی کے گالوں والی لڑکی بھی یہاں آئی ہے۔ تمام رسمیں ہو گئیں۔ اس کی نظریں اسے تلاش کرتی رہیں اسٹیج سے اٹھتے ہوئی نہ جانے کیسے اس کی نظر اوپر کی جانب اٹھی تو اٹھی ہی رہ گئی۔ چوڑیوں سے بھرے ہاتھوں پہ اپنا چہرہ ٹکائے دور کہیں خلاؤں میں گم تھی۔

گو کہ اس کا چہرہ دھلا ہوا تھا اور وہ اندھیرے کی طرف تھی لیکن پھر بھی اس کے بہتے آنسو روہان سے چھپے نہ رہ سکے۔

اس کا جی چاہا اس معصوم سی لڑکی کے سارے آنسو چن لے۔ نہ جانے کیا دکھ ملا تھا اسے۔

اسے شاید روہان کی نظروں کی تپش محسوس ہوئی تھی۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ وہاں سے ہٹ گئی۔

تقریب اختتام پر تھی۔ ورنہ وہ فوراً ہی چلا جاتا۔ اس کی دلچسپی ہر چیز میں سے ختم ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بابا آج بھی نہیں آئے روشانے۔" روشانے کو اس نے رات روک لیا تھا۔ اس کے گھر والے املیہ کو جانتے تھے سو با آسانی اجازت مل گئی تھی۔ روشانے اندر ناول میں گم تھی۔ وہ ٹیرس پہ سے آکر بیڈ پہ ٹک گئی۔

"تم کال کر لو نا...." روشانے نے ناول ٹیبل پہ رکھا اور جگ میں سے پانی نکال کر گلاس اسے تھمایا۔

"وہ خود بھی تو نہ آنے کی اطلاع دے سکتے تھے نا۔" وہ ابھی بھی کہیں دور خلاؤں میں گم تھی۔

"پتا ہے روشانے! فرح کی شادی کا سن کر بابا کو میری بھی شادی کی فکر ہو گئی.... کہہ رہے ہیں اس بار ایک ماہ کے لیے آؤں گا تو کہیں نا کہیں بات پکی کر کے جاؤں گا...."

"اچھا ہے نا جان چھوٹ جائے گی ان لوگوں سے تمہاری...." روشانے تکیہ سر کے نیچے سیٹ کرتی ہوئی بولی۔

"جان.... پتا نہیں چھوٹے گی یا نہیں...." وہ گلاس رکھ کر اپنی انگلیاں موڑ رہی تھی۔

"جو بات ہے کھل کر کہو.... کیا کہنا چاہ رہی ہو...." روشانے پھر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"یار مجھے بابا کی باتوں سے کچھ عجیب سا فیل ہو رہا ہے...."

"کیا مطلب۔" اس نے آئی برو اچکائی۔

"پتا نہیں واقعتاً ایسا ہے یا نہیں یا صرف مجھے فیل ہو رہا ہے کہ بابا شاید نبیل بھائی یا عدیل بھائی کے لیے سوچ رہے ہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی نا.... تو تمہیں معلوم ہے تائی امی کا.... اور.... اور میں بابا کو کیا کہہ کر منع کروں گی.... میں تو منع بھی نہیں کر سکوں گی۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دی۔

روشانے نے اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ دھیرے دھیرے کمر تھپکنے لگی۔

"مت پریشان ہو پلیز تمہارے لیے جو بھی ہو گا بہتر ہو گا۔" امایہ آنسو پونچھتی پیچھے کو ہٹی۔

"اور جب سے تائی امی نے اپنا رویہ بدلا ہے مجھے مزید خوف آنے لگا ہے.... ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔" اس کی یہ بات سن کر روشانے بھی پریشان ہو گئی تھی کیونکہ وہ خود بھی اس کی تائی کے رویہ سے پریشان تھی۔

"تم انکل کو کال کرو.... اور نہ آنے کی وجہ پتا کرو.... ایسے رو رو کر ہلکان ہوتی رہو گی۔" روشانے نے اسے موبائل تھمایا۔

"بابا کہہ رہے ہیں آج موسم کی خرابی کی وجہ سے فلائیٹ ڈلے ہو گئی ہے۔ کل شام تک پہنچ جائیں گے۔" ابرار احمد سے بات کر کے وہ کچھ پرسکون ہوئی۔

"او کے اب لائٹ آف کر دو اور پلیز آکر سو جاؤ کل پھر دن میں سونے کو نہیں ملے گا۔" روشانے جمائی لیتے ہوئے بولی تو اسے بھی احساس ہوا کہ وہ اس کی وجہ سے جاگ رہی ہے۔

لائٹ آف کر کے خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

صبح سے ہی گھر میں چہل پہل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اظہار احمد، عدیل اور نبیل کل کا سارا بکھراوا اڑکوں سے سمٹ وا رہے تھے۔ چونکہ آج کا فنکشن بھی گھر میں ہی ہونا تھا۔ انتظام کرنے میں مصروف تھے۔

اندر گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ قریب والے تو رات ہی میں چلے گئے تھے۔ لیکن دور سے آنے والے رہیں براجمان تھے۔ کچن میں کھٹ پٹ کی مسلسل آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک بجنے کو تھا۔ لیکن وقفہ وقفہ سے ابھی تک ناشتے ہی بن رہے تھے۔

امایہ خاموشی سے کچن میں آئی اپنا اور روشانے کی چائے کا پانی چڑھا کر بریڈ جیم اور کریم ٹرے میں رکھی چائے میں جوش آیا تو نکالنے لگی۔

"امایہ... ایک کپ چائے باہر نبیل کو دے آؤ وہ جھولے پہ بیٹھا ہے۔"

"جی اچھا تائی امی۔" اسے کوفت ہونے لگی اتنی مشکل سے چولہا خالی ملا اب یہ نیا حکم... اس نے ٹرے وہیں چھوڑی اور پرچ پیالی میں چائے لے کر باہر آگئی۔ نبیل آنکھیں موندے لان کے پچھلے حصے میں جھولے میں آڑا ترچھا لیٹا تقریباً" سو رہا تھا۔

"نبیل بھائی چائے۔"

"ہوں... تھینک یو۔" اس کے ہاتھ سے چائے لیتے نیند کی وجہ سے نبیل کی انگلیاں اس کے ہاتھ سے مس ہوئیں۔ اس کے ہاتھ سے چائے چھلک گئی۔ امایہ نے ناگواری سے نبیل کو دیکھا۔ اور قدم اندر کی جانب بڑھا دیے۔

"جب سے ڈیڈ نے گھر میں اس کی شادی کا نام لیا ہے خواہ مخواہ میرے آگے پیچھے رہتی ہے... کل بھی ماما بھی کہہ رہی تھیں۔ اچھا خاصا سو رہا تھا۔ نبیل بھائی چائے... جیسے میں مرا ہی تو رہا تھا چائے کے لیے۔"

نبیل دل ہی دل میں کافی دیر تک بڑبڑاتا رہا جو بیج اس کی ماں نے سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت اس کے دل میں بویا تھا اس میں پانی بھی خود ہی ڈال کر اسے تناور درخت بنانا تھا۔

وہ کچن میں واپس آئی تو اس کی بنائی ہوئی ٹرے بھی غائب تھی۔ اس کی اپنی تو خیر تھی مگر روشانے اوپر بھوک سے بے حال ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اسے جگہ ملی تو اس نے رات والی روٹی فرائی کر کے سالن گرم کیا اور چائے لے کر یہ جا وہ جا...

"شکر ہے تم نمودار تو ہوئیں۔ ورنہ کچھ دیر میں یہاں سے میرا جنازہ جا رہا ہوتا۔" امایہ کے اندر داخل ہوتے ہی روشانے کی دہائیاں شروع ہو گئی تھیں۔

"میں نے ناشتا بنا لیا تھا۔ لیکن تائی امی نے چائے نبیل بھائی کو بھجوا دی واپس آئی تو ٹرے غائب تھی۔ سلائس ختم تھے۔ دوبارہ ناشتا بنا کر لائی ہوں بنا نخرے کرے آجاؤ۔" وہ رائٹنگ ٹیبل پر جگہ بنا کر ٹرے رکھتے ہوئے بولی۔

"آرہی ہوں بابا۔" روشانے واش روم سے چھپکے مار کر باہر آگئی۔

"کن سوچوں میں گم ہو۔" روشانے اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی۔

"یار آج تائی امی نے میرا نام لیا نہ جانے کتنوں سالوں بعد یا شاید میں نے جب سے ہوش سنبھالا جب سے اب تک پہلی بار...

دعا کرو آج پاپا بخیریت پہنچ جائیں۔ ورنہ یہ تو ایک عجیب پہیلی بنتی جا رہی ہیں۔"

"ہوں..." روشانے بھی سوچنے لگی۔

"تم ناشتا کرو ٹھنڈا ہو رہا ہے میں بھی تمہیں کن باتوں میں لگا دیتی ہوں۔"

☆ ☆ ☆

اسے دکھ کیا ہے؟

اس کی آنکھیں اداس کیوں رہتی ہیں؟

وہ جب سے عمیر کی مہندی سے لوٹا تھا۔ بے سکون اور بے چین اسٹڈی میں ہی بیٹھا تھا۔

فرحت بیگم فجر کی نماز کے لیے اٹھیں اسٹڈی کے آگے سے گزر رہی تھیں اسٹڈی کے نیم وا دروازے سے روشنی کی لمبی لکیر دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔ پورا کمرہ دھوئیں سے بھرا تھا۔ انہیں اندر جاتے ہی کھانسی شروع ہو گئی تو فوراً" باہر پلٹ آئیں۔ کھانسی کی آواز پہ وہ چونکا۔ اور اٹھ کر باہر نکل آیا۔

"ماما..." وہ گہرے سانس لے رہی تھیں۔

"تم ڈاکٹر ہو کر اسموکنگ کر رہے ہو روہان... اور... اور کم از کم پردے ہی کھول لیتے اتنے دھوئیں میں بیٹھے ہو بیٹا۔"

"سوری ماما رات گزرنے کا پتا ہی نہ چلا سوچوں میں۔" وہ مسکرا کر اپنے کان پکڑ کر جھکا۔

اس کی مسکراہٹ دیکھ کر وہ بھی پرسکون ہوئیں۔ ورنہ انہیں یہی ٹینشن رہتی کہ یہ امان کی ڈپریشن لے کے بیٹھا ہے۔

"خیریت رات بھر کیوں نہ سوئے... کہیں کوئی پری نے تو میرے جن پر قبضہ کر لیا...؟"

وہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھے چہرہ ٹٹول رہی تھیں۔

"کم آن ماما... ابھی آپ کے جن کو بھی کنفرم نہیں ہے جیسے ہی ہو گا سب سے پہلی آپ سے شیئر کروں گا۔"

وہ مسکرا کر ان کا ہاتھ تھپتھپاتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ تو فرحت بیگم سوچنے لگیں کہ وہ یہاں آئیں کس کام سے تھیں۔ کمرے میں آکر بھی وہ ٹہلتا رہا۔ کبھی سوچتا اس سے بات کر کے دیکھے گا۔ آخر میں ماما کو بتانے کا فیصلہ کر کے پرسکون ہو کر لیٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

آج عمیر کی بارات تھی۔ عمیر کو سیلون سے لے جانے کی اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ اسے سیلون سے لینے گھر پہنچا تو بارات جانے کے لیے تیار تھی۔ خوب شور شرابے کے ساتھ بارات نکلی، فرح بھابھی کے گھر قدم رکھتے ہی سامنے دشمن جان پہ نظر پڑ گئی تو گویا اس کا آج اسپتال سے چھٹی کرنا کارگر ثابت ہو گیا۔ اس کی پسند کی پنک فراک ایک طرف سے مغلیہ انداز میں سر پہ دوپٹا ڈالے دوسری طرف بالوں پر موتیا کی لڑیاں... لیکن آج اس نے کل کی طرح میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔ میک اپ کے نام پہ سوٹ کی ہم رنگ لپ اسٹک اور کاجل... اس میں بھی اس کا سہانہ روپ دمک رہا تھا۔ آج بھی اس کے معصوم چہرے پہ اداسی تھی۔ نکاح کے بعد کھانا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ لان کے آخری کونے میں کھڑی تھی۔ روہان کا ارادہ تھا کہ ماما کو آج ضرور اسے دکھانا ہے۔ وہ دور دور سے اسے اپنی نگاہوں میں جذب کر رہا تھا۔ یکدم ہی اس ماہ جبیں کی آنکھوں میں چمک ہوئی وہ تیز تیز قدموں سے گیٹ کی جانب چلنے لگی۔ گیٹ اس سے کافی دور تھا۔ تیز قدموں سے چلنے کے بجائے اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ بھاگتی ہوئی واقعی کوئی آسمانی پری لگ رہی تھی۔ ایک قدم پہ اس کا گلابی فراک بالکل گول دائرہ اختیار کر لیتا تو دوسرے قدم پہ نیچے گر جاتا وہ اس کا ایک ایک قدم اپنے دل پہ نقش کر رہا تھا۔ یکدم ہی وہ کسی گریس فل آدمی کے سینے سے جا لگی۔

وہ کون تھے۔ شاید اس کے فادر دلہن کے والد اور بھائی ان صاحب کے قریب آگئے۔ وہ اسے ایک طرف بازو کے گھیرے میں لیے سب سے مل رہے تھے۔ وہ ہنس رہی تھی۔ خوش تھی روہان کو لگ رہا تھا سب خوش ہیں ان کے پاس سے رش چھٹنے لگا تو وہ ان کے ساتھ لگے لگے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔

رخصتی تک وہ انتظار ہی کرتا رہا مگر وہ باہر نہ آئی۔ اس کے فادر باہر آئے فرح بھابھی کو گلے لگایا پیار کیا ان کا صدقہ اتارا اور اندر کی طرف بڑھ گئے ان کے چہرے پہ سفر کی تکان واضح تھی۔

"نصیبوں والی ہے ہماری امایہ... ادھر فرح کی شادی ہوئی... ادھر امایہ کا رشتہ آیا۔ جیسے تم چاہ رہے تھے ابرار ویسا ہی جھو قدرت بھی سوچے بیٹھی تھی۔ انہیں بھی جلدی ہے اور تمہیں بھی لوگ بھی دیکھے بھالے ہیں لڑکے کے باپ کا بزنس ہے وہیں ہوتا ہے باپ کے ساتھ۔ بھائی ڈاکٹر ہے۔ کوئی جھنجھٹ ہی نہیں... میں نے اپنی طرف سے تو ہاں کر دی باقی تم

باپ ہو سوچ لو سمجھ لو پھر ہی فائنل کریں گے۔"

فرح کی شادی میں فرحت بیگم نے مرینہ سے تذکرہ کیا، وہیں پاس ہی طوبیٰ بیگم بھی کھڑی تھیں۔ ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ امان کی طبیعت کا سن کر پھر جو انہوں نے امایہ کے لاوارثی کے قصے سنائے۔ ایسی معصوم کہ کسی بات پہ چوں بھی نہیں کرتی اور حقیقتاً" امایہ تھی بھی ایسی ہی خیر.... فرحت بیگم نے وہیں رشتہ دے ڈالا کہ بس ان کے بیٹے کو سنبھال لے۔ طوبیٰ بیگم نے گارنٹی دی کہ امایہ ان کی تربیت ہے (جو کہ انہوں نے کبھی کی ہی نہیں)

"میں کیا کہوں بھابھی آپ اس کی ماں ہیں۔ آپ نے ہی پالا ہے جو بہتر لگے آپ کر لیجیے.... شادی کے لیے جتنی بھی رقم درکار ہو بتا دیجیے گا۔" ابرار نے احسان مندانہ انہیں کہا۔

☼ ☼ ☼

وہ آنکھیں موندے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا اور آنکھوں کے سامنے ایک ہی شبیہہ تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ فرحت بیگم کے دروازہ ناک کرنے اور اندر آنے کی اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ تو جب کھنکار کر اس کے برابر میں بیڈ پہ بیٹھیں تو وہ چونکا۔

"ارے ماما.... آپ۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"بیٹا جی مجھے تو دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے بلکہ پوری دال ہی کالی لگ رہی ہے۔ کیا بہت خوب صورت ہے وہ....؟"

"نن نہیں ماما...." وہ یکدم سٹپٹا گیا۔

"خیر میں نے امان کے لیے لڑکی پسند کی تھی۔ لیکن سوچ رہی ہوں وہ تمہارے ساتھ سوٹ کرے گی۔"

ان کے ذہن میں امایہ کا سراپا گھوم گیا۔

"ارے نہیں ماما آپ امان کی ہی کر دیں۔ میرا فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے.... امان سیٹ ہو جائے ہمارے لیے یہی سب سے بڑی خوشی ہے۔"

"ہاں.... زوباریہ اچھی لڑکی تھی۔ مجھے افسوس رہے گا کاش.... میں ماں ہونے کا حق استعمال کر لیتی تو وہ سب یوں نا ہوتا...." ان کا ذہن پیچھے کی جانب چلنے لگا۔

"جب امان اپنے کمرے سے تقریباً" بھاگتا ہوا نکلا ....ماما.... زوباریہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا میں ہسپتال جا رہا ہوں.... روہان کہاں ہے اس سے کہیں جلدی پہنچے۔" وہ دوڑتا ہوا کہہ کر نکل گیا....

"یا اللہ خیر...." فرحت بیگم دل پہ ہاتھ رکھے صوفے پہ بیٹھ گئیں۔

پورے راستے وہ اپنے آنسو صاف کرتا فل اسپیڈ سے ڈرائیو کرتا پہنچا لوگوں کو پیچھے دھکیلتا.... آپریشن تھیٹر کے دروازے تک پہنچ گیا۔

"مریضہ کے ہسبینڈ کون ہیں....؟" ڈاکٹر کے سوال پر وہ آگے بڑھا۔

"میں.... میں ہوں پلیز کیا ہوا اسے وہ ٹھیک تو ہے نا....؟"

"ایسی کنڈیشن میں آپ نے انہیں گھر سے نکلنے ہی کیوں دیا بہت خون ضائع ہو چکا ہے، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ماں اور بچہ دونوں کی جان بچ جائے۔ بہرحال آپ ان پیپرز پہ سائن کر دیجیے۔" نہ جانے کس طرح اس نے بنا پڑھے پیپرز سائن کیے اور وہیں بیٹھ کے رونے لگا۔ کچھ دیر میں روہان ایک نرس کے ساتھ باہر آیا۔ اس کی گود میں تولیے میں لپٹا ہوا گل گوتھنا بچہ تھا۔ اس نے لا کر امان کی گود میں دے دیا۔

"یہ ٹھیک تو ہے نا....؟"

"معجزہ ہے کہ بچ گیا.... زوباریہ کے لیے بھی دعا کرو۔" روہان اسے جواب دے کر چیئر پہ بیٹھ گیا۔

وہ بچے کی آنکھوں کو چومتا کبھی ہاتھوں کو.... اس کے آنسو بچے کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ بچے نے آنکھیں کھولیں اور کسمسا کر امان کو دیکھا۔

"ہو بہو اپنا باپ ہے...." فرحت بیگم بھی اس کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔ امان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ یکدم ہی بچے کی آنکھیں اوپر کو چڑھنے لگیں اس نے زوردار جھٹکا لیا اور دنیا سے منہ

موڑ لیا۔

امان کے کانوں کے پاس کوئی زور سے چیخا۔

"یہ خود دنیا میں آ کر بتائے گا کہ اس کا باپ کون ہے۔" کسی نے اس کا گریبان تھاما۔

"گالی مت دو.... گالی مت دو امان۔"

"میری رپورٹ پازیٹو آئی ہے امان.... وعدہ کرو اب نہیں لڑو گے۔" اسے خبر بھی نہ ہوئی کوئی بچہ کو اس کی گود سے لے جا چکا تھا۔ اس کے ہاتھ پہلو میں گر گئے۔

"سوری ہم آپ کی وائف کو نہیں بچا سکے...."

ڈاکٹر نے اس کے دماغ پہ ایک اور بم پھوڑا۔

"میں تھکنے لگی ہوں امان.... اب تو مان جاؤ.... تمہیں نہیں خبر میں کیا چاہتی ہوں...." آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں.... وہ وہیں فرش کے بیچوں بیچ بیٹھ گیا۔ اسے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا کون کیا کر رہا ہے۔ اس کے سامنے تو کبھی ہنستی مسکراتی کھلکھلاتی زوباریہ آ جاتی۔ تو کبھی روتی بلکتی اور.... اور وہ بچہ جسے جی بھر کے دیکھ بھی نہ سکا تھا.... ناراض ہو گیا.... اس کا ذہن کچھ کام نہیں کر رہا تھا۔ کتنا وقت بیت چکا تھا۔ کچھ خبر نہ تھی۔ روہان اس کا ہاتھ پکڑ کر قبرستان تک لایا۔ اس کے بچے کو۔ اس کی زندگی کو۔ منوں مٹی تلے دبا دیا گیا.... روہان جب بچے کو قبر میں اتار رہا تھا اسے لگا اسے کسی نے جھنجھوڑا۔ وہ بھاگتا ہوا روہان تک آیا اور بچہ کو لے کے دوسری سمت بھاگنا شروع کر دیا روہان نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے تھاما....

"پاگل ہو گئے ہو کیا.... یہ قانون قدرت ہے میرے بھائی۔" روہان نے آہستگی سے بچہ کو تھاما۔

"اس کا مجرم میں ہوں۔ اس کی ماں کا مجرم بھی میں ہوں۔ میں نے قتل کیا ہے.... دو قتل کر دیے پھانسی دو مجھے۔" وہ دیوانوں کی طرح گلا پھاڑ کر چلانے لگا۔ سب جنازہ چھوڑ کر اسے سنبھالنے لگے۔ پیچھے سے ایک آدمی آیا اس کے ہاتھ میں سرنج تھی۔ "اسے یہ لگا دو بھائی ورنہ یہ پاگل ہو جائے گا۔" روہان نے اس کے ہاتھ سے سرنج لے کر لگا دی اسے معلوم تھا کہ یہ کیا ہے.... قبرستانوں میں کیا ہوتا ہے۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ یہاں ایک تماشا کھڑا ہو چکا تھا۔

سرنج لگتے ہی اس پر ہلکی ہلکی غنودگی آنے لگی۔ روہان اسے پکڑ کر گاڑی تک لے گیا اور پچھلی سیٹ پہ بٹھا دیا۔

تدفین اور فاتحہ کے بعد گاڑی میں آ کر بیٹھا تو امان مکمل نیند میں جا چکا تھا۔

دوسرے دن صبح میں جب امان کو ہوش آیا وہ گاڑی لے کر قبرستان کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ ڈھیر سارے پھول لے کر زوباریہ کی قبر کے پاس جا کھڑا ہوا۔ فاتحہ پڑھی جب بچے کی قبر پہ پہنچا تو پھر ضبط کھو بیٹھا۔ کافی دیر تک روتا رہا۔ کل والا آدمی کہیں سے نکل آیا۔

"سکون چاہتے ہو....؟" وہ چونک کر پلٹا۔

"یہ لو.... سکون ہی سکون ملے گا...." کل واقعی اسے بہت سکون ملا تھا۔ اس نے بازو آگے کر دیا۔

اس کی آنکھ جب کھلی کوئی دھیرے دھیرے اس کا چہرہ تھپتھپا رہا تھا۔

"امان۔ امان۔" کوئی اسے دور سے آوازیں دے رہا تھا۔

"اٹھو امان۔" اسے کسی نے سہارا دے کر بٹھا دیا۔ اس کا ذہن ابھی تک سن تھا۔

"صبح سے فون ملا رہا ہوں.... ماما کتنی پریشان ہیں پتا ہے تمہیں اور تم یہاں سو گئے۔"

روہان سمجھ چکا تھا اسے کس چیز نے سلایا ہے لیکن اسے احساس دلانے کو بولا۔

پھر ہر روز یہی ہونے لگا....

فرحت بیگم رو رو کر روہان کو کال کرتیں۔ امان وہیں پایا جاتا۔ اب وہ اپنے "سکون" کے لیے موٹی موٹی رقمیں دینے لگا تھا۔ کسی دن روہان اسے نہ جانے دیتا تو وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر باقاعدہ رونے لگتا۔

فرحت بیگم ماں تھیں کب تک بے خبر رہ سکتی تھیں۔ کبھی اس پر چیختیں کبھی پیار سے سمجھاتیں۔ لیکن وہ بہت آگے نکل چکا تھا۔

فرحت بیگم کا چیخنے کا اتنا اثر ہوا تھا کہ اپنی تین چار دن کی "خوراک" اکٹھی گھر میں لانے لگا۔

جبران صاحب خاموش تماشائی تھے انہیں معلوم تھا جوان اولاد پہ زور آزمائی نہیں کی جا سکتی۔ ان کے پاس خاموشی کے علاوہ کوئی حکمت عملی نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اور روہان اچھے سے اچھے ڈاکٹر کی تلاش میں لگے تھے۔

مسلسل پانچ ماہ سے وہ یہ زہر اپنے اندر اتار رہا تھا۔

اب ڈاکٹر نے اس کی شادی کا مشورہ دے دیا تھا۔

پہلے تو کسی کا بھی ذہن تیار نہ تھا لیکن اب آہستہ آہستہ سب تیار تھے پہلے پہلے امان جب ہوش میں ہوتا اس کے سامنے شادی کا تذکرہ کیا جاتا تو وہ اٹھ کر چلا جاتا۔ اب کچھ دنوں سے وہیں خاموش بیٹھا رہتا اور ڈاکٹر کی بھرپور کوششوں سے آج کل اس نے ڈوز بھی کم کردی تھی اور شادی کی بات پر ہوں ہاں میں جواب دینے لگا تھا۔

"تم یہ تصویریں دیکھ نو... اگر کوئی اچھی لگے تو..." فرحت بیگم حال میں واپس آتے ہوئے بولیں۔ انہوں نے لفافہ روہان کی طرف بڑھایا۔

"اوہ نو ماما مجھے نہیں ہے ابھی ضرورت۔" اس نے لفافے والا ہاتھ ان کی طرف واپس بڑھا دیا۔

"اچھا پھر امان کی تو میں نے بات ڈال دی تھی۔ لیکن میرا دل تھا کہ امایہ تمہارا نصیب بنتی خیر... جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔ وہ لوگ بھی سمجھو راضی ہی ہیں۔ جسٹ فارملیٹی کل یہاں آئیں گے۔ میں نے ڈنر ساتھ کرنے کا کہا ہے تم پلیز اپنی مصروفیت بیچ میں نا لانا' اوکے اب سو جاؤ۔ میں دودھ بھجوا رہی ہوں پی کر سونا۔" وہ کہتی کھڑی ہوئیں اور کمرے سے نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

"مہندی سے لکھ دوری ہاتھوں پہ سکھیو میرے سانوریا کا نام..." آج رسم کے لیے امان کے گھر والوں کو آنا تھا۔ روشانے کو اس نے صبح ہی بلوا لیا تھا اور وہ آتے ہی نہ جانے کون کون سے گانے گا کر اس کا سر کھا رہی تھی۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا ہو تمہاری تائی نے اتنے اچھے پرپوزل پہ بنا چوں چراں ہاں کیسے کردی... یاد ہے جب تمہارا رشتہ کیپٹن زبیر سے آیا تھا۔ تو تمہاری تائی کو اس کے پائلٹ ہونے پر ہی اعتراض تھا..." روشانے اس کی وارڈ روب میں سر گھسائے رات کی تقریب کے لیے کپڑے تلاش کر رہی تھی۔

"ہوں..." امایہ بیڈ پہ بیٹھی اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں خوشیوں کو ٹٹول رہی تھی۔ کیونکہ کل ہی تائی اس کے کمرے تک چل کے آئی تھیں۔ اور اتنا میٹھا لہجہ اپنائے ہوئی تھیں۔

"نصیبوں والی ہے امایہ... اتنے بڑے گھر میں جا رہی ہے نہ کوئی نند نہ زیادہ لوگوں کا جھنجھٹ... پھر بھی میری عزت رکھنا بیٹا سسرال جا کر یہ نا کہیں لوگ کہ تائی نے تربیت اچھی نہیں کی..."

نہ جانے کیا ایسی بات تھی جس کے لیے انہیں اتنی تمہید باندھنی پڑ رہی تھی۔ امایہ دل میں بہت پریشان تھی۔

"اور آج کل کے لڑکوں کا تو بیٹا یہی ہے وہ اچھی لگی اس سے دل لگا بیٹھے وہ اچھی لگی اس کا غم لگا بیٹھے۔ امان کو بھی کوئی لڑکی پسند تھی۔ اس کا دکھ ہے کہ مر گئی۔ خیر تم جا کر اسے اپنا بنا لینا..." انہوں نے جھوٹ سچ ملا کر کہانی گڑھی اور اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کمرے سے چلی گئیں۔

اوہ... تو یہ بات تھی جس کے لیے تائی کو محبت کے ڈرامے کرنے پڑے۔ فرحت بیگم کی شرط ہی یہی تھی کہ امایہ کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا جائے۔

طوبیٰ بیگم ہرگز اسے کچھ نہ بتاتیں اگر انہیں ڈر نہ ہوتا کہ کل وہ امایہ سے کچھ پوچھ بھی سکتی ہیں۔

اور امایہ پہلی بار یہ بات روشانے سے چھپا گئی۔ کیا بتاتی تائی نے محبت کے مارے عاشق کو سدھارنے کی اس کی ڈیوٹی لگائی ہے۔

روہان کو اچانک اسپتال سے کال آ گئی وہ رسم میں شریک نہ ہو سکا... فرحت بیگم نے اسے انگوٹھی پہنائی... کھانے کے بعد نکاح اور رخصتی کی ڈیٹ

فکس ہوئی کیونکہ ابرار صاحب ایک سال سے پہلے دوبارہ نہیں آسکتے تھے اور فرحت بیگم رخصتی جلدی چاہتی تھیں۔ سو ابرار صاحب کے جانے کی ڈیٹ سے ایک ہفتہ پہلے کی ڈیٹ فکس کی گئی۔

انتہائی کم وقت میں دونوں طرف تمام تیاریاں مکمل کی گئیں۔ دولہا کی گاڑی سج کے آئی تو روہان جبران احمد کے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا جبکہ فرحت بیگم اور امان پچھلی سیٹ پر... جبران صاحب ڈرائیو کر رہے تھے۔ گاڑی جانے پہچانے راستوں پر چلنے لگی تو روہان چونکا اور جب بیت السکون کے آگے رکی تو اس کے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی۔ یعنی آج پھر اس دشمن جان کا دیدار ملے گا۔ یہ سوچ آتے ہی دل عجیب لے پہ دھڑکنے لگا۔ ایک سرور کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ہونٹوں پہ مسکراہٹ لیے اس نے امان کو گاڑی سے اتارا۔ مہندی ابٹن جیسی فضول رسموں کا جبران صاحب نے منع کر دیا تھا یوں آج سادگی سے بارات لے آئے تھے۔ مہمانوں کی گاڑی کے آنے کے بعد یہ سب اندر گئے۔ روہان کی نظریں مسلسل اس دکھ بھری آنکھوں والی لڑکی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن ہر بار ناکام لوٹ جاتیں۔ عمیر لڑکی والوں کی طرف سے پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس کی شادی کی طرح آج بھی وہی انتظامات تھے۔ یہاں تک کہ آج بھی روہان دولہا کے برابر سیٹ پر تھا۔ کچھ یاد آجانے پر اس کی نظر اس کھڑکی کی طرف اٹھیں... وہاں یہ کھڑا سناٹا تھا۔

اسے عجیب وحشت ہونے لگی۔ اتنی دیر میں نکاح کا شور اٹھا۔ نکاح کے فوراً" بعد کھانا کھل گیا۔ یہاں تک دلہن اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں سج سج کے آتی دکھائی دی۔ اس نے دلہن کو کیا دیکھنا تھا۔ اس کے ساتھ آنے والیوں میں اسے ڈھونڈنے لگا۔ اس کی دوست تو نظر آ گئی لیکن وہ نظر نہ آئی۔ اسٹیج پر چڑھتی دلہن کو جگہ دینے کے لیے جیسے ہی وہ اٹھا اس کی نظر دلہن کے چہرے پر پڑی۔ لاکھ میک اپ کی تہوں اس کا حسین چہرہ بدلا بدلا لگ رہا تھا لیکن روہان کی رگوں میں وہ خون کی مانند دوڑنے لگی تھی وہ کیسے نہ پہچانتا۔ اسے

دیکھ کر وہ وہیں منجمد ہو گیا۔ اس کے چہرے پہ ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا۔

جیسے ہی اسے امان کے برابر میں بٹھایا گیا وہ تیزی سے سیڑھیاں اترا اور گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن کچھ بھی سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا وہ اسٹیرنگ پہ سر رکھے ساکن تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ کتنا وقت گزرا۔

"روہان یہاں کیوں آکر بیٹھ گئے بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے...؟" فرحت بیگم نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"نہیں ماما... میں بالکل بھی ٹھیک فیل نہیں کر رہا۔ پلیز آپ مجھے گھر بھجوا دیں میں ڈرائیو کرنے کی بھی پوزیشن میں نہیں ہوں..."

"اچانک کیا ہو گیا بیٹا...؟"

"پتا نہیں ماما..." وہ اپنی کنپٹیاں دباتا ہوا بولا۔ "شاید بی پی اپ ڈاؤن ہوا ہے۔"

"اوکس اوکے... تم برابر سیٹ پہ آجاؤ ویسے بھی رخصتی ہو رہی ہے۔ وہ تو تمہارے پاپا نے کہا کہ روہان سے کہو گاڑی گیٹ تک لے آئے۔ میں انہیں بتاتی ہوں کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔" وہ کہتی واپس اندر کی جانب چلی گئیں۔

"وہ... وہ اس گاڑی میں بیٹھ کر جائے گی... میرے سامنے نہیں نہیں۔" اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔ گاڑی سے اترا اور پیدل ہی مین روڈ کی طرف چل نکلا۔

ٹیکسی کر کے گھر آگیا۔ ماما کو ٹیکسٹ کر دیا کہ میں گھر آچکا ہوں مجھے کسی بھی رسم کے لیے نہ بلایا جائے نہ ڈسٹرب کیا جائے۔

"آہ... ہم دونوں جڑواں پیدا ہوئے تو قسمت بھی دونوں کی ایک ہی نکلی۔ محبت میں ناکامی دونوں کو ملی۔" وہ جوتوں سمیت ہی بیڈ پہ الٹا لیٹا تھا۔ آج اس کا بھی دل چاہ رہا تھا دنیا سے بے گانہ ہونے کا کئی بار اس کا دل چاہا امان کی رکھی ڈوز خود استعمال کر لے لیکن امان اور اس میں یہی فرق تھا۔ امان ضدی تھا وہ ٹھنڈے مزاج کا۔

امان سوچے سمجھے بنا فیصلہ کرلیتا تھا وہ سوچ سمجھ کر کرتا۔ امان کسی بات پر اڑ جاتا تو اس کا رخ بدلنا مشکل ہو جاتا اور وہ... خود اپنے آپ کو حالات کے دھارے پہ چھوڑ دیتا۔

لیکن آج... اس کا دل چاہا وہ بھی آج امان کی طرح بن جائے کمرے کی ہر چیز توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔

کیسا مذاق ہوا تھا اس کے ساتھ... محبت اسے ہوئی... دلہن اس کے بھائی کی بنی... اسے لگا اس کی رگیں پھٹ جائیں گی... فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگائی... اندر کی آگ میں کچھ کمی آجائے... ساری رات ایسے ہی گزر گئی یہاں تک کہ صبح وہ آنسوؤں سے رو پڑا... بہت سوچنے کے بعد آخر میں ایک فیصلہ کرکے مطمئن ہو گیا اور خود کو بستر پہ گرادیا۔

☆ ☆ ☆

حجلہ عروسی میں بیٹھے بیٹھے وہ تھک گئی تو گردن اٹھا کر چاروں طرف کا جائزہ لینے لگی۔ خوب صورتی سے سجایا گیا کمرہ بیڈ کے اطراف میں سرخ گلاب اور موتیا لڑیوں کی صورت میں لٹک رہا تھا۔ پھولوں کی مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر خوشبو اپنے اندر اتاری۔ فرنیچر کا کلر اور ڈیزائن کمرے کے مکین کے باذوق ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔

دروازے پہ دستک ہوئی تو وہ فوراً گھونگھٹ گرا کر بیٹھ گئی۔ دل لگتا تھا پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔

اے سی کے باوجود اس کا ماتھا اور ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ اسے آگے کی ٹینشن تھی... اپنی تذلیل کی ٹینشن... اپنی ذات کی نفی کی ٹینشن...

دروازے سے بیڈ تک وہ چند قدم طے کرکے آیا۔ احتیاط سے بیڈ پر بیٹھ کر اس کا گھونگھٹ اٹھادیا۔

اتنا حسن دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا...

"بہت... بہت خوب صورت ہو تم۔" وہ امایہ کے ہاتھ تھام کر بولا اور اسے خود سے قریب کرلیا... پانچ ماہ میں پہلی رات ایسی تھی جب وہ اپنی خوراک کے بنا سویا تھا۔

امایہ کے بھی سارے خدشات دور ہو گئے وہ مطمئن سی اس کی بانہوں میں سو گئی۔ صبح ہوتے ہی اس کی خوش فہمی جھاگ کی مانند بیٹھ گئی۔

جب امان نے اسے یہ کہہ کر اٹھایا۔

"تم کیوں آئی ہو... بولو اور اور پھر چھوڑ کے چلی جاؤ گی۔"

"میں آپ کو کہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی امان۔" کہہ کے وہ اس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔

"وعدہ کرو... تم حماد سے نہیں ملو گی؟"

"حماد...؟" وہ کسی حماد کو نہیں جانتی تھی لیکن پھر بھی اس نے وعدہ کیا۔ امان نے اسے کاندھوں سے اٹھا کر سینے میں بھینچ لیا۔

امایہ کو کیا خبر تھی کہ کتنے وعدے وہ صبح شام اس سے ہر روز لے گا۔ فرحت بیگم نے ناشتے کی ٹیبل پہ جب دونوں کو فریش دیکھا تو مطمئن ہو کر شام میں ولیمہ کی تیاریوں میں مگن ہو گئیں۔ یہ دونوں ناشتا کرکے واپس کمرے میں چلے گئے تو روحان بریف کیس لیے نیچے آتا دکھائی دیا۔

"کیسی طبیعت ہے بیٹا اب۔"

"مچ بیٹر۔"

"او کے ناشتے میں کیا لو گے...؟"

"کچھ بھی نہیں ماما... میری فلائٹ کا ٹائم ہو گیا ہے مجھے فوری پنڈی کے لیے نکلنا ہے..." وہ ان سے نظریں ملائے بنا بولا۔

"ارے بیٹا اچانک... شام کو بھائی کا ولیمہ ہے اور پھر تمہاری خود کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔" وہ پریشان سی ہو کر اس کے قریب آئیں۔

"ارے ماما ایسے بھی کوئی طبیعت خراب نہیں ہے اور پلین کا ٹریول ہے کون سا ہاتھی گھوڑے لگیں گے۔ وہاں کچھ ایمرجنسی ہے جانا ضروری ہے۔" اس نے اپنا لہجہ حتی الامکان ہلکا رکھا کہ ماں پریشان نہ ہو جائیں۔

"اچھا بیٹا... تمہاری مرضی خیر سے جاؤ... خیر سے آؤ..." انہوں نے اس کا کندھا تھپکا تو اس نے بریف کیس رکھ کر ان کے ہاتھ چومے آنکھوں سے لگائے

اور الوداعی نظر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔

جیسے ہی جہاز نے زمین کو الوداع کہہ کر آسمان کا رخ کیا اسے لگا اس کا دل بند ہو گیا۔

پنڈی اتر کر بھی اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی لاش ہے اپنی لاش کو گھسیٹتا ہوٹل تک پہنچا۔

وہاں سے اپنے ایک دوست کو کال کرکے ہوٹل بلایا۔ تمام معاملات سمجھاتے بار بار اس کے خیالوں میں امایہ کا دلہن بنا روپ آجاتا... اس نے پریشان ہو کر ثاقب کو کل آنے کا کہہ دیا۔ ثاقب اس کے تمام ڈاکومنٹس لے کر چلا گیا تو اس نے اپنے آپ کو بستر پہ گرادیا۔

بچپن سے امان اپنی ضدی طبیعت کی وجہ سے ماں باپ کے قریب رہا اور وہ... وہ بھی امان کی ہر ضرورت کا ایسے خیال رکھتا جیسے وہ واقعی بڑا بھائی ہو... اس نے کبھی ضد کرکے کوئی چیز نہ لی اکثر امان کو اس کے لیے آئی گئی چیزیں پسند آجاتیں یہ خوشی خوشی اسے دے دیتا۔ امان بات بات پر سارا گھر سر پہ اٹھالیتا اسے امان کا یہ انداز پسند نہ تھا۔ سو اپنی ذات کے خول میں شروع ہی سے سمٹا رہا۔ دوسری صبح جبران صاحب کو کال کرکے اپنے چند دن لندن جانے کا بتایا تو وہ کچھ دیر تو بول ہی نہ سکے پھر اسے اتنا کہہ کر فون بند کردیا۔

"یہ یاد رکھنا پیچھے تمہارے بوڑھے ماں باپ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ حیران رہ گیا کہ پاپا نے کبھی خود کو بوڑھا نہ کہا اور آج... اسے حقیقی شرمندگی ہوئی۔ لیکن اب اس کا وہاں رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو کیسی ہو جانی...؟"

"ٹھیک... تم سناؤ..."

"خوش ہو...؟"

"خوش... ہاں... ہاں۔"

اس نے نگاہ برابر میں لیٹے امان پہ ڈالی جو موبائل پہ گیم کھیلنے میں مگن تھا یا شاید ظاہر کر رہا تھا۔

"تم سناؤ..."

"کیا سناؤں یار صبح صبح عبید کو ڈیڈی کا فون آگیا کہ عبید اسی ویک آرہے ہیں اور وہ لوگ نکاح کا کہہ رہے ہیں تاکہ پیپرز وغیرہ بن جائیں اور جیسے ہی پیپرز بنیں ما بدولت شوں..."

"ارے واہ یہ تو گڈ نیوز ہے..." امایہ بھی چند لمحوں کے لیے ریلیکس ہو گئی۔

"اور سناؤ... تمہارے سرتاج... تمہاری ساس... سسر سب کیسے ہیں تمہارے ساتھ..." وہ فل والیوم میں بول رہی تھی۔ یقیناً آواز امان تک پہنچ رہی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر ایک بار پھر امان کو دیکھا اب وہ موبائل ہاتھ میں تھامے اسی کو دیکھ رہا تھا شاید اس کے جواب کا منتظر تھا۔

امایہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

جواباً وہ نہ مسکرایا بس امایہ کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھتا رہا۔

"کون تھا...؟" اس نے جیسے ہی فون بند کیا سوال تیار کھڑا تھا۔

"کون تھا نہیں امان... کون تھی... میری دوست روشانے تھی۔" وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"اس کا منگیتر امریکہ سے آرہا ہے اسی ویک میں نکاح کے لیے..." وہ بالوں کو انگلی پہ لپیٹتے ہوئے بولی۔

"وہ فرینڈ جو شادی میں سب سے آگے آگے تھی...؟"

"جی..." وہ کہنے کے ساتھ اس کے مزید قریب ہوئی اسے لگا امان کا پورا جسم ٹھنڈا پڑ کر لرز رہا ہے۔

"امان... کیا ہوا آپ کو...؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نہ؟" وہ اس کا پسینے سے تر چہرہ تھام کر بولی۔

"پلیز... پلیز تم کچھ دیر کے لیے باہر چلی جاؤ... پلیز۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

"آپ کو اس حال میں چھوڑ کر کیسے چلی جاؤں... ہوا کیا ہے آپ کو...؟" وہ اس کا چہرہ تھپتھپانے لگی۔

"گو... گو... ہیل۔" اس نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر سسکتی ہوئی کمرے سے باہر بھاگی۔

لاؤنج میں ملازمہ سے ٹکرا گئی۔
"آنٹی.... آنٹی کہاں ہیں....؟" لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے ادا ہو رہے تھے۔
"دلہن بیٹی سنبھل کر.... آپ یہاں بیٹھیں میں بلاتی ہوں.... وہ باہر لان میں رات کے لیے انتظام کر رہی ہیں۔" وہ اسے زبردستی صوفے پہ بٹھا کر چلی گئیں۔
دو یا تین منٹ گزرے ہوں گے وہ بیٹھی انگلیاں مروڑ رہی تھی کہ دروازہ کھول کر تیزی سے فرحت بیگم داخل ہوئیں۔
"آنٹی وہ.... امان وہ ان کی طبیعت...." انہیں دیکھ کر وہ تیزی سے کھڑی ہوئی.... انہوں نے آگے بڑھ کر اسے خود سے لگالیا۔
"ٹھیک ہو جائے گا ابھی۔" وہ اسے دھیرے دھیرے تھپکتی صوفے پہ بیٹھ گئیں۔
"پریشان نہ ہو.... مجھے تم سے بہت امید ہے امایہ .... تم میرے بچے کو سنبھال لوگی.... مجھے معلوم ہے یہ تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے تم بھی جذبات سے گندھی ایک لڑکی ہو مگر بیٹا.... شاید اسے تم میری خودغرضی کہہ لو.... ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اسے 'مخلص ساتھ ہی نارمل زندگی کی طرف لاسکتی ہے۔ پلیز مجھ سے وعدہ کرو.... ساتھ دوگی نا....؟"
وہ بہت آس سے اس کی جانب دیکھ رہی ہیں۔ اس نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ ان کے ہاتھ پر اپنا مہندی لگا ہاتھ رکھ دیا۔
نہ جانے کیسے ماں بیٹے تھے جو عہد ہی لے رہے تھے جب سے آئی تھی۔ تقریباً" ایک گھنٹہ تک وہ سارے کام چھوڑے اس کا ہاتھ پکڑے امان کے بارے میں چھوٹی موٹی باتیں کرتی رہیں۔
"اوکے تم اب روم میں چلی جاؤ.... کچھ دیر آرام کر لو پھر بیوٹیشن آرہی ہوگی۔" وہ اس کا گال تھپتھپا کر اٹھ گئیں۔
"وہ...."
"امان سو گیا ہو گا.... تم بھی ریلیکس ہو جاؤ۔" وہ اس کی پریشانی کو سمجھتے ہوئے بولیں۔
وہ پھر بھی وہیں کھڑی رہی تو اس کا ہاتھ نرمی سے پکڑ کر دروازے تک لے گئیں۔ دروازہ لاکڈ نہیں تھا۔ ہینڈل پہ ہاتھ رکھا تو کھلتا ہی چلا گیا۔ اسے اندر کر کے انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔
امان گہری نیند سو رہا تھا۔ لیکن اس کا سانس بہت تیز چل رہا تھا۔ وہ چند لمحے اسے کھڑی دیکھتی رہی۔
خدا نے بہت فرصت سے بنایا تھا اسے 'چمکتی پیشانی پر بکھرے بال مغرور سی کھڑی ناک بھرے بھرے ہونٹ....
نہ جانے کتنی لڑکیوں کے اسے دیکھ کر دل دھڑکتے ہوں گے۔ وہ اس کی دسترس میں تھا۔ لیکن نامکمل.... ادھورا وجود.... وہ گہری سانس لے کر دوسرے سائڈ سے آکر لیٹ گئی۔ خود بھی بہت تھک گئی تھی۔ پلکیں موندتے ہی اس پہ بھی نیند مہربان ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

دن گھسٹ گھسٹ کر گزر رہے تھے۔
ویسے تو امان اس کا بہت خیال رکھتا۔ لیکن جب وہ اسے خوراک لینے سے روکتی یا منع کرتی تو وہ اسے دھنک کر رکھ دیتا۔
فرحت بیگم ہر طرح سے تعاون کر رہی تھیں اور ایک ماں کی طرح اسے چاہت دے رہی تھیں۔ چند دن میں اسے اپنے آپ میں تبدیلی کا احساس ہوا تو اس نے فرحت بیگم سے ذکر کیا.... وہ اسے فوراً" ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ ڈاکٹر نے خوش خبری سنائی فرحت بیگم نے راستے سے ڈھیر ساری مٹھائی لے لی۔ اور گھر آتے ہی امان کو خبر سنائی کاش نہ سناتیں۔ سنتے ہی امان کو دورے اٹھنے لگے۔
فوری طور پر ڈاکٹر کو گھر بلایا۔ انہوں نے بمشکل اسے قابو کر کے انجکشن لگائے۔
امایہ ہر وقت کی الٹیوں سے بے زار رہنے لگی تھی۔ اسی دوران روشانے اپنی ماما کے ساتھ اپنے نکاح کا انویٹیشن دینے چلی آئی۔

اس کی گرتی ہوئی حالت کی وجہ اس نے پریگنینسی سے اخذ کرلیا اور فرحت بیگم کو خاص تاکید کر کے گئی کہ لازمی آنا ہے۔
"نہیں آنٹی میری طبیعت بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ میں نہیں جاسکوں گی...." فرحت بیگم نے امایہ سے روشانے کی شادی میں جانے کا پوچھا تو اس نے بے زاری سے جواب دیا۔
"چلی جاؤ تھوڑا دل بہل جائے گا.... مجھے دکھ ہوتا ہے تمہیں اذیتوں میں دیکھ کر تمہاری تائی کی غلط بیانی اور میری خود غرضی نے تمہاری زندگی تباہ کر دی ہے میں تمہاری مجرم ہوں اور اگر تم.... بالکل ہی ہنسنا بولنا چھوڑ دوگی تو.... میں شاید خود کو ہی ختم کرلوں....
آخر میں فرحت بیگم پھپھک کر رو دیں۔
"اوکے آنٹی پلیز آپ نہ روئیں.... میں چلی جاتی ہوں اور پلیز آپ خود کو مجرم نہ ٹھہرائیں.... میری قسمت ہی ایسی ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھیں مجھے آپ جیسی پیار کرنے والی ماں بھی تو مل گئیں۔ اگر میں امان کی زندگی میں نہ آتی تو آپ کیسے ملتیں...." امایہ نے جگ سے پانی نکال کر انہیں دیا۔ امایہ خود بھی ٹوٹنے لگی تھی لیکن فرحت بیگم کو بکھرتا بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔
"ہاں...." انہوں نے گہری سانس لی اور امایہ کے ہاتھ سے گلاس لیا اور بولیں "وہ تو روہان سے بھی...." اتنا کہہ کر انہوں نے ہونٹ بھینچ لیے۔
"ایک بیٹا یوں دور ہو گیا اور دوسرا.... شاید اسے میرا یہ عمل پسند نہیں آیا۔ وہ شروع سے امان کی اس کنڈیشن میں شادی سے خوش نہ تھا۔
وہ.... وہ بھی روٹھ گیا۔ شروع سے ہی ایسا ہے وہ ظاہر کچھ نہیں کرتا اندر ہی اندر گھٹتا ہے۔ کال کرو تو کہتا ہے بزی ہوں۔ جلدی جلدی خیریت جتا کر بند کر دیتا ہے۔ یہ نہیں پوچھتا.... ماں تم کیسی ہو تمہاری میرے بنا کیسی حالت ہے۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بول رہی تھیں۔
"آجائیں گے آنٹی.... آپ پریشان نہ ہوں۔" وہ ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔
"میں نے بھی تمہیں کن باتوں میں لگالیا ہے۔ کل بس تم چلی جانا میں بیوٹیشن کو کہہ دوں گی آکر تیار کر جائے گی۔"
ان کے اصرار پہ وہ خاموش ہو گئی لیکن دل میں ایک فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی۔
"ہیلو.... ہیلو۔" کال ملتے ہی اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ لیکن پھر ہمت کر کے بول اٹھی۔
"جی ڈاکٹر روہان سے بات کرنی ہے۔"
"ڈاکٹر روہان بات کر رہا ہوں۔ جی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"
"میری خدمت کر کے آپ نے کون سے دو جہاں پا لینے ہیں۔ خدمت کرنی ہے تو ان بوڑھی آنکھوں کو مت ترسائیے جو ایک ماہ سے ایک بیٹے کی جدائی اور چھ ماہ سے دوسرے کا پاگل پن جھیل رہے ہیں۔
اور میرے نزدیک تو یہ بھی پاگل پن ہی ہے۔ مزاج کے خلاف بات ہونے پر گھر چھوڑ کر چلے جانا.... معاف کیجیے۔ آپ مسیحا ہو کر مسیحائی کا کوئی حق ادا نہیں کر رہے ہیں۔" اس کا سانس تیز چلنے لگا تو اس نے کال ڈراپ کر دی۔ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنسو بہانے لگی۔ روہان سن بیٹھا رہ گیا۔ یہ کون تھی....؟
امایہ....؟
یہ.... یہ کیا کہہ رہی تھی....؟
میں واقعی کتنا بدنصیب ہوں.... یہ سزا میں خود کو دے رہا ہوں یا ماں باپ کو....؟
اس کا ضمیر آواز بن کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ماں باپ کو اس کی ضرورت تھی.... وہ اس سے کہہ نہیں پا رہے تھے۔
امایہ.... ساری رات اس کی آنکھوں میں کٹی۔
بیوٹیشن آگئی تھی لیکن اس کا بالکل دل نہ تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی امان نے ڈوز لی تھی وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔
فرحت بیگم اس کا پرپل اینڈ پنک کنٹراس کا

اسٹائلش ساگون والا سوٹ نکال گئی تھیں۔ ناچار اسے شرٹ بدل کر باہر جانا پڑا۔

"امان سو رہا ہے.... میں روہان کا کمرہ کھلوا دیتی ہوں تم وہیں تیار ہو جاؤ۔" وہ روہان کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

بیوٹیشن کے ماہرانہ ہاتھ اس کے چہرے پہ لگتے ہی آنکھوں کے حلقے غائب ہو گئے۔ ساتھ ہی امان کے دیے تحفے بھی اب ہلکے پڑ گئے تھے۔

"ہیئر اسٹائل کیسا بناؤں....؟"

"جیسے آپ کو مناسب لگے۔" اسے زیور پہنا کر اس کے بال بنانے لگی۔

"اوہ.... " بیوٹیشن کی آواز پہ اس نے چونک کر دیکھا۔ ہیئر جیل ان کے کپڑوں پہ آ گری۔ وہ دھونے کے لیے واش روم گئی۔ وہی لمحہ تھا جب روہان اپنے کمرے کے ادھ کھلے دروازے میں قدم رکھتا ٹھٹک گیا۔ اسے زمان و مکان بھول گئے۔

وہ وہم نہیں تھی۔ حقیقت تھی۔ کوئی خواب نہیں تھی۔ اس کے سامنے اس کے کمرے میں اس کی ڈریسنگ چیئر پہ بیٹھی تھی۔

کھلے ہوئے بال ایک طرف کو پڑے تھے ڈارک پرپل اینڈ پنک لانگ شرٹ دوپٹے سے بے نیاز ساری جشر سامانیوں سمیت اس کے سامنے تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔

"سوری مجھے تھوڑی دیر لگ گئی۔ اصل میں جیل جم گئی تھی۔" کسی دوسری آواز پر چونکا اور فوراً" ہی پلٹ گیا شکر تھا کہ اس کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی ورنہ کیا سوچتی۔

"ارے روہان.... میرا بچہ...." فرحت بیگم جو امایہ کی تیاری دیکھنے جا رہی تھیں۔ اسے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ اسے چھو کر محسوس کرنے لگیں۔

"میرے بچے آ گئے تم...." اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامے بے ربط بول رہی تھیں۔

وہ بھی آوازیں سن کر دروازے کے بیچ آ کھڑی ہوئی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ اس کے کہنے کو کوئی اہم بھی سمجھ سکتا ہے۔ اس کے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے خوشی اس کے آنے کی تھی یا اپنی بات ماننے کی۔

"پلیز آپ ہیئر اسٹائل کا فائنل ٹچ لے لیں پھر باہر چلی جائیے گا مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔"

بیوٹیشن کی آواز پہ وہ پلٹ کر اندر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆
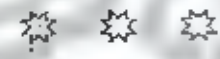
وہ پلک جھپکے بنا چھت کو تک رہا تھا۔ فرحت بیگم نے اسے آرام کے لیے کمرے میں بھیج دیا۔ مگر وہ مزید بے آرام ہو گیا۔ اس کے پرفیوم کی خوشبو اسے چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ ابھی بھی اس کے کمرے میں موجود ہے۔ اس نے اپنے دل کو ڈپٹا۔ سمجھایا وہ اس کے بھائی کی امانت ہے اب بھول جانا ہے۔ اپنے ہاتھوں اپنی محبت کھو بیٹھا ہے۔ ماما کی بات اس وقت مان لینی تھی۔ اب سب بے کار ہے۔ کب تک بھاگو گے روہان وہ تمہاری نہیں ہے بھلا دو اس کو۔

کچھ دیر گزری تو باہر ہلچل محسوس ہونے لگی شاید وہ آ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر سکون تھا۔ ٹھہراؤ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ امان کے ساتھ خوش ہے اگر وہ خوش ہے تو مجھے کیا ضرورت.... ہلکان ہونے کی.... وہ پھر سے سوچوں میں محو ہو گیا۔

یک دم عجیب و غریب شور کی آواز آنے لگی۔

وہ جھٹکے سے اٹھا اور سلیپر پہن کر باہر آ گیا۔ آوازیں امان کے کمرے سے آ رہی تھیں۔

گھٹی گھٹی چیخوں کی امان کے زور زور سے بولنے کی۔

"بتا حماد سے ملنے گئی تھی....؟"

"آہ.... نہیں امان.... میں روشانے آہ۔" روہان نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اندر کا منظر روہان کا خون کھولانے کے لیے کافی تھا۔

امان کے ہاتھوں میں امایہ کے بال تھے۔ اس کا میک اپ بری طرح خراب ہو چکا تھا ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔

"کیا جہالت ہے یہ امان چھوڑو اسے...." وہ دھاڑا اور ساتھ ہی اس کے بال بھی چھڑائے۔ بال چھوٹتے ہی اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر دوپٹا اوڑھ لیا۔

"روہان.... روہان تمہیں نہیں معلوم یہ حماد سے ملنے گئی تھی۔" وہ پھولی سانسوں کے ساتھ بولا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے وہ اپنی دوست روشانے کی شادی میں گئی تھی۔"

"نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں زوبار یہ بھی حماد سے ملتی تھی یہ بھی...."

"میں تمہارا گلا دبا دوں گا اگر تم نے آج کے بعد اس پر ہاتھ اٹھایا۔" اس نے بات کاٹی اور آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں امایہ ہاتھ میں میڈیسن اور پانی کا گلاس لیے آگے بڑھی۔

"امان میڈیسن لے لیں آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

اس کی آواز پہ امان پلٹا اور فوراً" ہی میڈیسن لے کر پانی کا گلاس ایک گھونٹ میں چڑھا گیا۔ اسے معلوم تھا میڈیسن میں سکون ہے۔

"سو جائیں پلیز آپ...." وہ اسے تقریباً" کھینچتے ہوئے بیڈ تک لے گئی۔ روہان کو شدید تاسف نے گھیر لیا۔

اسے اپنا آپ مس فٹ محسوس ہوا تو وہاں سے باہر نکل آیا۔ کس قدر شوہر پرست عورت ہے۔ مار کھا کر بھی اسی کی ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی مار کی عادی ہو گئی ہو.... کچھ بھی ہو یہ ظلم ہے اس کے ساتھ۔ صبح یہی بات اس نے فرحت بیگم سے کر دی۔

"وہ اسی سے سنبھلتا ہے.... میں بھی نہیں سنبھال سکتی اور اب تو کافی بہتری کی جانب آ رہا ہے۔ بس چاہتا ہے کہ امایہ ہر وقت اس کے سامنے رہے۔ بہت اچھی بچی ہے امایہ اسے کمرے سے باہر نکال لائی ہے کبھی کبھی سامنے پارک تک بھی لے جانے لگی ہے۔"

"ہوں.... " واقعی بہت اچھی ہے جبھی تو دونوں بھائی یہی چاہتے ہیں کہ وہ ہر وقت سامنے رہے...." اس کے دل نے جواب دیا تو دماغ نے دل کو جھڑکا۔

کیا فضول باتیں سوچ رہے ہو وہ امانت ہے۔

ہر تھوڑے دن بعد وہ مار کھاتی اور مڈل کلاس شوہر پرست عورتوں کی طرح اسے ٹریٹ کرتی۔

ایک بار تو حد ہو گئی امان نے پوری طاقت سے چائے کا مگ اسے کھینچ مارا تھا پھٹ گیا تھا۔ روہان نے بمشکل اس کے بینڈیج کری۔ بہت خون بہہ گیا تھا۔ مگر اب وہ نڈھال نڈھال سی رہنے لگی تھی۔

امان اس کی توجہ کا طالب تھا۔ نہ ملتی تو اسے جھنجوڑ دیتا۔

"آنٹی میں گھر جانا چاہتی ہوں...." وہ تھک گئی تھی شاید۔

"ک.... کیوں بیٹا.... سب خیریت تو ہے نا.... یوں اچانک....؟" وہ سامان سے بھرا بیگ لے کر کمرے سے نکلی اور فرحت بیگم کو اطلاع دی۔

"جی سب خیریت ہے پاپا آ رہے ہیں ایک دو دن میں...."

"اوہ.... ہاں۔" انہیں بھی احساس ہوا وہ تو اسے پتھر کی مورت جذبات سے عاری ہی سمجھنے لگی تھیں یا شاید ان کے بیٹے کی ملازمہ....

"بیٹا ایک دو دن بعد چلی جانا.... پلیز ابھی ماتھے کے زخم کو تو ٹھیک ہو لینے دو....." ان کی آنکھوں میں کیا کیا ہر رنگ میں التجا دکھائی دی۔

"یہ ٹھیک ہو جائے گا.... تو نئے زخم مل جائیں گے۔" وہ خود کلامی کے انداز میں اپنے زخم کو چھو کر بولی۔

اب تو ڈاکٹرز بھی ناامید ہونے لگے تھے۔ اسے لگتا کہ وہ خود بھی ٹھیک نہیں ہونا چاہتا شاید۔

"اچھا ابھی ڈرائیور تو ہے نہیں کچھ دیر میں روہان آ جاتا ہے۔ یا تمہارے انکل آ جائیں تو ان کے ساتھ چلی جانا۔"

"نہیں میں نے نبیل بھائی کو کال کر دی ہے وہ آ رہے ہیں۔"

اسے لگ رہا تھا وہ اپنی ٹانگوں پر مزید کھڑی نہیں رہ سکے گی تو صوفے پہ یوں ٹک گئی جیسے ویٹنگ روم میں

بیٹھی ہو۔

روہان آج لیٹ ہو گیا تھا۔ جبران صاحب نے اندر داخل ہوتے ہی سامنے صوفے پہ آڑی ترچھی امایہ کو پڑے دیکھا تو حیران رہ گئے۔

"امایہ۔ امایہ بیٹا۔" انہوں نے اسے آواز دی۔

جواب ندارد۔ وہ آگے بڑھے اس کے ہاتھ کو چھوا۔

"امایہ بیٹا روم میں جا کر سو جایئے۔" اس میں جنبش نہ ہوئی تو انہوں نے اس کی نبض ٹٹولی... دل کی دھڑکن معمولی رفتار سے انتہائی کم تھی۔

ملازمہ کے ہاتھ انہوں نے فرحت بیگم کو بلوایا۔

اس کی حالت دیکھ کر ان کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ بخار میں پھنک رہی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگیں۔

ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھیں۔ اسے پھر بھی ہوش نہیں آ رہا تھا۔ روہان کو کال کر کے بلوایا۔ وہ دوڑا چلا آیا۔

"لگی رہیں آپ اپنے بیٹے کو زندگی کی طرف لانے کی کوششوں میں دو زندگیاں برباد کر دیں۔

اسے کچھ ہوا نا... تو آپ اس کی قاتل ہوں گی۔

اسے جسے ماں باپ بیوی بچے تک کی پروا نہیں ہے اپنی انا سے زیادہ کچھ بھی عزیز نہیں اسے... کرتی رہیں اس کے لاڈ آپ... اور یہ... یہ کس قدر بے حس بنی رہتی ہے۔"

روہان آتے ہی اس کی حالت دیکھ کر چیخ پڑا۔ جبران صاحب نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے چپ کرایا۔

فرحت بیگم اپنے منہ پر دوپٹا رکھے رو رہی تھیں۔

روہان کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

وہ اسے کسی گڑیا کی طرح اپنی بانہوں میں اٹھا کر گیسٹ روم میں لے گیا۔ ہاسپٹل کال کر کے ضروری میڈیسن منگوائیں... اسے ڈرپ لگائی ساری رات اس کے پاس بیٹھ کر گزار دی۔

مستقل خود سے جنگ کرتا رہا۔ کسی بھی فیصلے پر نہ پہنچ رہا تھا۔

اس کے ہونٹ ہلے۔

"پا... پاپا۔" روہان کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ اتنی معصوم لڑکی ظلم کے پہاڑ سہہ رہی تھی۔ رات قطرہ قطرہ بھیگ رہی تھی۔ اس کی پلکوں میں جنبش ہوئی... روہان نے چمچے سے اس کے منہ میں پانی کے چند قطرے ڈالے۔ اس نے سوکھی زبان ہونٹوں پر پھیری اسے ہوش آ رہا تھا۔ روہان نے تھوڑا پانی اور اس کے منہ میں ڈالا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"امایہ... امایہ کیسا فیل کر رہی ہیں اب آپ...؟"

یہ پہلی براہ راست بات تھی اس سے۔ اس نے گردن ہلا کر اسے جواب دیا۔

"گڈ... پلیز زیادہ ہلیے گا نہیں آپ کو ڈرپ لگی ہے..." اس کی نگاہ اپنے تکیے پہ رکھے ہاتھ کی طرف گئی جس میں سے قطرہ قطرہ دوائی اس کے خون میں شامل ہو رہی تھی۔ اسی وقت فرحت بیگم نے کمرے میں جھانکا۔

"اب کیسی طبیعت ہے امایہ کی...؟"

"بہتر ہے۔" روہان نے جواب دیا۔

"بیٹا سو جاؤ تم بھی ساری رات سے بیٹھے ہو..."

"یہ اکیلی رہے گی کیا...؟" وہ بھی اب وہاں سے اٹھنا چاہ رہا تھا۔ ساری رات اسے تکتے گزری تھی ہر حد بھلا کر پوری رات اس نے اسے دیکھا تھا۔ سوچا تھا۔ لیکن کب تک ایک بار پھر سہرے بٹھا کر وہاں سے اٹھ گیا۔

"گڈ مارننگ پاپا!" صبح ناشتے کی ٹیبل پر آیا تو پاپا ٹیبل پر بیٹھے تھے۔

"گڈ مارننگ سن۔"

"پاپا ایک بات بتائیں گے...؟" وہ دونوں ڈائننگ ٹیبل پہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ملازمہ ناشتا لگا رہی تھی۔ "آپ کیا سمجھتے ہیں اماں کے ساتھ ٹھیک ہو رہا ہے؟" ان کا جوس کی طرف جاتا ہاتھ رک گیا انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ ابھی بات ہی کر رہا تھا کہ فرحت بیگم کے سہارے سے وہ آتی دکھائی دی۔

"کہاں....؟" وہ بھنویں اچکا کر بولا۔

"امان بلا رہا ہے اسے۔" فرحت بیگم دھیمے لہجے میں بولیں۔

"آپ واپس اندر جائیں...." وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑا ہوا پہلے فرحت بیگم پھر امایہ سے مخاطب ہوا۔ ملازمہ اسے واپس گیسٹ روم میں لے گئی۔

"آج کے بعد یہ مجھے امان کے قریب بھی نظر نہ آئے...." وہ انگلی اٹھا کر بولا اور زوردار آواز میں دروازہ بند کر کے گھر سے باہر نکلتا چلا گیا۔

فرحت بیگم دونوں ہاتھوں میں سر گرا کر بیٹھ گئیں۔ جبران صاحب نفی میں گردن ہلا کر کھڑے ہوئے بریف کیس اٹھا کر باہر نکل گئے۔ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز کا مطلب تھا وہ بھی چلے گئے۔ ناشتا ٹیبل پہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

سارا دن امایہ نے غشی کی حالت میں گزارا۔

شام میں طبیعت کچھ بہتر محسوس ہوئی تو غسل کا جی چاہنے لگا۔ اپنے کمرے کی طرف دھیرے دھیرے قدموں سے بڑھ گئی۔ فرحت بیگم کچن میں رات کے کھانے کی تیاری کروا رہی تھیں ورنہ اسے ضرور روک لیتیں۔ امان واش روم میں تھا وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"کہاں گزار کر آئی ہو رات....؟" وحشیانہ انداز میں اس نے اس کے بال پکڑے.... اور مکوں کی بارش کر دی....

"چھوڑیں امان....؟" اس کے رونے پر وہ اور پاگل ہو گیا۔ اس کے ماتھے کی چوٹ پھر سے کھل گئی خون بھل بھل بہنے لگا۔ وہ اسے نیچے گرائے لاتیں مار رہا تھا۔

روہان جو سارا دن باہر گزار کر آیا تھا۔ شور سن کر سیدھا اس کے کمرے کی طرف بھاگا۔ خون میں لت پت بے حس و حرکت پڑی تھی۔

روہان امان پر پل پڑا۔ اس کا گلا دبوچ لیا۔ "میں نے کہا تھا نا تیرا گلا دبا دوں گا۔" امان کی آنکھیں باہر کو ابل آئیں۔ فرحت بیگم چیخ پڑیں۔ بمشکل اسے چھڑایا۔ امان گلا سہلاتا پیچھے کو ہٹا۔

"خدا کے واسطے روہان امایہ کی حالت دیکھو اسے جھٹکے پڑ رہے ہیں۔ روہان اسے دھکا دے کر امایہ کی جانب لپکا۔ اسے بانہوں میں اٹھا کر دوڑا.... گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹایا۔ فل اسپیڈ سے گاڑی دوڑاتا اسپتال پہنچا۔

ڈاکٹر اکبر کو راستے سے ہی کال کر دی تھی۔ ان کی وائف گائناکولوجسٹ تھیں یہ پولیس کیس تھا۔ لیکن ڈاکٹر اکبر نے تمام معاملات سنبھال لیے۔ کچھ ہی دیر میں جبران صاحب اور فرحت بیگم بھی چلے آئے۔

روہان نے ماں کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

"بلڈ کی ضرورت ہے...." ڈاکٹر اکبر نے آہستگی سے کہا تو وہ اسے خون دینے چلا گیا۔ اس کا خون قطرہ قطرہ امایہ کی رگوں میں جانے لگا۔

آپریشن کی فوری ضرورت تھی۔ آنے والی ننھی کونپل اپنے باپ کے ظلم کا شکار ہو کر ختم ہو چکی تھی۔

فرحت بیگم کے پاس ملازمہ کی کال آئی کہ امایہ کے باپ اور چچا اس سے ملنے آئے ہیں۔

جبران صاحب نے لہجے کو ہشاش بشاش بناتے ہوئے کہا کہ ہم لونگ ڈرائیو پہ نکلے ہوئے ہیں۔ دو گھنٹے تو لازمی لگیں گے اگر فوراً بھی واپسی کریں گے۔ آپ انتظار کریں یا ہم صبح امایہ کو لے آئیں گے۔

انہوں نے دوسرا آپشن قبول کیا۔ جبران صاحب نے چند رسمی کلمات کہہ کر فون بند کر دیا۔ اور گہری سانس لی۔

باہر بارش بڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر اکبر نے زبردستی جبران صاحب اور فرحت بیگم کو گھر بھیج دیا۔

خون دے چکنے کے بعد روہان کو بھی غشی ہونے لگی تھی۔ دو دن اس نے کمر نہیں ٹکائی تھی۔ ڈاکٹر اکبر نے صرف کچھ گھنٹے اسے آرام کرنے کے لیے زبردستی اپنے ڈرائیور کے ساتھ گھر بھیج دیا۔

گھر آ کر بھی پوری رات خیالوں میں گزر گئی تھی۔ باہر گرج چمک کے ساتھ دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ رات بھر اسموکنگ سے کالے پڑ چکے تھے وہ اپنے مضبوط مردانہ ہاتھوں کا مکا بنا تا دھیرے دھیرے چیئر پہ مار رہا تھا۔ اس کا ذہن الجھنوں کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔

موبائل کی ٹون پر اس کی سرخ نگاہیں گھڑی کی طرف اٹھیں۔ ساڑھے چار بج گئے تھی۔ ٹیبل سے موبائل اٹھایا۔ ڈاکٹر اکبر کالنگ لکھا تھا۔

"ہیلو...." اسے اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی سنائی دی۔

ڈاکٹر اکبر نے اسے زندگی کی نوید سنائی.... وہ جو ڈگمگا رہا تھا۔ یک دم ہی اک فیصلے پر تھم کر پرسکون ہو گیا۔ گہری سانس لی گاڑی کی چابی اٹھائی اور کمرے سے نکل گیا۔ فرحت بیگم لاؤنج میں ٹہل رہی تھیں۔

"کیسی کنڈیشن ہے امایہ کی....؟"

"بہتر ہے۔" وہ مختصر جواب دے کر آگے بڑھنے لگا کہ فرحت بیگم کی آواز نے پھر سے قدم روک لیے۔

"امان کی حالت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی روہان اسے دیکھتے جاؤ...." وہ ڈرتے ڈرتے ماںتا سے مجبور ہو کر بولیں۔

"جہنم میں جائے...." وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ ماں کی التجا اس کے کانوں میں گونجی تو واپس پلٹ گیا۔ کارپٹ پر امان بے حس و حرکت پڑا تھا۔

ڈرگز کی کافی مقدار شاید وہ اندر اتار چکا تھا۔ اس کا اندازہ اس کے پاس پڑی بوتلوں سے ہو رہا تھا۔

وہ آگے بڑا اس کی نبض تھامی....

اس کا ہاتھ پتھرا چکا تھا.... ہاتھ میں نبض کہیں محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ دوسرا ہاتھ تھاما دھڑکن نہ جانے کب کی رکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ روہان نے اس کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر بند کر دیں۔ وہ ڈاکٹر تھا جان دار اور بے جان میں فرق محسوس کر سکتا تھا۔

فرحت بیگم کی کسی انہونی خدشے سے چیخیں نکل گئیں۔ وہ انہیں ساتھ لیے کمرے سے باہر آ گیا۔ کچھ کالز کیں۔ کچھ دیر میں گھر مہمانوں سے بھر چکا تھا۔

سب کو یہی بتایا گیا کہ امان اور امایہ دوسری گاڑی میں تھے بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا۔ امان جان سے گیا امایہ اولاد سے.... ہر ایک کی آنکھ پر نم تھی جوان موت پہ.... فرحت بیگم کو سکتہ ہو گیا۔ امایہ کے رشتے دار پہلے امایہ کو ہسپتال میں ICU میں شیشے کے پار مشینوں میں جکڑا دیکھ آئے۔ پھر امان کی تدفین میں شرکت کی۔

ایک ہفتے میں امایہ ڈسچارج ہو گئی۔ فرحت بیگم کا اس پہ کوئی حق نہ تھا کہ اسے اپنے گھر لاتیں۔ وہ ایک بار پھر اپنی تائی کے رحم و کرم پہ تھی۔ عدت کے بعد ابرار صاحب اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ وہ پتھر کا مجسمہ بن چکی تھی۔ طوبیٰ بیگم کو اسے دیکھ ہول اٹھنے لگتے۔ روشانے بھی کئی بار آئی گھنٹوں اکیلے بول کے چلی جاتی۔

ابرار صاحب اس کے کاغذات بنوا رہے تھے۔

تقریباً" ایک ماہ بعد فرحت بیگم نے امایہ سے ملنے کی خواہش کی تو روہان انکار نہ کر سکا۔ وہ خود بھی دشمن جان سے ملنا چاہتا تھا۔ طوبیٰ بیگم نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ چند رسمی کلمات کے بعد انہوں نے اس کی حالت بتائی تو وہ مزید بے چین ہو گیا۔ کچھ دیر میں طوبیٰ بیگم انہیں ساتھ لیے اس کے کمرے میں آ گئیں۔ وہ بیڈ پہ چت لیٹی تھی۔

"امایہ دیکھو کون آیا ہے...." ان کی آواز پہ اس نے پلٹ کر دیکھا اور جھٹ سے ان کے سینے سے آ لگی۔

"آپ.... آپ کہاں تھیں.... مجھے بھول گئیں.... کوئی اپنی بیٹی کو بھی بھول سکتا ہے.... بیٹی کہتی تھیں نا آپ مجھے.... بتائیں؟؟" وہ ان کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے سوال و جواب کر رہی تھی۔

فرحت بیگم نے اسے پھر سے سینے میں بھینچ لیا۔ تائی امی ناک پہ انگلی رکھے اسے دیکھ رہی تھیں۔ پورے ایک ماہ بعد اس نے زبان کھولی تھی۔ وہ ان کی بانہوں میں بکھر گئی تھی۔

بہت مشکل سے سنبھالا انہوں نے۔ بیڈ پہ بٹھا کر پانی پلایا۔ روہان جو اس سے نظریں چرائے کھڑا تھا اب

تک یکدم نظر پڑی تو دنگ رہ گیا۔ وہ امایہ تو نہیں تھی۔ وہ تو۔۔۔ وہ تو کوئی ڈھانچہ تھی ہڈیوں کا۔ الجھے بکھرے بال۔۔۔ ملگجے سے حلیے میں۔ اسے یکدم وہی ہنستی مسکراتی پنک فراک میں چہرے پہ ہزاروں رنگ لیے اپنے باپ سے ملتی یاد آئی۔ کتنا فرق تھا اس امایہ میں اور اس میں

اس نے فرحت بیگم کو رات رکنے کے لیے کہا۔ روہان انہیں وہاں چھوڑ کر گھر چلا آیا۔ وہ رات بھر جاگ کر اس سے چھوٹی موٹی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ صبح اس نے عجیب سی فرمائش کر ڈالی۔

"آپ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں پلیز۔" کتنی التجا تھی اس کے لہجے میں فرحت بیگم کا دل کٹ گیا۔

"عدت پوری ہو جائے پھر کچھ دن کے لیے چلی چلنا۔"

"سچ کہہ رہی ہیں نا۔۔۔"

"ہاں۔۔۔" انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔

"اب کب آئیں گی۔۔۔" وہ چلتے چلتے ان کے ساتھ لاؤنج میں آ گئی۔ سامنے ہی جالی کا دروازہ تھا وہ اس سے باہر نہیں جا سکتی تھی کہ باہر ملازمین موجود تھے۔

"بہت جلد۔۔۔" وہ اس کے ماتھے پہ بوسہ دے کر باہر نکل آئیں۔ روہان باہر ان کا انتظار کر رہا تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی ان کا ضبط جواب دے گیا۔ آنسو پلکوں کی باڑ توڑ آئے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر کے سیٹ کی بیک سے سر ٹکا لیا۔

"کیا ہوا ماما۔۔۔؟" اس نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

بند آنکھوں سے ہی اس کے ہاتھ کو تھپکی دی اور لب بھینچ لیے۔

وہ خود اپنے اندر سوال و جواب کی سکت نہ رکھتا تھا۔ سو گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☆ ☆ ☆

وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ وہ اپنے آفس میں آنکھیں موندے راکنگ چیئر پہ بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر دلنشین ناک کر کے چلی آئی۔

"کیسے مزاج ہیں جناب کے۔۔۔؟"

"فائن۔"

"کین آئی سٹ ہیئر۔" (کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔)

"یس۔"

"اس بار ویک اینڈ پہ آپ کا کیا پروگرام ہے۔۔۔؟"

"کچھ خاص نہیں کیوں۔۔۔؟"

"25 دسمبر آ رہا ہے نا۔۔۔ ڈاکٹر خاور کی ویڈنگ اینورسری ہے۔ پہلے ہم سب کا پروگرام تھا کہ کوئی فارم ہاؤس بک کرا لیتے ہیں لیکن ڈاکٹر خاور نے اپنے ہی فارم پر ہم سب کو انوائٹ کر لیا۔ ابھی مینیو طے ہو رہا ہے باربی کیو کر رہے ہیں۔ میں نے سوچا آپ تو باربی کیو شوق سے نہیں لیتے تو آپ کے لیے اسپیشلی میں اپنے شیف سے کوئی آپ کی فیورٹ ڈش بنوا لاؤں گی۔ پھر آپ بتا دیں کہ کیا بنوانا ہے؟" ڈاکٹر دلنشین کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی ڈاکٹر روہان بس خاموشی سے اسے تکتے ہی رہے تو وہ کچھ الجھ سی ہو گئی۔

اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجاتے ہوئے بولی۔

"کہاں گم ہو گئے آپ۔۔۔ کچھ سنا آپ نے جو میں نے کہا۔۔۔؟"

"آں۔۔۔ ہاں۔۔۔ آپ نے کہا نا کہ 25 دسمبر آ رہا ہے۔" ڈاکٹر دلنشین مسکرائی وہ واقعی اسے سن رہے تھے۔

"ہوں۔۔۔ اور۔۔۔" وہ ابھی بھی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

"اور۔۔۔ اور یہ کہا کہ۔۔۔ 25 دسمبر کو امایہ کی عدت ختم ہو جائے گی۔۔۔ یہی کہا نا۔۔۔؟" روہان نے الجھی نظروں سے دیکھا اسے۔۔۔ کہ واقعی اس نے یہ کہا۔

"امایہ۔۔۔ امایہ کون۔۔۔ آپ کے بھائی کی مسز۔۔۔؟"

"ہوں۔۔۔ ہاں۔"

"میں نے آپ سے ایسا کچھ بھی نہیں کہا ہو سکتا ہے آپ خود سے باتیں کر رہے ہوں۔۔۔ اوکے میں چلتی ہوں اس وقت آپ بزی ہیں شاید۔۔۔"

وہ آف موڈ کے ساتھ اپنا پرس اٹھاتی اٹھی اور روم سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر روہان کی سوچوں میں اس کے باہر جانے سے بھی کچھ فرق نہ پڑا۔

"آج ضرور ماما سے بات کروں گا۔" اپنی فائلیں سمیٹتے ہر روز خود سے یہی کہتا لیکن گھر جا کر کہنے میں جھجک آڑے آ جاتی۔

اس نے فارم ہاؤس جانے سے معذرت کر لی کیونکہ فرحت بیگم نے اسے کہہ رکھا تھا کہ تکمیل عدت پہ وہ امایہ کے لیے جوڑا اور کچھ چیزیں لے کر جائیں گی۔

نہ جانے امایہ کی اور فرحت بیگم کی فون پہ کیا بات ہوئی تھی جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو امایہ صاف ستھرے حلیے میں اس دن سے قدرے بہتر محسوس ہوئی۔ وہ تین ماہ بعد اسے دیکھ رہا تھا۔ فرحت بیگم کو ملنے آنا ہوتا تھا تو وہ باہر ہی سے چھوڑ جایا کرتا۔

وہ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے کہ امایہ کمرے سے ایک بیگ لے آئی جس میں شاید اس کے کپڑے وغیرہ تھے۔ اس نے بڑی سی چادر پھیلا کر اوڑھی۔

"تیار ہو بٹیا۔" فرحت بیگم سلائس کا گلاس رکھتے ہوئے بولیں۔

"جی۔۔۔"

"اچھا بہن اجازت۔۔۔" اب وہ تائی امی سے مل رہی تھیں۔

لاؤنج کے دروازے میں سب سے آگے روہان تھا اس کے ہاتھ میں امایہ کا بیگ تھا۔ اس کے پیچھے امایہ اور پھر فرحت بیگم۔

یکدم ہی روشانے گیٹ سے آتی دکھائی دی۔

حال احوال لینے کے بعد اس کی نگاہ روہان کے ہاتھ میں موجود امایہ کے بیگ پر پڑی۔

"کہیں جانے کی تیاری ہے۔۔۔؟"

"ہاں میں کچھ دن کے لیے آنٹی کے ساتھ رہنے جا رہی ہوں۔۔۔" امایہ نے کچھ جھجک کر بتایا۔

"کس رشتے سے جا رہی ہو امایہ۔۔۔"

روشانے کے سوال پہ جو جہاں تھا وہاں کھڑا رہ گیا۔

"رشتہ۔۔۔" امایہ کی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے ایک نظر بیگ پکڑے روہان کو دیکھا پھر فرحت بیگم کو اور وہیں بیٹھتی چلی گئی۔

روشانے تیزی سے آگے بڑھی اور اسے سنبھال کے صوفے پہ بٹھایا۔ روہان برے دل سے اس کا بیگ وہیں دروازے کے بیچوں بیچ رکھ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ فرحت بیگم اس کے پیچھے باہر کو لپکیں۔

"روہان۔۔۔ روہان بیٹا۔۔۔" ان کے آوازیں لگانے کے باوجود وہ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔

"کہاں سے لاؤں میں اس کا اپنے سے رشتہ۔" وہ پھپھک کر رو دیں۔

"ایک بیٹا مرا ہے دوسرا تو زندہ ہے نا۔۔۔" اس کی آواز پہ وہ رونا بھول کر اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

"تمہارا مطلب ہے۔۔۔ تم۔۔۔ بیٹا یہ زور زبردستی کے رشتے نہیں ہوتے سوچ سمجھ لو۔۔۔ جذبات میں آ کر کوئی فیصلہ مت کرو۔" وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولیں۔

"نہ زور زبردستی ہے نہ جذباتی فیصلہ آپ جا کے اس کی دوست کو بتا آئیں بہت جلد ہم رشتہ بنا کر اسے لینے آئیں گے۔" جو بات اتنے عرصے سے نہ کہہ سکا تھا۔ وہ ایک لمحے میں کہہ گیا انہوں نے فرط مسرت سے اس کی پیشانی چوم لی۔

جب وہ دوبارہ اندر داخل ہوئیں تو خوشی ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

"روشانے بیٹا۔۔۔ آپ نے رشتہ پوچھا ہے نا۔۔۔" اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے روشانے کو مخاطب کیا۔

وہ جو امایہ کو پکڑے اس کے کمرے میں لے جا رہی تھی۔ ٹھٹک کر رک گئی۔

"میں۔۔۔ میں روہان کے لیے امایہ کو مانگتی ہوں۔" انہوں نے طوبیٰ بیگم کے آگے اپنی جھولی پھیلا لی۔

"بہن مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھلا۔۔۔ آپ ابرار سے کہہ دیجیے۔ امایہ پہلے بھی آپ کی تھی آپ کی ہی رہے گی۔"

وہ جس کی زندگی کا فیصلہ تھا وہ سن کھڑی تھی۔ زندگی کیسے کیسے امتحان لے رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔

"بولو بیٹا تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں....؟" وہ چند قدم آگے بڑھ کر اس سے بھی پوچھ رہی تھیں۔ روشانے نے اس کا ہاتھ دبایا۔ کہ وہ انکار کردے۔

"نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ روشانے کے منع کرنے کی پروا کیے بنا بولی اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی نا جانے کیسے ٹانگوں میں جان پڑ گئی تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے.... دوبارہ اس جہنم میں جانے کے لیے تیار ہو گئی ہو.... ابھی پرانے زخم مندمل نہیں ہوئے نئے لگوانے چلی ہو....." کمرے میں آتے ہی روشانے اس پر چیخ پڑی۔

"وہاں زخم لگتا تھا تو مرہم لگانے والے بھی موجود تھے روشی.... ان چار مہینوں میں ہر زخم ادھڑ گیا ہے یہاں میرا.... تم کچھ بھی کہو میں اپنے فیصلے سے مطمئن ہوں۔"

"جیسے تمہیں دوسرا کوئی رشتہ تو ملے گا ہی نہیں نا۔"

"تم نہیں سمجھو گی روشی تم وہاں میری وہی قدر ہو گی جو پہلے تھی دوسری کسی جگہ پہ میری وہ عزت نہیں ہو گی۔"

"عجیب منطق ہے تمہاری...."

"عجیب نہیں ہے۔"

"بھاڑ میں جاؤ۔"

وہ اسے ایک بار پھر اسی جہنم میں جلتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے روہان سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"روہان صاحب بات کر رہے ہیں....؟"

گھر آ کر اس نے سب سے روہان کو کال ملائی۔

"جی فرمایئے۔"

"میں روشانے بات کر رہی ہوں۔ امایہ کی دوست۔"

"جی.... کہیے۔"

"آپ نے رشتہ کیوں دیا ہے امایہ کا.... آپ کو معلوم ہے وہ دکھوں کی ماری لڑکی ہے پہلے آپ کے بھائی کے تشدد کا نشانہ بنی رہی اور اب آپ.... آپ لوگوں کو اور کوئی نہیں ملی تو دوسری باری میں بھی میری معصوم دوست ہی نظر آئی۔ اگر ذرا بھی شرافت ہے آپ کے اندر تو برائے مہربانی اس بات کو یہیں ختم کر دیجیے وہ پہلے ہی آپ کے نفسیاتی بھائی کے ہاتھوں مار کھا کر ادھ موئی ہو چکی ہے آپ کیا سمجھتے ہیں آپ لوگوں کے جھوٹ پر دنیا نے یقین کر لیا ہو گا۔ مگر میں نے اس کے زخم پرانے دیکھے ہیں۔ دھوکے سے کی ہے آپ لوگوں نے شادی۔

ایکسیڈنٹ میں سگریٹ کے جلے نشان نہیں پڑتے۔ وہ بے وقوف بن گئی ہے آپ کے ہاتھوں.... اور اس کی تائی تو چاہتی ہی یہی ہیں کہ اسے ہر پل تکلیف دیں۔" اس کی آواز بھرا گئی اس نے کال کاٹ دی۔ چند پل گزرے ہوں گے اس کے موبائل پر بیل ہونے لگی۔

"جی فرمایئے....؟" وہ چیخی۔

"مجرم کو بھی پھانسی سے پہلے ایک موقع صفائی کا دیا جاتا ہے.... کیا آپ مجھے موقع فراہم کریں گی کہ اپنی صفائی میں کچھ بولوں....؟"

"بولیے۔" روشانے نے حاتم طائی کی قبر پہ لات ماری۔

"نہیں ایسے نہیں.... کہیں بیٹھ کر آرام سے قصہ بہت پرانا ہے۔"

"یہ مت سمجھیے گا کہ میں آپ کی باتوں میں آجاؤں گی۔ لیکن پھر بھی سن لیتے ہیں حرج نہیں بتایئے کہاں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

وقت اور جگہ ڈیسائڈ کر کے اس نے کال ڈراپ کر دی۔

☆ ☆ ☆

وہ منہ اندھیرے میں ہی کمرے سے نکل آئی۔ اماں تخت پہ بیٹھی نماز میں مشغول تھیں اسے افسوس ہوا نماز تو مجھے بھی پڑھنی چاہیے پلٹ کر کمرے میں گئی فجر کی نماز ادا کر کے خوب دعائیں کیں.... دل کچھ ہلکا ہوا تو باہر پو پھٹنے لگی تھی۔ وہ ٹیرس میں کھڑی ہوئی سورج نکلنے کا منظر اس قدر حسین ہوتا ہے روشانے شاید پہلی بار اپنی بائیس سالہ زندگی میں دیکھ رہی تھی دم بخود رہ گئی۔ جب سورج کی تیز شعاعیں اس کی آنکھوں میں چبھیں تو اسے خیال آیا کہ وہ کیا سوچنا چاہ رہی تھی۔ ڈاکٹر روہان سے بات کرنے کے لیے اس نے ہامی تو بھر لی تھی لیکن ان کی پرسنالٹی میں کچھ ایسا سحر تھا ان کے آگے بات کرنے والا خود کو چغد محسوس کرے لیکن اسے یہ رسک لینا تھا' روشانے خود ایسی تھی کہ لوگوں کی بولتی بند کرا دیتی۔ وہ دل ہی دل میں الفاظ ترتیب دینے لگی۔

دوپہر کو جب وہ تیار ہو کر نکلی تو صبح والے موسم کا شائبہ تک نہ تھا۔ تیز چلچلاتی دھوپ تھی اس نے ماتھے پہ ٹکائے گاگلز کو آنکھوں پر لگایا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

مال کے فوڈ کورٹ تک جب پہنچی تو دو بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ اندر داخل ہوئی تو سامنے ہی ڈاکٹر روہان ریزرو ٹیبل پہ موجود تھے۔ سلام دعا کے بعد سوفٹ ڈرنک کا آڈر دیا۔

"سب سے پہلے تو آپ یہ بتایئے کہ آپ نے کس ہمدردی یا پالیسی کے تحت یہ رشتہ دیا ہے؟" روشانے نے اسے کٹہرے میں کھڑا کیا۔

"ہوں.... تو آپ پہلے میرا انٹرویو لیں گی۔ پھر ہی مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہو گی....؟ روہان کے سوفٹ ڈرنک کا گلاس ٹیبل پہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں میں آپ سے زیادہ نہیں پوچھوں گی اور آپ کی بھی زیادہ نہیں سنوں گی۔"

"ٹھیک اگر میں آپ کو آپ کے پہلے سوال کا جواب دوں تو کیا آپ یقین کریں گی؟"

"جی بتائیں لیکن سو فیصد سچ۔"

"نہ ہمدردی.... نہ پالیسی...." ڈاکٹر روہان نے ڈرامائی وقفہ لیا جو کہ روشانے کو سخت گراں گزرا۔

"صرف اور صرف محبت۔

آپ کو وہ دن تو یاد ہوگا جب آپ کی دوست کو سوبر کلر کا فراک نہیں مل رہا تھا۔ لیکن... ہو سکتا ہے اکثر ہی ایسا ہوتا۔ میں بتاتا ہوں وہ غالباً" نہیں یقیناً" ان کی کزن فرح کی بارات والے دن کے لیے تھا اور کسی شاپ کیپر نے آپ کی دوست کا مسئلہ چٹکیوں میں حل کر دیا تھا۔ ذرا ذہن پہ زور دیجیے... کیا آپ کو میری شکل اس شاپ کیپر سے نہیں ملتی ہوئی لگتی۔"

"شاپ کیپر... ڈاکٹر۔" روشانے کو وہ یاد آگیا تھا لیکن وہ پریشان تھی کہ ایک شاپ کیپر ڈاکٹر کیسے ہو سکتا ہے اور ڈاکٹر کیسے...

"او کے او کے آپ اپنے ننھے ذہن پر زور مت دیجیے وہ تھا میری محبت کا پہلا دن... پھر دوسرا دن جب وہ ڈارک مہندی اور میرون گھیردار فراک میں فل میک اپ اور چوڑیوں کے ساتھ آنسو لیے پلٹی تھی۔"

روشانے کو لگا اب اسے یقین کرنا پڑے گا۔

اسے یاد تھا جب تائی امی نے اس کے ڈارک میک اپ پر طنز کیا تھا۔

"اور تیسرا دن... ہاں وہ میری پسند کی بے بی پنک فراک پہنے اڑتی ہوئی کسی آسمانی حور کی طرح اپنے باپ کے سینے سے لگی تھی۔

بس یہی کل تین دن کی تھی میری محبت...

اور میں پاگل اسے اپنا سمجھتا رہا۔ جس کا نام بھی نہ جانتا تھا۔

دوسری طرف میرے بھائی کے ساتھ پہلی شادی کی ناکامی کی وجہ سے کچھ نفسیاتی کیس چل رہا تھا ڈاکٹرز نے شادی ہی اس کے مسئلے کا حل بتایا تھا۔ میں اس کی شادی کے خلاف تھا۔ لیکن لوگوں کے سمجھانے پر اور ماں کا درد نہ دیکھ سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی مما کو کہہ دیا کہ آپ امان کی شادی کر دیں لیکن سب کچھ پہلے بتا دیں امان کی کنڈیشن۔ آہ... وہ میری قسمت کہ جو میرے دل میں بسنے لگی تھی میرے بھائی کے گھر میں بس گئی۔ بٹ میری ماں اک بار پھر میرے پاس آئیں ان لڑکیوں میں کسی کو پسند کر لو مگر میں نے بنا دیکھے وہ تصاویریاں کو لوٹا دیں۔

"کہاں تک سناؤں..." روہان کہتا جا رہا تھا روشانے دم بخود اسے سن رہی تھی۔

"تو کیا... امایہ کی تائی کو سب خبر تھی..." ڈاکٹر روہان کے خاموش ہونے پہ روشانے کے صرف لب ہلے تھے۔ کیونکہ روہان اسے دیکھ رہا تھا سو سمجھ گیا۔

"جی آپ کی تائی کیا آپ کی نفسیاتی دوست کو بھی معلوم تھا۔"

"کیا آپ... آپ امایہ کو نفسیاتی کہہ رہے ہیں؟"

"تو کیا آپ کی دوست کو روزانہ صبح شام مار کھانے پہ اکیس توپوں کی سلامی دی جائے۔ ایسی بھی کیا شوہر پرستی کیا لاوارث تھی وہ... جو مار کھا رہی تھی... میں نے جب بھی اسے سپورٹ کیا۔ اس نے ٹھینگا دکھایا مجھے..." آخر میں جس انداز سے وہ بولا تو سیریس ماحول میں بھی روشانے کو ہنسی آگئی۔

"چڑھا دیجیے اب مجھے پھانسی... سنا دیجیے سزا۔"

"آپ کو معلوم ہے روہان بھائی... میں امایہ سے کیا کہتی تھی میں کہتی تھی کہ تم جیسی معصوم اور پاکیزہ لڑکی کے لیے بہت سارے خوشیوں کے دروازے کھلیں گے اور میں آپ سے اس کی خوشیوں کے لیے وعدہ لینے کی ضرورت نہیں سمجھتی۔" روشانے شاہانہ انداز میں کہتی کھڑی ہوئی۔

"لنچ..." روہان پہلے تو اس کے بھائی کہنے پہ حیران تھا اور اب اس کی بات میں الجھا تھا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی ... کچھ نہ سمجھ آنے پہ اس سے لنچ کا ہی کہہ دیا۔

"ڈیو رہا لنچ آپ کی طرف سے بلکہ اب تو ہوتے ہی رہیں گے ڈنر بھی آپ کے ساتھ۔" وہ اس کی طرف مسکراہٹ اچھالتی ہاتھ ہلاتی یہ جا وہ جا... اسے بہت جلدی تھی اپنی دوست کو خوشیوں کی نوید سنانے کی روہان کی آنکھوں میں چھم سے دکھ بھری آنکھوں والی لڑکی آگئی۔ وہ مسکرا کر ٹیبل کو دھیرے دھیرے انگلیوں سے بجانے لگا کہ اب اس نے اس کے تمام دکھ چن لیے تھے۔ اسے باہر کا تپتا سورج بھی ٹھنڈا پر سکون لگا کہ اس کے چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔

☆☆

نفیسہ سعید

گر جو سمجھے باتیں

اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں ہم ایک ہیں
سانجھی اپنی خوشیاں اور غم ایک ہیں غم ایک ہیں

اسکول گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی، نجم السحر کے کانوں سے ٹکرانے والے اس ملی نغمہ نے ان کی پوری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ اپنے آفس جاکر انہوں نے ہینڈ بیگ ٹیبل پر رکھا' اپنا دوپٹا ایک بار پھر سے درست کیا کہ اسی پل خورشید ان کے لیے پانی کا گلاس لیے اندر داخل ہوئی۔

"السلام علیکم میڈم جی۔"

"وعلیکم اسلام یہ گلاس یہاں ٹیبل پر رکھ دو' میں پہلے ذرا سارے اسکول کا ایک راؤنڈ لے لوں پھر آکر پیتی ہوں۔"

سویرے سویرے اسکول کا راؤنڈ خورشید کو حیران کر گیا عام طور پر تو میڈم بریک کے بعد اپنے راؤنڈ پر نکلتی تھیں اور کبھی زیادہ مصروفیت ہوتی تو وہ کبھی نہیں اتنی صبح آتے ہی وہ کبھی اس طرح راؤنڈ پر نہ نکلتی تھیں جیسے کہ آج' لیکن ظاہر ہے وہ ان سے یہ سوال نہیں کر سکتی تھی اس لیے

"اچھا جی۔" کہہ کر فوراً" آفس سے باہر نکل آئی۔

نجم السحر سامنے والے کاریڈور میں داخل ہوئیں جس کے آخری سرے پر جمنازیم تھا۔ جہاں سے آنے والی ملی نغمہ کی آواز ابھی بھی ان کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ جس نے ان کے دل میں موجود وطن کی محبت کو مزید جلا بخش دی تھی۔

ہمارا پرچم یہ پیارا پرچم
یہ پرچموں میں عظیم پرچم

کسی بھی کلاس میں داخل ہوئے بنا وہ سیدھی جمنازیم کے دروازے پر جا پہنچیں' جہاں بالکل سامنے کرسی پر مس سدرہ غنی پورے جوش و خروش سے بچوں کی' چودہ اگست کے حوالے سے ہونے والے پروگرام کی تیاری میں مصروف تھی۔ یہ اسکول کی ایک ایسی قابل ٹیچر تھی' جس پر بحیثیت پرنسپل نجم السحر کو ہمیشہ ایک خاص فخر رہا۔ یہ ہی وجہ تھی جو انہوں نے چودہ اگست کے اس خاص فنکشن کی تیاری کی ذمہ داری اسے سونپی تھی۔

اس سال انہوں نے یہ تقریب گزشتہ سالوں کی مانند زیادہ وسیع پیمانے پر ترتیب دینے کا انتظام کیا تھا' جس کی خاص بات اس میں شریک ہونے والے مہمانان خصوصی تھے۔ جن میں سے زیادہ تر کا تعلق محکمہ تعلیم سے تھا۔ ایک دو لوگ حکومت سے متعلق بھی تھے۔ دراصل وہ اس تقریب کے ذریعے اپنے اسکول کی مزید پبلسٹی چاہ رہی تھیں' یہ ہی وجہ تھی کہ تمام طلبا کے والدین کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ جبکہ اس تقریب کی اطلاع بذریعہ اخبارات سب کو دی گئی تھی۔ دراصل اس کے اسکول کے قریب حال ہی میں ایک نیا اسکول کھلا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس کی وجہ سے ان کے داخلوں میں پہلے کی نسبت ذرا سی بھی کمی واقع ہو۔ دروازے کے قریب کھڑی وہ ان ہی سوچوں میں گم تھیں جب اچانک مس سدرہ کی نگاہ ان پر پڑی اور وہ یک دم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"گڈ مارننگ میم۔"

"گڈ مارننگ۔"

مسکراہٹ بھرا جواب دیتے ہوئے انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کا بھی کہہ دیا' کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی اس طرح اچانک جمنازیم میں آمد بچوں کو کنفیوز کر دے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ بچوں کے درمیان خاموشی سے گزرتی وہ پیچھے رکھے ایک ڈیسک پر جا بیٹھیں۔ انہوں نے دیکھا مختلف کلاسز کے بچے یہاں جمع تھے ملی نغمے' تقاریر اور ٹیبلو سب کی تیاری ایک ساتھ جاری تھی۔ جب اچانک انہیں کچھ یاد آیا اور وہ سدرہ کو آواز دے بیٹھیں۔

"سدرہ۔"

"جی میم۔" وہ جلدی سے اٹھ کر ان کے قریب آن کھڑی ہوئی۔

"میرا خیال ہے تم چودہ اگست کے حوالے سے ایک کوئز شو بھی رکھ لو جس میں سارے سوالات پاکستان کی تاریخ سے متعلق ہوں۔"

"جی میم یہ آئیڈیا بہت اچھا ہے لیکن اب تو ہمارے پاس صرف دو دن ہیں تو کیا ان دو دنوں میں ہم اس کوئز شو کی تیاری کر سکتے ہیں۔"

میڈم کی تجویز تو اسے بے حد پسند آئی مگر ساتھ ہی اس حوالے سے ذہن میں آئی اپنی سوچ کو وہ بیان کیے بنا نہ رہ سکی۔

"آسان آسان سوال رکھ لیجیے جن کے جواب بچے آسانی سے دے سکیں جیسے پاکستان کا نام کس نے تجویز کیا؟ بانی پاکستان کا نام؟ پہلا پرچم کس نے بنایا وغیرہ وغیرہ۔"

ان کے نزدیک یہ آسان سوال تھے' جبکہ سدرہ جانتی تھی کہ کوئی بچہ بھی ان کے جواب سے واقف نہ ہو گا۔ البتہ اگر ان سے انگلش موویز' گانے اور اداکاروں کے بارے میں کوئی سوال کیا جاتا تو یقیناً" ان کی معلومات کہیں زیادہ ہوتی مگر وہ یہ سب کچھ نجم السحر سے نہیں کہہ سکتی تھی اس لیے صرف اتنا ہی بولی۔

"اوکے میم میں کوشش کرتی ہوں۔"

"تم ایسا کرو چند بچوں کو میرے پاس بھیجو میں خود انہیں کوئز شو کے حوالے سے تیار کر دیتی ہوں۔"

اپنی قائدانہ صلاحیتوں پر انہیں آج بھی بھرپور اعتماد تھا' جس کے سہارے وہ کوئز پروگرام کی ذمہ داری اپنے سر لینے کو تیار ہو گئیں۔

"اوکے میم۔" اور پھر اگلے ہی پل چھ سات طلبا جن کا تعلق مختلف جماعتوں سے تھا ان کے قریب آن کھڑے ہوئے۔ نجم السحر نے ان کے چہروں پر ایک نظر ڈالی' تھوڑا سوچا اور پھر اپنے تئیں ایک آسان سا سوال کر دیا۔

"ہم یوم آزادی کس تاریخ کو مناتے ہیں؟؟"

"یوم آزادی۔" ہر بچے کا چہرہ ایسا تھا جیسے انہیں پرنسپل صاحبہ کی بات سرے سے سمجھ ہی نہ آئی ہو۔

"انڈیپنڈنس ڈے بیٹا۔" سدرہ فوراً" ان کی مدد کو آگے بڑھی۔

"فورٹین (چودہ) اگست کو۔"

"گڈ۔" ایک چھوٹے بچے کے منہ سے انہیں درست جواب سن کر حقیقی خوشی ہوئی۔

"اس لیے کہ ہر سال اسی تاریخ کو ہمارے اسکول میں فنکشن ہوتا ہے اور سب کے پاس فلیگ بھی ہوتے ہیں۔ ہم گرین اور وائٹ کپڑے پہنتے ہیں میم اس لیے ہم سب جانتے ہیں کہ یہ ہمارا انڈیپنڈنس ڈے ہے۔"

ایک اور چھوٹی سی بچی نے انہیں مزید وضاحت دی اور اس دن کوئز شو کے حوالے سے پوچھے گئے اپنے چند سوالات کے جواب سن کر ہی' نجم السحر کو اندازہ ہو گیا کہ پاکستان کی تاریخ اتنی مشکل ہے کہ اسے آسانی سے یاد کرنا نہایت ناممکن کام ہے۔ ساتھ ہی انہیں اپنی ٹیچرز پر بے حد غصہ آیا نصابی عمل سے ہٹ کر طلبا میں ذرا سا بھی تاریخی شعور پیدا کرنے میں قطعی ناکام تھیں اور اس حوالے سے انہوں نے چھٹی کے ٹائم ایک چھوٹی سی میٹنگ بھی رکھ لی۔ جس کا ٹائم تو ایک بجے کا تھا مگر وہ شروع ایک بج کر تیس منٹ پر ہوئی' وجہ پرنسپل صاحب کی مصروفیت تھی جس میں مصروف ہو کر وہ قطعی طور پر فراموش کر بیٹھیں کہ باہر کھڑی بیس عدد ٹیچرز نے اپنا آدھا گھنٹا یوں ہی ضائع کر دیا اور پھر دوران میٹنگ انہوں نے تمام ٹیچرز کو بہت اچھی طرح لتاڑا۔

"کیا کر رہی ہیں آپ لوگ اس نئی نسل کے ساتھ ۔۔۔ صرف کتابوں کے رٹے' جبکہ ان کی عام معلومات نہ ہونے کے برابر ہے' خاص طور پر تاریخ میں ہر بچہ صفر' کوئی نہیں جانتا کہ پاکستان کا نام کس نے تجویز کیا' پرچم میں ہرا اور سفید رنگ کیوں ہے؟ آج پندرہ منٹ بچوں کے درمیان بیٹھ کر میں اتنی شرمندگی محسوس کر رہی تھی کہ آپ لوگ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اس لیے پلیز میری آپ سے درخواست ہے کہ بچوں کو کتابوں سے ہٹ کر معلومات دیں' تاکہ جب وہ اس اسکول سے فارغ ہوں تو دنیا کو علم ہو کہ ان کا تعلق کس تعلیمی ادارے سے تھا۔"

اپنی اس تقریر کے دوران انہیں قطعی اندازہ نہ تھا کہ وہاں موجود چند ایک ٹیچرز کے سوا باقی سب کی توجہ

ان سے زیادہ اپنی گھڑیوں پر تھی اور جیسے جیسے ان کی گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں ویسے ویسے ان کا دماغ پرنسپل صاحبہ کی باتیں سمجھنے سے یکسر قاصر ہوتا جارہا تھا۔

"آپ لوگ اس قوم کی مائیں ہیں بڑی بھاری ذمہ داری ہے آپ کے کندھوں پر' اسے پورا کرنے کی کوشش کریں' پوری ایمان داری اور دل جمعی کے ساتھ ان بچوں پر توجہ دیں۔"

یہاں تک کہہ کر وہ رک گئیں' تمام ٹیچرز کے تھکے تھکے چہروں پر ایک نظر ڈالی جہاں اس وقت تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ بے زاریت بھی چھائی ہوئی تھی۔

"میرا خیال ہے آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے اللہ حافظ۔"

اس کا مطلب تھا اب آپ لوگ جاسکتی ہیں اور ان کے منہ سے نکلنے والے اس جملے کے دو سیکنڈ بعد ہی سارا آفس خالی ہوگیا سب وہاں سے ایسے نکل کر بھاگیں جیسے کوئی قیدی جیل سے رہا ہوتا ہو۔

☼ ☼ ☼

"مسز ہاشمی خیال رکھیے گا کل لنچ میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ رہ جائے بڑی مشکل سے سیکریٹری صاحب نے ہمارے لیے وقت نکالا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ کسی حوالے سے انہیں کوئی شکایت پیدا ہو۔"

"بالکل میم' آپ مطمئن رہیں میں سب کچھ اپنی نگرانی میں کروں گی۔"

"پلیز ڈیکوریشن اور کرسیاں بھی چیک کرلیجیے گا نیچے موجود اسٹور میں جھنڈے رکھے ہیں وہ نکلوالیں' اگر گندے ہوں تو دھلوالیں' کراکری کے لیے غفور کو بھیجیں' یاددہانی کروا آئے کہ دیے گئے ٹائم کے مطابق سامان پہنچادیں۔"

"میں نے بھیج دیا ہے' میم' اسکول کا مائک صحیح کام نہیں کر رہا' اگر آپ کہیں تو وہ بھی ڈیکوریشن سے منگوالیں۔"

"ہاں ہاں ضرور یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے والی بات ہے۔"

"تھینک یو میم۔" اس کے ساتھ ہی مسز ہاشمی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آپ کو کوئی اور کام تو نہیں؟" باہر نکلنے سے قبل انہوں نے رک کر سوال کیا۔

"نہیں میرا خیال ہے آپ اپنی ذمہ داریوں کو بہ حسن خوبی پورا کریں گی اور اس سلسلے میں مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے۔"

"ایک اور بات میم....." باہر نکلتے نکلتے مسز ہاشمی کو اچانک کچھ یاد آگیا اور وہ واپس ان کی جانب پلٹیں۔

"قومی ترانہ کا وقت آٹھ بجے ہے تو میرا خیال ہے تمام ٹیچرز اور طلبا کو ساڑھے سات بجے اسکول پہنچنے کے لیے کہہ دیا جائے۔"

"بالکل' بلکہ میرا خیال ہے سوا سات کہہ دیں' یہ پاکستانی قوم ہے جو کبھی اپنے ٹائم پر کہیں نہیں پہنچتی ۔ابھی بھی آپ کے سوا سات کو وہ خود بخود آٹھ تصور کرلیں گے۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور ان کے اس جواب سے مسز ہاشمی کو قطعی اختلاف نہ تھا کیونکہ وہ بھی جانتی تھیں کہ کسی ٹیچر نے آٹھ سے پہلے اسکول نہیں آنا۔

"اوکے میم۔"

تمام مہمانان کے لیے دس بجے کا ٹائم ہے کیونکہ صبح صبح کوئی اٹھ کر ہمارے لیے اسکول نہیں آئے گا اسی لیے پروگرام کا باقاعدہ آغاز آپ دس بج کر تیس منٹ پر کریں' شروع ہوتے ہوتے گیارہ بج جائیں گے اور ایک بجے تک ختم کردیں۔ بچوں کے لیے لنچ باکس کا آڈر دے دیا ہے جو کہ ہال کے داخلی دروازے پر رکھ دیے جائیں گے آپ باہر آنے والے تمام طلبا کو دیں گی اور خیال رکھیے گا کوئی بچہ رہ نہ جائے۔

"ٹھیک ہے میم آپ تو صبح آئیں گی نا میرا مطلب ہے قومی ترانہ آپ ہمارے ساتھ مل کر پڑھیں تو یقیناً" طلبا کے ساتھ ساتھ تمام ٹیچرز کو بھی بے حد خوشی ہوگی۔"

"کوشش کروں گی کہ ساڑھے سات تک اسکول پہنچ جاؤں ویسے تو آپ جانتی ہیں کہ مجھے آج کل شوگر کی شکایت ہوگئی ہے جس کی میڈیسن کھا کر سوؤں تو صبح آنکھ تھوڑا لیٹ کھلتی ہے بہرحال پھر بھی میں آٹھ تک تو آہی جاؤں گی۔"

"تھینک یو میم۔" جاتے جاتے مسز ہاشمی ان کا شکریہ ادا کرنا نہ بھولیں کیونکہ جانتی تھیں کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں کئی دفعہ میڈم کو بلاوجہ ناراضی کا سبب بن جاتی ہیں۔

اور پھر اگلے دن ہونے والا یوم آزادی **فنکشن نجم السحر** کی تمام تر توقعات سے بڑھ کر ثابت ہوا۔ ماسوائے اس کے کہ باوجود کوشش کے وہ قومی ترانہ کے وقت اسکول نہ پہنچ سکیں جس کی کئی وجوہات تھیں' جن میں سب سے خاص یہ تھی کہ وہ رات ایک تقریب سے لیٹ لوٹی تھیں۔ جس کے باعث صبح ان کی آنکھ بھی سات تیس پر کھلی اور پھر تیار ہو کر اسکول آتے ہوئے انہیں نو تو بج ہی گئے اور جب وہ اسکول پہنچیں تو ہر طرف لہراتے جھنڈے سفید اور ہرے لباس میں ملبوس بچے دیکھ کر ان کا دل خوش ہوگیا۔ پروگرام اپنے وقت پر شروع ہوا تمام مہمان بھی آگئے اور پھر سب نے اپنی تقاریر میں پاکستان کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان کے اسکول اور بحیثیت پرنسپل نجم السحر کی بے حد تعریف کی۔

"اسکول میں انگریزی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی ہے" اس کا اظہار بھی سیکریٹری صاحب نے بارہا اپنی تقریر میں کیا۔ یوم آزادی کے حوالے سے انگریزی میں کی جانے والی تقاریر کو بے حد سراہا گیا۔ آخر میں پرنسپل صاحبہ نے اسکول میں انگریزی کے فروغ کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کا بھی خاص طور پر ذکر کیا اور طلبا کو بتایا کہ آج کے اس دور میں انگریزی زبان کا جاننا سب سے زیادہ ضروری ہے اور انگریزی کے بنا اس معاشرے میں ترقی کرنا تقریباً" ناممکن ہے انہیں خوشی تھی کہ ان کے اسکول کا شمار علاقے کے بہترین اسکولوں میں ہوتا ہے' جہاں مناسب فیس میں بچوں کو ماڈرن زمانے کی ہر رمز سے آشنا کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک بار پھر قومی ترانہ پڑھا گیا اور پھر آخر میں ایک شان دار لنچ۔ شروع سے آخر تک شہر کے بہترین فوٹو گرافرز نے اس پروگرام کی کوریج کی۔ کچھ مقامی چینلز کی ٹیمیں بھی وہاں تھیں جنہوں نے پروگرام کی ریکارڈنگ کے بعد میڈم **نجم السحر** کا ایک خصوصی انٹرویو بھی لیا۔

آخر دو بجے کے قریب یوم آزادی کا یہ خصوصی پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا جس کے بعد پرنسپل صاحبہ نے تمام ٹیچرز کو خراج تحسین پیش کیا' خاص طور پر ان کو جنہوں نے اس پروگرام کو بہترین بنانے کے لیے ان کا ساتھ دیا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ آج کا یہ **فنکشن** ان کے اسکول کو علاقے میں مزید نمایاں کردے گا جس کا اثر ان کے نئے اکیڈمک سال پر ضرور پڑے گا اور جس مقصد کے لیے انہوں نے اتنی محنت کی' وہ مقصد انہیں ضرور حاصل ہوگا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن پندرہ اگست کی چھٹی تھی' پھر اتوار لہٰذا پیر کی صبح جب انہوں نے اسکول گراؤنڈ میں قدم رکھا تو یہاں وہاں پھیلی جھنڈیاں دیکھ کر یک دم ہی ان کا پارہ ہائی ہوگیا۔ انہیں حیرت ہوئی کہ دو دنوں میں بھی اسکول کی مکمل صفائی نہ کی گئی۔ اسی خیال کے تحت وہ غصہ میں اپنے آفس پہنچیں اور جاتے ہی پیون کو بلانے والی گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا شدت سے بجتی گھنٹی ان کے غصہ کا بھرپور اظہار کر رہی تھی۔

"یا اللہ خیر یہ ایک دم انہیں کیا ہوگیا۔"

"باہر کرسی پر اطمینان سے بیٹھی خورشید گھنٹی کی آواز سنتے ہی جلدی سے گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بھاگتی ہوئی اندر آفس پہنچی۔

"جی میڈم جی۔" جہاں نجم السحر ایک اچھی پرنسپل تھیں وہاں ان کے غصہ کی شدت سے تمام اسٹاف بہت گھبراتا تھا۔

"فوراً" شکیل اور نوری کو بلاؤ۔" یہ دونوں اسکول

کی صفائی پر مامور افراد تھے' ان کی بات سنتے ہی خورشید تیزی سے واپس پلٹی اور اگلے پانچ منٹ میں ہی ان کے دونوں مطلوبہ افراد آفس میں ان کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

"سلام جی۔" پہلی آواز نوری کی آئی' **نجم السحر** نے اپنے چشمہ کی اوٹ سے اس کا بغور جائزہ لیا۔

"آپ نے بلایا جی۔" یہ شکیل تھا۔

"تم دونوں اسکول سے تنخواہ کس بات کی لیتے ہو؟" کہنیوں کے بل آگے ہوتے ہوئے انہوں نے دونوں پر ایک ایک نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا' جو یقیناً ان کے لیے خلاف توقع تھا۔ جس کا اندازہ ان کے چہرے پر چھائی حیرت کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

"صفائی کی جی۔" چہرے کے ساتھ ساتھ نوری کی آواز میں بھی حیرت نمایاں تھی۔

"تو پھر آج اسکول کا گراؤنڈ اتنا گندہ کیوں ہے؟ جبکہ باہر سے آنے والے ہر فرد کی نگاہ سب سے پہلے اس گراؤنڈ پر ہی پڑتی ہے ایسے وقت میں جب ہمارے نئے سیشن کے داخلے ہو رہے ہیں' آپ جانتے ہیں یہ گندگی ہمارے اکیڈمک سیشن پر کتنی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ والدین اپنے بچوں کے لیے کبھی ایسے اسکول پسند نہیں کرتے جہاں صفائی کا اس قدر فقدان ہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جی پر اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔" شکیل نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کس کا قصور ہے؟"

شکیل کا جواب ان کی توقع کے بالکل برعکس تھا۔

"کریم بابا کا' انہوں نے ہمیں منع کیا تھا کہ اسکول کی صفائی وہ خود کریں گے جو کہ وہ کر بھی چکے ہیں بس اب صرف یہ گراؤنڈ رہ گیا تھا جس کی صفائی وہ ابھی کر رہے ہیں۔"

"کریم بابا نے؟" یہ نام **نجم السحر** کے لیے خاصا حیران کن تھا۔

"یہ چوکیداری چھوڑ کر انہوں نے صفائی کا کام کب سے سنبھال لیا۔" اب ان کا رخ خورشید کی جانب تھا جو دروازے پر کھڑی اندر ہونے والی ساری کارروائی بڑے شوق سے دیکھ رہی تھی۔

"پتا نہیں جی پر یہ سچ کہہ رہے ہیں ان کو بابا کریم نے میرے سامنے منع کیا تھا۔"

خورشید نے نوری اور شکیل کے بیان کی فوراً" تائید کردی۔

"بلاؤ اسے ذرا میں پوچھوں' کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ۔"

اور پھر کچھ ہی دیر بعد کریم بابا بھی نوری اور شکیل کے ساتھ لائن میں آن موجود ہوئے۔

"یہ آپ نے انہیں منع کیا تھا کہ اسکول کی صفائی نہ کریں۔"

"جی میڈم صاحبہ' لیکن آپ ناراض مت ہوں میں پورا اسکول اچھی طرح صاف کرچکا ہوں گراؤنڈ رہ گیا تھا آپ اب جا کر دیکھیں وہ بھی صاف ہو گیا ہے۔"

اپنا پسینہ صاف کرتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔

"مجھے سمجھ نہیں آیا آپ نے اس عمر میں اکیلے اسکول کی صفائی کیوں کہ جبکہ یہ آپ کی ذمہ داری نہیں' جو کام جس کا ہے اسی کو کرنا چاہیے۔"

"آپ کی بات ٹھیک ہے میڈم جی' مگر شاید آپ نہیں جانتیں اسکول میں کچرے کے نام پر زیادہ تر وہ جھنڈیاں تھیں جنہیں یوم آزادی کے موقع پر آرائش و زیبائش کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ہری اور سفید جھنڈیاں جو ہمارے ملک کا وقار ہیں۔ ہماری پہچان ہیں' لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ یہ وقار اور پہچان چودہ اگست کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد ہمارے یہی جھنڈے قدموں تلے روند دیے جاتے ہیں۔"

یہاں تک پہنچ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے رکے اور ایک دکھ بھری نگاہ کمرے میں موجود تمام افراد پر ڈالی۔

"میں نہیں چاہتا تھا کہ ان جھنڈیوں کو جھاڑو کے ذریعے اکٹھا کر کے کوڑے دان میں ڈال دیا جائے جیسا کہ ہر سال ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کی نئی نسل میں وطن کی عزت و احترام ختم ہوتا جا رہا ہے اسی لیے میں نے اپنے ہاتھوں کی مدد سے ساری جھنڈیوں کو اکٹھا کر کے ایک بوری میں بھر لیا ہے لیکن اب میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا اس بھری ہوئی بوری کا کیا کروں؟"

ساری بات ختم کرنے کے بعد ان کا آخر میں کیا جانے والا سوال ایسا تھا جس کا جواب کمرے میں موجود کسی فرد کے پاس نہ تھا۔

"اسی لیے تو انہیں اکٹھا کر کے کچرے دان میں پھینکنا پڑتا ہے کیونکہ ہر سال اتنی جھنڈیاں ہم اپنے گھر کی الماریوں میں سنبھال کر نہیں رکھ سکتے۔"

کریم بابا کے سوال میں ہی **نجم السحر** کے لیے جواب چھپا تھا اس لیے وہ فوراً" بول اٹھیں۔

"ایک بات کہوں میڈم صاحبہ اگلے سال جب آپ یوم آزادی کی تقریب کا اہتمام کریں تو برائے مہربانی جھنڈیاں اور چھوٹے جھنڈوں پر پابندی لگا دیجیے گا کیونکہ وطن کے احترام کے لیے قومی ترانہ کے ساتھ لہرایا جانے والا ایک پرچم ہی کافی ہے۔ شاید آپ کی طرف سے کی جانے والی اس چھوٹی سی کوشش کے نتیجہ میں میری نسل کے کئی بچے اپنے وطن کے جھنڈے کو پاؤں تلے روندنے سے بچ جائیں اور اگر ایسا ہو سکا تو یقیناً" آپ اور آپ کے اسکول کا نام ہمیشہ اچھے لفظوں میں یاد رکھا جائے گا اور آج جن بچوں کو آپ سبق دیں گی کہ پرچم پاؤں تلے روندنا اپنے وطن کی بے حرمتی کے برابر ہے' یقیناً" کل یہ ہی سبق وہ بچے اپنے بچوں کو دیں گے اور اس طرح نسل در نسل جھنڈے کا احترام ہمارے دلوں میں زور پکڑ جائے گا اور شاید آئندہ چند سالوں میں چودہ اگست کے بعد ہمیں ہر طرف یوں یہ جھنڈیاں بکھری نظر نہیں آئیں گی جو گندگی اور نالوں میں بہتی ہوئی اپنی بے حرمتی پر نوحہ کناں ہوتی ہیں۔"

نجم السحر خاموشی سے کریم بابا کی باتیں سن رہی تھیں جن سے انہیں کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ انہیں افسوس تھا جو سبق آج انہیں اسکول کے ایک ملازم نے دیا وہ بات اپنی اتنی تعلیم کے باوجود انہیں کیوں معلوم نہ ہوئی اور پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کریم بابا کے قریب جا کھڑی ہوئیں۔

"میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ کم از کم میرے اسکول کی حدود میں جھنڈے کی بے حرمتی نہیں ہو سکے گی۔" ان کے یہ الفاظ کریم بابا کے لیے خراج تحسین تھے جنہیں سن کر ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اچھا سبق دینے والا ضروری نہیں کہ کوئی بہت بڑا عالم ہی ہو کئی دفعہ یہ سبق ہمیں ان سچے اور بے لوث لوگوں سے بھی مل جاتا ہے جیسے کہ ابھی کریم بابا نے **نجم السحر** جیسی قابل پرنسپل کو اپنے وطن کی بے حرمتی سے بچنے کا ایک چھوٹا سا درس دیا۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم اسے سمجھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور یقیناً" اس سلسلے میں ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ ان جھنڈیوں کو اس بے حرمتی سے بچایا جائے جو ہر پندرہ اگست کی صبح سڑکوں پر ہو رہی ہوتی ہے کیونکہ یہ بھی وطن کی محبت کا ہی ایک تقاضا ہے۔

☆ ☆

مہوش افتخار

طوبیٰ ضروری سامان خریدنے بازار جاتی ہے تو اس کی ملاقات دس سال بعد نوفل جاہ سے ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک بے حد خوب صورت لڑکی نگین ہوتی ہے۔ طوبیٰ گھر پہنچتی ہے تو دیکھتی ہے کہ عصمی پھپھو اور تائی جان بیٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔ حسن مجتبیٰ کی جائداد کی وجہ سے طوبیٰ کے تایا جان اپنے بیٹے ضیا کی شادی طوبیٰ کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں اور حسن مجتبیٰ کے انکار کی وجہ سے ناراض ہو جاتے ہیں۔

حسن مجتبیٰ ان سب کے سگے نہیں بلکہ واحد سوتیلے بھائی ہیں جنہیں ان کی والدہ مرحومہ نے اپنی یتیم بھتیجی ارجمند بیگم سے بیاہ دیا تھا۔ ان کی دو بیٹیاں طوبیٰ حسن اور ماہ نور حسن اور ایک بیٹا احمر حسن تھا۔ احمر کو اپنے باپ کے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ پڑھنے کے لیے باہر گیا تو وہیں شادی کر کے سیٹل ہو گیا۔

حسن مجتبیٰ دل کے عارضے میں مبتلا تھے لیکن وہ سرجری بیٹیوں کی وجہ سے نہیں کروا رہے تھے طوبیٰ ان کو راضی کرتی ہے اور وہ پشاور سے واپسی پر سرجری کروانے کا وعدہ کر لیتے ہیں۔

نوفل جاہ کا کراچی میں اپنے ایک دوست کے ساتھ بہت بڑے پیمانے پہ اسپتالوں میں استعمال ہونے والی مشینری کا بزنس تھا۔ وہ بزنس کے سلسلے میں ایک اسپتال موجود ہوتا ہے کہ اچانک کچھ زخمی لائے جاتے ہیں۔

ان زخمیوں میں حسن مجتبیٰ بھی ہوتے ہیں۔ پشاور کے لیے ایئرپورٹ جاتے ہوئے ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے اور ڈاکٹرز کی تمام تر کوششوں کے باوجود حسن صاحب اور ان کا ڈرائیور دونوں ہی دم توڑ جاتے ہیں۔ نوفل جاہ سب کچھ بھلا کے نہ صرف میت کے ساتھ ان کے گھر جاتا ہے بلکہ فون کر کے اپنے گھر والوں کو بھی پہنچنے کا کہتا ہے۔ وہاں جا کر نوفل کو ماضی یاد آجاتا ہے۔

حسن مجتبیٰ اور منصور جاہ ایک دوسرے کے پرانے دوست ہوتے ہیں۔ منصور جاہ گورنمنٹ کے ایک اعلا عہدے پر فائز ہوتے ہیں۔ حسن مجتبیٰ کو کاروبار میں پیسے کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ منصور جاہ کے ساتھ شراکت کر لیتے ہیں۔ دو خاندانوں کی آپس میں بہت دوستی ہوتی ہے۔ منصور جاہ کے دو بیٹے نوفل جاہ اور محب جاہ اور ایک بیٹی ضحیٰ ہوتی ہے۔ طوبیٰ من ہی من میں نوفل جاہ سے محبت کرنے لگتی ہے نوفل بھی اسے چاہتا ہے لیکن اظہار نہیں کرتا۔ منصور جاہ نے حسن مجتبیٰ کے مشورے پر ان کے گھر کے برابر پلاٹ پہ بنگلا تعمیر کروا لیتے ہیں۔ اور اپنی ساری جمع پونجی اس پر لگا دیتے ہیں۔ ان ہی دنوں اچانک منصور جاہ پر آفس میں اچانک فنڈز میں گھپلے کا جھوٹا الزام لگ جاتا ہے اور ان کو سسپینڈ کر دیا جاتا ہے۔ اس پریشانی میں حسن مجتبیٰ بجائے اپنے دوست کا ساتھ دینے کے ان سے اپنی بزنس پارٹنرشپ ختم کر دیتے ہیں۔ منصور جاہ اس صدمے کو جھیل نہیں پاتے اور ان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد حسن مجتبیٰ نوفل سے کہتے ہیں کہ منصور نے یہ شراکت خود ختم کی تھی اور ان کے دستخط بھی دکھا دیتے ہیں۔ نوفل پر اچانک بہت بڑی ذمہ داری آجاتی ہے۔

اب آگے پڑھیے۔

دوسری قسط

بھائی! ضحیٰ کی آواز نوفل جاہ کو ماضی کی بھول بھلیوں سے باہر کھینچ لائی تھی۔ اس نے چونکتے ہوئے سامنے دیکھا تھا' ضحیٰ چائے کا کپ لیے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"میں آپ کو پورے گھر میں ڈھونڈ کر آرہی ہوں۔" وہ آگے بڑھی تو نوفل نے سیدھے ہوتے ہوئے کپ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ضحیٰ اس کے برابر رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آپ یہاں اکیلے کیوں بیٹھے تھے؟" وہ اسے اردگرد سے بے خبر جاہ پیلس پر نظریں جمائے بیٹھا دیکھ چکی تھی۔

"یوں ہی گزرے وقت کی یاد آگئی تھی۔" وہ پھیکا سا مسکرایا۔ "تم نے دیکھا ہے ان لوگوں نے کتنے اچھے طریقے سے اوپر کی منزل میں تبدیلیاں کی ہیں۔" قصداً" ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے جاہ پیلس کی طرف اشارہ کیا۔ تو ضحیٰ کے لبوں سے اک ٹھنڈی سانس ٹوٹ کر بکھر گئی۔

"جی دیکھا ہے..... اپنے ہی گھر کو یوں اجنبیوں کی طرح باہر سے بیٹھ کر تکنا کتنا تکلیف دہ ہے نا بھائی؟" وہ دلگرفتگی سے بولی تو نوفل کی آنکھوں میں بھی اداسی پھیل گئی۔

"ہاں بہت تکلیف دہ ہے..... امی تو ٹھیک ہیں نا؟" اسے بے اختیار صباحت بیگم کا خیال آیا۔

"بظاہر تو ٹھیک ہیں۔ لیکن اپنے گھر اور گزرے وقت کو یاد کرکے کئی بار آنسو بہا چکی ہیں۔" وہ پھیکی سی بولی تو نوفل بھی خاموش ہوگیا۔ ضحیٰ نے بغور اسے دیکھا۔

"ایک بات تو بتائیں بھائی۔ یہ آپ کو اتنے سالوں بعد اپنا فیصلہ بدلنے کی کیا سوجھی؟ آپ اگر اس وقت اتفاقاً" اسپتال میں موجود تھے تو بعد میں آپ نے انکل کے جنازے میں شرکت کرتو لی تھی۔ پھر آپ نے ہمیں یہاں کیوں بلایا؟"

"وقت وقت کا تقاضا ہوتا ہے ضحیٰ۔ میں نے تب جو فیصلہ کیا تھا وہ اپنی جگہ پر بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اور آج بھی جو تم لوگوں کو یہاں بلایا ہے تو کچھ سوچ کر ہی بلایا ہے۔ میں جنازے میں شریک ہوکے واپس بھی آسکتا تھا۔ لیکن ذرا سوچو' کل کو اگر کوئی ان کے خاندان میں سے میری یہاں موجودگی کا ذکر آنٹی یا طوبیٰ لوگوں سے کردیتا' تو ان کے دل پہ کیا گزرتی کہ ہم نے اتنی بڑی بات جاننے کے باوجود ان کے غم میں شریک ہونے کی زحمت نہیں کی۔ انسان اپنی خوشیوں میں تو ایک دوسرے کی کوتاہی معاف کرسکتا ہے۔ لیکن غم میں ہر کمی سیدھی دل پر لگتی ہے۔"

"یہ تو آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔" ضحیٰ نے اثبات میں سرہلایا۔ "آنٹی لوگوں کو ہمارے ساتھ کی ضرورت جتنی آج ہے۔ پھر شاید کبھی نہ ہو۔ نام نہاد اپنوں کا محض ایک **جمگھٹا** ہے' جس میں یہ تینوں گھری ہوئی ہیں۔ لیکن درحقیقت بالکل اکیلی ہیں۔ لیکن پھر سوچتی ہوں کہ یہ سب تو سوتیلے ہیں۔ آپ بات کریں احمر بھائی کی۔"

"کیوں کیا ہوا؟" نوفل نے چونک کر بہن کو دیکھا۔

"انہوں نے تو بے حسی کی حد ختم کردی ہے بھائی۔ آنٹی بتارہی تھیں کہ وہ وہیں کینیڈا میں ہی ایک عیسائی لڑکی سے شادی کرکے سیٹل ہوگئے تھے۔ جس کے بعد انہوں نے کبھی بھول کر بھی باپ کی ذمہ داریوں کو بانٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ انکل تنہا ہی پر بوجھ اٹھانے لگے تھے۔ لیکن احمر بھائی کی خود غرضی نے انہیں دل کا مریض بنادیا تھا۔ وہ دن رات اسی فکر میں گھلنے لگے تھے کہ ان کے بعد ان کی بچیوں اور اتنے بڑے کاروبار کا کیا بنے گا۔"

"ہونہہ۔ صحیح کہا ہے کسی نے..... خدا کے ہاں دیر تو ہوسکتی ہے لیکن اندھیر نہیں۔ اللہ پاک بے شک بہترین منصف ہے۔" نوفل اس کی بات سن کے اپنے دھیان میں بولا تھا۔ اس کی آنکھیں پرسوچ انداز میں غیر مرئی نقطے پہ جمی تھیں۔ اور چہرے پر عجیب استہزائیہ سے تاثر تھا۔ جسے دیکھ کے ضحیٰ الجھ سی گئی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے۔" نوفل نے سنبھل کر اسے دیکھا۔ "احمر نے جو کچھ آج اپنے ماں باپ کے ساتھ کیا ہے۔ کل اپنی اولاد سے پالے گا۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ان کے ساتھ بہت برا ہوگا۔" ضحیٰ نے بھائی کی تائید کی۔ "لیکن اگر وہ یہاں نہ رکے تو ان لوگوں کا کیا ہوگا بھائی؟" وہ متفکر سی بولی تو نوفل اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ آنٹی کے سسرال والوں نے قابض ہوجانا ہے بزنس پہ۔" ضحیٰ کی خیال آرائی پہ نوفل کے چہرے پر بھی پریشانی پھیل گئی۔ لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

"طوبیٰ کیسی ہے؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے ضحیٰ کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک نہیں ہے۔ بامشکل تمام تھوڑا سا کھانا کھلا کے نیند کی گولی دی ہے اسے۔" ضحیٰ نے خالی کپ اٹھایا۔ "آپ بھی اب چل کر آرام کریں۔ آنٹی نے آپ کے لیے خاص طور پہ الگ کمرہ کھلوایا ہے۔"

"اچھا۔" اس کے دھیرے سے کہنے پہ ضحیٰ نے ایک نظر اس کے تھکے ہوئے چہرے پہ ڈالی اور خاموشی سے اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔ نوفل نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ اس کا دل بے حد بوجھل تھا۔ اس بوجھ کے ساتھ بھلا کسے نیند آنے والی تھی۔

وہ وہیں لان میں بیٹھا رہا تھا۔

ڈھلتی رات کے ساتھ فضا میں ہر سو خاموشی چھا گئی تھی۔ ڈیڑھ پونے دو کا وقت تھا' جب نوفل تھکا تھکا سا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وہ لان پار کرکے داخلی دروازے کی جانب بڑھا تھا' جب گھر کے عقبی حصے کو جانے والی راہداری میں کسی چیز کے گرنے کی آواز نے اس کے بڑھتے قدموں کو روک دیا تھا۔ اس نے ٹھٹک کر عمارت کے انتہائی سرے پہ موجود راستے کی طرف دیکھا تھا' اور اگلے ہی لمحے تیز قدموں سے اس جانب چلا آیا تھا۔ جوں ہی وہ راہداری کے قریب پہنچا تھا۔ اسے اردگرد چٹکی چاندنی میں دیوار پہ اپنے مقابل کسی کا ہیولا نظر آیا تھا۔

نوفل نے فوراً" سے پیشتر جیب سے موبائل نکال کر ٹارچ آن کی تھی اور ایک ہی جست میں راہداری کے سرے پہ آکھڑا ہوا تھا۔

"کون ہے وہاں؟"

سختی سے پکارنے کے ساتھ ہی اس نے روشنی سامنے کو ڈالی تو وہاں موجود شخص اس اچانک حملے پہ پوری جان سے کانپ گیا۔

"میں..... میں ہوں۔" ضیا کی آواز پہ نوفل کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ طوبیٰ کے کمرے کی کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوا تھا۔ نوفل کو دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا تھا۔ لیکن تب تک اس کی یہ حرکت نوفل کی نظر میں آگئی تھی۔ آن واحد میں وہ اس ذلیل انسان کی وہاں موجودگی کی وجہ جان گیا تھا۔ اس کا خون کھول اٹھا تھا۔

"تم وہاں کیا کررہے ہو اس وقت؟" اس نے کڑے لہجے میں استفسار کیا تو ضیا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔

"وہ میں....." اس نے گلا کھنکارا۔ "مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ ٹہلنے کے لیے باہر نکلا تو اس طرف سے عجیب سی آواز آئی۔ میں وہی چیک کرنے آیا تھا۔" وہ نوفل کے قریب چلا آیا تو اس کے لب سختی سے بھینچ گئے۔ اس کا دل کررہا تھا کہ وہ ضیا کا سر توڑ دے۔

"ہوگیا چیک؟" اس کے کاٹ دار لہجے پر ضیا بری طرح کھسیا گیا۔ افتاد اتنی اچانک آٹھہری تھی کہ وہ نوفل کو اس لب و لہجے پر کوئی تیور بھی نہ دکھا سکا تھا۔

"ہاں۔"

"تو پھر میرے خیال میں اب اندر چلنا چاہیے۔" نوفل کہتے ہوئے ایک طرف ہوا تو ضیا خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ نوفل نے ایک سلگتی نظر اس گھٹیا شخص کی پشت پہ ڈالی اور گیٹ کی طرف چل پڑا۔

"تم کہاں جارہے ہو؟" ضیا اسے آگے جاتا دیکھ کر چونکا۔

"چوکیدار کا بندوبست کروانے..... چوکیدار کو یہ

سمجھانے کے صرف گیٹ کی ہی نہیں اندر کی بھی حفاظت درکار ہے۔" نوفل تنتے ہوئے لہجے میں کہتا پلٹ کر آگے بڑھ گیا تو ضیا کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔ اس نے غصیلی نگاہوں سے دور جاتے نوفل کو دیکھا اور ایک جھٹکے سے پلٹ کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن گیارہ بجے احمر کی فلائٹ تھی۔ گھر سے مردوں کا ایک جلوس تھا جو اسے لینے ایئرپورٹ گیا تھا۔ سب کے لیے احمر کو اپنی موجودگی کا احساس دلوا کر اس سے اپنی ہمدردی جتانا زیادہ ضروری تھا بجائے پس پردہ گھر میں رہ کر سوئم کے انتظامات کروانے کے۔ ان کی پہنچی ہوئی سوچ کو سراہتے ہوئے نوفل تنہا ہی انتظامات میں لگ گیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ارجمند بیگم سے ایک بھی پیسہ نہیں لیا تھا۔ اسے ملازموں کے ساتھ بھاگ دوڑ کرتا دیکھ کے ارجمند حسن کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ یہ نوفل کی نہیں، ان کے بیٹے کی ذمہ داریاں تھیں۔ مگر وہ تو جیسے اپنے ہر فرض کو فراموش کر چکا تھا۔ اس کی یہ فراموشی انہیں صبح سے رلا رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں بیٹھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ جب صباحت اندر داخل ہوئی تھیں۔ ارجمند کا رویا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ بے اختیار ان کے قریب آبیٹھی تھیں۔

"اس طرح کیوں بیٹھی ہو ارجمند؟" انہوں نے ان کا بازو سہلایا تو ان کی خالی نظریں صباحت بیگم کے چہرے پر آٹھہریں۔

"بھابھی۔ مجھے اپنا اور اپنی بچیوں کا مستقبل بہت تاریک نظر آرہا ہے۔" وہ بولیں تو ان کے لہجے میں صدیوں کی تھکن تھی۔ "بیوگی کس روح فرسا احساس کا نام ہے یہ آپ سے بہتر بھلا اور کون جان سکتا ہے۔ مگر آپ خوش نصیب تھیں جو نوفل جیسا سعادت مند بیٹا آپ کو ملا۔ میری طرف دیکھیں۔ مجھ جیسی حرماں نصیب بھی بھلا کوئی ہوگی۔ میرے اکلوتے بیٹے کو نہ تو اپنے باپ کے مرنے کا کوئی غم ہے اور نہ ہی اپنی ماں، بہنوں کی کوئی پروا۔ ہماری جان، مال اور اس کے باپ کی کمائی ہوئی برسوں کی عزت مال غنیمت کی طرح بیچ چوراہے پر آپڑی ہے۔ مگر اسے کوئی احساس، کوئی فکر نہیں!" وہ پھپھک کے رو پڑیں تھیں۔ اور صباحت بیگم کے لیے اپنے آنسوؤں کو روکنا مشکل ہو گیا تھا۔

"اللہ نہ کرے کہ تم لوگ بیچ چوراہے پر آؤ۔" وہ آنسوؤں کے درمیان بامشکل تمام بولیں۔ "احمر لاپروا ضرور ہے مگر بے حس نہیں۔ مجھے یقین ہے وہ تم لوگوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔" انہیں تسلی دیتے ہوئے صباحت نے جیسے خود بھی رب سے استدعا کی تھی۔ مگر ہر دعا قبولیت کی سند نہیں پاتی، اور اس کا احساس انہیں بہت جلد ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ارجمند بیگم کے کمرے کی فضا میں حیرت بھری خاموشی کا راج تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا، آنے والے نے صرف باپ کے قلوں کا ختم نپٹایا تھا اور رات میں ہی پنچایت لگا کے بیٹھ گیا تھا۔ اس نے دنیا دکھاوے کو بھی اگلی صبح نہ چڑھنے دی تھی، اپنی ماں بہنوں کی دلی حالت کا احساس کرنا تو بہت دور کی بات تھی۔

"دیکھیں اماں جان، ہو سکتا ہے کہ آپ کو میری باتیں بہت ناگوار گزریں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ صرف رونے دھونے سے کام نہیں چلنے والا... ہمیں بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ جن کا ہم جتنی جلدی کوئی حل نکال لیں گے، اتنا ہی ہمارے لیے اچھا ہوگا۔" اس نے ساکت بیٹھی ماں کی طرف دیکھا تھا، جو بنا پلکیں جھپکائے ایک ٹک اپنے لاڈلے کا چہرہ تک رہی تھیں۔ کچھ ایسی ہی حالت ان کے برابر بیٹھی صباحت بیگم کی بھی تھی۔ جن کی ہر خوش فہمی ڈھیر ہوئی تھی۔

کمرے میں اس وقت ان تینوں کے علاوہ **عصمی** پھپھو، تایا جان اور دونوں چچا بھی تھے۔ ان سب کو یہاں اکٹھا کرنے والا بھی احمر ہی تھا۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی، کبھی بھی ان کا خیر خواہ نہ رہا تھا۔

ماں کو مسلسل خاموش پا کے اس نے سلسلہ کلام ایک بار پھر جوڑا تھا۔

"میں جانتا ہوں اماں جان کہ پاپا کے گزر جانے کے بعد آپ تینوں میری ذمہ داری ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میری اپنی بھی ایک فیملی ہے، جسے میں بہرکیف چھوڑ نہیں سکتا... میں آپ لوگوں کی خاطر پاکستان شفٹ نہیں ہو سکتا اماں جان۔" ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے ارجمند بیگم کے اندر پنپتی امید کی واحد کرن کو نہایت بے رحمی سے بجھا دیا تھا۔ یہ سوچے بنا کہ اگر وہ ان کی خاطر کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا تو پھر وہ یہاں لینے کیا آیا تھا۔

اس کی بدلحاظی پہ ایک لمحے کو سب ہی **ہونقے** رہ گئے تھے۔

"مگر بیٹا اگر تم پاکستان نہیں آؤ گے تو کون اتنے بڑے کاروبار کو سنبھالے گا؟" **عصمی** پھپھو کے منہ سے نکلنے والا سوال بے ساختہ تھا۔

"ملازم ہیں نا۔ دیکھ لیں گے..."

"ملازم؟" **عصمی** نے اسے یوں دیکھا تھا جیسے اس کی دماغی حالت پہ شبہ ہو۔ "ملازموں نے بھی کبھی کسی کو کما کر دیا ہے بیٹا؟"

"تو پھر میں کیا کروں پھپھو؟" وہ جھنجلا اٹھا۔ "میں پاکستان آ نہیں سکتا۔ یہ لوگ وہاں جا نہیں سکتے۔ میں آخر کروں تو کروں کیا؟"

"اس کا ایک حل ہے میرے پاس۔" تایا جان نے اپنے اندر پھیلتی خوشی کو چھپاتے ہوئے، نہایت ہوشیاری سے اپنی بساط بچھائی۔

"تم طوبیٰ کو میری بہو بنا دو۔ ضیا نا صرف کاروبار کو سنبھال لے گا۔ بلکہ اپنی چچی کا بیٹا بن کے اس گھر میں بھی رہ لے گا۔" انہوں نے مسکرا کر بھتیجے کی طرف دیکھا تو کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ارجمند نے ہول کر پاس بیٹھی صباحت کا ہاتھ تھام لیا۔

"ارے آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی بھائی جان۔" **عصمی** سب سے پہلے ہوش میں آئی تھیں۔

"اف توبہ! کس قدر ہوشیار ہیں بھائی جان۔ مجال ہے جو ایک لمحہ بھی ضائع کیا ہو۔" اندر ہی اندر **کلستے** ہوئے انہوں نے مسکرا کر تایا جان کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر احمر کی طرف پلٹی تھیں۔

"بھائی جان بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا۔ اس مسئلے کا سب سے مناسب حل یہی ہے کہ تم اپنی بہنوں کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤ۔ اور اس سلسلے میں آج میں بھی تمہارے اور ارجمند کے سامنے دست سوال دراز کرتی ہوں۔ ماہ نور کو میرے دانش کی دلہن بنا دو۔" بھائی کی حمایت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی بازی بھی چل دی تو جہاں تایا جان چونک گئے۔ وہیں عثمان اور عمر چچا بھی ہکا بکا سے بہن کا منہ تکنے لگے۔ جبکہ ارجمند بیگم کی تو کاٹو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت ہو گئی تھی۔ یہ کیسے سارے موقع پرستوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔

صباحت الگ حیران سی ان لوگوں کو رنگ بدلتے دیکھ رہی تھیں حسن مجتبیٰ اور ان کے بیوی بچوں سے، ان کے سوتیلے بہن بھائیوں کی پرخاش صباحت بیگم کے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہ تھی۔

"**عصمی** شاید تم بھول رہی ہو کہ تمہارا بیٹا کہیں اور دلچسپی رکھتا ہے۔" عثمان چچا سے مزید برداشت نہیں ہو سکا تو انہوں نے طنزیہ نظروں سے بہن کو دیکھتے ہوئے بھانجے کی پول سب کے سامنے کھول دی تھی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس درجہ مکاری پہ اپنے بہن اور بھائی کے اچھے لتے لیں۔ جنہوں نے ساری زندگی حسن مجتبیٰ کے خلاف محاذ کھڑا کیے رکھا تھا اور اب جو ان کی دولت اینٹھنے کا وقت آیا تھا۔ تو بھی سب سے پہلے کینچلی ان دونوں نے ہی بدلی تھی۔

"اللہ معاف کرے عثمان بھائی۔ میرا بیٹا نہیں، الٹا وہ لڑکی میرے بیٹے کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔" ان کے جلبلا کے کہنے پر عثمان مجتبیٰ نے ہنکارا بھرا تھا۔

"ہونہہ! ایسے ہی کہا جاتا ہے۔" ان کا انداز **عصمی** کو سر تا پا سلگا گیا تھا۔

"اف آپ غلط بات کر رہے ہیں عثمان بھائی... بھلا بتاؤ، آج کل کا کوئی دور ہے کہ جوان اولاد پہ زور زبردستی

کی جائے۔ میرے دانش کی اگر مرضی نہ ہوتی تو کیا میں ماہ نور کا نام لیتی کبھی؟" انہوں نے غصے سے بھائی کی طرف دیکھا تو اب تک خاموش بیٹھا احمر مصالحتی انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"پلیز پھپھو اور چچا جان آپ لوگ آپس میں تو بحث میں نہ الجھیں۔" اس کی بات پہ ناچار دونوں کو خود پہ قابو پاتے ہوئے خاموشی اختیار کرنی پڑی تھی۔

"میرے خیال میں تو دونوں ہی مناسب رشتے ہیں۔ خاندان کے دیکھے بھالے لڑکے ہیں پاپا کا کاروبار اور گھر کی ذمہ داریاں مل کر سنبھالیں گے تو مجھے بھی اطمینان رہے گا۔" احمر کی تو جیسے دلی مراد بر آئی تھی۔ اس کا اصل ارادہ تو اس گھر جائیداد بلکہ ہر چیز کو فروخت کرنا تھا' لیکن فی الوقت تو اسے اپنی جان چھڑانے کے لیے کوئی نہ کوئی سہارا درکار تھا۔ پھر چاہے یہ سہارا ان کے ازلی مخالفین کی طرف سے کیوں نہ پیش کیا جاتا۔ اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

"آپ کیا کہتی ہیں اماں جان؟" وہ ماں کی طرف پلٹا تو ارجمند کا دل چاہا کہ وہ اپنے مفاد پرست بیٹے کا منہ توڑ دیں کیا وہ اپنے باپ کے سوتیلے بہن بھائیوں کے ارادوں اور نیتوں سے واقف نہیں تھا یا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا باپ ضیا کی حرکتوں کی وجہ سے' اپنی زندگی میں ہی بھائی کو انکار کر چکا تھا۔ پھر اس کی یہ رضامندی کیا معنی رکھتی تھی؟

"میں فی الحال اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولیں تو تایا جان نے ایک کڑی نظر ان پر ڈالی۔

"مگر اماں جان....."

"میں نے کہا نا مجھے پریشان مت کرو!" سختی سے کہتی وہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں تو ناچار سب کو خاموشی اختیار کرنی پڑی' لیکن اب کی بار اس خاموشی کا دورانیہ بہت مختصر ہونے والا تھا اور یہ بات وہ سب ہی جانتے تھے۔

☼ ☼ ☼

صباحت اپنے کمرے میں آئیں تو ان کا غصہ عروج پہ تھا۔ نوفل ایک طرف بیٹھا ٹکٹوں کی آن لائن بکنگ میں مصروف تھا جب کہ ضحیٰ' طوبیٰ کے پاس تھی۔ ماں کے چہرے پہ نگاہ پڑتے ہی وہ چونک گیا تھا۔

"کیا ہوا امی؟"

"میں نے اتنا ذلیل لڑکا اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔" وہ غصے سے بولتیں اس کے قریب آبیٹھیں تو نوفل کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

"احمر نے آپ سے بدتمیزی کی ہے کیا؟" وہ جانتا تھا کہ وہ ارجمند بیگم کے ساتھ ان کے کمرے میں موجود تھیں۔ بیٹے کی بات پر صباحت کے چہرے پہ تاسف پھیل گیا۔

"کاش کہ اس نے ایسی ہی کوئی معمولی حرکت کی ہوتی۔ مگر وہ تو....." انہوں نے دل گرفتگی سے اک گہری سانس لی اور پھر دھیرے دھیرے ساری بات نوفل کو سنانے لگیں جو پوری بات سن کے ساکت رہ گیا۔

"طوبیٰ کی شادی؟" اسے لگا جیسے کسی نے اس کی سانس ایک پل کے لیے روک دی ہو۔ وہ بے اختیار لب بھینچ گیا تھا۔

"ارجمند کا رونا دیکھا نہیں جا رہا۔ ضیا ایک نکما اور ٹھیک ٹھاک آوارہ لڑکا ہے۔ تعلیم بھی واجبی سی ہے۔ رہا دانش تو وہ بھی بزنس کے نام پہ ایک معمولی سی دکان چلا رہا ہے۔ اوپر سے ماہ نور سے اچھا خاصا بڑا بھی ہے۔ سونے پر سہاگہ کسی فاریہ نامی لڑکی کے ساتھ معاشقہ بھی چلا رکھا ہے اور پھر دس باتوں کی ایک بات ان لوگوں کی نیتیں! اگر ان کے ارادے نیک ہوتے تو ارجمند کچھ سوچتی بھی' مگر یہاں تو صرف دولت اور جائیداد پہ ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ ہے..... ایسے لالچی لوگوں نے بھلا بچیوں کی کیا قدر کرنی ہے؟" بات کرتے کرتے ان کی آواز بھر آئی تھی۔ نوفل بے اختیار اک بوجھل سانس کھینچتا اپنی پیشانی مسلنے لگا۔ اسی کے ذہن میں گزری رات کا منظر گھوم گیا جب ضیا' طوبیٰ کے کمرے کی کھڑکی سے لگا کھڑا تھا۔ اس کی اخلاقی پستی کا سوچ کر نوفل کا خون نئے سرے سے کھول اٹھا تھا۔

"آپ نے آنٹی کو سمجھانا تھا کہ وہ اپنے فیصلے پہ ڈٹ جائیں۔ ان کی مرضی نہیں ہوگی تو کوئی کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔"

"ارجمند بہت بے بس ہے نوفل۔ یہ سب مل کے اس کی ایک نہیں چلنے دیں گے اور پھر بیٹا جب اپنا ہی سکہ کھوٹا ہو تو وہ بے چاری تنہا کہاں تک لڑے گی۔" وہ دکھ سے بولیں تو نوفل پریشان سا خاموش ہو گیا۔ احمر کی ذلالت نے اسے گنگ کر دیا تھا۔ اس کا ذہن یک لخت خالی پلیٹ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ کراچی واپسی' کاروبار کی مصروفیت وہ ہر چیز جیسے بھول گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح جہاں کچھ لوگوں کے لیے بہت بوجھل طلوع ہوئی تھی وہیں عصمت پھپھو اور تایا جان کی پوری فیملی کے لیے یہ نیا دن بہت سی امیدیں لے کر آیا تھا۔ احمر بھی کل کے برعکس آج خاصا پر سکون نظر آرہا تھا۔ عصمی پھپھو خود جا کر طوبیٰ اور ماہ نور کو ان کے کمروں سے لے کر آئی تھیں۔ صباحت کے سمجھانے پر ارجمند بھی باہر آئی تھیں۔ یوں کافی دنوں بعد سب نے ایک ساتھ ناشتا کیا تھا۔ کھانے کی میز پہ ضیا کی طوبیٰ پہ جمی نگاہیں' نوفل کو رہ رہ کے طیش دلا رہی تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ یا تو طوبیٰ کو وہاں سے غائب کر دے یا پھر اس گھٹیا انسان کو اٹھا کر اس جگہ پھینک آئے جہاں سے دوبارہ اس کی واپسی ممکن نہ ہو۔

"آپ ناشتا کیوں نہیں کر رہے بھائی؟" ضحیٰ کے ٹوکنے پر اپنے غصے سے الجھتے نوفل نے چونک کر بہن کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی بات طوبیٰ کو بھی نظریں اٹھانے پر مجبور کر گئی تھی اس نے بے اختیار نوفل کی پلیٹ کی طرف دیکھا تھا جس میں سے برائے نام چند نوالے لیے گئے تھے۔

"دل نہیں کر رہا۔ تم بس مجھے چائے بنا دو۔" بے دلی سے کہتا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تو طوبیٰ کی نظریں اس کے چہرے پہ جا ٹھہریں۔ وہ کھانے کی میز سے اٹھ کر ایک طرف رکھے صوفوں پر جا بیٹھا تھا۔ اس کی بے زاری طوبیٰ کے دل میں ایک ٹیس بن کر چبھی تھی۔ یہ یقیناً" اس کی موجودگی کا اعجاز تھا جو نوفل جاہ کے لیے وہاں بیٹھنا محال ہو گیا تھا۔ یک لخت اسے ڈھیروں شرمندگی نے آن گھیرا تھا۔ اسے اپنی موجودگی سے کسی کو پریشان کرنے کا کوئی حق نہ تھا اور اس شخص کو تو بالکل بھی نہیں جو پہلے ہی یہاں مارے باندھے رکنے پہ مجبور ہوا تھا۔

"ہاں تو ارجمند۔ پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟" تایا جان کی آواز طوبیٰ کی سوچوں کے تانے بانے کو بکھیر گئی تھی۔ اس نے رخ موڑ کر اپنے دائیں جانب دیکھا تھا۔ جہاں تایا جان اس کے پاپا کی کرسی پہ بڑے کروفر سے جمے بیٹھے تھے۔

"مجھے یہ دونوں رشتے منظور نہیں!" اس کی ماں سرد لہجے میں بولیں تو طوبیٰ نے ایک جھٹکے سے پلٹ کر اماں جان کی طرف دیکھا۔ جو بے تاثر چہرے کے ساتھ اپنی نظریں چائے کی پیالی پہ جمائے ہوئے تھیں۔ "یہ کن رشتوں کی بات ہو رہی تھی؟" ڈوبتے ابھرتے دل کے ساتھ اس نے ماہ نور کی جانب دیکھا تھا جو اسی کی طرح دم سادھے بیٹھی تھی۔ ڈائننگ روم کی فضا میں اچانک خاموشی چھا گئی تھی۔

"پوچھ سکتا ہوں کیا خرابی ہے ان رشتوں میں؟" احمر کی ناگواری سے بھرپور آواز پہ طوبیٰ نے الجھ کر بھائی کی طرف دیکھا تھا۔

"یہ کیا ماجرا ہے؟" اس نے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔

"کوئی خرابی نہیں۔ بس میری ہی بیٹیاں ان رشتوں کے قابل نہیں۔" سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے ارجمند نے سر اٹھا کر بیٹے کی جانب دیکھا۔ تو عصمی پھپھو کی بھنویں تن گئیں۔

"یہ تو تمہاری کسر نفسی ہے ارجمند جو تم سب کے درمیان ہمیں ریشم میں لپیٹ کے مار رہی ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتی کہ ہمارے ہی بیٹے تمہاری شہزادیوں کے لائق نہیں۔" اور پھپھو کی بات پہ طوبیٰ کا رنگ اڑ

گیا۔ تو کیا کل رات اماں جان کے کمرے میں یہ باتیں ہوئی تھیں؟ اس نے بے یقینی سے اپنے اردگرد موجود چہروں کی طرف دیکھا تھا۔ کیا یہ وقت ان باتوں کا تھا؟ اس کے اندر جیسے دھواں سا بھرنے لگا تھا۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا آپا۔ دونوں بچیاں ابھی پڑھ رہی ہیں..... میں فی الحال انہیں گھرداری کے جھنجھٹ میں نہیں ڈالنا چاہتی۔" ارجمند نے نند کی طرف دیکھتے ہوئے بات سنبھالی تو احمر نے استہزائیہ انداز میں ہنکارا بھرا۔

"ہونہہ! انہیں گھرداری کے جھنجھٹ میں نہیں ڈالنا چاہئیں۔ چاہے میری جان یہاں نئے جھنجھٹ میں پھنس جائے!" اس کے لہجے کی ترشی طوبیٰ اور ماہ نور کے ساتھ ساتھ ضحیٰ اور نوفل کو بھی ساکت کر گئی۔ اس درجے بے زاری! طوبیٰ کو اپنی آنکھیں جلتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

"تو کس نے کہا ہے تمہیں یہاں نئے جھنجھٹوں میں پھنسنے کو؟" ارجمند کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ "اپنا سامان اٹھاؤ اور کل ہی یہاں سے چلتے بنو۔ ہمارے لیے ہمارا اللہ بہت کافی ہے۔" ان کا گلا بے اختیار رندھ گیا تھا، مگر مقابل کو نہ تو شرم آئی تھی اور نہ ہی خوف خدا محسوس ہوا تھا۔

"ہاں یہاں سے چلتا بنوں تاکہ آپ میری ناخلفی اور اپنی مظلومیت کے قصے رو رو کر ساری دنیا کو سنائیں!" احمر نے تیوریاں چڑھائیں۔ "ایک بات اچھی طرح سے سمجھ لیں اماں جان۔ میں ہر حال میں ان دونوں کے فرض سے فارغ ہو کے جاؤں گا۔ اگر آپ کے پاس کوئی اور پرپوزل ہیں تو مجھے بتائیں۔ نہیں تو تایا جان اور پھپھو آپ میری طرف سے ان رشتوں کو ....."

"میرے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟" نوفل جاہ کی آواز اچانک کمرے میں گونجی تو ایک پل کو وہاں سناٹا چھا گیا۔ اتنا گہرا سناٹا جیسے وہاں کوئی ذی النفس موجود نہ ہو۔

"کیا؟" احمر نے بھنویں سکیڑے اسے دیکھا تھا جب کہ طوبیٰ کی آنکھیں مارے بے یقینی کے برسنا بھول گئی تھی۔

"کیا بکتے ہو لڑکے!" تایا جان کی غصے سے بھری آواز سب کو ہوش میں لے آئی تھی۔

"تم نے کیا ہمارے خاندان کی عزت کو مذاق سمجھ رکھا ہے؟" وہ ایک جھٹکے سے اٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں شعلوں کی لپک تھی۔ نوفل نے ایک سرد نظر ان پہ ڈالی تھی اور احمر کی جانب دیکھنے لگا تھا۔

"میں نے تم سے پوچھا ہے احمر حسن۔ کیا تمہیں طوبیٰ کے لیے میرا رشتہ قبول ہے؟"

"نوفل!" پتھرائی بیٹھی صباحت اپنی جگہ سے گھبرا کے اٹھی تھیں۔ یک لخت ماحول میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔

"تیری تو!" دانت پیستے ہوئے ضیا نے آن کی آن میں میز پر سے چھری جھپٹی تھی اور کرسی دھکیل کر نوفل کی جانب لپکا تھا۔ اسے آگے بڑھتا دیکھ کر خواتین کی چیخیں نکل گئی تھیں۔

"ضیا!" دانش اور احمر نے سرعت سے اس کا راستہ روکا تھا۔ سراسیمگی کے عالم میں طوبیٰ کا چہرہ خطرناک حد تک سفید پڑ گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ لہرائی تھی اور برابر بیٹھی ماہ نور کے کندھے پہ آ رہی تھی۔ اسے بے سدھ پا کے ماہ نور کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ دانش اور احمر کے ساتھ عمر اور عثمان چچا نے بامشکل تمام ضیا کو قابو کیا تھا۔ اسی اثنا میں صباحت اور ضحیٰ بھاگتی ہوئی نوفل کے پاس آئی تھیں۔

"چلیں بھائی! خدا کا واسطہ ہے یہاں سے چلیں!" ضحیٰ نے فق رنگت لیے اس کا بازو کھینچا۔ وہ پوری جان سے کانپ رہی تھی۔

"میں جواب لیے بغیر یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔" احمر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے ہاتھ چھڑایا تو ضحیٰ ماں کو دیکھتی خوف زدہ سی رو پڑی۔

"جواب چاہیے!" احمر غصے سے کھولتا آگے بڑھا۔ "نہیں منظور۔ مجھے تمہارا رشتہ نہیں....."

"مجھے منظور ہے۔" ماں کی آواز پہ احمر ایک پل کو ساکت رہ گیا تھا۔

"کیا؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" وہ حیرت زدہ سا ان کی طرف پلٹا تو ارجمند آگے بڑھ آئیں۔

"وہی جو تم نے سنا ہے۔"

"ارجمند تم ہماری توہین کر رہی ہو!" تایا جان کا چہرہ انگارے کی مانند دہک اٹھا تھا۔

"معذرت کے ساتھ بھائی جان، لیکن ہر ماں کو حق ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے بہتر سے بہترین کا انتخاب کرے اور نوفل میری نظر میں میری طوبیٰ کے لیے بہترین شریک سفر ہے۔" وہ بنا کسی پس و پیش کے واشگاف الفاظ میں بولیں۔ ان کے جواب نے نوفل جاہ کے چہرے پہ بڑی بھرپور مسکراہٹ بکھیر دی۔

"بہت ہو گیا۔" تائی جان غصے سے ارجمند بیگم کی طرف بڑھیں۔ "تم غیروں کو اپنوں پہ فوقیت دے کے بہت پچھتاؤ گی ارجمند!" ان کی آنکھوں سے لپٹیں سی نکل رہی تھیں۔

"ارے یہ تو ہماری اعلا ظرفی اور اس خاندان کو جوڑے رکھنے کی کوشش تھی جو ہم تمہارے جیسی بددماغ عورت کے انکار کے باوجود یہ دہلیز پکڑے بیٹھے تھے، مگر آج تم نے سب کے سامنے میرے بچے کو کم تر گردان کے ہمارا اور اپنا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔ تم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تم ہمارے خاندان کی نہ تھیں اور نہ کبھی بن سکتی ہو!"

"بھابھی!" ارجمند حسن کی آنکھوں میں مارے تاسف کے آنسو اتر آئے تھے۔

"خبردار جو مجھے بھابھی کہا۔" انہوں نے انگلی اٹھائی۔ "اور آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ مزید عزت افزائی کروانی ہے کیا؟" وہ شوہر کی جانب پلٹیں تو تایا جان نے ایک کھولتی نظر ارجمند بیگم پہ ڈالتے ہوئے بہن بھائیوں کی طرف دیکھا۔

"میرے خیال میں تم سب کے بھی اب یہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں رہا۔" ان کی بات پہ عصمی پھپھو قہر آلود نگاہوں سے ان چاروں کو گھورتی اندر کی جانب بڑھ گئی تھیں۔ عثمان اور عمر چچا نے بھی اپنی اپنی بیگمات کو اشارہ کیا تو ان کی فیملیز بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے اطمینان کو یہی کافی تھا کہ جو دولت ان کی نہ ہو سکی تھی وہ ان کے بڑے بھائی اور بہن کے ہاتھ بھی نہ لگ پائی تھی۔ ان سب کو جاتا دیکھ کے احمر بھی غصے سے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اگلے چند لمحوں میں پورچ میں گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آوازیں آئی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے حسن ولا خالی ہو گیا تھا۔ ان کے جاتے ہی ارجمند سسک اٹھی تھیں۔

"مت روئیں آنٹی۔ میں ہوں نا۔" نوفل نے آگے بڑھ کر انہیں خود سے لگایا تو ارجمند بیگم کی سسکیوں میں اضافہ ہو گیا۔

"میری بچی کا بہت خیال رکھنا نوفل!" اور نوفل جاہ کی نظریں اردگرد سے بے خبر طوبیٰ حسن کے وجود پہ جا ٹھہری تھیں۔

"بے فکر رہیں آنٹی۔ میں اس کا خود سے بھی بڑھ کر خیال رکھوں گا۔" انہیں یقین کی ڈور تھماتے ہوئے اس کی نگاہیں طوبیٰ کی بند آنکھوں پہ جم گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم نے اتنی اچانک اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟" صباحت بیگم نے غصے سے بیٹے کی طرف دیکھا وہ اسی وقت نوفل اور ضحیٰ کے ساتھ اپنے کمرے میں تنہا تھیں۔ نوفل کچھ ہی دیر پہلے ڈاکٹر کو لے کر آیا تھا جس نے طوبیٰ کو چیک کرنے کے بعد نیند کا انجکشن لگا دیا تھا۔ ڈاکٹر کے نزدیک اس کی یہ بے ہوشی صدمے اور ذہنی دباؤ کا نتیجہ تھی، سو اس کا پر سکون ہونا ازحد ضروری تھا۔ طوفان گزر جانے کے بعد ماہ نور کا چہرہ بھی کھل اٹھا تھا۔ نوفل جیسے بے مثال شخص سے استوار ہونے والا یہ نیا اور مضبوط رشتہ اس کے دل و دماغ کو بہت سی فکروں سے آزاد کر گیا تھا۔ وہ اپنی عزیز از جان آپی کے لیے بے حد خوش تھی۔ ایسا ہی بھرپور اطمینان ارجمند بیگم کے چہرے سے بھی چھلک رہا تھا۔ جسے دیکھ دیکھ کر صباحت بیگم کی

پریشانی دوچند ہوگئی تھی۔ ان کے لیے نوفل کے اس فیصلے کی وجہ جاننا ناگزیر ہوگیا تھا۔ تب ہی وہ تنہائی ملتے ہی اس پہ پھٹ پڑی تھیں۔

"کہاں تو تم سالوں ان لوگوں سے نا صرف خود دور رہے بلکہ ہمیں بھی دور رکھا اور کہاں اب اتنی محبت امڈ آئی ہے کہ لے کر رشتہ ہی جوڑ لیا! میں پوچھتی ہوں تمہارا دماغ درست ہے بھی کہ نہیں؟" ان کا خشمگین انداز نوفل کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھیر گیا جسے اس نے "فوراً" سے پیشتر دبا لیا، لیکن اس کے چہرے سے پھوٹتی روشنی اس کی حقیقی خوشی کی غماز تھی۔ اس چمک نے ضحٰی کو چونکا دیا تھا۔ یہ کسی کی ہمدردی میں کیا فیصلہ تو ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے بھائی کے تیور دیکھتے ہوئے سوچا۔

"امی ماضی میں بھی، میں نے جو فیصلہ لیا تھا وہ ہم سب کی بھلائی کے لیے لیا تھا اور آج بھی میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ ہم سب کی بہتری کے لیے ہی کیا ہے۔ آپ بس مجھ پہ بھروسا رکھیں۔" رسان سے کہتے ہوئے اس نے ماں کا ہاتھ تھاما۔

"تم پر بھروسا تھا بیٹا تب ہی تو میں نے تم سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا تھا، لیکن آج بات اور ہے۔ تمہیں اس فیصلے کی وجہ بتانی ہوگی۔ شادی کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے نوفل اور طوبیٰ مجھے اپنی بیٹی کی طرح عزیز ہے۔ میں نہیں چاہوں گی کہ محض ہمدردی میں آکر تم اس یتیم بچی پہ کوئی احسان کرو۔"

"آپ مجھے ایسا انسان سمجھتی ہیں کیا؟" اس نے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا تو صباحت نے اک گہری سانس لی۔

"نہیں، لیکن میں کسی بھی لمحاتی فیصلے سے ڈرتی ہوں۔"

"یہ بات ہے تو پھر بے فکر رہیں۔" وہ دھیرے سے مسکرایا تو صباحت چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگیں۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ لمحاتی فیصلہ ہرگز نہیں۔ یہ سالوں پہ محیط میری خواہش ہے امی۔" وہ دھیرے سے بولا۔ تو صباحت کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"کیا؟" ان کی حیرت میں ڈوبی نظریں اس سے ہوتیں ضحٰی پہ آٹھہریں جو منہ کھولے بھائی کو تک رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے ان کے لبوں پہ خوش گوار سی بے یقینی میں ڈوبی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم سچ کہہ رہے ہو نوفل؟" ماں کے انداز پہ وہ بے اختیار جھینپ گیا۔ اور اپنے سنجیدہ سے بیٹے کا نیا روپ صباحت کو اندر تک سرشار کر گیا۔

"جی امی۔" اس کے اقرار پہ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔

"اگر ایسی بات تھی بیٹا۔ تو تم نے ہمارے درمیان موجود تعلق کو مضبوط کرنے کے بجائے توڑا کیوں؟" انہوں نے اس کا چہرہ چھوا۔ "تمہارا یہ فیصلہ طوبیٰ کو ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے دور بھی لے جا سکتا تھا۔"

"لے جا سکتا تھا۔ لے کر گیا تو نہیں نا۔" اس کی مسکراہٹ لحظہ بھر کو پھیکی پڑی۔ "جانتی ہیں امی۔ زندگی میں بعض اوقات ایسے موڑ آجاتے ہیں کہ انسان کو نا چاہتے ہوئے بھی اپنے ہی دل کے خلاف جانا پڑ جاتا ہے اور میرا یہ فیصلہ ایسا ہی ایک تکلیف دہ فیصلہ تھا، لیکن شاید کاتب تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ جب ہی تو حالات نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ میں خود بھی حیران رہ گیا ہوں۔"

"نا صرف حیران رہ گئے ہیں بلکہ ہمیں بھی حیران کر دیا۔" ضحٰی باچھیں کھلائے اس کے قریب آبیٹھی۔ "اب سمجھ میں آئی، آپ ہر وقت طوبیٰ طوبیٰ کیوں پکارتے رہتے تھے۔" اس نے نوفل کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

"پہ بتائیں میری سہیلی کو بھی پتا ہے یا اس غریب پہ بھی بم گرانے کا ارادہ ہے؟" وہ شرارت سے بولی تو صباحت ہنس پڑیں۔

"تو اس معصوم کو بھلا کہاں سے پتا چلنے لگا۔ اس گھنے نے تو ہمیں بھی خبر نہیں ہونے دی۔" ماں کی بات پر دونوں بہن بھائی ہنس پڑے۔

"بالکل صحیح نام دیا ہے امی آپ نے۔" ضحٰی ہنستے ہوئے بولی۔ "یہ اتنے بڑے گھنے نکلیں گے مجھے اندازہ نہیں تھا، لیکن ایک بات ماننی پڑے گی بھائی۔" وہ نوفل کی طرف پلٹی۔ "آپ بہت خوش قسمت انسان ہیں۔ اتنے سالوں کے بعد بھی قسمت نے پانسا آپ کے حق میں پلٹ دیا، مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"ماشاء اللہ کہو۔" صباحت نے فی الفور بیٹی کو ٹوکا۔

"جی۔ جی ماشاء اللہ... میں اب ذرا جا کے آپ کے دوسرے لاڈلے کو بھی مطلع کر دوں۔ قسم سے چیخ اٹھیں گے۔" وہ مزے لیتی موبائل پکڑے باہر نکل گئی تو وہ دونوں ہنس پڑے۔

☆ ☆ ☆

طوبیٰ کا مکمل طور پہ ہوش میں آنا، ارجمند بیگم کے لیے ایک نئی قیامت لے آیا تھا۔ انہوں نے اپنے تئیں اسے نوید سنائی تھی، مگر اس کا ردعمل انہیں ساکت کر گیا تھا۔ اس نے رو رو کے پورا کمرہ سر پہ اٹھا لیا تھا۔

"مر جاؤں گی، مگر نوفل جاہ سے شادی نہیں کروں گی۔" اس کی رٹ ارجمند کے صبر کا پیمانہ لبریز کر گئی تھی۔

"تو کس سے کرو گی؟ اس ضیا سے؟" وہ بالآخر چیخ اٹھی تھیں۔

"ہاں کرلوں گی!" وہ چہرے پہ سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی تو ارجمند دنگ رہ گئیں۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔" ان کے لہجے کی سختی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"ہاں نہیں ہے میرا دماغ ٹھیک!" وہ روتے ہوئے چلائی تو اس درجہ بدتمیزی پہ ارجمند ہکا بکا رہ گئیں۔ اگلے ہی لمحے وہ دانت پیستیں آگے بڑھی تھیں اور طوبیٰ کا بازو جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔

"منہ بند کرو اپنا۔ اس سے پہلے کہ تمہارا وہ بدخصلت بھائی سن لے۔"

"اچھا ہے وہ سن لیں... نہیں کرنی مجھے نوفل جاہ سے شادی۔" اس پہ جیسے ضد سوار ہوگئی تھی۔ اس کے تیور ارجمند بیگم کو تھکانے لگے تھے وہ ہار کے اس کے قریب بیٹھ گئی تھیں۔

"کیوں مجھے ستاتی ہو طوبیٰ؟ بجائے خدا کا شکر کرنے کے کہ اس نے تمہاری جان ان مکار لوگوں سے چھڑا کر نوفل جیسا انمول ہیرا تمہارا مقدر بنا دیا، تم یہ تماشا لگا رہی ہو۔" انہوں نے نرمی سے اس کا چہرہ چھوا۔ "ارے وہ بچہ تو اس مشکل وقت میں ہمارے لیے فرشتہ بن کر آیا ہے... میں تو چاہ کر بھی ساری عمر اس کا احسان نہیں اتار سکتی۔" ماں کی بات اس کا خون جلا گئی۔ وہ ان کا ہاتھ جھٹکتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہی تو وہ گھٹیا شخص چاہتا ہے۔ وہ میرے مان، میری خودداری کو اپنے احسان تلے کچل دینا چاہتا ہے۔" وہ زہرخند سی بولی۔ ارجمند بیگم کا ضبط چیخ سا گیا۔

"طوبیٰ!" وہ غصے سے اٹھیں۔ ان کی بلند آواز سن کے اس کے کمرے کی طرف آتا نوفل ٹھٹک کر رک گیا۔ بے اختیار اس کی نظریں دروازے کی جانب اٹھ گئیں جو ہلکا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے چلتا دروازے کے پاس آکھڑا ہوا۔

"تمہاری شادی نوفل سے ہی ہوگی اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" ارجمند کا قطعیت میں ڈوبا لہجہ نوفل کے خیال کی تصدیق کر گیا... اندر اسی کی ذات زیر بحث تھی۔

"میں آپ کے اس فیصلے کو کبھی نہیں مانوں گی۔ میں کبھی بھی نوفل جاہ سے شادی نہیں کروں گی۔" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتی دوبدو بولی تو ارجمند حسن کی برداشت مکمل طور پہ جواب دے گئی۔ اگلے ہی لمحے ان کا ہاتھ اٹھا اور پے در پے طوبیٰ کے چہرے پہ ایک نہیں بلکہ دو بار اپنا نشان چھوڑ گیا۔ تھپڑوں کی آواز باہر کھڑے نوفل کو ہلا کر رکھ گئی۔ وہ دروازہ دھکیلتا سرعت سے اندر چلا آیا۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں آنٹی؟" اس نے آگے بڑھ کے انہیں روکنا چاہا۔ اسے یوں اچانک اپنے سامنے

پا کے جہاں ارحمند بیگم کا چہرہ فق ہو گیا وہیں طوبیٰ بیٹھے سے اکھڑ گئی۔

"آپ کی جرأت کیسے ہوئی میرے کمرے میں آنے کی؟ نکل جائیں یہاں سے!" وہ حلق کے بل چلائی تو ارحمند گھبرا کے آگے بڑھیں۔

"طوبیٰ!" لیکن نوفل نے ان کا بازو تھام لیا۔

"پلیز آنٹی۔ اس طرح پیش نہ آئیں۔" اس کا نرم لہجہ ارحمند بیگم کو مارے شرمندگی کے پانی پانی کر گیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"یا اللہ یہ دن دکھانے سے پہلے تو نے مجھے موت کیوں نہیں دے دی۔" وہ چہرے پہ دوپٹا رکھے سسک اٹھی تھیں۔ طوبیٰ نے آگ برساتی نظروں سے نوفل جاہ کی طرف دیکھا تھا اور مٹھیاں بھینچے آگے بڑھی تھی۔

"مل گیا چین! پڑ گئی ٹھنڈک! یہی چاہتے تھے نا آپ کہ ہمیشہ کی طرح آپ کی اچھائی کے ڈنکے بجیں۔ تو لیں خوش ہو جائیں۔ ہو گئی آپ کی واہ واہ، مگر میری جان چھوڑیں۔" انتہائی گستاخانہ انداز میں بولتے ہوئے اس نے زور سے ہاتھ جوڑے تو نوفل کے لبوں پہ اک دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ایک نظر روتی ہوئی ارحمند پہ ڈالی۔

"آنٹی میں طوبیٰ سے اکیلے میں بات کر سکتا ہوں؟" وہ اسے نظر انداز کیے ارحمند سے مخاطب ہوا تو طوبیٰ بپھر اٹھی۔

"سنا نہیں۔ آپ نے؟ جان چھوڑیں میری۔ مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔"

"نوفل!" ارحمند روتی ہوئی اس کی طرف پلٹیں۔ "بیٹا آج میں تمہیں کہتی ہوں۔ لعنت بھیجو اس لڑکی پہ۔ یہ سچ میں تمہارے لائق نہیں۔"

"آنٹی۔" نرمی سے کہتے ہوئے اس نے ان کا ہاتھ تسلی آمیز انداز میں سہلایا تو ارحمند پلٹ کے تیز قدموں سے باہر نکل گئیں۔ طوبیٰ لمحے کا توقف کیے بنا ان کے پیچھے لپکی تھی، مگر اس کی کلائی پہ نوفل کی مضبوط گرفت نے اس کے بڑھتے قدموں کو روک دیا تھا۔

"چھوڑیں مجھے!" بری طرح مچلتے ہوئے وہ غصے سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اگلے ہی پل اس نے اپنے بائیں ہاتھ کے ناخن نوفل کے ہاتھ کی پشت میں گاڑ دیے تھے۔ اس کے لبوں سے "سی" کی آواز پہ طوبیٰ نے فاتحانہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا تھا اسے اپنی طرف تکتا پا کے نوفل تکلیف کے باوجود مسکرا دیا تھا۔

"ہو گئی تسلی؟" اپنا وار خالی جاتا دیکھ طوبیٰ کے لب سختی سے بھینچ گئے تھے۔

"تم شادی سے انکار کیوں کر رہی ہو؟" اس پہ نگاہیں جمائے نوفل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا تو طوبیٰ کی آنکھوں میں چنگاریاں سی اڑنے لگیں۔

"اس لیے کہ مجھے آپ سے نفرت ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ سلگ کر بولی تو نوفل کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اچھا! لیکن غالباً" وہ تم ہی تھی نا جس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔" اور طوبیٰ اس کے منہ سے گزرے وقت کا حوالہ سن کے ایک لمحے کو سن رہ گئی۔ تو کیا وہ سب اسے ابھی تک یاد تھا؟ اس کا دھواں دھواں چہرہ نوفل جاہ کی مسکراہٹ گہری کر گیا۔

"جس بات کو تم آج تک فراموش نہیں کر سکیں، اسے میں کیسے بھلا سکتا ہوں طوبیٰ حسن۔" اور طوبیٰ اپنے خاموش سوال کا جواب پا کے بری طرح چونک گئی۔ تو کیا وہ آج بھی اس کا چہرہ پڑھنے کا ہنر جانتا تھا؟ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طوبیٰ نے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔

"یہ جو تمہارا چہرہ ہے نا، یہ ہمیشہ سے میرے لیے ایک کھلی کتاب رہا ہے۔" نرمی سے کہتے ہوئے نوفل نے اس کے بالوں کی لٹ اس کے کان کے پیچھے اڑسی تو طوبیٰ کے لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اسی بات کا تو فائدہ اٹھایا ہے آپ نے ساری زندگی۔"

"طوبیٰ!"

"بس۔" وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑاتی پیچھے ہٹی۔ "میں نے جو کہنا تھا کہہ لیا۔ آپ ناحق خود کو مشکل میں ڈال رہے ہیں۔ مجھے ضیا کے رشتے پہ کوئی اعتراض نہیں۔"

"مگر مجھے ہے۔"

"آپ کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے؟" اس کی پیشانی کے بلوں میں اضافہ ہوا۔

"میں کون ہوتا ہوں یہ تمہیں جلد پتا لگ جائے گا۔ فی الحال تمہارے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"شادی کرنا چاہتے ہیں؟" طوبیٰ نے استہزائیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔ "اور وہ بھی مجھ سے؟" وہ اپنے سینے پہ ہاتھ رکھے ہنستی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ نوفل کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

"کیوں جھوٹ بول رہے ہیں؟ نہ میں آپ کو چاہتی ہوں اور نہ آپ مجھے.... آپ جس سے محبت کرتے ہیں۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ جائیں جا کر اس سے شادی کریں اور اپنی زندگی گزاریں۔ مجھے آپ کی ہمدردی اور ترس کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ تیز نظروں سے اسے گھورتی سرد مہری سے بولی تو نوفل پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے مقابل آکھڑا ہوا۔

"اس سے بھی کر لوں گا۔ پہلے تم سے تو کروں۔"

"آپ...." طوبیٰ دانت پیستے ہوئے غرائی۔ "نہایت گھٹیا انسان ہیں۔ آپ سے شادی تو دور کی بات میں آپ کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی۔ نجانے اتنے سالوں بعد کہاں سے آکے گلے پڑ گئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے آپ کی نظر میرے باپ کی دولت پر ہے۔ آپ سازشی اور موقع پرست انسان ہیں نے اپنی...." اور نوفل جاہ کا تھپڑ طوبیٰ کو اس کی بات مکمل کرنے سے روک گیا اس کا چہرہ صحیح معنوں میں دوسری طرف گھوم گیا تھا۔

"میں نے بہت کوشش کی کہ تم سے نرمی سے بات کر سکوں، مگر تم اس قابل نہیں رہیں کہ تم سے انسانیت سے پیش آیا جائے۔"

"ہاں میں بری ہوں۔ آپ مجھے دکھ دینے کے علاوہ اور دے بھی کیا سکتے ہیں۔ چلے جائیں میری زندگی سے۔ چھوڑ دیں میرا پیچھا!" چلاتے ہوئے وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر روتی کارپٹ پہ دو زانوں گر گئی تھی۔ نوفل لب بھینچے اس کے سسکتے ہوئے وجود کو دیکھتا رہا تھا اور پھر پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بے نشان راستوں پہ قدم اٹھاتے اس کے پاؤں تھکنے لگے تھے۔ وہ ایک پارک کے بنچ پہ آکے گر سا گیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں پارک میں زیادہ رش نہ ہونے کی وجہ سے خاصا سکون تھا۔ اس نے اپنی دکھتی ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے بنچ کی پشت سے سر ٹکا دیا تھا۔ ستاروں سے بھرا آسمان اس کی خالی نظروں کے سامنے تھا۔ اس کی نگاہیں ان چمکتے ستاروں کے درمیان بھٹکنے لگی تھیں۔ پتا نہیں ان میں سے اس کے مقدر کا ستارہ کون سا تھا؟ مایوسی سے سوچتے ہوئے اسے بے اختیار وہ وقت یاد آیا تھا جب وہ اور احمر چھوٹے تھے۔ بچپن میں وہ دونوں ہمیشہ اس ستارے کو اپنا کہا کرتے تھے جو آسمان میں سب سے زیادہ چمک دار ہوا کرتا تھا۔ ایسے میں کتنی ہی بار اس چمک دار ستارے کی ملکیت پہ ان کی لڑائی بھی ہوئی تھی، مگر دونوں کے یقین میں کبھی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اگلی بار پھر اسی دھڑلے سے اس ستارے کی طرف اشارہ کیا کرتے تھے۔

کاش کہ وہ آج بھی اسی یقین اور اسی اعتماد کے ساتھ اس ستارے کو اپنا کہہ سکتا جو اس لمحے آسمان میں سب سے زیادہ روشن اور خوب صورت تھا، مگر افسوس کہ بچپن کا وہ اعتماد بچپن کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا تھا۔ اب تو حقیقتوں نے جیسے ہر مان اور ہر یقین کو کمزور کر دیا تھا۔ وہ یقین جو اسے اپنی محبت پہ تھا۔ وہ مان جو اسے اپنے محبوب پہ تھا۔ نوفل جاہ کو یقین تھا کہ وہ طوبیٰ

حسن کو منالے گا اور نوفل جاہ کو مان تھا کہ طوبیٰ حسن مان جائے گی، مگر اس کے دونوں ہی دعوے غلط ثابت ہوئے تھے۔ وہ ان سے اس حد تک بدگمان ہو چکی ہوگی اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اس کی محبت کو ترس گردان رہی تھی۔ تقدیر کے اس اتفاق کو اس کی مکاری اور موقع پرستی قرار دے رہی تھی، لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ سب کہتے ہوئے بس کی آنکھیں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں آج بھی نوفل جاہ کی محبت میں پور پور ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس کی زبان لاکھ نفرت کا راگ الاپتی، مگر اس کا دل آج بھی نوفل کی محبت کو خود میں بسائے ہوئے تھا۔ وہ صرف غصے اور ضد میں اپنا نقصان کرنے پہ تلی ہوئی تھی اور اس بات کی اجازت نوفل اسے کسی قیمت پر نہیں دے سکتا تھا۔

کاش کہ وہ وقت کو پیچھے لے جا سکتا تو ان تمام واقعات کو حرف غلط کی طرح اپنی زندگی سے مٹا دیتا جنہوں نے اسے اپنی محبت کی دل شکنی پر مجبور کیا تھا۔ اسے آج بھی ماضی کے وہ دن یاد تھے جب مشکلات نے ان کا گھر دیکھ لیا تھا اور وہ ان کا سامنا کرنے کو بالکل تنہا رہ گیا تھا.....

☆ ☆ ☆

کہتے ہیں کہ جب وقت خراب ہو تو ساری پریشانیاں ایک ساتھ چلی آتی ہیں۔ گھر کے سارے اخراجات اپنی جگہ تھے اور آمدنی کا واحد در بھی بند ہو گیا تھا۔ ناچار نوفل کو گاڑی بیچنی پڑی تھی۔ اس نے گاڑی کی رقم کو لاکریاں کے حوالے کیا تھا۔ جو اس سے گھر چلانے لگی تھیں۔ حسن مجتبیٰ کے دیے ہوئے چیک کو صباحت نے فی الوقت اٹھا کے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ وہ اس بندھی ہوئی رقم کو کسی صورت توڑنے کے حق میں نہ تھیں۔ نوفل نوکری کی تلاش میں جو صبح کا گھر سے نکلتا تو رات گئے انسٹیٹیوٹ سے پڑھا کے واپس لوٹتا۔ ہر جگہ رشوت اور سفارش کا راج تھا۔ وہ چند ہی دنوں میں تھکنے لگا تھا۔ تنگ آکر اس نے تین چار پوزیشنز پکڑلی تھیں۔ حالات کی سختی اس کا دل چھوٹا کرنے لگی تھی، مگر وہ امید اور ہمت کا دامن چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔

اس دوران احمر نے باپ سے بات کر کے اپنی باہر جانے کی ضد منوالی تھی۔ حسن مجتبیٰ کے اثر و رسوخ اور پیسے نے سال چھ ماہ کے سلسلے کو ہفتوں تک محدود کر دیا تھا۔ یوں محض تین ماہ میں احمر کینیڈا کے لیے فلائی کر گیا تھا۔

وقت چند ماہ مزید آگے بڑھا تھا۔ نوفل کی نوکری کا مسئلہ تاحال حل نہ ہو سکا تھا حالانکہ صباحت کتنی ہی بار حسن مجتبیٰ سے اس سلسلے میں مدد کی درخواست کر چکی تھیں، مگر انہوں نے سوائے لفظی تسلی کے اور کچھ نہ کیا تھا حالانکہ اگر وہ چاہتے تو نوفل کو اپنی کمپنی میں کسی بھی عہدے پہ رکھ سکتے تھے، مگر انہوں نے تو ایسے آنکھیں بدلی تھیں کہ صباحت تو ایک طرف خود ارجمند بھی شوہر کی اس بے گانگی بھرے سلوک پہ حیران رہ گئی تھیں۔ یہی حال طوبیٰ کا بھی تھا۔ وہ باپ کی اس بے حسی کا گلہ کتنی ہی بار ماں سے کر چکی تھی، لیکن ارجمند کے احساس دلانے کے باوجود حسن مجتبیٰ نے اس معاملے میں چپ سادھے رکھی تھی۔ یہاں تک کہ وہ تھک کر خود ہی خاموشی اختیار کرنے پہ مجبور ہو گئی تھیں۔

طوبیٰ کے لیے یہ ساری صورت حال بے حد تکلیف اور شرمندگی کا باعث تھی۔ اس کے لیے باپ کا یہ رویہ ناقابل فہم تھا۔ وہ نوفل کو دن رات بھاگ دوڑ کرتا دیکھ کے اندر ہی اندر نادم اور ملول ہو جایا کرتی تھی، مگر آفرین تھی جاہ پیلس کے مکینوں پہ۔ ان کے لبوں پہ نہ تو حرف شکایت آیا تھا اور نہ ہی رویوں میں کوئی فرق۔ ان کی محبتوں کا وہی عالم تھا جو طوبیٰ کو مزید پشیمان کیے دیتا تھا۔ تنگ آکر اس نے وہاں جانا ہی کم کر دیا تھا، لیکن کب تک۔ وہ خود کو ان سب سے خاص کر نوفل سے زیادہ عرصے تک دور نہیں رکھ سکتی تھی۔

دن کچھ اور آگے بڑھے تھے اور ایک روز غبن کے اس مقدمے کا فیصلہ بھی آگیا تھا جس کے وہ سب بے چینی سے منتظر تھے، لیکن ہمیشہ کی طرح جیت طاقت وروں اور ظالموں کی ہوئی تھی۔ منصور جاہ جیسے ایمان دار اور نیک آفیسر اپنی جان کی بازی ہار کر بھی خود پہ لگی تہمت کو مٹا نہ سکے تھے۔ عدالت کے اس فیصلے نے ان سب کی زندگیوں میں کہرام برپا کر دیا تھا۔ وہ دن نوفل جاہ کی زندگی کا کڑا ترین دن تھا۔ جس دن اس کے فرشتہ صفت باپ کا نام مجرموں اور چوروں کی فہرست میں لکھا گیا تھا۔ اس روز وہ ایک مقدمہ ہی نہیں بلکہ اپنے مرحوم باپ کی آن اور اپنے خاندان کی عزت بھی ہار گیا تھا۔

فیصلے کے مطابق غبن میں شامل تمام افسران کو دو سال قید کے ساتھ چوری ہونے والی رقم کا ایک مخصوص حصہ بھی ایک ماہ کے اندر اندر ڈپارٹمنٹ کو لوٹانا تھا۔ منصور جاہ چونکہ اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ اس لیے ان کے حصے میں مختص شدہ رقم کے علاوہ سزا نہ کاٹنے کا جرمانہ بھی آیا تھا جو کہ کل ملا کے اچھی خاصی بڑی رقم ہو گئی تھی۔ اتنی بڑی رقم کا انتظام ان سب کی نیندیں اڑا گیا تھا۔ اس پہ مستزاد لوگوں کی تمسخر اڑاتی نگاہیں اور طرح طرح کی باتیں۔ ان کے لیے اپنے ہی شہر میں سر اٹھا کے جینا مشکل ہو گیا تھا۔ اس غم نے صباحت بیگم کو دنوں میں بستر سے لگا دیا تھا۔ منحی اور محب کا اپنی جگہ برا حال تھا، لیکن سب سے کڑا امتحان نوفل جاہ کے حوصلوں کا تھا۔ اسے دنیا کے تلخ و ترش رویوں کو برداشت کرتے ہوئے اپنے گھرانے کی بقا کی جنگ لڑنی تھی۔ یہ گھڑیاں اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھیں۔ اس کا کل اثاثہ یہ گھر تھا اور اس بھنور سے نکلنے کے لیے اس کے پاس سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ جاہ پیلس کو فروخت کر دیتا۔

☆ ☆ ☆

"امی!" نوفل کی پکار میں صدیوں کی تھکن تھی۔ تکیوں کے سہارے نیم دراز صباحت نے اپنی آنکھیں کھولی تو نظروں کے سامنے نوفل کا پژمردہ چہرہ آگیا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی اور آنکھوں کے گرد گہرے حلقے تھے۔ ماں کو آنکھیں کھولتا دیکھ کے نوفل نے ان کا ہاتھ نرمی سے تھام لیا۔ ان کی طبیعت کے پیش نظر اس وقت وہاں ان تینوں بہن بھائیوں کے علاوہ طوبیٰ اور ارجمند بھی تھیں۔

"امی۔ میری بات حوصلے سے سنیے گا۔" نوفل نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے بات شروع کی تو سب کی نگاہیں اس پہ جم سی گئیں۔

"امی ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ یہ رقم اتنی بڑی ہے کہ میں اگر خود کو بیچ بھی دوں، تب بھی میرے لیے اس کی ادائیگی ممکن نہیں ہو پائے گی۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ ہم یہ....." اس نے خشک لبوں پہ زبان پھیری۔ "یہ گھر بیچ دیں۔"

"لیکن ہم جائیں گے کہاں؟" صباحت بیگم کی آواز کانپ گئی تھی۔

"کراچی۔" وہ دھیرے سے بولا تو سب ہی پریشان ہو کے نوفل کا چہرہ تکنے لگے۔ طوبیٰ کی متوحش نظریں بے یقینی کے عالم میں نوفل پہ یوں جمی تھیں گویا پتھر کی ہو گئی ہوں۔

"کراچی کیا لینے جانا ہے؟" ارجمند بیگم کا استفسار بے ساختہ تھا۔

"میرا ایک دوست ہے آنٹی۔ اس نے کچھ عرصہ پہلے مجھے اپنے بزنس میں پارٹنر شپ کی آفر دی تھی، لیکن تب میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا۔ اب اگر ہم یہ گھر فروخت کریں گے تو نا صرف یہ کہ بابا کے حصے کی رقم کی ادائیگی کر پائیں گے بلکہ کچھ پیسہ جو بچ جائے گا، اس میں انکل کی دی ہوئی رقم شامل کر کے میں اپنے دوست کے ساتھ کاروبار بھی شروع کر سکوں گا۔"

"یہ تو بہت اچھا آئیڈیا ہے بھائی!" محب کے بے جان چہرے پہ پہلی بار زندگی کی رمق آئی تھی۔ اس کی بات سن کے صباحت نے پریشانی سے ارجمند کی طرف دیکھا۔

"کیا کہتی ہو؟"

"میرے خیال میں نوفل صحیح سوچ رہا ہے بھابھی۔ یہ ایک بہت مناسب حل ہے۔" انہوں نے نوفل کی تائید کی تو طوبیٰ کو لگا جیسے کسی نے اس کی سانس روک دی ہو۔ "تو کیا نوفل بھائی ہمیشہ کے لیے چلے جائیں گے؟" اس کی آنکھیں بے اختیار جھلملا اٹھی تھیں۔ یہ کیا غضب ہونے جا رہا تھا؟

"لیکن نوفل بیٹا کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ بھابھی اور بچے یہیں رہ جائیں؟" ماں کی بات پہ طوبیٰ کی بھیگی آنکھوں میں بھی آس اتر آئی اگر وہ لوگ یہیں رہ جائیں گے تو کم از کم نوفل کا اس شہر میں آنا جانا تو رہے گا۔

"نہیں آنٹی۔ میرے لیے ان سب کے بغیر رہنا ممکن نہیں۔" وہ دھیرے سے بولا تو طوبیٰ کے دل پہ اک گھونسا سا پڑا۔

"اور میرے بغیر؟" اس کے دل نے تڑپ کر شکوہ کیا تھا۔ بے اختیاری کے عالم میں آنسو قطروں کی صورت اس کی آنکھوں سے گرنے لگے تھے۔ تب ہی نوفل کو ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھاتے ہوئے سیدھا طوبیٰ کی طرف دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ٹکرائی تھیں اور نوفل جاہ بری طرح چونک گیا تھا۔ آنسوؤں سے بھری ان آنکھوں میں کیا کچھ نہ تھا۔ گلہ، درد اور... اور شاید محبت! نوفل کے اعصاب کو شدید جھٹکا لگا تھا۔

ان شفاف آنکھوں کو پڑھنا بھلا اس کے لیے کب مشکل رہا تھا، لیکن شاید وہ ہی اپنے غموں میں اس طرح سے الجھا تھا کہ اپنے محبوب کی طرف سے غفلت برت گیا تھا۔ اس کے ان منہ بند جذبوں کی خوشبو کب اور کیسے طوبیٰ حسن تک پہنچی تھی نوفل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے خود کو تکتا پا کے طوبیٰ کے لیے اپنی سسکیوں پہ قابو پانا ممکن نہ رہا تھا۔ وہ پلٹی تھی اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی تھی۔

"لیجیے محترمہ کا احتجاج شروع ہو گیا۔" محب نے اداسی بھری مسکراہٹ لیے بھائی کی طرف دیکھا تو وہ اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبائے چہرہ جھکا گیا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا تھا ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ محبت کو کم از کم اس وقت اور ان حالات میں طوبیٰ حسن کے دل پہ دستک نہیں دینی چاہیے تھی۔ کرب سے سوچتے ہوئے نوفل کی نظریں اپنے ہاتھوں کی لکیروں سے الجھ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

آنے والے دنوں میں سب کچھ بہت تیزی سے ہوا تھا۔ قلیل عرصے میں جاہ پیلس کے لیے مناسب خریدار ڈھونڈنا بھی کنویں میں بانس ڈلوانے کے مترادف تھا اور جب یہ مشکل ترین مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ تب نوفل نے اپنے دوست عالی کو کراچی فون کر کے ہر چیز فائنل کر دی تھی۔ کراچی میں ان کی رہائش، عالی کے ایک فلیٹ میں ہونے والی تھی جو اس کے استعمال میں نہ تھا۔ زندگی اس نئے شہر میں آسان نہ سہی، لیکن آسانیوں کی جانب گامزن ضرور ہونے والی تھی اور اسی امید نے ان کے لیے اس تلخیوں بھرے وقت میں کچھ آسرا کر رکھا تھا۔ وگرنہ اپنے گھر، اپنے شہر اور اپنے پیاروں سے جدائی ان سب کے لیے کہاں آسان تھی۔ ضرورت کے سامان کے علاوہ باقی ہر چیز کو اونے پونے داموں میں فروخت کرنا پڑا تھا اور ایسا کرتے ہوئے صباحت بیگم کے دل پہ کیا گزری تھی یہ صرف وہی جانتی تھیں۔

اس کڑے وقت میں ارجمند بیگم نے ہر ہر لمحہ ان کا ساتھ دیا تھا۔ حسن مجتبیٰ نے تو بس ایک تکلف کی رسم نبھائی تھی، لیکن طوبیٰ کی کمسن محبت کے لیے لمحہ بہ لمحہ جدائی کی طرف بڑھنا ناگزیر تھا۔ اس نے رو رو کے اپنا برا حال کر لیا تھا اور چونکہ سب اس کی ضحیٰ اور نوفل سے دلی وابستگی کو جانتے تھے۔ اس لیے کسی کو بھی اس کی اس جذباتی کیفیت کی اصل وجہ معلوم نہ ہو سکی تھی اور جو انسان کچھ سمجھ سکتا تھا وہ گردش دوراں میں اتنی بری طرح پھنسا تھا کہ طوبیٰ سے اس کا سامنا ہی نہیں ہو پایا تھا۔ ذمہ داریوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو اس مختصر عرصے میں اسے نپٹانی تھیں۔ عالی کے کہنے پہ اس نے محب کے ساتھ صباحت بیگم اور ضحیٰ کو پہلے کراچی بھیج دیا تھا اور اب ڈیڑھ ہفتے کی اہم عدالتی کارروائیوں کو بھگتانے کے بعد وہ بھی کل صبح کی فلائٹ سے کراچی جا رہا تھا اور ادھر طوبیٰ اپنے کمرے میں جلے پیر کی بلی بنی چکرا رہی تھی۔

"تو کیا نوفل بھائی مجھ سے محبت نہیں کرتے؟" زار و قطار آنسو بہاتے اس کا مارے غم کے برا حال تھا۔

"لیکن میں تو ان کے بغیر مر جاؤں گی۔" اس کے لیے نوفل کی جدائی سوہان روح تھی۔ "مجھے انہیں بتانا ہو گا کہ میں ان سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ انہیں میری محبت کا پتا ہونا چاہیے۔ انہیں پتا ہونا چاہیے کہ انہیں یہاں لوٹنا ہو گا، میری خاطر، میرے لیے۔" لب کچلتے ہوئے اس نے آنسو صاف کیے تھے۔ خود کو مضبوط کرتی وہ دروازے کی جانب بڑھی تھی اور سب سے نظر بچا کر جاہ پیلس چلی آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

لاؤنج کا دروازہ ہمیشہ کی طرح کھلا ہونے کے بجائے بند تھا۔ طوبیٰ ایک لمحے کے لیے جھجکی تھی۔ لیکن پھر اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھائے دستک دی تھی، جو خالی گھر میں اندر تک سنائی دی تھی۔ اپنے کمرے میں پیکنگ میں مصروف نوفل نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ وہ ارجمند آنٹی کی آمد کا سوچ کے نیچے چلا آیا تھا لیکن جوں ہی اس نے دروازہ کھولا تھا وہ ایک پل کے لیے حیران رہ گیا تھا۔ سامنے کھڑی طوبیٰ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کا سامنا کسی طور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر اب جبکہ وہ دروازے پہ آ کھڑی ہوئی تھی تو اس کے پاس خود کو نارمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا۔

"طوبیٰ! تم اس وقت؟"

"کیوں میں اس وقت نہیں آ سکتی؟" وہ بوجھل سے لہجے میں بولی تو نوفل مسکرا دیا۔

"کیوں نہیں، آؤ۔" وہ راستے سے ہٹا۔ طوبیٰ اندر چلی آئی۔ سامان سے عاری لاؤنج بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ گہری سانس لیتی خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرنے لگی۔

"میں تو تمہیں بیٹھنے کا بھی نہیں کہہ سکتا۔" نوفل دروازہ بند کرتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا تو طوبیٰ جو اسے ہی دیکھ رہی تھی سنجیدگی سے بولی۔

"آپ اگر مجھے فرش پہ بھی بٹھائیں گے تو میں بیٹھ جاؤں گی نوفل بھائی۔" اس کی بات پہ نوفل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ قصداً کھل کر مسکرا دیا۔

"جانتا ہوں۔ مگر میں اپنی چھوٹی سی دوست کو کبھی بھی فرش پہ نہیں بٹھاؤں گا۔"

"میں آپ سے اتنی چھوٹی تو نہیں ہوں۔" وہ ہمت کر کے بولی تو نوفل کی نظریں اس پہ ٹھہر سی گئیں۔ اس کی آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ نوفل کے دل کو بے اختیار کچھ ہوا تھا۔ کتنی مشکلوں سے اس نے خود پہ ضبط کے پہرے بٹھائے تھے۔ کتنی مشکلوں سے اس نے خود کو اسے سوچنے سے روک رکھا تھا۔ اور وہ کتنے آرام سے اس کی اتنی کڑی کوششوں پہ پانی پھیرتی اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی تھی۔

"نوفل بھائی آپ۔ آپ واپس آئیں گے نا؟" وہ اسے دیکھتی امید سے بولی تو نوفل کو لگا جیسے امتحان کی گھڑی آ گئی ہو۔

"یا اللہ میری مدد فرما۔ مجھے اپنے فیصلے پہ ثابت قدم رکھنا۔ میرے مولا۔ تو جانتا ہے۔ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ مگر میں اس کی معصومیت کو اپنی آزمائشوں کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا۔ میں اس کی قسمت میں انتظار نہیں لکھنا چاہتا۔ مجھے معاف کر دینا طوبیٰ۔ مگر میں تمہیں اپنے ساتھ ان ان دیکھی راہوں کا مسافر نہیں بنا سکتا۔ میں اتنا خود غرض نہیں ہو سکتا!" کرب سے سوچتے ہوئے نوفل نے اپنی ہمت مجتمع کی۔

"نہیں۔ میں اس شہر میں دوبارہ کبھی واپس نہیں آنا چاہوں گا۔" اس کے چہرے پہ نگاہ جمائے وہ بے تاثر لہجے میں بولا تو طوبیٰ ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی۔

"میری خاطر بھی نہیں؟" اس کی آواز میں بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔ لہجہ جیسے اپنی سماعتوں پہ خود ہی یقین نہ آرہا ہو۔

"طوبیٰ! تم اس وقت یہ پوچھنے آئی ہو؟" نوفل نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ تو وہ جھنجلا سی گئی۔

"میرے سوال کا جواب دیں نوفل بھائی۔۔۔ کیا آپ میری خاطر بھی واپس نہیں آئیں گے؟"

"نہیں!" قطعیت سے بولتا وہ طوبیٰ کو گنگ کر گیا۔

"تو کیا آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے؟" اس کا پورا وجود آن کی آن میں آندھیوں کی زد میں آگیا تھا۔ "مجھ۔ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے؟"

"واٹ ربش۔۔۔! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" نوفل نے غصے سے اس کی طرف دیکھا تو طوبیٰ کو لگا جیسے اس کے سر پہ پوری چھت آپڑی ہو۔ یہ لہجہ تو اس کے نوفل بھائی کا نہیں تھا۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتی ٹرانس کی سی کیفیت میں آگے بڑھی۔

"آپ سچ میں مجھ سے محبت نہیں کرتے؟" بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے اس نے جوں ہی نوفل جاہ کے بازو کو چھونا چاہا اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑالیا۔ وہ حیران سی اسے دیکھنے لگی۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں۔ کچھ احساس بھی ہے کہ تم کس سے اور کیا بات کر رہی ہو؟"

"میں آپ سے۔ اپنی محبت سے بات کر رہی ہوں۔" وہ تڑپ کے بولی تو نوفل ایک لمحے کو تھم سا گیا۔ کمرے میں یک لخت خاموشی چھا گئی۔ طوبیٰ نے ہمت کر کے نوفل جاہ کی طرف دیکھا جو بنا پلکیں جھپکائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ طوبیٰ کو تھوڑا حوصلہ ہوا۔

"میں۔۔۔" اس نے اپنے خشک پڑتے لبوں پہ زبان پھیری۔ "میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔" دھیرے سے بولتی وہ نظریں جھکا گئی تھی۔ اور نوفل جاہ کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کے جلتے ہوئے وجود پہ ابر کرم کی پھوار برسا دی ہو۔ اس نے آنکھیں موندتے ہوئے اس پر کیف احساس کو اپنے اندر اترتے محسوس کیا تھا۔ اور پھر اپنے حوصلوں کو آخری حد تک آزماتے ہوئے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"جاؤ یہاں سے۔" شکستگی سے کہتا وہ پلٹ کر اندر کی جانب بڑھا تو طوبیٰ نے ایک جھٹکے سے سر اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"نوفل بھائی پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔" وہ بھاگ کر اس کی راہ میں آئی تو نوفل کا صبر جواب دے گیا۔ وہ غراتے ہوئے آگے بڑھا اور اسے دونوں بازوؤں سے جکڑ لیا۔ طوبیٰ بری طرح ڈر گئی۔

"کیا سمجھوں ہاں؟ کیا جانتی ہو تم محبت کے بارے میں؟" نوفل کی وحشت زدہ گرفت، طوبیٰ کی خوف زدہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔

"جسے تم محبت کہہ رہی ہو نا وہ صرف ایک وقتی کشش ہے۔ جو تمہاری عمر میں اکثر اپنے قریب موجود کسی شخص کے لیے محسوس ہونے لگتی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے درمیان محبت نامی کوئی جذبہ نہیں! تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ جس دن اپنے کالج اور ان دو گھروں کے باہر کی دنیا دیکھو گی نا اس دن بھول جاؤ گی کہ کبھی کوئی نوفل جاہ نامی شخص بھی تمہاری زندگی میں آیا تھا۔" اس کی بات پہ طوبیٰ کے دل پر ٹھیس سی لگی تھی۔

"یہ وقتی کشش نہیں ہے۔" اس نے تڑپ کر نوفل جاہ کی انگارہ بنی آنکھوں میں دیکھا۔ "میں سچ میں آپ سے۔۔۔"

"طوبیٰ!" غصے سے دھاڑتے ہوئے نوفل نے اس زور سے اسے پیچھے دھکیلا کہ وہ گرتے گرتے بچی۔

"آئی سیڈ گیٹ لاسٹ فرام ہیئر!" (میں نے کہا یہاں سے دفان ہو جاؤ) اس نے دروازے کی جانب اشارہ کیا تو طوبیٰ کو لگا جیسے نوفل جاہ نے اسے پیچھے نہیں بلکہ منہ کے بل آسمان سے زمین پہ دے مارا ہو۔

اس کی خودداری، اس کی نسوانیت اور اس کی انا کو

ایک ہی جھٹکے میں اس شخص نے ختم کر دیا تھا۔ وہ غرور جو اسے خود پہ تھا۔ وہ مان جو اسے نوفل جاہ پہ تھا، دونوں کو پاش پاش کر دیا تھا اس نے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹی تھی۔ اس کا چہرہ خطرناک حد تک سفید پڑ گیا۔ نوفل کو بے اختیار اپنی سفاکی کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا طوبیٰ پلٹی تھی اور بھاگتی ہوئی جاہ پیلس کی دہلیز پار کر گئی تھی۔ اور پیچھے کھڑا ہوا نوفل پورا سر دونوں ہاتھوں میں سر گرائے مارے بے بسی کے سسک اٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

سنو!
میں تمہیں چھوڑ آیا ہوں
سنو!
میں خود کو مار آیا ہوں

نوفل کی روانگی کے وقت نہ طوبیٰ باہر آئی تھی اور نہ اس نے کچھ پوچھا تھا۔ ایک گہری خاموشی تھی، جس پہ چلتا ہوا وہ اس شہر کی فضاؤں کو خیرباد کہہ گیا تھا۔

کراچی میں ایک نئی جدوجہد بھری زندگی نے اس کا استقبال کیا تھا۔ کام کی آڑ میں نوفل نے اپنے دل کا غم پس پشت ڈال کر خود کو بے حد مصروف کر لیا تھا۔ صباحت بیگم اور ضحیٰ کا لاہور والوں سے ٹیلی فون پر رابطہ تھا۔ ایسے میں اکثر ان کی کوئی نہ کوئی بات نوفل کے کانوں میں پڑتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ چاروں رات کے کھانے پہ بیٹھے ہوئے تھے جب صباحت بیگم نے ارجمند بیگم کی کال کا ذکر کرتے ہوئے نوفل کی طرف دیکھا تھا۔

"کتنی بری بات ہے نوفل۔ تمہیں یہاں آئے آج ڈیڑھ مہینہ ہونے کو ہے اور تم نے ایک بار بھی اپنی آنٹی سے حال احوال نہیں کہا۔ ارجمند نے اتنا گلہ کیا ہے بیٹا۔" ماں کی بات پہ محب نے بھی مسکراتے ہوئے بھائی کی طرف دیکھا تھا۔

"واقعی بھائی آپ نے تو کمال کر دیا ہے۔ اپنی لاڈلی سے بھی بات نہیں کی۔" طوبیٰ کے ذکر پر نوفل کے اندر اک ہوک سی اٹھی۔ پھیکی سی مسکراہٹ لیے اس نے پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

"اس بدتمیز کا تو نام نہ لیں۔ وہ تو مجھ سے بھی اب زیادہ بات نہیں کرتی۔" ضحیٰ نے سر جھٹکتے ہوئے نوالہ منہ میں رکھا تو نوفل نے بے اختیار بہن کی طرف دیکھا۔

"کیوں؟"

"ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی ہے۔ آنٹی بتا رہی تھیں۔ ہمارے جانے کے بعد اسے جیسے چپ سی لگ گئی ہے۔" ضحیٰ اسے دیکھتے ہوئے بولی تو نوفل کے دل پہ چوٹ سی لگی۔

"تم سب سے اٹیچ بھی تو بہت تھی۔" صباحت بیگم کی آواز میں افسردگی گھل گئی تھی۔ "نوفل اگر کھانا کھا لیا ہے تو فورا" اٹھ کر اسے کال کرو بیٹا۔"

"امی اس وقت؟" نوفل نے سٹپٹا کے ماں کو دیکھا۔ "کل کر لوں گا۔"

"امی ٹھیک کہہ رہی ہیں بھائی۔ کرلیں کال۔" ضحیٰ کی بات پہ نوفل کو ناچار اٹھنا پڑا تھا۔ لاؤنج میں آکر چند لمحوں کے تذبذب کے بعد اس نے حسن ولا کا نمبر ملایا تھا۔ اس کی دھڑکنوں میں ناچاہتے ہوئے بھی بے چینی اتر آئی تھی۔ مگر ارجمند بیگم کے فون اٹھانے پر اس کے دل پہ اوس سی گر گئی تھی۔ شکوے، شکایت اور پیار بھری ڈھیروں باتوں کے بعد انہوں نے طوبیٰ کو پکارا تو نوفل کا پورا جسم کان بن گیا۔

"اماں جان۔ آپی کہہ رہی ہیں کہ وہ پڑھ رہی ہیں۔ انہیں ڈسٹرب مت کریں۔" ماہ نور نے آکے من و عن بہن کا پیغام ماں کو دیا تو منتظر بیٹھے نوفل کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ جبکہ دوسری طرف ارجمند، ماہ نور کو ڈپٹتے ہوئے گویا ہوئی تھیں۔

"ارے اسے کہو نوفل بھائی کا فون ہے۔"

"میں نے کہا تھا۔ انہوں نے میرے منہ پہ دروازہ بند کر دیا۔" ماہ نور کی آواز نوفل جاہ کو لب بھینچنے پہ مجبور کر گئی۔

"رہنے دیں آنٹی۔ میں بعد میں کال کر لوں گا۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے بیٹا۔" ارحمند شرمندہ سی فقط یہی کہہ پائی تھیں۔ نوفل نے رابطہ منقطع کرتے ہوئے اپنا سر صوفے کی پشت پہ ڈال دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں درد نمی بن کے پھیل گیا تھا۔

"اب کے تجدید وفا کا نہیں امکاں جاناں۔" زیر لب گنگناتے ہوئے اس کے لبوں پہ بڑی زخم خوردہ مسکراہٹ آٹھہری تھی۔ یہ جدائی اس کی اپنی ہی تو رقم کردہ تھی۔ وہ کسی سے کہتا بھی تو کیا کہتا۔

☼ ☼ ☼

نوفل کا فون بند ہونے کے بعد ارحمند، طوبیٰ کے کمرے میں آئی تھیں اور اس کی اچھی خبر لے کے گئی تھیں۔ وہ بنا کچھ بولے ان کی ڈانٹ سنتی رہی تھی۔

ان کے جانے کے بعد وہ دھیرے دھیرے چلتی دریچے میں آکھڑی ہوئی تھی۔ باہر چٹکتی چاندنی میں اس کی خالی نگاہیں اندھیرے میں ڈوبی جاہ پیلس کی سفید عمارت پہ آٹھہری تھیں۔ اس کے اندر پھیلا سناٹا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔

"آپ بھول سکتے ہیں جو کچھ آپ نے کیا اور آپ نے کہا تھا۔ مگر میں آپ کے دیے گئے تحفوں کو نہیں بھول سکتی۔ آپ نے مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچائے ہیں نوفل صاحب..... آپ نے میری عزت نفس چور چور کردی۔ مجھ سے وہ شخص چھین لیا جو مجھے بہت پیارا تھا۔ آپ نے محبت پہ سے میرا ایمان اٹھا دیا ہے۔ مجھے دوبارہ کسی پہ اعتبار کے لائق نہیں چھوڑا۔ میں اپنے کس کس نقصان کو روؤں؟ مجھے آپ سے شدید نفرت ہے۔ شدید نفرت!" اس کی بے جان آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر اس کے چہرے پہ پھسلتے اندھیرے میں کہیں گم ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

نوفل اپنے آفس میں بیٹھا کام میں مصروف تھا۔ جب ملازم نے آکر لاہور سے کسی خالد قریشی کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ اسے خوش گوار حیرت نے آن گھیرا تھا۔ خالد انکل اس کے بابا اور حسن مجتبیٰ کی کمپنی کے منیجر تھے۔

ملازم کو انہیں اندر لانے کا کہہ کر اس نے سامنے کھلی فائل بند کردی تھی۔ تب ہی دروازہ کھول کر خالد صاحب اندر داخل ہوئے تھے۔ نوفل تپاک سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ حال احوال کے بعد وہ اس کے مقابل کرسی سنبھال کے بیٹھ گئے تھے۔

"دیکھ لو برخوردار۔ تم نے تو ہمیں نہیں بتایا لیکن ہم نے پھر بھی تمہیں ڈھونڈ نکالا۔" وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئے تو نوفل بے اختیار شرمندہ ہو گیا۔

"بس انکل سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ میں کسی کو انفارم ہی نہیں کرسکا۔"

"جانتا ہوں۔" ان کے تاثرات سنجیدہ ہو گئے۔ "تم نے جس ہمت سے حالات کا مقابلہ کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ڈھیروں کامیابیاں عطا کرے۔" ان کی دعا پہ نوفل کے لب مسکرا دیے۔

"بہت شکریہ۔ آپ سنائیں کراچی کیسے آنا ہوا؟"

"بس بیٹا ایک کمپنی میں تجربہ کار فرم منیجر کی ضرورت تھی۔ میں نے اپلائی کیا تو انہوں نے مجھے انٹرویو کے لیے کال کرلیا۔ اسی سلسلے میں آیا تھا۔"

"تو کیا آپ نے حسن انکل کی کمپنی چھوڑ دی ہے؟" نوفل نے چونکتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

"مدت ہوئی..... منصور صاحب کی وفات کے بعد ہی میں نے انہیں چھوڑ دیا تھا۔"

"لیکن کیوں؟ آپ تو وہاں شروع سے تھے انکل۔" نوفل کی آنکھوں میں حیرت پھیل گئی۔

"تمہارے بابا بھی تو وہاں شروع سے تھے بیٹا۔" وہ افسردگی سے مسکرائے تو نوفل جاہ کے لبوں پہ بھی پھیکی سی مسکراہٹ آٹھہری۔ "جو کچھ انہوں نے تمہارے بابا کے ساتھ کیا... اس کے بعد تو میرا دل ہی نہیں کرتا تھا کہ میں ان کی صورت بھی دیکھوں۔" اور نوفل جو بغور ان کی بات سن رہا تھا۔ بری طرح چونک گیا۔

"بابا کے ساتھ؟ کیا، کیا تھا انہوں نے بابا کے ساتھ؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟" خالد صاحب کے حیرت بھرے استفسار پہ نوفل کا سر نفی میں ہل گیا۔

"نہیں۔" اس کے جواب پہ ان کے لبوں سے ایک گہری سانس ٹوٹ کر فضا میں بکھر گئی۔

"تم نے تو مجھے حیران کردیا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ تمہارے بابا کو ہارٹ اٹیک کیوں ہوا تھا؟ وہ کون سی بات تھی جس کا بوجھ ان کے اعصاب سہار نہیں سکے تھے؟"

"میرا یقین کریں انکل۔" ہم میں سے کوئی کچھ نہیں جانتا۔ جس دن بابا کی ڈیتھ ہوئی تھی۔ اس دن وہ کہیں گئے تھے۔ کہاں گئے تھے؟ یہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن امی بتاتی ہیں کہ جب لوٹے تھے تو بہت پریشان، بہت ٹوٹے ہوئے تھے۔ امی کے اصرار پہ بھی انہوں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ جس کے بعد....." نوفل کی آواز بے اختیار کپکپا گئی تو وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے میں ایک پل کو بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔

"اس دن تمہارے بابا حسن مجتبیٰ کے بلانے پہ آفس گئے تھے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد خالد صاحب ملول سے بولے تو اس انکشاف پہ نوفل جاہ پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ "وہاں کمپنی کے دیگر اہم اراکین کے ساتھ میں بھی موجود تھا....." وہ دھیرے دھیرے پوری بات نوفل کو بتانے لگے تھے۔ جس کا رنگ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ متغیر ہوتا چلا گیا تھا۔ اگر حقیقت یہ تھی تو وہ کیا تھا جو کاغذات کے ایک پلندے کی صورت اس کے پاس فائل میں پڑا تھا؟

سنسناتے ہوئے دماغ کے ساتھ وہ حسن مجتبیٰ کی ذلالت اور اپنے باپ کی مظلومیت کی داستان سنتا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں موجود کئی اور الجھنیں بھی خالد صاحب کی بات کی روشنی میں واضح ہونے لگی تھیں۔ تو یہ وجہ تھی حسن مجتبیٰ کی ان کے تمام مسائل سے لاتعلقی اختیار کرنے کی۔ نوفل کو جھوٹے منہ بھی اپنی کمپنی میں جاب نہ آفر کرنے کی کیونکہ وہ چاہتے ہی نہیں تھے کہ منصور جاہ کی فیملی ان کی زندگی یا کاروبار میں دوبارہ مداخلت کرتی۔ وہ لوگ جیتے یا مرتے، ان کی عزت نیلام ہوتی یا بچ جاتی، حسن مجتبیٰ کو اتنی سی بھی پروا نہیں تھی۔ اس درجہ مکاری، اس درجہ منافقت نوفل کا خون کھولا گئی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ اور لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ تم لوگ اگر حقیقت سے واقف نہیں تھے تو حسن مجتبیٰ نے کیا کہہ کر تمہیں اپنے کاروبار سے الگ کیا؟" خالد صاحب نے نوفل کی طرف دیکھا۔ تو اس کے لب تلخی سے مسکرا دیے۔

"انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ بابا نے اپنی زندگی میں ہی اپنے حصے کا مطالبہ کردیا تھا۔ کیونکہ وہ دبئی میں کسی کے ساتھ کاروبار کرنا چاہتے تھے۔"

"کیا؟" اس کی بات خالد صاحب کو حیران کر گئی۔

"یہی نہیں۔ انہوں نے تو بطور ثبوت علیحدگی کے تمام کاغذات بمع بابا کے دستخط کے میرے سامنے رکھ دیے تھے جو بقول ان کے بابا نے اپنی زندگی میں ہی سائن کردیے تھے۔"

"یا اللہ!" خالد قریشی اپنی جگہ سے اچھل پڑے تھے۔ "اتنا بڑا جھوٹ! اتنا بڑا دھوکا!"

"ہونہہ..... اور میں سمجھتا رہا کہ وہ ہمارے خیر خواہ ہیں۔ ہمارے باپ کی طرح ہیں۔" اذیت سے کہتے ہوئے نوفل نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ خالد صاحب کی آنکھوں میں ملال بھر گیا۔ وہ اس کی تکلیف کی شدت کا اندازہ بخوبی کرسکتے تھے۔

"حوصلہ کرو بیٹا۔ خدا ہے نا۔ وہ ضرور اس ظلم کا بدلہ لے گا تم دیکھنا!"

"ہونہہ۔ کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔" دھچکا اتنا شدید تھا کہ نوفل کا نیکی بدی پہ سے ایمان ہی اٹھ گیا تھا۔

"ایسے نہیں کہتے بیٹا۔ اللہ کے ہاں دیر تو ہوسکتی ہے مگر اندھیر نہیں۔ تم دیکھنا اس شخص کا کیا انجام ہوگا۔"

"انجام تو اس کا بہت برا ہوگا۔ کیونکہ میں اسے

نہیں چھوڑنے والا!" دانت پیستا وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا تو خالد صاحب پریشان ہوگئے۔

"تم ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔" انہوں نے فہمائشی نظروں سے نوفل کی طرف دیکھا۔ "اب کہیں جاکے تو تمہاری پریشانیاں ختم ہوئی ہیں۔ تم کیا چاہتے ہو کہ تمہاری زندگی کے آنے والے قیمتی سال ایک بے معنی سی دشمنی کی نظر ہوجائیں؟"

"بے معنی؟ قاتل ہے وہ شخص میرے بابا کا' ہمارے اعتبار کا۔" نوفل غصے سے پاگل ہونے لگا تھا۔ "آپ کو شاید علم بھی نہیں ہے انکل کہ اس شخص کی اصلیت نے مجھے کتنا بڑا دھچکا پہنچایا ہے۔ یہ وہ انسان تھا جس پہ میں نے ساری زندگی آنکھیں بند کرکے بھروسا کیا۔ یوں جیسے کوئی اپنے ماں باپ پر کرتا ہے۔ اور اس نے بدلے میں ہماری ہی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا!" دکھ کی شدت نوفل کے روم روم سے چھلک رہی تھی۔ خالد صاحب نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں جانتا ہوں۔ بہت گہرا صدمہ ہے یہ تمہارے لیے۔ مگر اتنا نہیں کہ تم اپنی بیوہ ماں اور اپنے بہن بھائیوں کے مستقبل کو داؤ پر لگادو۔ میری ایک بات یاد رکھنا نوفل' حسن مجتبیٰ کو تمہاری دی ہوئی سزا اللہ کی نظر میں تمہارا اور اس کا حساب برابر کردے گی۔ جبکہ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے باپ کا پلڑا تاقیامت اس گرے ہوئے انسان کے مقابلے میں بھاری رہے۔ اور اس کے لیے تمہیں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرنا ہوگا۔ اپنے باپ کو سرخرو کرنے کے لیے تمہیں صبر سے کام لینا ہوگا بیٹا!" انہوں نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا تو نوفل اپنے لب سختی سے بھینچ گیا۔ خالد صاحب کا کہا ایک ایک لفظ اپنی جگہ بالکل صحیح تھا لیکن صبر اور حوصلے کی تلقین جتنی آسان تھی' اس پہ عمل اتنا ہی مشکل تھا۔

اس کا ذہن رات بھر کھولتا رہا تھا۔ وہ جب بھی حسن مجتبیٰ سے حساب برابر کرنے کا سوچتا۔ اس کی آنکھوں کے آگے ارجمند آنٹی' طوبیٰ اور ماہ نور کا چہرہ آٹھہرتا۔ حسن مجتبیٰ کے کردار کا یہ بھیانک روپ تو ان ماں بیٹیوں کی زندگی کو ہلا کر رکھ دیتا۔ طوبیٰ کے لیے اس کے پاپا کی ذات ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتی تھی' ایسے میں ان کی اصلیت اسے اندر تک توڑ کے رکھ دیتی۔ اور وہ اسے اپنی ذات سے ایک اور دھچکا نہیں پہنچا سکتا تھا۔ بلکہ وہ ان تینوں میں سے کسی کو بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا۔ وہ سب ہی اسے اپنوں کی طرح عزیز تھے۔ وہ حسن مجتبیٰ نہیں نوفل جاہ تھا۔ جس کی رگوں میں منصور جاہ جیسے نیک اور باظرف آدمی کا خون تھا۔ بدلے کی تپش میں انسانیت کے درجے سے گرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

بالآخر تھک کر وہ اس نتیجے پہ پہنچا تھا کہ اس کڑوی سچائی کو اپنی ذات تک محدود رکھنے میں ہی ان سب کی بھلائی تھی۔ اور نوفل جاہ نے یہی کیا تھا۔ اس تلخ حقیقت کا بوجھ تنہا ہی اپنے سینے پہ اٹھالیا تھا۔ اور اس بات کا ذکر صباحت بیگم سے بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے لیے حسن ولا کے مکینوں سے مزید رابطہ رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔ کیونکہ ان لوگوں سے رابطے کا مطلب تھا' حسن مجتبیٰ سے آمنا سامنا۔ اور وہ اس ذلیل شخص کی صورت اب ساری زندگی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے صباحت بیگم اور ضحیٰ کو لاہور والوں سے ہر طرح کا رابطہ ختم کردینے کے لیے کہا تھا۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے اور طوبیٰ حسن کے درمیان موجود آخری دروازے کو بھی ہمیشہ کے لیے بند کرنے والا تھا۔ مگر وہ اپنے باپ کے گناہ گار کو معاف نہیں کرسکتا تھا۔ سو اس نے زہر کا یہ پیالہ بھی خود ہی پی لیا لیکن طوبیٰ حسن کو کانوں کان اس کے باپ کی حقیقت کی خبر نہیں ہونے دی تھی۔

نوفل کے اس فیصلے نے سب ہی گھر والوں کو حیران پریشان کردیا تھا۔ صباحت بیگم نے کئی بار وجہ جاننے کی کوشش کی تھی۔ لیکن نوفل کی خاموشی نے انہیں بھی حالات سے سمجھوتا کرلینے پہ مجبور کردیا تھا۔ مگر انہیں اپنے بیٹے پہ پورا بھروسا تھا۔ وہ حسن ولا کے مکینوں سے اس کی انسیت سے بھی باخوبی واقف تھیں' لیکن اگر اس اپنائیت کے باوجود بھی وہ ان سے مزید رابطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا تو یقیناً کوئی وجہ تھی جو اسے اس فیصلے تک لے کر آئی تھی۔

نوفل نے گھر کے فون نمبر سے لے کر اپنے آفس کے نمبر تک بدلوادیے تھے۔ ان کی طرف سے اس اچانک خاموشی نے جہاں ارجمند بیگم کو پریشان کردیا تھا۔ وہیں طوبیٰ کے دل پہ نوفل جاہ کی طرف سے چھائی بدگمانی کو مزید گہرا کردیا تھا۔ وہ اسے کہہ کر گیا تھا کہ وہ اس شہر سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اور اس نے یہ کرکے دکھایا تھا۔

ارجمند بیگم نے کئی بار حسن صاحب سے کراچی جاتے ہوئے نوفل سے ملنے کے لیے کہا تھا۔ مگر ان کے لیے تو جاہ فیملی کی یہ خاموشی کسی نعمت سے کم نہ تھی۔ سو انہوں نے نا صرف خود ایسی ہر زحمت سے اجتناب کیا تھا بلکہ ارجمند بیگم کو بھی سختی سے منع کردیا تھا۔ ان کے نزدیک اگر وہ لوگ کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے تو ان میں سے بھی کسی کو ایسے بے مروت لوگوں کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجبوراً" ارجمند بیگم کو بھی خاموشی اختیار کرنی پڑی تھی۔ جس کے بعد دونوں گھرانوں کے درمیان ہر تعلق ختم ہوگیا تھا۔

وقت کی گردش ماہ و سال کو آگے لے آئی تھی۔ نوفل اور عالی کا ساتھ خوب نبھا تھا۔ دونوں کی مشترکہ محنت نے ان کے کاروبار کو چار چاند لگادیے تھے۔ نوفل چند ہی سالوں میں عالی کے فلیٹ سے اپنے ذاتی گھر میں شفٹ ہوگیا تھا۔ محب بھی اپنی پڑھائی ختم کرکے بھائی کے ساتھ بزنس میں شامل ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ نے نوفل کو مزید ترقی دی تھی۔ وہ باہر سے اسپتالوں کے لیے مشینری درآمد کرنے لگے تھے۔

اس دوران عالی کے چھوٹے بھائی سے ضحیٰ کی بات بھی طے ہوگئی تھی۔ دونوں چونکہ ہم عمر تھے' اس لیے شادی دونوں کی پڑھائی کے بعد سوچی گئی تھی۔ نوفل جاہ کو اللہ تعالیٰ نے اس کے ارادوں میں سرخرو کیا تھا۔ اس کی پہلی ترجیح اپنی ماں اور اپنے خون سے وفا بھی اور قدرت نے اسے ان کے درمیان اسی ملک میں ترقی اور کامیابی عطا کی تھی۔ جو احمر حسن جیسے خود غرض اور مادہ پرست لوگوں کے منہ پہ ایک طمانچہ تھی۔

سب ہی گھر والوں کی اولین خواہش تھی کہ اب نوفل اپنا گھر بسالے۔ مگر وہ ہر بار اس بات کو ٹال جاتا تھا۔ اس کا دل اس تمام عرصے میں بالکل خاموش ہوگیا تھا۔ ایک عجیب سا سناٹا تھا جو شادی کے نام پہ اس کے اندر پھیل جاتا تھا۔ حالانکہ نگین کی اس کے لیے دیوانگی نوفل کے تو کیا' سب ہی کے سامنے تھی۔ وہ اس کے پیچھے اپنا سب کچھ چھوڑ کے کراچی تک چلی آئی تھی۔ نگین کا یہ پاگل پن اور اس کی بے باکی گو کہ صباحت بیگم کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی مگر پھر بھی وہ نگین کو قبول کرنے کے لیے تیار تھیں اگر جو نوفل اسے اپنی شریک سفر کے طور پہ پسند کرلیتا۔ لیکن وہاں تو شادی کے معاملے کو لے کر سوائے ٹال مٹول کے اور کچھ نہ تھا۔ جس پہ صباحت کو بیٹے سے بے حد گلہ تھا۔

مگر اپنے دوست عالی کے استفسار پہ نوفل اپنا حال دل بیان کرنے سے خود کو روک نہ سکا تھا۔ وہ طوبیٰ سے اپنی محبت سے لے کر اس وقت کے اپنے حالات اور بعد ازاں حسن مجتبیٰ کی منکشف ہونے والی خود غرضی اور دھوکے بازی تک' ہر بات اسے بتاتا چلا گیا تھا۔ ساری حقیقت سن کے عالی خاموش ہوگیا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ نوفل جاہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔

عالی نے دبے لفظوں میں صباحت بیگم سے نوفل کو اس کے حال پہ چھوڑ دینے کی درخواست بھی کی تھی۔ لیکن ایک ماں ہونے کے ناطے نوفل کی اپنی ذات سے اس معاملے میں بے نیازی انہیں پریشان کرنے لگی تھی۔ انہیں لاہور سے آئے دس سال ہونے کو تھے۔ ایسے میں کتنی ہی بار صباحت کا دھیان ارجمند اور حسن مجتبیٰ کی طرف گیا تھا۔ لیکن نوفل کی بات ہر بار ان کے آڑے آجاتی تھی۔ مگر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ نوفل اپنے کام کے سلسلے میں لاہور گیا تھا۔ اور وہاں اس کا سامنا ایک ایسی صورت حال میں حسن مجتبیٰ سے ہوا تھا کہ وہ چاہ کر بھی ان کی حالت سے منہ نہ موڑ پایا تھا۔

خون میں لت پت وہ زندگی اور موت کی کشمش میں ڈولتے اپنے وقت کے اس فرعون کو ایک بے بس انسان کے روپ میں دیکھ کے لرز اٹھا تھا۔ ان کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی اور وجود زخموں سے چور تھا۔ نوفل اگر چاہتا تو انہیں اس حال میں چھوڑ کے وہاں سے جا بھی سکتا تھا۔ مگر شاید یہی وہ امتحان کی گھڑی تھی جب اسے اپنی عداوت بھلا کے یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ اپنا معاملہ اور اپنا بدلہ اللہ کے سپرد کرچکا ہے۔ اور نوفل جاہ نے وہاں رک کے یہی ثابت کیا تھا۔ اس نے اپنی انسانیت کا ثبوت دیا تھا۔

اس کے کہنے پہ ہی اسپتال کے بہترین ڈاکٹر نے خود حسن مجتبیٰ کو فوری ٹریٹمنٹ دیا تھا۔ وہ اور بات تھی کہ ان کا وقت آگیا تھا اور وہ اس دولت اور نام و مقام کو چھوڑ کے بالکل خالی ہاتھ اس دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ اس موقعے پر نوفل کا دل اس کے مقابل ڈٹ گیا تھا۔ اور وہ اپنی محبت نبھانے کو حسن ولا کھنچا چلا آیا تھا۔ اس کی ایک کال پہ اس کی ماں اور بہن بھی دوڑی چلی آئی تھیں۔ انہوں نے ایک بار بھی نوفل سے اس کے اس بدلے ہوئے رویے کی وجہ نہیں پوچھی تھی۔ لیکن تقدیر کی جھولی میں اسے حیران کرنے کو ابھی بہت کچھ باقی تھا۔

نوفل کے دیکھتے ہی دیکھتے حالات نے ایک عجیب سا رخ لیا تھا۔ اور اس کی کسی شعوری کوشش کے بغیر طوبیٰ حسن کو اس کی زندگی میں شامل کردینے کا فیصلہ ہوگیا تھا۔ اس انہونی پہ نوفل جاہ حیران رہ گیا تھا۔ وہ اپنے رب کی اس مہربانی پہ اس کا جتنا بھی شکر ادا کرتا کم تھا۔

وہ جانتا تھا کہ طوبیٰ اس سے ناراض ہے۔ اور وہ اسے منانے کی ہی غرض سے اس کے پاس گیا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ماضی میں کہے گئے اس کے اپنے الفاظ ہی اس کے لیے عذاب بن جائیں گے۔ وہ اس کی صورت دیکھنے کی روادار نہیں رہی تھی اور اس ضد میں اپنا ہی نقصان کرنے پہ تل گئی تھی۔ وہ اپنے اور اس کے درمیان ضیا کو لارہی تھی۔ جبکہ اگر وہ ضیا کو پسند بھی کرتی تو بھی نوفل جاہ اسے دوبارہ کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ ان دس سالوں میں جو اس کے دل پہ گزری تھی وہ وہی جانتا تھا.... طوبیٰ حسن اس کی زندگی کی واحد تمنا تھی' پھر چاہے وہ اب کی بار اس کا ساتھ باخوشی قبول کرتی یا نہیں' وہ اس سے کسی قیمت پہ دستبردار نہیں ہوسکتا تھا۔

"یا اللہ تو طوبیٰ کو میری زندگی میں شامل کردے۔ میں نے جو اس کا دل توڑنے کی غلطی کی ہے تو مجھے اس کے ازالے کا ایک موقع دے دے۔ میں اسے اپنی بھرپور محبت کا یقین دلانا چاہتا ہوں۔" یادوں کے دریچے بند ہوئے تو نوفل کے دل سے بے اختیار اک ہوک نکلی تھی' جو دعا بن کے اس کے لبوں پہ آٹھہری تھی۔

گہری ہوتی رات نے اسے اٹھنے پہ مجبور کردیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا واپسی کے لیے چل پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

نوفل جس وقت حسن ولا میں داخل ہوا۔ رات کے ایک بج رہے تھے۔ اور سوائے طوبیٰ کے سب ہی گھر والے شدید پریشانی کے عالم میں اس کے منتظر تھے۔ کیونکہ وہ اپنا موبائل لیے بنا گھر سے نکل گیا تھا۔ اس کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی جہاں سب نے سکھ کا سانس لیا تھا' وہیں احمر بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے تم؟" اسے دیکھتے ہی صباحت بیگم کی پریشانی غصے میں ڈھل گئی تھی۔ "کچھ پتا بھی ہے یہاں ہم سب کتنے پریشان ہورہے تھے؟"

"آئی ایم سوری۔ مجھے وقت کا احساس نہیں رہا۔" بوجھل لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ صباحت بے اختیار چونک گئیں۔ اس کی آنکھوں میں بہت گہری اداسی تھی۔ ان کا دل یک لخت فکر مند ہوگیا۔

"میں بہت تھکا ہوا ہوں امی۔ صبح بات کرتے ہیں۔" دھیرے سے کہتا وہ آگے بڑھ گیا تھا تو صباحت کے ساتھ ساتھ ارجمند بھی پریشان ہوگئیں۔ ان کا دل تو پچھلے کئی گھنٹوں سے ہول رہا تھا۔ طوبیٰ اور نوفل کی کیا بات ہوئی تھی وہ نہیں جانتی تھیں۔ لیکن نوفل کے ردعمل نے انہیں متشوش کردیا تھا۔ وہ پریشان سی وہیں صوفے پہ ٹک گئی تھیں۔

اپنے کمرے میں آکے نوفل بیڈ پہ بکھر سا گیا تھا۔ اس کے رُوم رُوم میں شدید تھکن سمائی تھی۔ وہ آنکھوں پہ بازو رکھ کے جوتوں سمیت نیم دراز ہوگیا تھا۔ تب ہی دروازے پر دستک دے کر صباحت اندر چلی آئی تھیں۔ نوفل نے بازو ہٹاتے ہوئے دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ اور انہیں وہاں دیکھ کر نوفل سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"سچ سچ بتاؤ نوفل' کیا ہوا ہے؟" تیز قدموں سے اس کی طرف آتے ہوئے انہوں نے پریشانی سے سوال کیا تو نوفل نے اک گہری سانس لیتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔ جو اس کے پاس آبیٹھی تھیں۔

"امی وہ نہیں مان رہی۔ اس نے اس شادی سے انکار کردیا ہے۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتا وہ شکستگی سے بولا تو صباحت کا دل دھک سے رہ گیا۔

"امی' میں اسے دوبارہ کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ میں اس کے بغیر اب جی نہیں پاؤں گا۔" اپنی بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ وہ ضبط کی کس انتہا پر تھا' صباحت بخوبی اندازہ کرسکتی تھیں۔

"تم فکر نہیں کرو۔ میں خود طوبیٰ سے بات کروں گی۔ میں اپنی بیٹی کو خود مناؤں گی۔" دھیرے سے کہتے ہوئے انہوں نے اس کا ہاتھ تھاما تو نوفل اپنی آنکھوں میں پھیلتی نمی چھپانے کو نظریں جھکا گیا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح صباحت ناشتا بنواتی ضحیٰ اور ماہ نور کے پاس چلی آئی تھیں۔

"مجھے طوبیٰ کا ناشتا پکڑاؤ بچیوں' آج میں اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے ناشتا کرواؤں گی۔" ان کی بات پہ دونوں لڑکیاں مسکرانے لگی تھیں ان کے علم میں کل کی کوئی بات نہ تھی۔

"خیر تو ہے امی' ابھی سے ہونے والی بہو کی خدمتوں کا ارادہ ہے کیا؟" ضحیٰ نے شرارت سے کہتے ہوئے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ تو صباحت ہنس پڑیں۔

"ارے آج کرلوں گی تو کل کرواؤں گی نا۔" ان کی بات پہ وہ دونوں بھی ہنس پڑی تھیں۔ اس گھر کے درودیوار نے آج کتنے ہی دنوں بعد کسی کی ہنسی کی آواز سنی تھی۔

طوبیٰ کے لیے ناشتا ٹرے میں سجائے صباحت دستک دے کر جوں ہی اندر داخل ہوئیں' غصے میں بولتی ارجمند بے اختیار چپ ہوگئیں۔ ان کے تاثرات صباحت کو بتانے کے لیے کافی تھے کہ وہ طوبیٰ کی کلاس لینے میں مصروف تھیں۔ جو نڈھال سی بیڈ پہ نیم دراز تھی۔

"ارے بھابھی' آپ نے کیوں زحمت کی۔ ماہ نور کہاں ہے؟" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولیں۔ تو صباحت نے آگے بڑھ کر ٹرے سائڈ ٹیبل پہ رکھ دی۔

"میں نے خود اسے منع کیا تھا.... میں نے سوچا آج اپنی بیٹی کو خود ناشتا کراؤں گی۔" ان کے شفیق لہجے پہ ارجمند کی جتاتی ہوئی نظریں طوبیٰ کی طرف اٹھ گئیں۔ جنہیں محسوس کرتے ہوئے وہ نچلا لب دانتوں تلے دبائے نگاہیں چرا گئی۔

"اب کیسی طبیعت ہے بیٹا؟" صباحت نے بیٹھتے ہوئے پیار سے اس کے بال سنوارے تو طوبیٰ کے حلق میں آنسوؤں کا گولا پھنس گیا۔ وہ بے حد ندامت محسوس کررہی تھی۔ اس ایک شخص کے پیچھے اس نے اپنے پیاروں کو ناراض کردیا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ بامشکل تمام بولی کوشش کے باوجود اس کی آواز لرز گئی تھی۔ صباحت نے چونک کر پہلے اسے اور پھر ارجمند بیگم کو دیکھا تو ارجمند کی آنکھیں بھر آئیں۔

"طوبیٰ میری طرف دیکھو بیٹا۔" انہوں نے نرمی سے اس کی ٹھوڑی چھوئی تو وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے سسک اٹھی۔

ماہنامہ کرن 155 اگست 2016

"ارے!" صباحت نے بے اختیار اسے خود سے لگالیا۔ ان کے سینے سے لگتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ انہوں نے اسے کھل کر رونے دیا تھا۔ کتنی ہی دیر آنسو بہانے کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ خود کو سنبھالتی سیدھی ہو بیٹھی۔ صباحت بیگم کی نظریں اس کے زردیاں چھلکاتے چہرے پہ آٹھہریں۔

"میں تو سمجھی تھی کہ تم ہم سب سے بہت پیار کرتی ہو طوبیٰ۔" اسے دیکھتی وہ دلگرفتی سے بولیں تو طوبیٰ کی بھیگی آنکھیں بے چینی سے ان کی طرف اٹھ گئیں۔

"میں سچ میں آپ لوگوں سے پیار کرتی ہوں آنٹی۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر اس رشتے سے کیوں انکار کررہی ہو بیٹا؟" ان کی سوالیہ نگاہیں خود پہ جمی پاکر جہاں طوبیٰ کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہیں ارجمند بیگم بھی ایک لمحے کو ساکت رہ گئیں۔ تو بات ان تک پہنچ ہی گئی تھی۔

"دیکھو بیٹا اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ نوفل نے محض ہمدردی میں آکر تمہارا نام لیا ہے تو بے فکر رہو' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی انسان کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو وہ کبھی بھی محض کسی کی ہمدردی میں آکر اپنی ذات کے ساتھ زیادتی نہیں کرے گا۔ تم میں نوفل نے یقیناً اپنی شریک سفر کی خوبیاں دیکھی ہوں گی۔ تب ہی تو اس نے اتنا بڑا فیصلہ لیا ہے۔" رسان سے کہتے ہوئے انہوں نے اس کا ہاتھ تھاما تو طوبیٰ کے لبوں پہ اک پھیکی سی مسکراہٹ آکے غائب ہوگئی۔

"میں آپ کو کیسے بتاؤں آنٹی کہ مجھ میں اگر اتنی خوبیاں ہوتیں تو آپ کے بیٹے نے مجھے اور میری محبت کو آج سے دس سال پہلے اتنی بری طرح رد نہ کردیا ہوتا میں تو ان کے اس فیصلے سے خود الجھ گئی ہوں..... یہ ترس کی ماری ہوئی ان کی بھیک ہے' لالچ ہے یا ہمیشہ کی طرح سب کی نظروں میں اچھا بننے کا ڈھونگ..... میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔" چہرہ جھکائے وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ صباحت بیگم نے ایک نظر اس کی خاموشی پہ ڈالتے ہوئے گہری سانس لی۔

"لیکن پھر بھی اگر تم سمجھتی ہو کہ تم ضیا کے ساتھ زیادہ خوش رہ سکتی ہو تو یقین مانو میں خود احمر کے ساتھ جاکے تمہارے تایا اور تائی جان کو منا کے لاؤں گی۔" ان کی بات پہ طوبیٰ نے گھبرا کے سر اٹھاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ صباحت ملول سی مسکرادیں۔

"میں صحیح کہہ رہی ہوں بیٹا..... کیونکہ شادی دلوں کے سودے کا نام ہے' زور زبردستی کا نہیں اور تم تو میری اپنی بیٹی ہو۔ میں نے تم میں اور ضحیٰ میں کبھی کوئی فرق نہیں سمجھا۔ میرے لیے تمہاری خوشی' تمہارے اطمینان سے بڑھ کر اور کچھ نہیں۔ اس لیے اگر تم چاہتی ہو کہ ارجمند ضیا کو تمہارے لیے قبول کرلے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں بیٹا۔" انہوں نے محبت سے اس کا گال سہلایا تو دم سادھے ان کی بات سنتی طوبیٰ کا سر بے اختیار نفی میں ہل گیا۔ صباحت بیگم نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"تو کیا تمہیں میرے نوفل کا رشتہ منظور ہے؟" ان کا ہاتھ اس کی ٹھوڑی پہ آٹھہرا تھا۔ طوبیٰ لب کچلتی نظریں جھکا گئی۔ اس دوران ارجمند کا رواں رواں اس کی "ہاں" کا منتظر تھا۔

"بولو بیٹا۔" صباحت کے اصرار پہ اس نے اک گہری سانس لیتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔

"جی!"

"جیتی رہو۔ خوش رہو۔ اللہ میرے بچوں کو سدا شاد و آباد رکھے!" صباحت بیگم کا چہرہ یک لخت کھل اٹھا تھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے خود سے لگالیا تھا۔ ارجمند بیگم کی اٹکی ہوئی سانس بھی بحال ہوئی تھی۔ طوبیٰ نے بے اختیار اپنی جلتی ہوئی آنکھیں سختی سے میچ لی تھیں۔

"جب پیچھے کنواں اور آگے کھائی ہو تو کیوں نہ وہاں گرا جائے جہاں مرتے ہوئے آپ کو کم از کم آپ کے اپنوں کا ساتھ تو نصیب ہو۔" صباحت کے سینے سے لگے اس کے دل نے جیسے سسکی لی تھی۔ آنسو ٹوٹ کر خاموشی سے اس کے چہرے پہ بہہ نکلے تھے۔

طوبیٰ کی رضامندی کی خبر صباحت بیگم نے سب سے پہلے نوفل کو جاکے دی تھی جو کتنے ہی پل بے یقینی کے عالم میں بت بنا انہیں تکتا رہ گیا تھا اور جب اسے اپنی خوش بختی کا یقین ہوا تھا تو مارے خوشی کے اس نے ماں کو اٹھا کے گھما ڈالا تھا۔ صباحت بیگم نے' ارجمند سے پوچھ کر اسی وقت بازار سے مٹھائی منگوائی تھی۔ وہ ان خوشی کے لمحوں کو یادگار بنادینا چاہتی تھیں' مگر حسن مجتبیٰ کی فوتگی کے پیش نظر انہیں ہر حال میں سادگی کو ملحوظ خاطر رکھنا تھا۔

"تم عالی کو تو فون کرو نا۔ اسے کہو کہ وہ اور فہد ہر بصورت جمعے سے پہلے یہاں پہنچیں۔ باقی زہرہ بہن سے میں خود بات کرلوں گی۔" انہوں نے سمدھن کا حوالہ دیتے ہوئے نوفل سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ سب' سوائے طوبیٰ اور احمر کے اس وقت لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ایک خوش گوار سی ہلچل تھی جس نے سب ہی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

"امی' محب بھائی نے تو کہہ دیا ہے کہ وہ کل ہی آرہے ہیں۔ پھر چاہے انہیں جہاز کی دم پہ ہی کیوں نہ بیٹھ کے آنا پڑے۔" ضحیٰ نے محب کی بات دہرائی تو سب ہی ہنس پڑے۔

"میں عالی کو فون کرکے آتا ہوں۔" نوفل مسکراتا ہوا اپنا موبائل اٹھائے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا' لیکن دروازے میں احمر کو کھڑا دیکھ کے وہ اپنی جگہ پر رک گیا۔ احمر اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے اندر چلا آیا۔ لاؤنج میں موجود چاروں خواتین خاموش ہوگئی تھیں وہ چلتا ہوا نوفل کے مقابل آکھڑا ہوا تھا۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے..... پہلے کچھ معاملات تو طے کرلیں۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا تو نوفل کے چہرے پہ سنجیدگی چھاگئی تھی۔ ارجمند بیگم کے کمرے میں موجود تینوں افراد سناٹے کی کیفیت میں احمر حسن کا منہ دیکھ رہے تھے۔

"میں نے کوئی اتنی عجیب بات تو نہیں کی۔" احمر نے استہزائیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"عجیب نہ سہی' لیکن گری ہوئی بات ضرور کی ہے۔" نوفل کے سپاٹ لہجے پہ احمر کی بھنویں تن گئیں۔

"کیوں اپنا حصہ مانگنا گری ہوئی بات ہے کیا؟"

"نہیں..... لیکن ہر آن صرف اپنے بارے میں سوچنا گری ہوئی بات ضرور ہے۔" نوفل نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کم ظرف انسان کو دیکھا۔

"تمہیں اتنا احساس بھی ہے کہ تمہاری ماں بہنیں کھائیں گی کہاں سے؟"

"میں نے تو بھئی ہر لحاظ سے ان سب کے لیے بہترین فیصلہ کرنا چاہا تھا' لیکن جب انہیں وہ منظور نہیں تو پھر یہ جانیں اور ان کے کام۔ رہا کھانے پینے کا سوال تو اس کی تم فکر مت کرو۔ بہت کچھ چھوڑا ہے میرے پاپا نے۔ ان فیکٹ تم بھی جب چاہو اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو سکتے ہو۔" اس کی چوٹ نوفل جاہ کا چہرہ سرخ کرگئی۔

"یہ گھٹیا مشورہ تم جیسا شخص ہی دے سکتا ہے۔" اس کا تلملایا ہوا انداز احمر کو مزا دے گیا۔

"ہاں تو اماں جان!" وہ ارجمند حسن کی طرف پلٹا۔ "اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کی بیٹی کی شادی نوفل سے ہو تو آپ کو یہ کمپنی میرے نام کرنی ہوگی۔"

"اور اگر میں چاہوں کہ یہ کمپنی نوفل چلائے تو؟" انہوں نے تیز نظروں سے اسے دیکھا تو جہاں نوفل چونک کر انہیں تکنے لگا وہیں احمر کے چہرے پہ سرد مہری چھاگئی۔

"تو میں آپ کو اس بات کی اجازت کبھی نہیں دوں گا۔"

"کیوں ضیا اور دانش میں سرخاب کے پر لگے تھے کیا؟" ارجمند بیگم کا غصہ دو چند ہوگیا۔

"سرخاب کے پروں کا تو نہیں پتا' لیکن کسی بے ایمان باپ کی اولاد نہیں تھے وہ۔"

"احمر!" نوفل جاہ کی دھاڑ پہ پورا کمرہ لرز اٹھا تھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا تھا اور احمر حسن کو اس کے کالر

سے جکڑ لیا تھا۔ ارجمند اور صباحت کی چیخیں بے اختیار تھیں۔ شور کی آواز پہ تینوں لڑکیاں بھاگی چلی آئی تھیں، لیکن اندر کے منظر نے ان کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے کردی تھی۔

"اگر تم نے میرے بابا کے بارے میں ایک لفظ بھی اور کہا تو خدا کی قسم میں تمہیں اسی زمین میں گاڑ دوں گا!" نوفل نے اپنی لہورنگ آنکھیں احمر کی آنکھوں میں ڈال دی تھیں۔ اس کی مضبوط گرفت احمر کی ہوائیاں اڑا گئی تھی۔

"آئی۔ آئی ایم سوری۔" پھنسی ہوئی آواز میں وہ فقط اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ صباحت اور ارجمند اٹھ کر ان دونوں کی طرف لپکی تھیں۔

"تمہیں میری قسم نوفل گریبان چھوڑ دو۔" صباحت نے بیٹے کو کھینچتے ہوئے دہائی دی تو نوفل جاہ کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہوگئے۔

"میں اگر تم جیسا پنچ اور کمینہ انسان ہوتا تو آج بہت سی حقیقتیں تمہارے بھی منہ دے مارتا، مگر میں نے اپنی ماں کے صدقے میں تمہیں معاف کیا۔" زوردار جھٹکا دیتے ہوئے نوفل نے اسے پرے دھکیلا تو احمر پیچھے گرتے گرتے بچا۔ نوفل کے پیچھے ہٹتے ہی آگ بگولا ہوئی ارجمند آگے بڑھی تھیں اور ایک زناٹے دار تھپڑ احمر کے منہ پہ دے مارا تھا۔ یک لخت ماحول پہ خاموشی چھاگئی تھی۔

"تمہارا دین ایمان یہ مال و دولت ہے نا... تو لے لو۔ لے لو یہ کمپنی اور نکل جاؤ ہماری زندگی سے... چاہے اسے بیچو یا آگ لگاؤ، مگر مجھے پلٹ کے اپنی شکل مت دکھانا... نہ ہی میرے جنازے میں شامل ہونے کی کوشش کرنا کیونکہ میں تم سے ناخلف سے ہر رشتہ توڑتی ہوں۔ سنا تم نے ہر رشتہ توڑتی ہوں!" شدت جذبات سے ارجمند بیگم کی آواز پھٹ گئی تھی۔

"اور میں بھی لعنت بھیجتا ہوں آپ سب پہ... ابھی کے ابھی بابا کے وکیل کو بلائیں اور میری چیز میرے حوالے کریں۔ رہا یہ گھر تو اسے بیچیں یا آگ لگائیں میری بلا سے!" غصے سے چلاتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔ اس کی ذلالت ارجمند بیگم کو سرے سے توڑ کے رکھ گئی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے روتی وہیں کارپٹ پہ گر گئی تھیں۔ طوبیٰ اور ماہ نور بھاگ کے تڑپتی ہوئی ماں سے آلپٹی تھیں۔ نوفل کے لیے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ وہ پلٹا تھا اور کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

حسن مجتبیٰ کی تیرہویں کے بعد صباحت نے سیدھے نکاح کا فیصلہ کرلیا تھا۔ رخصتی دو ماہ بعد کی رکھی گئی تھی۔ نکاح کی اس اچانک خبر نے طوبیٰ کو بری طرح پریشان کردیا تھا۔ اس روز وہ ایک لمحے کے زیر اثر ہاں تو کر بیٹھی تھی، لیکن اس دن سے ایک عجیب سی کشمکش تھی جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تھک کر اس نے خود کو یہی تسلی دی تھی کہ فی الحال اگر کچھ ہوگا بھی تو زیادہ سے زیادہ بات ہی طے ہوگی۔ اس دوران وہ نوفل جاہ سے جان چھڑانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ ہی لے گی، لیکن نکاح کا سن کے تو اسے اپنے فرار کی ہر راہ مسدود ہوتی نظر آئی تھی۔ وہ بہت سٹپٹائی تھی، مگر کوئی حل سوجھ کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ اتنے میں گھر میں قریبی ملنے والوں کی آمد ایک بار پھر شروع ہوگئی تھی، مگر اب کی بار نوعیت کچھ اور تھی۔ سب ہی نے ارجمند بیگم کے اس فیصلے کو بے حد سراہا تھا۔ بچی کے فرض سے سبکدوش ہونے سے بڑھ کر بھلا اور کیا اچھی بات ہوسکتی تھی۔ احمر اس دوران ہوٹل شفٹ ہوچکا تھا۔

اس نے اسی روز وکیل کو بلوا کر سارا معاملہ طے کروایا تھا اور اگلے دن حسن ولا چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ جانے سے پہلے وہ نہ ماں سے ملا تھا اور نہ بہنوں سے۔ اس کی یہ حرکت سب ہی کو مزید دلگرفتہ کرگئی تھی۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے تھا جو راہ ہدایت سے مکمل طور پہ بھٹک چکے ہوتے ہیں۔ ورنہ اپنی ماں اور بہنوں کو دنیا کے تھپیڑے کھانے کو بھلا کون غیرت مند بیٹا تنہا چھوڑتا ہے۔ احمر حسن کا جانا ارجمند اور ان کی بیٹیوں کی زندگی میں اذیت کا ایک نیا باب رقم کر گیا تھا، لیکن یہ بھی اوپر والے کا شاید کرم ہی تھا کہ وہ اس کے بغیر بہت پہلے جینا سیکھ چکی تھیں، مگر اب کی بار وہ جاتے ہوئے حسن مجتبیٰ کی برسوں کی محنت بھی اپنے ساتھ سمیٹ لے گیا تھا، جس کا قلق ان تینوں کو ہمیشہ رہنے والا تھا۔

محب کے ساتھ تمہی کی ہونے والی سسرال یعنی فہد اور عالی کی فیملی کی آمد نے ناچاہتے ہوئے بھی ماحول میں خوش گوار سی ہلچل مچادی تھی۔ عالی خاص طور پہ طوبیٰ سے ملا تھا۔ اسے اپنے دوست کی پسند سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ عالی سے ملاقات بھی طوبیٰ کے لیے ایک عجیب مرحلہ رہی تھی۔ اس کا مشتاق انداز اور آنکھوں سے چھلکتی شوخی طوبیٰ کو الجھن بھری حیرت میں مبتلا کرگئی تھی۔ وہ اس سے پہلی بار ملی تھی، لیکن عالی کا انداز برسوں کی شناسائی لیے ہوئے تھا۔ اس پہ مستزاد اس کی نوفل سے آنکھوں آنکھوں میں کی جانے والی شرارت بھری گفتگو نے طوبیٰ کو اس کی موجودگی میں اچھا خاصا نروس کردیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی عالی کی اس بے تکلفی کی وجہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ نکاح کی تقریب گوکہ سادگی سے ہونی تھی، لیکن صباحت بیگم نے طوبیٰ کے لیے نئے جوڑے اور زیور کا اہتمام ضروری سمجھا تھا۔ اس کی ایک ایک چیز نوفل نے اپنی پسند سے لی تھی جس پہ سب ہی نے اس کا خوب ریکارڈ لگایا تھا اور نوفل ان کے درمیان بیٹھا مزے سے مسکراتا رہا تھا۔

اس کی یہ من مانی طوبیٰ کو رہ رہ کے اپنی ہار کا احساس اور بھی شدت سے دلا رہی تھی۔ ابھی بھی وہ اندر بکھری شوخیوں سے بے زار آکر باہر برآمدے کی سیڑھیوں پہ آبیٹھی تھی۔ نوفل جاہ کا رویہ اسے آگ لگائے دے رہا تھا۔ وہ مسلسل سب کے درمیان یوں ظاہر کررہا تھا جیسے اس رشتے میں اس کی اپنی پسند شامل ہو۔ اس کا یہ کھیل طوبیٰ کے لیے بہت اعصاب شکن ثابت ہورہا تھا۔ وہ نڈھال سی اپنی پیشانی گھٹنوں پہ ٹکا گئی تھی۔ تب ہی اسے اپنے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھاتے ہوئے رخ موڑا تھا اور اپنے بے حد قریب بیٹھے نوفل جاہ کو دیکھ کے وہ پہلے چونکی اور پھر تیزی سے اٹھی تھی نوفل نے اسی تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس بٹھالیا تھا۔

"چھوڑیں میرا ہاتھ۔" وہ بری طرح جھنجلائی۔

"اب تو یہ ہاتھ میں نے ساری زندگی کے لیے پکڑ لیا ہے۔" نوفل شوخ سا مسکرایا تو طوبیٰ نے کھولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

"غلط فہمی ہے آپ کی۔ میں اگر اس نکاح کے لیے مجبور کردی گئی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے آپ کو قبول کرلیا ہے۔ میں آپ کی ساری پلاننگ پہ پانی پھیردوں گی، میں کبھی اس نکاح کو رخصتی تک نہیں پہنچنے دوں گی!"

"تم مجھے چیلنج کررہی ہو؟" نوفل جاہ نے بھنویں اچکائیں۔ طوبیٰ اس کے تیور دیکھ کے ایک لمحے کو گھبرائی، لیکن اگلے ہی پل سر اٹھاکے گویا ہوئی۔

"ہاں!"

"جیتنے والے کو کیا ملے گا؟" نوفل کی آنکھوں میں چمک اتر آئی۔ طوبیٰ بے اختیار سٹپٹا گئی اس نے لحظہ بھر کو رکتے ہوئے سوچا اور اپنے خشک پڑتے لبوں پہ زبان پھیری۔

"اس کی خواہش!"

"ڈن!" نوفل جاہ کے لبوں پہ بڑی جان دار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ "اب مس طوبیٰ حسن تم ہمارے رشتے کو آگے بڑھنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرو۔ اگر تم اپنی اس کوشش میں کامیاب رہیں تو یہ وعدہ ہے نوفل جاہ کا تم سے کہ وہ تمہاری خواہش ضرور پوری کرے گا۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتا وہ اٹھ کھڑا ہوا تو طوبیٰ حسن کی حیرت بھری نگاہیں اس کے چہرے پہ جم سی گئیں۔

☼ ☼ ☼

انگوری اور ڈل گولڈن رنگ کے کام والے خوب صورت فراک اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس طوبیٰ نے نظر اٹھاکر آئینے میں خود کو دیکھا تھا اور اپنے روپ

پہ حیران رہ گئی تھی۔ حالانکہ میک اپ کے نام پہ اس کے ہونٹوں پر پنک رنگ کی لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ البتہ اس کی نہ نہ کے باوجود رجا اور اسماء نے اس کے بالوں میں کرلز ڈال کر انہیں ایک طرف کو سیٹ کر دیا تھا۔ صباحت بیگم کا لایا ہوا سیٹ پہنے، ماتھے پہ نازک سی بندیا اور ہاتھوں میں خوب صورت سے جڑاؤ کنگن اور سونے کی چوڑیوں کے ساتھ مہکتے ہوئے گجرے پہنے وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ نوفل کی پسند شان دار تھی۔ ہر چیز حقیقتاً "لاجواب" تھی۔

"شرطیہ کہتی ہوں۔ آج تو تمہیں دیکھ کے نوفل صاحب نے اپنا سر پیٹ لینا ہے کہ رخصتی دو ماہ بعد کی کیوں رکھوائی۔" اس کا دوپٹا سیٹ کرتے ہوئے نادیہ شرارت سے مسکرائی تو طوبیٰ نے گھبرا کے نظریں چرائیں۔

"قسم سے مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ ہمارا اندازہ درست نکلا ہے۔ نوفل جاہ صاحب سچ میں محترمہ کے عشق میں مبتلا تھے۔" رجا چہرے پہ خوش گوار سی بے یقینی لیے بولی تھی۔ ان تینوں کو تو جس دن سے ارجمند بیگم نے نوفل اور طوبیٰ کی بات پکی ہو جانے کی اطلاع دی تھی۔ وہ مارے خوشی کے دیوانی ہی ہو گئی تھیں۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" طوبیٰ کے جلبلا کے تردید کرنے پہ اسما نے بے اختیار اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"تم تو چپ ہی رہو... پہلے ہی ہمیں اتنے سال تعلق واسطہ ختم کی رپورٹ دیتی آئی تھی... اب ذرا بتاؤ، دلوں کے تعلق کیا اتنی آسانی سے ختم ہوتے ہیں؟" اسما کی جتاتی ہوئی نظریں خود پہ مرکوز پا کے طوبیٰ اک گہری سانس لیتی خاموش ہو گئی تھی۔ اس کے لیے تو سچ میں اس ساری صورت حال کو لفظوں میں ڈھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ تب ہی دروازہ کھول کے ماہ نور اندر آئی تھی۔ طوبیٰ پہ نگاہ پڑتے ہی وہ ایک پل کے لیے ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ بھرپور مسکراہٹ لیے بہن کے گلے آلگی تھی۔

"ماشاءاللہ۔ بہت پیاری لگ رہی ہیں آپی۔" اس نے طوبیٰ کا گال چوما تو وہ بے اختیار سسک اٹھی۔ اس کا رونا ان چاروں کی آنکھیں بھی بھرلایا تھا۔ ماحول میں یک لخت سوگواری سی چھا گئی تھی۔

"ارے بچیوں تم ابھی تک یونہی کھڑی ہو؟" رجا کی امی اندر داخل ہوئی تھیں۔ انہیں طوبیٰ کے سرہانے کھڑا دیکھ کے وہ تیزی سے آگے بڑھی تھیں۔

"ارے بھئی چادر دو کوئی۔ قاضی صاحب اور مرد اندر آرہے ہیں۔" ان کی بات پہ ماہ نور خود کو کوستی الماری کی طرف لپکی تھی۔ وہ یہی اطلاع دینے تو اندر آئی تھی۔ آن کی آن میں کمرے میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ طوبیٰ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ ماہ نور نے آگے بڑھ کے اس پہ چادر ڈالی تو طوبیٰ کو لگا جیسے اس کا وقت نزع قریب آگیا ہو۔

کمرہ مختلف آوازوں سے بھرنے لگا تھا۔ تب ہی طوبیٰ کو ارجمند بیگم کا شفیق لمس اپنے سر پہ محسوس ہوا تھا۔ ماں کی خوشبو پاتے ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔ اس نے اپنے یخ بستہ ہاتھ سے ان کا ہاتھ تھاما تو ارجمند خود بھی آبدیدہ ہو گئی تھیں انہوں نے بے اختیار جھک کر اس کا سر چوم لیا تھا۔ تب ہی قاضی صاحب بمع گواہوں کے اندر چلے آئے تھے۔ نوفل جاہ کے لیے اقرار کرتے اس کے اندر ایک حشر برپا تھا۔ کبھی یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی، لیکن آج جب اتفاقی طور پہ یہ خواہش پوری ہو گئی تھی تو اسے یہ رشتہ کسی پھندے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ ایک ایسا پھندہ جو نہایت ہوشیاری سے اس کے گرد کس دیا گیا تھا۔

نکاح کے بعد اسے باہر لان میں نوفل جاہ کے پہلو میں لاکے بٹھایا گیا تو وہ اپنی تمام تر لاتعلقی کے باوجود جان سے کانپ گئی تھی۔ نوفل نے اس کی گھبراہٹ باآسانی محسوس کرلی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ دبائے بے اختیار اس کی جانب جھکا تھا۔

"ابھی سے ہمت ہار رہی ہو؟" اس کی سرگوشی طوبیٰ

کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ بن کے دوڑ گئی تھی۔ وہ نظریں جھکائے اپنی جگہ پہ ساکت بیٹھی رہ گئی تھی۔ عالی، محب، ضحیٰ اس کی سہیلیاں سب کی شوخیاں عروج پر تھیں، لیکن وہ سب سے بے نیاز اس ایک جملے کی تکرار اپنے اندر سنتے ہوئے لب بھینچے بیٹھی تھی۔

دودھ پلائی کی رسم کے بعد تصویروں کا دور چلا تھا جس کے بعد مہمانوں کے لیے کھانا لگا دیا گیا تھا۔ نوفل صوفے سے اٹھ کے مہمانوں میں چلا گیا تھا۔

طوبیٰ لڑکیوں اور خواتین میں گھری بے چینی سے اب اس سارے تماشے کے اختتام کی منتظر تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر اپنے کمرے میں پہنچ جائے اور نوفل جاہ کی لائی ہوئی ہر چیز خود پہ سے اتار پھینکے۔

"امی!" ضحیٰ کے پکارنے پہ ارجمند کے ساتھ محو گفتگو صباحت نے پلٹ کے بیٹی کی طرف دیکھا تھا اور بری طرح چونک گئی تھیں۔ ضحیٰ خاصی پریشان لگ رہی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی عالی کے ساتھ محب اور فہد بھی ان کے قریب چلے آئے تھے۔

"آنٹی۔" عالی نے آگے بڑھتے ہوئے دونوں خواتین کو اپنی جانب متوجہ کیا تو وہ بغور اس کی بات سننے لگیں۔

"دماغ تو نہیں خراب ہو گیا اس کا؟" صباحت پریشانی سے عالی کی شکل دیکھنے لگی تھیں۔ ارجمند بھی ہکا بکا سی اس کا منہ تک رہی تھیں۔

"آنٹی اب اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے۔" عالی انہیں نارمل کرنے کو ہلکے پھلکے لہجے میں بولا تو صباحت نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پہ بھی انہیں شبہ ہو۔

"تم لوگ پاگل تو نہیں ہو گئے۔ یہ کوئی مذاق ہے کیا... پیچھے ہٹو میں خود جا کے دیکھتی ہوں اسے۔" صباحت اور ارجمند آگے بڑھیں تو وہ چاروں بھی ان کے ساتھ باہر نکل گئے۔ ان سب کو ایک ساتھ لان سے نکلتا دیکھ کے طوبیٰ نے حیرانی سے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"یہ لوگ کہاں جارہے ہیں؟"

"ٹھہریں میں دیکھ کر آتی ہوں۔" ماہ نور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی تھی اور تیز قدموں سے گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ طوبیٰ بے چینی سے بہن کا انتظار کرنے لگی تھی۔ نوفل جاہ بھی محفل میں کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ مضطرب سی گاہے بگاہے سب لوگوں پہ نظر ڈال رہی تھی کہ اچانک اس کی نظریں ایک نقطے پہ مرکوز ہو گئی تھیں۔ اس نے بے اختیار اپنی آنکھوں کو جھپکا تھا، لیکن لان میں داخل ہونے والا پری وش چہرہ اپنی جگہ پہ موجود رہا تھا۔ تب ہی آنے والی کی نظریں بھی ساری محفل سے ہوتی، دلہن بنی طوبیٰ پہ آٹھہری تھیں۔ دونوں کی نگاہیں ٹکرائی تھیں اور طوبیٰ کے اندر ایک عجیب سی سرد مہری پھیل گئی تھی۔ جسے شاید دور کھڑی نگین نے بھی محسوس کرلیا تھا۔ وہ بڑے ٹھنڈے انداز میں مسکرائی تھی اور اس کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ تب ہی ماہ نور بھاگتی ہوئی لان میں آئی تھی۔ طوبیٰ کی نظریں اس چاند چہرہ سے ہٹ کر بہن پہ آٹھہری تھیں جو پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

"آپی! نوفل بھائی نے ابھی آپ کی رخصتی کے لیے کہہ دیا ہے۔"

"کیا؟" طوبیٰ کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ------ انمول
میک اپ ------ روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی ------ موسیٰ رضا

دیا شیرازی

وہ ابھی ابھی یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔ آج اس کا آخری دن تھا۔ پیپرز سے فارغ ہو کر وہ کچھ دن آرام کرنا چاہتی تھی اور پھر دوستوں کے ساتھ کاغان ناران کی سیر کرنے کا پروگرام طے تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ بیٹھی ہی تھی کہ صغیر بابا کا پیغام لے کر آگیا۔ بابا آج گھر پر تھے اور کھانے پہ اس کا انتظار کر رہے تھے اس نے جلدی جلدی چپل پہنی اور دوپٹا لپیٹ کر ڈائننگ کی طرف آگئی جہاں بابا پہلے سے موجود تھے۔

"السلام علیکم بابا جان! وہ عجلت میں ٹیبل کی طرف بڑھی اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی موقع اچھا تھا۔ بابا سے اپنی پلاننگ بھی ڈسکس کر لیتی ساتھ ساتھ اجازت بھی مانگ لیتی۔

"وعلیکم السلام....." بابا نے متانت سے جواب دیا اور پلیٹ اس کی طرف بڑھادی۔

"شکریہ۔" لالہ نے پلیٹ تھام لی۔ اور چائنیز رائس نکالنے لگی اسے چاول بہت پسند تھے۔

"لالہ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" بابا بہت سنبھل کے بول رہے تھے۔ چائنیز رائس کا چمچہ منہ تک لے جاتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکی۔

"جی بابا آپ بولیں میں سن رہی ہوں۔" بظاہر کھانا کھاتے ہوئے اس کا پورا دھیان باپ کی طرف ہی تھا آج سے پہلے انہوں نے کبھی اس طرح تمہید نہیں باندھی تھی ان دونوں کے بیچ روایتی باپ بیٹی جیسے تعلقات نہیں تھے ہیلم کی وفات کے بعد بابا اس کا زیادہ دھیان رکھنے لگے تھے۔ دونوں باپ بیٹی میں کافی دوستانہ تعلقات تھے۔ گل لالہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ان سے ڈسکس کر لیتی تھی اور وہ کسی سہیلی کی طرح اسے مفید مشورہ سے نوازتے تھے۔

"مجھے یونیورسٹی ڈپارٹمنٹ کی طرف سے ایک سال کے لیے ناروے بھیجا جا رہا ہے۔ کچھ فریش کورسز کرنے کے لیے۔ مجھے وہاں ایک سال تک قیام کرنا پڑے گا۔" وہ اپنی بات کے اختتام پر اس کے تاثرات جانچنے لگے۔

"او۔ واؤ یہ تو بہت اچھا ہے۔ آپ کو گھومنے کا موقع مل جائے گا اور میں بھی ناروے دیکھ لوں گی۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ ناروے گھومنے کا سوچ کر ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"ناروے میں اکیلا جا رہا ہوں۔" یوسف صاحب نے اس کی تصحیح کی لالہ کا چہرہ اتر گیا۔

"دیس ناٹ فیئر (یہ ٹھیک نہیں ہے) بابا۔ ویسے ہر کام میں آپ کو میں یاد آتی ہوں اور جب گھومنے کی باری آئی تو مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال باہر کیا۔" وہ منہ بسور کر بیٹھ گئی۔

"بھئی مجھے میرا ڈپارٹمنٹ بھیج رہا ہے تم خوب محنت کرو اور اپنے ڈپارٹمنٹ کی طرف سے چلی جانا۔" باپ کی اس طوطا چشمی پہ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

"مسئلہ یہ ہے کہ میرا اتنے عرصے باہر رہنے پر تم یہاں اکیلی نہیں رہ سکتیں۔"

تو..... گل لالہ چونکی ہو کر بیٹھ گئی۔

"تو یہ..... کہ تمہارے امتحان ختم ہو گئے ہیں۔ رزلٹ آنے میں تھوڑا وقت لگے گا اور مجھے پورا یقین ہے۔ تم نے ماسٹرز کلیئر کر لیا ہو گا۔ اس لیے جب تک ایم فل کی کلاسز شروع ہوں میں تمہیں اپنی ایک جاننے والی فیملی کے پاس بھیج رہا ہوں کشمیر تم وہاں محفوظ رہو گی تو میں بھی تسلی سے اپنا کام مکمل کر سکوں گا۔" وہ اتنے اطمینان سے بتا رہے تھے جیسے کوئی الف لیلہ کا قصہ سنا رہے ہوں۔ گل لالہ کا نوالہ منہ میں ہی رہ گیا وہ اسے نگل نہیں پائی تھی۔

"بابا میں اتنی دور کشمیر جا کر کیسے رہوں گی اور وہ بھی ایک سال کے لیے میں تو وہاں کسی کو جانتی بھی نہیں۔ اس طرح اجنبی لوگوں کے بیچ..... نہیں..... نہیں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ آئی کانٹ ڈو دس....." قطعی انداز میں بولی۔

"اجنبی نہیں ہیں وہ....." یوسف صاحب روانی میں بول گئے۔ "میرا مطلب ہے تمہیں وہاں اجنبی پن محسوس نہیں ہو گا۔ بہت اچھے لوگ ہیں وہ۔ شاہ میر میرا بہت اچھا اسٹوڈنٹ رہا ہے۔ میں ان کی فیملی کو اچھے طریقے سے جانتا ہوں۔ تم بہت انجوائے کرو گی

وہاں۔ یقین کرو وہ جگہ بہت خوب صورت ہے۔ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں۔۔۔ برف سے ڈھکے میدان۔۔۔ ہرے بھرے پہاڑ گھروں سے اٹھتا دھواں سخت سردی میں کشمیری چائے اور ڈرائے فروٹ۔۔۔" وہ کسی ٹرانس میں بولے جارہے تھے۔ جیسے اب بھی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ گل لالہ ایک ابرو اٹھائے بڑے مشکوک انداز میں ان کو سنے جارہی تھی۔

"آپ وہاں کب گئے۔" وہ تجسس سے پوچھنے لگی۔ جتنا اسے یاد تھا اس کی تئیس سالہ زندگی میں تو کبھی بابا یونیورسٹی اور گھر سے دور ادھر ادھر نہیں گئے تھے۔ یوسف صاحب ہڑبڑا کر حال میں واپس آئے۔

"میں یونیورسٹی کے دنوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے گیا تھا۔ اور اب تک ان دنوں کو بھول نہیں پایا۔ مرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر وہاں ضرور جاؤں گا۔ وہ جگہ ہے ہی ایسی جو ایک بار دیکھ لے وہ کبھی بھول نہیں پاتا۔" گل لالہ نے رکی ہوئی سانس خارج کی۔

"بابا وہ سب ٹھیک ہے۔" مانتی ہوں وہ جگہ بہت خوب صورت ہوگی لیکن مجھے بہت مشکل لگ رہا ہے یوں پورے ایک سال کے لیے گھر سے دور رہنا۔ میں یہاں سیٹ ہوں پھر اکیلی کہاں ہوں۔ رمضان چاچا ہیں۔ صغیرے بانو خالہ ہیں۔ آپ کیوں فکر مند ہورہے ہیں۔ آپ بس اطمینان سے ناروے جائیں مجھے کوئی مشکل نہیں ہوگی میں آپ سے روز اسکائپ پہ بات کرتی رہوں گی۔" یوں اجنبی لوگوں میں اتنا دور جانے کا سوچ کے ہی اسے گھبراہٹ ہورہی تھی وہ مختلف بہانوں سے باپ کو منانے کی کوشش کررہی تھی۔ دونوں کے بیچ لاکھ دوستانہ تعلقات سہی لیکن آخری فیصلہ سنانے کا حق آج بھی یوسف صاحب کے پاس محفوظ تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ باقاعدہ کوئی فیصلہ سناتے گل لالہ کو انہیں اپنی بات کے لیے قائل کرنا تھا۔ ورنہ آخری حکم صادر کرنے کے بعد وہ لالہ کی ایک نہیں سنتے۔

"دیکھو بیٹا زندگی میں ہمیں کبھی کبھی ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں جو عام حالات میں شاید ہم کبھی نا کریں۔ اپنی خوشی سے کوئی گھر چھوڑنا نہیں چاہتا۔ لیکن کبھی کبھار حالات ہمیں وہاں لے آتے ہیں جہاں سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔" ایک سایہ سا ان کے چہرے پر آکر گزر گیا۔

"مانا کہ رمضان چاچا صغیر اور بانو بہت اچھے اور وفادار لوگ ہیں لیکن میں تمہیں ان کے آسرے پہ چھوڑ کے نہیں جاسکتا۔ جوان بیٹی کے باپ پر بہت ذمہ داریاں ہوتی ہیں جنہیں صرف وہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ تم ابھی بچی ہو ان نزاکتوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ تمہارے لیے اتنا کافی ہونا چاہیے کہ میں تمہارا باپ یہ فیصلہ کررہا ہوں اب اچھا ہے یا برا تم مجھ پہ چھوڑ دو۔" فیصلہ صادر ہوچکا تھا وہ سر تھام کے بیٹھ گئی۔

"آج شام تک شاہ میر یہاں اسلام آباد پہنچ رہا ہے۔ تم اپنا سامان پیک کرلو۔ کل صبح تم لوگ روانہ ہوگے۔ میں آج رات ہی کراچی چلا جاؤں گا کچھ کام نمٹانے ہیں وہاں۔ تمہارے اکاؤنٹ میں میں نے پیسے جمع کروادیے ہیں۔ مزید کچھ چاہیے تو وہ آج رات تک لے آؤ۔ میرا مطلب ہے اپنی ضرورت کا سامان تاکہ تمہیں وہاں مشکل نا ہو۔ ہوسکتا ہے تمہیں وہاں یہ سب نا ملے۔" اپنی بات ختم کرکے وہ سکون سے کھانا کھانے لگے۔

اگر اس وقت کوئی پہاڑ بھی اس کے سر پر گرتا تو وہ شاید اتنا نا چکراتی جتنا بابا کے اس اچانک فیصلے نے اسے چکرایا تھا۔ اتنا بڑا فیصلہ اتنے کم وقت میں کہ وہ صدائے احتجاج تک بلند نا کرسکی۔ بابا کا یوں اچانک ناروے کا پروگرام اس کو اتنی دور بھیجنے کا فیصلہ اگر ان کے ذہن میں یہ سب تھا تو وہ تذکرہ تو کرتے۔ اپنے جانے سے محض چند گھنٹے پہلے اسے اطلاع کیوں دی۔ کھانے سے اس کا دل اٹھ چکا تھا۔

"شاہ میر کی فیملی بہت اچھی ہے تمہیں خوش رکھیں گے کوشش کرنا انہیں تم سے کم سے کم شکایت ہو۔" گل لالہ نے ان کی بات بیچ میں کاٹ دی۔

"بابا۔۔۔ میں وہاں رخصت ہوکے نہیں جارہی آپ تو ایسے ہدایات دے رہے ہیں جیسے میں اپنے سسرال جارہی ہوں۔" وہ ناراض ہوکر بولی بابا نے قہقہہ لگایا۔

"تم پہلی مرتبہ کسی کے گھر رہنے جارہی ہو وہ بھی اپنی مرضی کے بغیر۔ پتا نہیں کیا گڑبڑ کروگی وہاں۔" وہ پھر سے ہدایات دینے لگے کیا کیا سامان لے کر جانا ہے۔ ان سے کیسے پیش آنا ہے وغیرہ وغیرہ وہ سر ہلاتی جارہی تھی جیسے سب کچھ ذہن نشین ہوگیا ہو لیکن در حقیقت اس کے دماغ میں کوئی اور کھچڑی پک رہی تھی۔

✵ ✵ ✵

کمرے میں دائیں سے بائیں ٹہلتے ہوئے وہ مستقبل کی پلاننگ میں مصروف تھی۔ بابا آج رات کی فلائٹ سے کراچی روانہ ہورہے تھے اور اسے کل صبح جانا تھا مطلب اس کے پاس پورے دس گھنٹے تھے اور وہ ان دس گھنٹوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا دفاع کرنے کی ٹھان لی تھی' جہاں تک مجھ سے ہوسکتا ہے اور جتنا۔ مجھ سے ہوسکتا ہے میں بھرپور کوشش کروں گی پھر جو میری قسمت' بابا کے سامنے تو میری دال نہیں گلی لیکن اس شاہ میر کے ساتھ تو وہ کروں گی کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے گا۔ بڑا آیا میری حفاظت کرنے والا' اپنی حفاظت میں خود بھی کرسکتی ہوں۔ اس نے نتھنے پھلا کر سوچا۔

سارا دن وہ نارمل رہی تاکہ بابا کو اس کے تخریب کارانہ عزائم کا پتا نہ چلے۔ شام ڈھل چکی تھی رات نے اپنے سیاہ چادر پھیلادی تھی۔ بالکونی میں کھڑی گل لالہ نے کافی کا مگ ختم کیا اور ابھی وہ پلٹ ہی رہی تھی کہ اس کی نظر گیٹ سے اندر آتی وائیٹ ویگو پر پڑی تھی۔ وہ جاتے جاتے رک کر اندر آتی گاڑی کو دیکھنے لگی۔

شاہ میر دروازہ کھول کے نیچے اتر رہا تھا وائٹ کاٹن کی شلوار قمیص پہنے ہوئے بڑے بڑے قدم اٹھاتا وہ برآمدے کی طرف بڑھا اس کی چال میں واضح اعتماد جھلک رہا تھا۔ وہ ہکا بکا کھڑی دیکھتی رہ گئی آج سے پہلے اسے کسی مرد نے اتنا متاثر نہیں کیا تھا کشمیر کو اگر وادی حسن کہا جاتا تھا تو بالکل صحیح تھا۔ گل لالہ جھرجھری لے کر حال میں واپس آئی۔ یہ میں کیا سوچنے لگی ہوں۔ اس نے خود کو ملامت کی اور نیچے جانے کے لیے قدم بڑھادیے۔ تم اگر شاہ میر ملک ہو تو میں بھی گل لالہ یوسف ہوں تمہارے دانت نا کھٹے کردیے تو نام بدل دینا میرا' وہ رعونت سے سوچتی سیڑھیاں اترنے لگی۔

✵ ✵ ✵

ایک بار پھر وہ بابا کے سامنے ڈائننگ ٹیبل پہ موجود تھی۔ لیکن اس بار وہ دونوں اکیلے نہیں تھے۔

"لالہ ان سے ملو یہ شاہ میر ہیں ون آف مائے بریلینٹ اسٹوڈنٹس' (میرے قابل طالب علموں میں سے ایک) آرمی میں سول انجینئر ہیں آج کل ایبٹ آباد میں ہوتے ہیں۔" لالہ کے بیٹھتے ہی بابا نے شاہ میر کے قصیدے پڑھنے شروع کیے تھے۔ گل لالہ کا حلق تک کڑوا ہوگیا۔ لیکن اس کے چہرے سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا بظاہر وہ بہت مہمان نوازی سے مسکرائے جارہی تھی۔

"اور شاہ میر یہ میری پیاری سی بیٹی۔ ہے گل لالہ' حال ہی میں انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا ہے' اور آگے ایم فل کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔" شاہ میر نے مسکرا کر ایک سرسری نظر اس پہ ڈالی اور دوبارہ بابا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ گل لالہ جو اس سے بات کرنے کے لیے الفاظ ترتیب دے رہی تھی اس واضح ناقدری پہ کھول کے رہ گئی۔

سمجھتا کیا ہے خود کو یہ۔ اب میں اتنی بھی گئی گزری نہیں ہوں کہ کوئی نگاہ اٹھا کر بھی نا دیکھے۔ اپنا غصہ چھپاتے ہوئے کباب اور رائتہ نکال کر کھانے لگی۔ تب ہی ایک شیطانی آئیڈیا اس کے ذہن میں وارد ہوا۔ اس نے سوپ کے باؤل کے ساتھ رکھی سرکے کی شیشی اپنی کولڈ ڈرنک میں انڈیل لی اور شاہ میر کے گلاس کے ساتھ اپنا گلاس بدل دیا۔ بظاہر وہ اپنی

پلیٹ پہ جھکی ہوئی تھی لیکن اس کی پوری توجہ شاہ میر ہی کی طرف تھی کب وہ بوتل منہ سے لگاتا ہے اور کب اسے کھانسی کا دورہ پڑتا ہے وہ دل میں سوچ کر ہی محظوظ ہونے لگی۔
شاہ میر نے کولڈ ڈرنک سے ایک گھونٹ بھرا اور نگل لیا۔ اس کے چہرے پر کوئی غیر معمولی تاثر نہیں تھا گل لالہ نے حیرت سے اس کے ہاتھ میں پکڑے گلاس کو دیکھا پھر ٹیبل پہ نظر دوڑائی۔ کہیں ایسا تو نہیں شاہ میر نے کوئی اور گلاس اٹھالیا ہو۔ یا پھر وہ جان بوجھ کر ایسے تاثرات چہرے پہ نہیں لارہا' مرچ تو میں نے خود ڈالا تھا اس کے گلاس میں۔
"ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے محسوس ہی نا ہوا ہو۔" شاہ میر نے اسے ہاتھ روک کر خود کو گھورتے پایا تو بھنویں اچکا کر کیا ہے کا اشارہ دیا۔
لالہ کو احساس ہوا کہ وہ کب سے اسے گھورے جارہی ہے تو وہ شرمندہ ہو گئی۔ اور اس گھبراہٹ کو چھپانے کے لیے اس نے سامنے رکھا کولڈ ڈرنک کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگالیا۔ اگلے ہی پل اسے کھانسی کا دورہ پڑ چکا تھا۔
شاہ میر نے فورا" پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ پانی پی کر اس کی سانس بحال ہوئی تھی۔ اس نے کھاجانے والی نظروں سے شاہ میر کو گھورا جسے اس نے بہت خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ وصول کرلیا۔

☼ ☼ ☼

یوسف صاحب کو رخصت کرتے وقت اس کا دل بھر آیا ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اتنے عرصے کے لیے اس سے دور جارہے تھے۔ آنے والے وقت کو سوچ کر ہی اس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔
"اوکے مائے سن! اب میں چلتا ہوں اور اپنی سب سے قیمتی چیز تمہیں امانت دے کر جارہا ہوں اس کا خیال رکھنا اور اگر یہ کوئی اوٹ پٹانگ حرکت کرے تو تم اسے ڈانٹ سکتے ہو میری طرف سے اجازت ہے۔" یوسف صاحب نے شاہ میر کو گلے لگایا۔ ان کے رویں رویں سے خوشی چھلک رہی تھی۔ لالہ کو یہ محبت ایک آنکھ نا بھائی تھی۔
"ہونہہ بہت اویڈینٹ بن رہا ہے بابا کے سامنے ذرا بے باز کہیں کا۔" شاہ میر سے مل کر وہ اس کی طرف بڑھے۔
"اوکے بیٹا۔ اپنا خیال رکھنا اور کوشش کرنا وہاں دل لگا رہے۔ شاہ میر اور ان کی بے بے کو تم سے کوئی شکایت نا ہو۔ میں فون کرتا رہوں گا تمہیں' اپنی کتابیں ساتھ لے جانا وہاں ان کو پڑھنے کا اچھا ٹائم ملے گا۔ تم اپنے ٹیسٹ کی تیاری وہیں کرلو ایم فل میں ہیلپ مل جائے گی۔ ناروے سے کچھ منگوانا ہو تو بتانا۔ میں وہاں پہنچتے ہی تم سے رابطہ کروں گا۔ بے بے کو میرا سلام کہنا۔" بابا مختلف ہدایات دیتے گاڑی کی سمت بڑھ رہے تھے وہ بھی ان کے ساتھ چلتی گاڑی تک آگئی۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولا اٹک گیا تھا وہ چاہتے ہوئے بھی بول نہیں پارہی تھی۔
"اللہ حافظ۔" گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ اسے لگا وہ رو دے گی۔ وہ لب بھینچے کھڑی رہی۔ گاڑی جا چکی تھی۔ شاہ میر اندر جانے کے لیے مڑا گل لالہ کو یوں کھڑا دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ اب تک جو گل لالہ اسے نظر آئی تھی یہ روتی سہمی لالہ اس سے یکسر مختلف تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا لڑکیوں کا سارا اعتماد ان کے باپ کے دم سے ہوتا ہے۔ شاہ میر نے ہلکا سا کھنکار کر اسے متوجہ کرنا چاہا۔ وہ ہڑبڑا کر حال میں واپس آئی تھی۔ اس نے خالی پورچ کو دیکھا گاڑی کب کی جا چکی تھی۔
"چلیں...." شاہ میر پہلی مرتبہ اس سے مخاطب ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتی ہوئی اندر آئی تھی۔ میدان صاف تھا اور اس کا کھیل ابھی شروع ہونا تھا۔ سیڑھیوں پہ قدم رکھتے اس نے شاہ میر کو دیکھا جو لاؤنج میں رکھے صوفے پر نیم دراز نیوز دیکھ رہا تھا۔ گل لالہ نے تیسری سیڑھی پہ قدم رکھا اور ہاتھ چھوڑ دیے۔ فضا میں اس کی دردناک چیخ پھیل گئی۔
شاہ میر نے صوفے سے چھلانگ لگائی تھی لیکن

اس کے پہنچنے سے پہلے وہ زمین پہ گر چکی تھی۔ ریلنگ کو پکڑنے کی کوشش میں اس کی کہنی چھل گئی تھی اور دائیں پاؤں میں موچ آگئی تھی وہ دونوں ہاتھوں سے پاؤں تھامے کراہنے لگی۔ چوٹ زیادہ تو نہیں آئی۔ وہ قریب بیٹھ کر اس کے پاؤں کو دیکھنے لگا۔ شاہ میر کے ہاتھ لگانے سے درد کی ٹیس اٹھی تھی۔ گل لالہ چیخ پڑی۔ درد کی وجہ سے آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ شاہ میر نے فوری طور پر پاؤں چھوڑ دیا۔
"چلیں کسی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" شاہ میر نے سہارا دینے کو ہاتھ بڑھایا۔
"مجھ سے نہیں اٹھا جارہا۔" گل لالہ کی آواز رندھ گئی۔
"میں لے چلتا ہوں۔" شاہ میر نے اسے بازوؤں میں اٹھالیا۔ گل لالہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں وہ احتجاج کرتی رہ گئی' اپنے کاٹے کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ شاہ میر نے اسے اسپتال پہنچا کے دم لیا۔

☼ ☼ ☼

پاؤں پہ چڑھے پلاستر کو دیکھ کر وہ پچھتا رہی تھی۔ اپنی حماقت کی وجہ سے وہ اچھی خاصی تکلیف سے گزری تھی۔ بانو خالہ سوپ بنا کر لے آئی تھیں۔ وہ اسے تکیوں کا سہارا دے کر بٹھانے لگیں۔
"شاہ میر کہاں ہیں۔" اس نے سوپ پیتے ہوئے پوچھا۔
"شاہ میر صاحب ابھی ابھی اپنے کمرے میں گئے ہیں۔ شاید سو گئے ہوں۔" بانو خالہ نے اس کے بیڈ کے قریب ہی بستر لگالیا تھا۔
"اچھا۔" گل لالہ نے مزید کوئی تبصرہ نہیں کیا۔
اچھا ہی ہوا جو بھی ہوا' چلو کسی بہانے جانے کا پروگرام تو کینسل ہوا' فی الحال تو اس چوٹ کو لمبا کھینچوں گی۔ ہفتہ یا شاید دو ہفتے کام چل جائے۔ بھلا ہو اس ڈاکٹر کا جس نے ضرورت نا ہوتے ہوئے بھی پلاستر چڑھادیا۔ اب اس کے کھلنے کا انتظار تو وہ کرے گا نہیں دو دن میں بور ہو کر بھاگ جائے گا اور اگر رک بھی گیا تو صاف انکار کروں گی جانے سے' ویسے بھی تب تک بابا ناروے جا چکے ہوں گے۔
بس.... اس کی چوٹ سے ٹیس اٹھنے لگی تو باقی کا پروگرام کل پہ چھوڑ کے وہ سو گئی۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھ دروازے پہ ہوتی مسلسل دستک پہ کھلی تھی' نیم موندی آنکھوں سے اس نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔
"کون...." اس نے اٹھنے کی کوشش کی درد کی اک تیز لہر نے اسے وہیں لیٹے رہنے پر مجبور کیا۔
"میں ہوں شاہ میر.... آپ جاگ گئی ہیں تو ناشتا بھیجوں' آٹھ بجے تک ہمیں نکلنا بھی ہے۔ برف باری کی وجہ سے راستہ خراب ہو گیا ہے ہمیں گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے گی۔" وہ گل لالہ کے ارادوں سے بے خبر پروگرام بتا تا رہا۔ لالہ اب پوری طرح ہوش میں آچکی تھی۔ وہ قدرے سنبھل کر بولی۔
"دیکھیں جی میری طبیعت ٹھیک نہیں میں آج آپ کے ساتھ نہیں چل سکتی۔" لالہ نے حتی المقدور اپنی آواز میں نقاہت بھر کر کہا۔
"محترمہ یہ کوئی اتنی بڑی چوٹ نہیں ہے۔ میں آپ کو پیدل لے کر نہیں جارہا۔ آپ چاہیں تو گاڑی میں لیٹ کر جا سکتی ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔" وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔
"آپ سمجھنے کی کوشش کریں میں اس حال میں نہیں چل سکتی۔ میری ٹریٹمنٹ چل رہی ہے۔ آپ ایک ہفتہ ٹھہر جائیں یا پھر آجائیں گا۔" وہ جان بوجھ کر شاہ میر کو زچ کر رہی تھی۔ لیکن وہ بھی اپنی بات کا پکا تھا۔ اب الٹا لالہ زچ ہو گئی تھی۔
"یہ ٹریٹمنٹ وہاں جا کر بھی ہو سکتی ہے وہاں بھی اچھے اچھے ڈاکٹرز موجود ہیں' میں بڑی مشکل سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آیا ہوں اب ایک ماہ تک مجھے دوبارہ چھٹی نہیں مل سکے گی۔" وہ متانت سے سمجھانے لگا۔ گل لالہ اسے عجیب سرپھری لڑکی لگی

تھی۔ وہ اپنے باپ سے یکسر مختلف تھی۔ شاہ میر کو افسوس ہونے لگا یوسف ملک بیٹی کی اچھی تربیت نہیں کر سکے تھے۔ وہ کئی اور پہلوؤں پر بھی غور کر رہا تھا۔ اسے اب پچھتاوے گھیر رہے تھے۔

"میں آپ کو بتا چکی ہوں جب تک میں مکمل ٹھیک نہیں ہو جاتی۔ آپ کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ بہتر ہو گا آپ ایک مہینے بعد آئیں۔" بہت محتاط لہجے میں بولتے بولتے اچانک اسے لگا وہ غلطی کر بیٹھی ہے۔ اسے آخری جملہ اتنی بے فکری سے نہیں بولنا چاہیے تھا وہ کسی صورت شاہ میر کو یہ تاثر دینا نہیں چاہتی تھی کہ وہ یہ سب جان بوجھ کر کر رہی ہے۔

شاہ میر کا ماتھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا جب وہ بار بار ڈاکٹر کو کہہ رہی تھی کہ ہڈی میں فریکچر ہے آپ پلاستر چڑھائیں۔ جبکہ ڈاکٹر کہہ چکا تھا کہ صرف موچ آئی ہے دو تین دن مالش کرنے سے ٹھیک ہو جائے گی۔ شاہ میر اب تھوڑا سا پریشان ہوا۔ "تو محترمہ جانا ہی نہیں چاہتیں۔ باپ کے سامنے انکار نا کر پائی تو مجھے الو بنایا جا رہا ہے۔ تم مجھے جانتی نہیں ہو گل لالہ ملک۔ میں بھی دیکھتا ہوں تم کیسے نہیں جاتیں۔" شاہ میر دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھا۔

"ٹھیک ہے پھر میں ایک مہینے بعد ہی آؤں گا۔ تب تک آپ تیار رہیے گا۔" وہ کہتا ہوا نیچے اتر گیا۔ گل لالہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا واقعی وہ اتنی جلدی میری جان چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ وہ بے یقینی کے عالم میں کتنی ہی دیر دم سادھے پڑی رہی۔ کچھ ہی دیر بعد بانو بی چائے لے کر اوپر آئیں۔ چائے کے ساتھ دو سینکے ہوئے توس اور ایک گلاس دودھ کا تھا۔ اس کا ناشتا اتنا ہی سادہ ہوتا تھا۔

"بانو خالہ شاہ میر صاحب چلے گئے۔" اس نے بظاہر چائے کپ میں انڈیلتے سرسری انداز میں پوچھا۔ درحقیقت اس کی ساری توجہ اس طرف تھی۔ اسے اب بھی شاہ میر کے اتنی جلدی ہار مان کر چلے جانے کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بیٹا وہ تو کب کے چلے گئے کہہ گئے ہیں جب بی بی کو جانا ہو فون کر دیں میں آ جاؤں گا۔" "اور وہ فون میں تمہیں کبھی نہیں کروں گی۔" وہ دل میں مسکرائی۔

"آپ ایسا کریں میرا بلیک سوٹ نکال دیں۔ مجھے پلوشہ کے گھر جانا ہے۔" وہ مطمئن ہو کر بولی۔ "لیکن وہ آپ کی چوٹ..." بانو بی ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھیں۔

"اس کی خیر ہے کوئی بڑی بات نہیں۔ اب میں مہینہ بھر بستر پر تو نہیں گزار سکتی نا۔" گل لالہ نے توس کا ٹکڑا چائے کے ساتھ نگلتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی بیٹا دھیان کرنا کہیں تکلیف بڑھ نا جائے۔" بانو بی فکرمندی سے بولیں۔

"ہوں... کچھ نہیں ہوتا..." اس نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے پلوشہ کو میسج کیا۔

گل لالہ تیار ہو کر نیچے اتری۔ سیاہ شیفون کی قمیص کے ساتھ گلابی دوپٹا لیے وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ باریک نیٹ کی آستینوں سے سفید دودھیا بازو جھلک رہے تھے۔ گلے میں سونے کا نفیس لاکٹ اور ننھی بوندوں کی شکل کے سونے کے ٹاپس پہنے وہ کسی پر بھی قیامت ڈھا سکتی تھی۔ اس کی موچ بہت حد تک ٹھیک ہو چکی تھی تاہم چال میں تھوڑی سی لنگڑاہٹ باقی تھی جس کی وجہ اس کا ڈر تھا وہ درد کے ڈر سے پورا پاؤں زمین پر رکھنے سے کترا رہی تھی۔ آخری سیڑھی پر پاؤں رکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رکی۔ شاہ میر سامنے ہی صوفے پہ لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ لالہ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آئیے آئیے گل لالہ صاحبہ اب کیسی طبیعت ہے آپ کی۔ مجھے تو کچھ زیادہ ہی بشاش لگ رہی ہیں۔" شاہ میر کے لہجے میں چھپا طنز صاف ظاہر تھا۔ وہ جل کر رہ گئی۔ بہت ہی گھٹیا سوچ ہے اس کی بھلا ضرورت تھی یہ ڈرامہ کرنے کی اوپر سے اتالی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ شخص اتنا بھولا ہے نہیں جتنا شکل سے لگتا ہے۔ خیر دیکھ لوں گی اسے بھی۔

"پہلے سے بہتر ہے۔" وہ خشک لہجے میں بولی۔

"چلیں یہ تو بہت اچھا ہوا میں آپ ہی کا انتظار کر رہا

تھا۔ آپ کو جو سامان لینا ہے وہ بانو خالہ کو بتا دیں ہم آدھے گھنٹے میں شارجہ کے لیے نکل رہے ہیں۔"

اس بار شاہ میر کا لہجہ کسی بھی قسم کی نرمی سے عاری تھا۔ دو ٹوک الفاظ میں حکم دیا گیا تھا۔ لالہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شاہ میر کا یہ روپ اس کے لیے نیا تھا۔ اسے یوں چپ دیکھ کر وہ پھر گویا ہوا۔

"اب کیا کوئی نیا بہانہ ڈھونڈ رہی ہیں۔" شاہ میر کے لہجے میں تلخی کی آمیزش تھی۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں بہانے تلاش کرنے کی۔ میں اگر نا جانا چاہوں تو آپ زبردستی نہیں کر سکتے میرے ساتھ۔" اب کی بار گل لالہ نے بھی ڈھکی چھپی رکھنے کی بجائے صاف بات کرنا بہتر سمجھا۔

شاہ میر اس کے مدمقابل آ کھڑا ہوا۔ اور بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں زبردستی کر سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ چیلنج کرتا ہوا محسوس ہوا۔

"آپ بھول رہی ہیں یوسف صاحب آپ کو میرے حوالے کر کے گئے ہیں۔ اب جب تک وہ واپس نہیں آ جاتے آپ کو میری مرضی کے مطابق چلنا پڑے گا۔" شاہ میر کے لہجے میں تحکم اور اعتماد تھا کہ گل لالہ کو اپنا اعتماد ڈگمگاتا محسوس ہونے لگا۔

"سوچ ہے آپ کی..." وہ غرائی۔

"میں کوئی بے جان چیز نہیں جسے بابا نے آپ کو سونپ دیا ہو۔ ایک جیتی جاگتی لڑکی ہوں، مجھے کیا کرنا ہے کہاں رہنا ہے یہ فیصلہ میں خود کروں گی۔" وہ بہت ٹھوس لہجے میں بولی۔ اس کی گردن تنی ہوئی تھی نازک سے نتھنے غصے کی وجہ سے پھول گئے تھے۔ شاہ میر یک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔ اتنا غرور اتنا اعتماد اپنی ذات پر۔ شاہ میر نے اس سے پہلے کسی لڑکی میں یہ ساری خوبیاں یکجا نہیں دیکھی تھیں۔ گل لالہ پرت در پرت اس پر کھل رہی تھی۔ کبھی وہ اسے بہت نازک سی نرم دل دوشیزہ لگتی تو کبھی پہاڑوں کا حوصلہ لیے مضبوط لڑکی۔ کبھی وہ سمجھ دار اور فرمانبردار بیٹی لگتی تو کبھی ضدی اور ہٹ دھرم۔ وہ پل پل رنگ بدل رہی تھی۔ اور شاہ میر کو اس کے سارے رنگ بھا رہے تھے۔ بات اس کی مردانگی پہ آ گئی تھی وہ ایک لڑکی سے ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"کس کی سوچ ہے اور کس کی نہیں اس کا فیصلہ ابھی ہو جائے گا۔" شاہ میر نے موبائل نکال کر یوسف ملک کا نمبر ملانا شروع کر دیا۔ گل لالہ نا سمجھی کے انداز میں اسے یہ سب کرتا دیکھ رہی تھی۔

"ہیلو... سر... گل لالہ صاحبہ بضد ہیں کہ وہ میرے ساتھ نہیں جائیں گی بلکہ آپ کے آنے تک اس گھر میں قیام کریں گی۔" گل لالہ کو لگا اس کے پاؤں کے نیچے زمین کھسک گئی ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاہ میر کو دیکھے جا رہی تھی۔ اسے توقع نہیں تھی شاہ میر فوراً "بابا" کو فون لگا دے گا۔

"جی جی میں ہینڈل کر لیتا ہوں... آپ فکر نا کریں۔" فون رکھ کے وہ لالہ کی طرف پلٹا۔

"آپ خود گاڑی میں بیٹھیں گی یا میں اٹھا کے لے چلوں۔" وہ بہت سکون سے پوچھ رہا تھا۔ لالہ کی آنکھیں تحیر سے پھیل گئیں۔ زندگی میں پہلی بار وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شاہ میر نے گھر لاک کر کے چابیاں اپنے پاس رکھیں بانو خالہ اور رمضان چاچا انیکسی میں شفٹ ہو گئے تھے۔ صغیر واپس گاؤں چلا گیا تھا۔ گل لالہ سخت غصے میں تھی۔ اسے بابا پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ جنہوں نے ایک انجان آدمی کو اس پر مسلط کر دیا تھا۔ اور اسے خود پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ وہ شاہ میر سے ڈر گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا وہ شاہ میر کا سر پھوڑ دیتی۔ وہ تلملاتی ہوئی گاڑی کی پچھلی سیٹ کی طرف بڑھی۔ گاڑی لاک تھی۔ وہ وہیں انتظار کرنے لگی۔ شاہ میر رمضان چاچا کو ہدایات دے کر اسی طرف آ رہا تھا۔

"آپ فرنٹ سیٹ پہ آ جائیں۔" شاہ میر نے لاک کھولتے ہوئے کہا۔ گل لالہ پر کوئی اثر نا ہوا شاہ میر شانے اچکا کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا لالہ نے کافی

برہمی سے پچھلا دروازہ کھولا اندر رکھا سامان اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ پچھلی سیٹ کھچا کھچ سامان سے بھری تھی۔ سامان کچھ اس انداز میں رکھا گیا تھا کہ ایک بندے کے بیٹھنے کی جگہ بھی باقی نہیں بچی تھی۔ لالہ نے جس تیزی سے دروازہ کھولا تھا ویسے ہی بند کردیا۔ اور فرنٹ ڈور کھول کے اندر بیٹھ گئی شاہ میر نے ایک نظر اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ گل لالہ نے پاؤں اوپر سیٹ پر رکھے دوپٹا اپنی گرد لپیٹا اور آنکھیں موند لیں جیسے وہ مزید کسی کی شکل دیکھنا نا چاہتی ہو۔ شاہ میر خاموشی سے ڈرائیونگ کررہا تھا۔ گل لالہ کے بارے میں اس کی رائے کافی خراب ہوچکی تھی۔ پتا نہیں یوسف چاچا اس سرپھری لڑکی کے ساتھ کیسے گزارا کرتے رہے ہیں۔ وہ تاسف سے سوچنے لگا۔ لڑکیوں کو اتنا غصیلا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ اس کی اپنی رائے تھی۔

☼ ☼ ☼

مظفرآباد پہنچتے پہنچتے سڑک کے اطراف پڑی برف باری نظر آنے لگی تھی۔ شاہ میر ان راستوں سے بخوبی واقف تھا وہ بہت محتاط ڈرائیونگ کررہا تھا۔ ذرا سی چوک انہیں کسی گہری کھائی میں دھکیل سکتی تھی۔ راستے میں جگہ جگہ لوگ رضاکارانہ برف کو سڑک سے ہٹانے کی کوشش کررہے تھے۔ دریائے نیل کے شور سے کانوں کے پردے پھٹنے کو تھے شاہ میر نے شیشے چڑھا کر ہیٹر آن کردیا۔ گل لالہ بہت دلچسپی سے سارے مناظر دیکھنے لگی۔ اس کے لیے یہ سب نیا تھا۔ اسے افسوس ہونے لگا وہ پہلے وہاں کیوں نہیں آئی۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جارہے تھے سارا منظر سفید ہوتا جارہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا قدرت نے اس منظر سے سارے رنگ چرا لیے تھے۔ گل لالہ کو اب بھوک ستانے لگی تھی شاہ میر نے ایک ریسٹ ہاؤس کے سامنے گاڑی پارک کی۔ اور اس سے مخاطب ہوکر بولا۔

"یہاں کھانا بہت اچھا ملتا ہے۔ مجھے شدید بھوک لگی ہے۔ آپ کو بھی لگی ہوگی۔ اچھا ہے تھوڑا ریسٹ بھی ہوجائے گا۔" وہ ایسے بول رہا تھا جیسے ان دونوں کے گہرے دوستانہ تعلقات ہوں۔ صبح سے جو بدمزگی ہوچکی تھی شاہ میر کے لہجے میں اس کا شائبہ تک نا تھا۔ یا تو یہ شخص بہت اچھا ہے یا بہت بڑا ڈرامے باز ویسے صبح سے جو کچھ یہ میرے ساتھ کرچکا ہے مجھے دوسری بات میں شک تو نہیں ہونا چاہیے۔ وہ جان بوجھ کر اسے نظرانداز کرنے لگی۔ شاہ میر کو اندازہ تھا وہ اس سے ناراض ہے۔

"ہمیں شاردھا پہنچنے میں ابھی کافی ٹائم لگے گا۔ بہتر ہوگا ہم یہاں کھانا کھالیں۔" شاہ میر اس کی طرف کا دروازہ کھول کر بولا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں کوئی کٹھ پتلی ہوں کہ وہ جیسے بولے جائے گا میں ویسا کرتی جاؤں گی۔ اندر سے اٹھتی بھوک کی شدید ٹیسوں کو دبا کر وہ رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔ جیسے شاہ میر کی آواز ہی نا سنی ہو۔ شاہ میر کو شدید ہتک کا احساس ہوا وہ کب سے بولے جارہا تھا اور وہ تھی کہ جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا وہ لالہ کو گاڑی سے اٹھا کر باہر پھینک دے وہ مسلسل اسے زچ کررہی تھی۔ اگلے ہی پل وہ خود پہ قابو پاچکا تھا۔ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ اس نے اتنی تیزی سے دروازہ بند کیا کہ گل لالہ اچھل پڑی۔ وہ ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ تقریباً" آدھے گھنٹے کے بعد وہ ہاتھ میں ایک شاپر پکڑے واپس آیا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے شاپر پچھلی سیٹ پر رکھا اور گاڑی اسٹارٹ کردی کھانے کی تیز خوشبو گاڑی میں پھیل چکی تھی۔ لالہ کی بھوک شدید ہوچکی تھی۔

اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے کہ گل لالہ کو بات کرنے کی ہمت نا ہوپائی۔ وہ شرمندہ تھی۔ اسے احساس ہوچکا تھا وہ مسلسل شاہ میر کے ساتھ برا رویہ رکھے ہوئے تھی۔ وہ اپنی مرضی سے نہیں آیا تھا اسے بابا جان نے بلایا تھا اور کشمیر جاکر رہنے کا فیصلہ بھی سراسر بابا کا تھا تو وہ اسے سزا کیوں دے رہی تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنے باپ سے نہیں لڑسکتی تھی۔

کیا سوچتا ہوگا وہ میرے بارے میں۔ وہ جیسے جیسے سوچ رہی تھی ندامت کے گہرے گڑھے میں دھنستی جارہی تھی۔ وہ بات کرنا چاہ رہی تھی لیکن پہل کرنے میں اس کی انا آڑے آرہی تھی۔ وہ منتظر تھی کہ شاہ میر کچھ پوچھے اور وہ اس کا جواب دے لیکن اب شاہ میر کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ جتنی کوشش کرسکتا تھا کرچکا تھا۔ جتنا جھک سکتا تھا جھک کر دیکھ چکا تھا۔ یہ لڑکی اس کی سوچ سے زیادہ سرپھری تھی۔ وہ کوشش کررہا تھا گل لالہ کو جلد از جلد بے بے کے حوالے کرکے واپس آجائے اس نے یوسف چاچا سے جتنا وعدہ کیا تھا اسے اپنی طرف سے پورا کرنے کی بھرپور کوشش کرچکا تھا۔ گل لالہ سے بات کرنا اسے کسی پتھر سے سر پھوڑنے جیسا لگ رہا تھا۔ وہ کچھ سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ جو فیصلہ کرلیتی تھی اس پہ اڑ جاتی تھی۔ شاہ میر کے پاس زبردستی کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اس مزاج کا بندہ نہیں تھا اس لیے اسے یہ سب کرتے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

وادی نیلم شروع ہوچکی تھی۔ قدرت کے حسین مناظر آنکھوں کو خیرہ کررہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قصبے نظر آنا شروع ہوگئے تھے سڑک کے دونوں طرف سیب، آڑو اور چیری کے باغات بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ ننھی منی کشمیری لڑکیاں سرخ رنگ کا روایتی لباس پہنے گھروں کے سامنے کھیلنے میں مصروف تھیں۔ گل لالہ کا دل چاہنے لگا وہ بھی ان کے ساتھ مل کے کھیلنا شروع کردے یہ ننھی پریاں اسے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ بابا نے ٹھیک کہا تھا یہ جگہ بور ہونے والی نہیں تھی۔ وہ مین بازار سے گزرنے لگے چائے کے چھوٹے چھوٹے اسٹال لگے ہوئے تھے۔ جہاں بسکٹ اور بیکری کی دوسری چیزیں بھی مل رہی تھیں۔ ایک دکان پکوڑے تلے جارہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک مٹھائی کی دکان تھی۔ گل لالہ کا بھوک سے برا حال ہوچکا تھا۔ اسے چائے کی بھی شدید طلب ہورہی تھی۔ اس نے پرس اٹھا کر کھانے کی کوئی چیز تلاش کرنی چاہی لیکن وہاں سوائے چیونگم کے اور کوئی چیز نا ملی۔

اس کی شکل رونے جیسی ہوچکی تھی۔

شاہ میر مسلسل اس کی حرکات نوٹ کررہا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ اب وہ کچھ کہے گی لیکن وہ کچھ نا بولی۔ شاہ میر کو اس نے خود کھانے سے منع کیا تھا اب کس منہ سے مانگتی۔ اسے واپس اپنی پہلی پوزیشن میں بیٹھا دیکھ کر شاہ میر نے ٹھنڈی سانس بھری اور ہاتھ بڑھا کر پچھلی سیٹ سے کھانے کا پیکٹ اٹھا کر اس کی گود میں رکھ دیا۔ گل لالہ پہ جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اسے اپنی حماقت کا اب احساس ہورہا تھا اگر وہ ریسٹ ہاؤس پر اتر جاتی تو بات اتنی نا بڑھتی۔ اب مزید انکار کرنے کا اس میں دم نہیں بچا تھا۔

اس نے پیکٹ کھولا اور خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ شاہ میر گاڑی روک کر دو چائے لے آیا اس بار اس نے لالہ سے پوچھنے کا تکلف نہیں کیا تھا۔ لالہ نے تشکر بھرے لہجے میں شکریہ کہا اسے اس وقت چائے کی شدید طلب ہورہی تھی۔ وہ جان چکی تھی۔ یہاں اسے اپنی مرضی کے خلاف بہت سی باتوں سے سمجھوتا کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماشاء اللہ' ماشاء اللہ جیتا رہ میرا بیٹا ماں صدقے؟"
بے بے نے والہانہ انداز میں شاہ میر کو گلے لگایا اور اس کا ماتھا چوم لیا۔

"اور یہ لالی ہے نا ماشاء اللہ کتنی بڑی ہوگئی ہے۔"
وہ اب لالہ کو سینے سے لگائے کہہ رہی تھیں۔ گل لالہ کو ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں وہ کشمیری زبان نہیں جانتی تھی۔

"اتنا عرصہ ہوگیا میری تو آنکھیں ترس گئیں ان کو دیکھنے کے لیے۔ یوسف خود کیوں نہیں آیا۔ ایسے ہی اکیلے بچی کو بھیج دیا۔ کتنا ارمان تھا مجھے خود جاتی دھوم دھام سے بیاہ کے لے آتی اپنی بہو کو' اکلوتے بیٹے ہو تم میرے۔ لیکن اسے کیا پتا ماؤں کے ارمان کیا ہوتے ہیں۔ نا اپنے سہرے کے ارمان پورے کرنے دیے نا اب..... بے بے گزرے وقت کو یاد کرکے آبدیدہ

ہوگئیں۔

"بے بے چھوڑ دیں پرانی باتوں کو یاد کرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ اب تو سب کچھ ٹھیک ہوگیا ہے۔ یوسف چاچا کہہ رہے تھے وہ خود آئیں گے آپ سے ملنے۔" بے بے اب پھر لالہ کی طرف متوجہ ہوچکی تھیں۔ جو صحن میں رکھی چارپائی پر بیٹھ چکی تھی۔

"یہ لالی تو بالکل نیلم پہ گئی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی حسین تھی جب ہی تو یوسف یوں سب کچھ بھول بھال کے اس کے پیچھے دیوانہ ہوا تھا۔" وہ پھر ماضی کے دھندلکوں میں کھونے لگیں۔

"آپ ملی تھیں ان سے۔" شاہ میر نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ وہ بھی پیڑھی کھینچ کے وہیں بیٹھ گیا' بے بے گل لالہ کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

"ہاں ایک بار اس کی شادی کے تین سال بعد ڈاکٹر کو دکھانے کے بہانے گئی تھی اسے دیکھنے تب لالی صرف ایک سال کی تھی' دو دن وہاں رہی تھی میں' یوسف بہت خوش تھا۔ نیلم کچھ شرمندہ شرمندہ سی تھی اس کی وجہ سے تمہارا باپ قتل ہوا تھا۔ وہ راجپوت تھی راجپوت ذات پات کے معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ ان کی لڑکی کو بھگا کے لے جانا کوئی چھوٹی بات تو نہیں تھی۔ قصور تو ان کی لڑکی کا بھی تھا لیکن سزا صرف مجھے ملی۔ شوہر بھی جان سے گیا اور یوسف بھی آنکھوں سے دور چلا گیا۔ جب میں بیاہ کے آئی تھی تب وہ صرف چار سال کا تھا بیٹا سمجھ کے پالا تھا اسے۔ جب تم پیدا ہوئے تب تک وہ جوان ہوچکا تھا۔ یونیورسٹی پڑھتا تھا۔ پھر پتا نہیں کیسے اسے نیلم مل گئی اور وہ سب کچھ بھول بھال گیا۔" بے بے نے سو بار کی دہرائی کہانی پھر اسی شوق سے چھیڑ دی تھی۔

"بس کردیں بے بے سو بار سنا چکی ہیں یہ قصہ۔" شاہ میر بے چارگی سے بولا۔

"ارے میں تمہیں تھوڑی سنا رہی ہوں یہ سب تو میں لالی کو بتا رہی ہوں۔" وہ خفا ہوکر بولیں۔

"پھر تو آپ یہ تکلف نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔ اسے ایک لفظ سمجھ نہیں آئے گا آپ کا' اسے کشمیری زبان سمجھ میں نہیں آتی۔" شاہ میر نے انکشاف کیا۔

"یوسف نے اسے کشمیری نہیں سکھائی۔" وہ صدمے سے گرتے گرتے بچیں۔ لالہ ان کی گفتگو سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ خاموشی سے بیٹھی ماں بیٹے کو گفتگو کرتے دیکھ رہی تھی۔ "صرف کشمیری ہی نہیں اور بھی بہت کچھ نہیں سکھایا۔ سچ میں بے بے' چاچا نے لاڈ پیار میں اسے بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ ایک نمبر کی بدتمیز اور ضدی ہے۔" شاہ میر چہرے پہ سنجیدگی سجائے زمین کو گھورتا ہوا بول رہا تھا تاکہ گل لالہ کو یہ نہ لگے کہ وہ اس کے بارے میں کوئی ناخوش گوار بات کررہے ہیں۔ بے بے کو اس کی بات بالکل پسند نہیں آئی تھی۔

"ٹھیک ہوجائے گی رفتہ رفتہ' ابھی تم سے ملے ٹائم ہی کتنا ہوا ہے' دوبارہ اس کے لیے ایسا مت کہنا' بیوی ہے وہ تمہاری سنے گی تو اس کا دل برا ہوگا۔" شاہ میر نے بے بے کی بات پہ بے ساختہ گل لالہ کو دیکھا کہیں اس نے سن تو نہیں لیا' لیکن اسے ویسے ہی سکون سے بیٹھا دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"بے بے میں سونے جارہا ہوں بہت تھک گیا ہوں۔ آپ سنبھالیں اپنی لالی کو' بہت شوق تھا نا آپ کو بہو لانے کا' دو دن میں چکر نہ دیا تو کہیے گا۔" وہ شرارت سے کہتا ہوا جانے کو مڑا پھر کچھ یاد آنے پر پلٹ آیا۔

"اچھا سنیں۔ اسے کچھ پتا نہیں ہے اس شادی کے بارے میں بلکہ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ یوسف چاچا سے میرا کیا رشتہ ہے اور اسے فی الحال بتانا بھی نہیں ہے۔ چاچا نے منع کیا ہے ان کے خیال میں پہلے یہ اس ماحول میں گھل مل جائے پھر وہ خود ہی بتادیں گے۔ فی الحال وہ یہاں صرف ایک مہمان ہے اس کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کرنی جو اسے بے سکون کرے۔" شاہ میر بے بے کو ہکا بکا چھوڑ کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بے بے جو سوچے بیٹھی تھیں کہ گل لالہ سے ڈھیر ساری باتیں کریں گی اس سے یوسف اور نیلم کی باتیں پوچھیں گی اپنا دل مسوس کے رہ گئیں۔ گل لالہ نے شاہ میر کو جاتا دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری۔ شکر ہے جان چھوٹی۔ شاہ میر کے سامنے الرٹ بیٹھے بیٹھے وہ اکڑ گئی تھی۔ تھکن سے اس کا برا حال تھا وہ آرام کرنا چاہتی تھی۔

"آنٹی واش روم کہاں ہے' میں فریش ہونا چاہتی ہوں۔" وہ جب سے آئی تھی پہلی مرتبہ بولی تھی بے بے نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اچھا آؤ میں دکھاتی ہوں۔" بے بے اسے ساتھ لیے غسل خانے کی طرف بڑھیں۔

"اس طرف بالٹی میں گرم پانی رکھا ہے تم منہ ہاتھ دھولو میں کھانا لگاتی ہوں۔" وہ ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولیں گل لالہ کو ان کی بات سمجھ میں آگئی تھی۔

"نہیں میں ابھی کھانا نہیں کھاؤں گی' میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔" وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔ مبادہ بے بے کو برا نہ لگے۔ وہ کھانے سے انکار نہ کرتی اگر وہ تھوڑی دیر پہلے کھانا نہ کھاچکی ہوتی۔ گل لالہ واپس آئی تو بے بے اسے کمرہ دکھانے آئیں۔

یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا دالان میں دو کمرے تھے جن میں سے ایک میں ابھی شاہ میر سونے گیا تھا۔ دوسرا بے بے نے اسے رہنے کے لیے دیا تھا۔ دالان کے ایک سرے پر باورچی خانہ تھا اور دوسری طرف باتھ روم اور چھوٹا سا صحن تھا جس میں دو سیب کے درخت لگے تھے۔

اسے حیرت ہورہی تھی شاہ میر یہاں رہتا ہے اتنے چھوٹے سے گھر میں اس کی گاڑی دیکھ کر نہیں لگتا وہ یہاں رہتا ہوگا۔ لالہ اپنی سوچوں میں گم کمرے میں آگئی۔ کمرہ زیادہ بڑا نہیں تھا' لیکن نہایت سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ یہاں اس کی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ پلنگ' الماری' رائٹنگ ٹیبل' بک شیلف' بیڈ کے بائیں جانب ایک کھڑکی تھی جو باہر کھیتوں میں کھلتی تھی۔

گل لالہ تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ یہ کمرہ اس کے کمرے جتنا لگژری تو نہ تھا' لیکن پھر بھی اسے اچھا لگا تھا۔ یہاں اس کی پسند کی کافی چیزیں تھیں جیسے کتابیں' میز' کرسی اور لیمپ وغیرہ وہ بک شیلف کی طرف بڑھ آئی اور کتابوں کا جائزہ لینے لگی ان میں بہت سی اس کے پسندیدہ رائٹرز کی کتابیں تھیں۔ اسے یاد آیا وہ کتابیں ساتھ لانا بھول گئی تھی۔

"یہ شاہ میر کی کتابیں ہیں۔ اسے بہت شوق ہے کتابیں پڑھنے کا۔" بے بے کی آواز پر وہ چونک کر پلٹی۔ وہ چائے لے کر آئی تھیں۔

"ارے آپ نے اتنی تکلیف کیوں کی میں خود بنالیتی۔"

"مجھے لگا تمہیں اس کی ضرورت ہوگی۔" بے بے نے کشمیری چائے کپ میں انڈیل کر اس کی طرف بڑھائی۔ لالہ کو چائے کا ذائقہ تھوڑا عجیب لگا اس نے چند گھونٹ بھرنے کے بعد واپس رکھ دی۔

"یہ کمرہ کس کا ہے۔" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"شاہ میر کا تھا اس نے تمہارے لیے خالی کیا ہے۔ کہہ رہا تھا شہر کی لڑکی ہے اسے یہاں مشکل نہیں ہونی چاہیے۔" بے بے بہت محبت سے بیٹے کا ذکر کررہی تھیں۔ گل لالہ کے چہرے پر تفکر کے آثار دکھائی دینے لگے۔

"تو شاہ میر کہاں رہیں گے۔" وہ پریشان ہوکر بولی۔ اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا یوں کسی کی چیز پہ قبضہ کرنا۔

"وہ میرے ساتھ رہے گا ساتھ والے کمرے میں ویسے بھی وہ یہاں ہوتا ہی کب ہے۔ مہینے دو مہینے بعد آتا ہے چھٹی لے کر۔" گل لالہ کو اطمینان ہوا۔ اس کی وجہ سے کسی کو تکلیف نہیں ہوگی۔

"اچھا اب تم آرام کرو۔" بے بے اٹھ کے چلی گئیں لالہ نے رضائی اوپر ڈالی تو اسے عجیب احساس ہوا۔ یہ رضائی شاہ میر کی تھی اور اس میں سے مردانہ پرفیوم کی خوشبو آرہی تھی یہ وہ ہی پرفیوم تھی جو شاہ میر اکثر استعمال کرتا تھا۔ خوشبو آہستہ آہستہ اس کے اعصاب کو سہلا رہی تھی وہ کب نیند کی وادی میں چلی گئی اسے پتا ہی نہ چلا۔

☼ ☼ ☼

"السلام بے بے۔" شاہ میر پیڑھا کھینچ کے بے بے

کے ساتھ ہی باورچی خانے میں بیٹھ گیا۔

"وعلیکم السلام۔ جیتا رہ میرا پتر۔" بے بے نے محبت پاش نظروں سے اکلوتے بیٹے کو دیکھا اور ناشتے کا سامان اس کے سامنے رکھنے لگیں۔ شیرمال' وہی' حلوہ' ڈرائی فروٹس کے میٹھے لڈو اور کشمیری چائے۔ شاہ میر خاموشی سے کھانے لگا۔

"آج تم لالی کو وادی گھمانے لے جانا کل سے گھر میں اداس ہو رہی ہے۔ مجھ بوڑھی کا چہرہ دیکھ دیکھ کر اکتا گئی ہو گی۔ تم دونوں شہر کے پڑھے لکھے ہو تم جاؤ گے تو اسے اچھا لگے گا۔"

"وہ میرے ساتھ نہیں جائے گی' پسند نہیں کرتی وہ مجھے۔" شاہ میر نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم کہہ کر تو دیکھو ضرور جائے گی اور تم نے ایسا کیا کیا ہے جو تمہیں ناپسند کرے گی۔" بے بے روٹی بیلتے ہوئے یقین سے بولیں۔

"وہ یہاں آنا نہیں چاہ رہی تھی زبردستی لے کر آیا ہوں یوسف چاچا کے کہنے پر اسی لیے ناراض ہے۔" شاہ میر نوالہ توڑتے ہوئے بولا۔

"تو خود سے تو لے کر نہیں آئے یوسف نے کہا تھا تب ہی لائے ہو نا۔ کیا اسے نہیں پتا کہ یہ سب تمہیں یوسف نے کہا تھا۔" وہ حیرت سے پوچھنے لگیں۔

"پتا ہے۔" وہ سابقہ انداز میں بولا۔

"پتا ہے پھر بھی..." بے بے کو حیرت ہوئی۔

"بے بے تم اپنے لیے کوئی اور بہو ڈھونڈو۔" شاہ میر منہ لٹکا کر بولا۔

"پاگل ہو گئے ہو اتنی اچھی بہو کے ہوتے ہوئے میں کیوں دوسری بہو ڈھونڈوں۔ ارے چراغ لے کر بھی نکلوں تو ایسی اچھی لڑکی نہیں ملے گی' خوب صورت ہے پڑھی لکھی ہے تمہارے ساتھ کھڑی ہو گی تو اچھی لگے گی۔ سب سے بڑھ کر تمہارا اپنا خون ہے چاچا کی بیٹی ہے۔" وہ ڈپٹ کر بولیں۔

"چاچے کی وجہ سے تو خاموش ہو جاتا ہوں۔ سچ بے بے اگر مجھے پہلے پتا ہوتا کہ بڑی ہو کر یہ اتنی نک چڑھی ہو جائے گی تو میں نکاح کے وقت ہی بھاگ جاتا۔" وہ بے بے کو چڑانے کے لیے بولا۔

"نا بیٹا ایسے نہیں کہتے' ایک ہی تو دن ہوا ہے تمہیں اس سے ملے ہوئے۔ کچھ لوگ اتنی آسانی سے نہیں کھلتے انہیں پرت در پرت کھولنا پڑتا ہے۔ مجھے یقین ہے لالی تمہارے لیے بہت اچھی شریک حیات ثابت ہو گی۔ تم اس سے بات کرو۔ اسے وقت دو' گھماؤ پھراؤ مجھے یقین ہے وہ میرے بیٹے کو ضرور چاہنے لگے گی۔" بے بے اسے دھیمے لہجے میں سمجھانے لگیں۔

گل لالہ کو کچن کی طرف آتے دیکھ کر شاہ میر نے سر جھکائے دھیمی آواز میں بے بے کو اطلاع دی۔

"وہ ادھر ہی آ رہی ہے...."

"بسم اللہ' بسم اللہ... اٹھ گئیں میری بیٹی... بیٹھو۔" بے بے نے والہانہ استقبال کیا۔ بے بے نے دوسرا پیڑھا کھینچ کے شاہ میر کے قریب ہی اس کے لیے رکھ دیا۔

"جی..." گل لالہ جھینپی جھینپی سی بیٹھ گئی۔ یہاں بیٹھے دونوں ہی لوگ اس کے لیے اجنبی تھے۔ ان سے ملے اسے صرف دو دن ہوئے تھے۔ یوں اجنبی لوگوں کے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھانا اسے کافی مشکل لگ رہا تھا' لیکن اسے یہیں ایڈجسٹ کرنا تھا وہ خود کو سمجھانے لگی۔ بے بے نے اس کے سامنے کھانے کے لوازمات رکھنے شروع کر دیے۔

"میں صرف چائے اور توس لوں گی۔ صبح صبح مجھ سے یہ سب نہیں کھایا جائے گا۔" گل لالہ بے بے کو حلوہ پراٹھے' سالن اور لڈو رکھتے دیکھ کر شرمندگی سے بولی۔

بے بے کا چہرہ اتر گیا۔ یہ سب انہوں نے خاص طور سے گل لالہ کے لیے بنائے تھے۔ رات کو بھی وہ کھانا کھائے بغیر سو گئی تھی۔ شاہ میر نے ماں کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "دیکھ لیا آپ نے۔"

بے بے نے خاموشی کے ساتھ چائے اور لڈو بھی گل لالہ کے سامنے رکھ دیے۔

"یہ لڈو ضرور کھانا' میں نے خاص تمہارے لیے
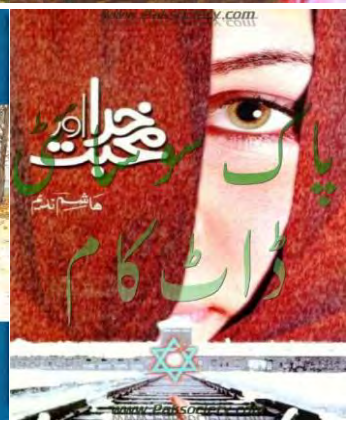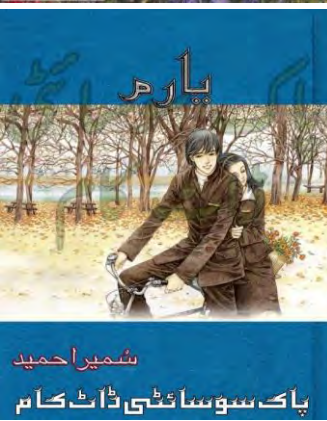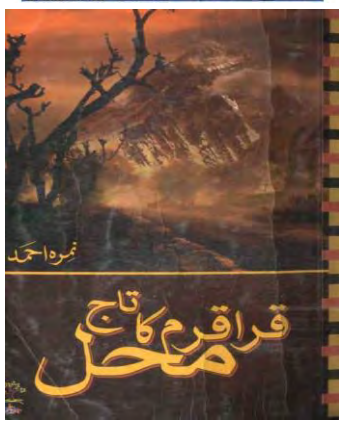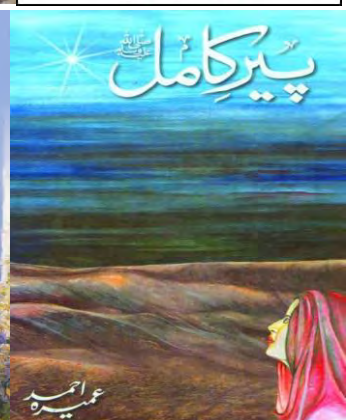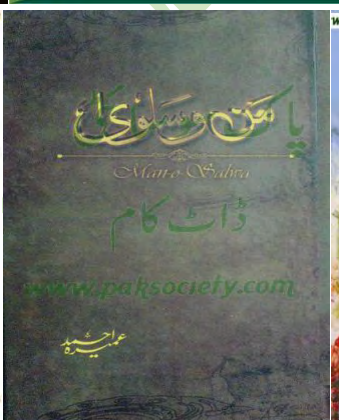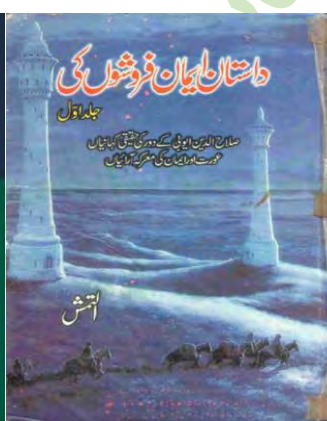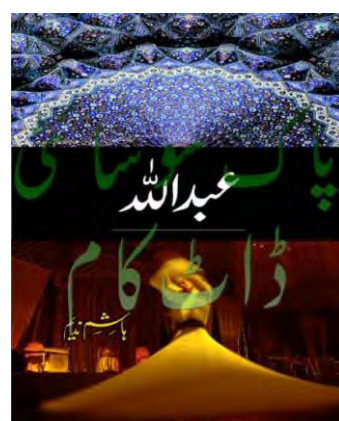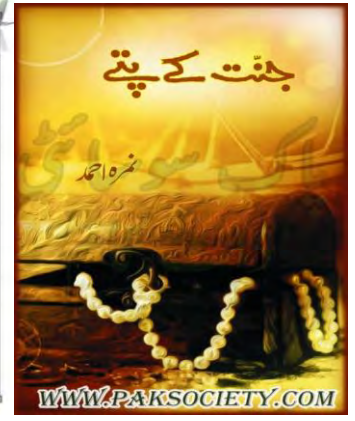
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بنائے ہیں دیسی گھی میں، سردیوں کے لیے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ یہاں کا موسم زیادہ ٹھنڈا ہے۔ صرف چائے سے گزارہ نہیں ہوگا۔" بے بے پیار سے اسے سمجھانے لگیں۔

صبح صبح اتنے ہیوی دیسی گھی کے لڈو دیکھ کر اس کا جی متلانے لگا، لیکن اب مزید کسی چیز سے انکار کرنا اسے اچھا نہ لگا وہ اثبات میں سر ہلا کر چائے پینے لگی، لیکن پہلا گھونٹ لیتے ہی اس نے فوارے کی طرح چائے باہر پھینکی۔

"کیا ہوا....." بے بے گھبرا کر پوچھنے لگیں۔ شاہ میر بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے غلطی سے چینی کی بجائے نمک ڈال دیا ہے چائے میں۔" وہ شرمندہ سی صفائی دینے لگی۔ بے بے ہونق بنی اسے دیکھ رہی تھیں۔ شاہ میر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آئی ایم سوری میں بے بے کو کہنا بھول گیا تھا کہ آپ کے لیے میٹھی چائے بنائیں۔ یہاں نمک والی چائے پی جاتی ہے۔" شاہ میر شرمندہ نظر آرہا تھا۔ پھر اس نے بے بے کو عام میٹھی چائے بنانے کو کہا۔ جسے وہ پاکستانی چائے کہتا تھا۔ بے بے نے سر ہلا کر چائے کے لیے پتیلی چڑھا دی۔ ایک لمحے کے لیے ماحول پہ خاموشی چھائی رہی پھر گل لالہ نے ہی بولنے میں پہل کی۔

"یہاں پورا سال اتنی ہی سردی رہتی ہے۔" وہ چولہے کے قریب کھسک کر ہاتھ سینکنے لگی۔ شاہ میر نے کن انکھیوں سے اس کے نرم و ملائم ہاتھوں کو دیکھا۔ اسے اعتراف کرنا پڑا لالہ اس کی سوچ سے زیادہ خوب صورت تھی۔ شاہ میر کو اپنا دل اس کی طرف کھنچتا محسوس ہوا۔

"ابھی تو سردی شروع بھی نہیں ہوئی۔ سرا کی پہلی برف پڑی ہے لیکن ہوا بند ہونے کی وجہ سے زیادہ سردی نہیں لگ رہی جب سردی بڑھ جاتی ہے تو رگوں میں خون بھی جمنے لگتا ہے۔ تم خود کو تیار کر لو یہاں موسم کا اعتبار نہیں ہوتا ادھر ہوا چلی ادھر سردی اپنی انتہا کو پہنچ جائے گی۔" بے بے مسکرا کر بتانے لگیں۔

"اوہ..... پھر تو میں اس حساب سے بالکل کپڑے نہیں لے کر آئی مجھے اندازہ نہیں تھا یہ علاقہ اتنا سرد ہوگا۔" وہ افسوس سے کہنے لگی۔

"تمہیں یوسف نے کچھ نہیں بتایا۔" بے بے کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا پھر وہ قدرے سنبھل کے بولیں۔ "تمہارے بابا نے نہیں بتایا یہاں کے موسم کے بارے میں....."

"شاید بتایا ہو، میں نے دھیان نہیں دیا ہوگا۔" وہ تاسف سے بولی۔

"تم فکر مت کرو تمہیں جو چاہیے ہوگا شاہ میر تمہیں شہر سے لادے گا۔ کیوں شاہ میر ٹھیک ہے نا۔" انہوں نے بات کرتے ہوئے اچانک شاہ میر کو مخاطب کیا جو خاموشی سے ان دونوں کے بیچ ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ ایک لمحے کو وہ گڑبڑا گیا۔

"ہاں..... کیوں نہیں..... آپ بتادیں جو بھی چاہیے ہو میں لے آؤں گا۔" شاہ میر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اسلام آباد سے آنے کے بعد یہ پہلی بات تھی جو شاہ میر نے براہ راست اس سے کی تھی اور بہت اچھے اور نرم لہجے میں کہی تھی۔ گل لالہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ کیا شاہ میر واقعی اس سے ناراضی ختم کر چکا تھا یا پھر محض بے بے کے سامنے یہ تاثر دے رہا تھا۔ شاہ میر کے چہرے سے ایسی کوئی بات ظاہر نہیں ہو رہی تھی جس سے وہ ایسا اندازہ لگا پاتی۔

"آج اگر تم تھکی ہوئی نہیں ہو تو شاہ میر کے ساتھ ایک دو جگہ گھومنے چلی جاؤ۔" بے بے چائے اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولیں۔ شاہ میر کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے رک سا گیا۔ اسے لگا گل لالہ صاف انکار کردے گی، لیکن اس کی سوچ کے برعکس گل لالہ نے بخوشی اس کے ساتھ جانے پر راضی ہوگئی۔

"ہاں ضرور..... میں یہ سب دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہ وادی سچ میں بہت حسین ہے۔ بابا نے صحیح کہا تھا۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

شاہ میر نے حیرت سے گل لالہ کو دیکھا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا بے بے میں تھوڑی دیر باہر جا رہا ہوں ایک دو گھنٹے تک واپس آجاؤں گا۔" گل لالہ کو مایوسی ہوئی تو کیا شاہ میر اسے گھمانے نہیں لے جائے گا۔ وہ کل سے گھر میں بور ہو چکی تھی۔

"اچھا جلدی آجانا جب تک لالی تیار ہو جائے۔" وہ جان بوجھ کر کشمیری زبان میں بولیں تاکہ شاہ میر کی طرف سے آنے والا کوئی ناخوش گوار جواب گل لالہ کو دکھی نہ کردے۔

"ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلاتا باہر چلا گیا۔ لالہ کو لگا سارا منظر جیسے ایک دم سے اداس ہو گیا ہو۔

☼ ☼ ☼

گل لالہ صحن میں لگے سیبوں کے درختوں پر چہچہاتی چڑیوں کو شوق سے دیکھنے لگی۔ بے بے برآمدے میں رکھے تخت پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔ گل لالہ ان کے ساتھ ہی آکر بیٹھ گئی۔ وہ دور کھڑے پہاڑوں کو دیکھنے لگی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر پڑی برف سنہری دھوپ میں چمک رہی تھی۔ گل لالہ کا دل ان پہاڑوں کو قریب سے دیکھنے کے لیے مچلنے لگا۔ وہ کب سے تیار ہو کر شاہ میر کا انتظار کر رہی تھی۔ صبح سے دوپہر ہونے کو آئی تھی اس کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ "شاہ میر کو شاید کوئی پرانا دوست مل گیا ہوگا۔" بے بے نے اس کا اترا چہرہ دیکھ کر تسلی دی۔

"تم کہو تو میں تمہیں باہر لے چلوں، آس پاس کا علاقہ تو میں بھی دکھا سکتی ہوں تمہیں۔" گل لالہ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کھڑی ہو گئی۔

"سردی کی وجہ سے اندھیرا جلدی پھیل جاتا ہے اس سے پہلے لوٹ آئیں گے۔ ابھی دو تین گھنٹے ہیں ہمارے پاس۔" بے بے کٹی ہوئی سبزیاں ایک طرف رکھتے ہوئے چپل پہننے لگیں۔ دونوں دروازہ بند کر کے باہر نکل آئیں۔ بے بے کے گھر کے ساتھ ہی ان کا کھیت تھا جس میں مختلف سبزیاں لگی تھیں۔ یہاں بمشکل پچاس مکان تھے جن کے تین طرف کھیت بنے تھے۔ کھیتوں سے آگے پھر باغات شروع ہو جاتے تھے۔ سیب، آڑو، ناشپاتی اور چیری کے خوب صورت سرسبز باغ پہاڑ کے دامن تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان باغات کے بیچوں بیچ ٹھنڈے پانی کے چشمے رواں تھے جنہیں چھوٹی چھوٹی نالیوں کی شکل میں تقسیم کر کے کھیت اور باغات کو سیراب کیا جا رہا تھا۔ لالہ نے جھک کر ایک چشمے کے پانی کو ہاتھ کے پیالے میں بھرنا چاہا، لیکن پانی کو چھوتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ وہ کپکپانے لگی۔ بے بے جو چیری کی جھاڑ سے چیریاں توڑ کر ٹوکری میں ڈال رہی تھیں۔ پلٹ کر اسے دیکھنے لگیں۔ لالہ نے ہمت جمع کر کے ایک بار پھر ہاتھ پانی میں ڈالا اس مرتبہ وہ ذہنی طور پہ تیار تھی اسے برداشت کرنے کے لیے۔ ٹھنڈا پانی اسے مزا دینے لگا۔

"تم اگر اسی طرح بھیگتی رہیں تو بیمار پڑ جاؤ گی۔" بے بے چیریوں سے بھری ٹوکری ایک طرف رکھ کر درخت کے تنے پر بیٹھ گئیں جو زمین کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔

"یہ چیریاں مجھے دیں میں انہیں دھولیتی ہوں۔" سرخ رنگ کی فریش چیری دیکھ کر لالہ کا دل اسے کھانے کو بے تاب ہوا۔ بے بے نے ٹوکری اس کی طرف بڑھائی۔ لالہ نے چشمے کے بیچ ٹوکری رکھ دی تیزی سے بہتا پانی انہیں دھوتا جا رہا تھا۔ چیری دھل کر ٹھنڈی ہو چکی تھیں۔ وہ انہیں نکال کر کھانے لگی۔

"آپ کھائیں گی۔" اس نے بے بے سے پوچھا۔

"نہیں تم کھاؤ میں کھٹی چیزیں نہیں کھا سکتی۔ گلا خراب ہو جائے گا میرا۔" وہ معذرت کرنے لگیں۔ وہ بہت دیر تک بے بے کے ساتھ گھومتی رہی۔ گل لالہ نے پوری زندگی اتنا انجوائے نہیں کیا تھا جتنا آج کر رہی تھی۔ شام ہوتے ہی ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ اس کے ناک سرخ ہو رہی تھی اور زکام بھی شروع ہو گیا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔" بے بے نے ڈوبتے سورج پر ایک نظر ڈال کر اس سے کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر رک جائیں میرا دل نہیں بھرا ابھی۔" گل لالہ التجائیہ لہجے میں بولی۔

"ابھی گھر چلو کل دوبارہ آجائیں گے۔ اندھیرا

ہوتے ہی یہاں جنگلی جانور نکل آتے ہیں ہمیں پہلے ہی کافی دیر ہوگئی ہے گھر پہنچتے پہنچتے اندھیرا چھا جائے گا۔" جنگلی جانوروں کا سن کے گل لالہ کی سانس حلق میں اٹک گئی۔

"کیا جنگلی جانور... آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" وہ خوف زدہ نظروں سے چاروں اور دیکھنے لگی۔

"پلیز جلدی چلیں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" گل لالہ کے چہرے پہ خوف چھایا ہوا تھا۔ وہ ابھی تھوڑا ہی آگے بڑھی تھیں کہ انہیں شاہ میر ہاتھ میں گن اور ٹارچ لیے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر لالہ کی جان میں جان آئی۔ وہ اب قریب آچکا تھا۔

"آپ لوگ یہاں ہیں اور میں وہاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے پاگل ہوگیا ہوں۔ بتا کے جانے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی آپ نے۔ ایک ایک گھر سے پوچھا ہے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا آپ کہاں ہیں۔ بے بے آپ بھی کبھی کبھی حد کردیتی ہیں۔" وہ سخت غصے میں لگ رہا تھا۔ گل لالہ کو اس کی باتیں سمجھ میں نہ آئیں۔ وہ چپ چپ ان دونوں کے ساتھ چلتی رہی۔

"اور کتنا انتظار کرواتی دو گھنٹے تو تمہارے انتظار میں بیٹھی رہی کیا سوچتی ہوگی بے چاری تم نے تو اپنی ماں کی بات بھی نہ رکھی۔ کیا بتائے گی جاکر یوسف کو ہمارے بارے میں۔ تمہارا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے شاہ میر۔" بے بے مسلسل اسے ڈانٹتی جارہی تھیں وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

وہ جان بوجھ کے گھر نہیں آیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ آہستہ آہستہ گل لالہ کی محبت میں گرفتار ہوتا جارہا ہے۔ وہ خود کو اس احساس سے چھڑانا چاہتا تھا۔ گل لالہ ایک الگ ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ اس کی پسند ناپسند مزاج سب کچھ اس سے الگ تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا لالہ اپنے جیون ساتھی کے بارے میں کیا سوچ رکھتی ہے۔ ان دونوں کے بیچ نکاح سے لالہ بے خبر تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا حقیقت کھلنے کے بعد گل لالہ کیا فیصلہ کرے گی اسے زیادہ امید نہیں تھی کہ وہ اس کے حق میں فیصلہ دے گی۔ شاہ میر اس لمحے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ وہ گل لالہ سے اس کی محبت کی بھیک نہیں مانگے گا۔ وہ لالہ کے سامنے کمزور پڑنا نہیں چاہتا تھا۔

گھر آچکا تھا۔ شاہ میر نے دروازہ کھولا تینوں آگے پیچھے گھر میں داخل ہوئے شاہ میر نے صحن میں لگا بلب آن کیا پورے گھر میں مدھم زرد روشنی پھیل گئی۔ بے بے نے برآمدے اور کچن کی لائٹیں کھولیں اور کھانا بنانے لگیں۔ گل لالہ اپنے کمرے میں چلی آئی اسے ہلکا ہلکا بخار محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے پرس سے بخار کی ٹیبلیٹ لے کر کھائی اور شال لپیٹ کر باہر چلی آئی۔

"لائیں بے بے میں بنا دیتی ہوں کھانا... آپ تھک گئی ہوں گی۔" صحن میں رکھے گملوں کو پانی دیتے شاہ میر نے مڑ کر حیرت سے لالہ کو دیکھا۔ یہ گل لالہ اس سے کتنی مختلف تھی جسے اس نے یوسف چاچا کے گھر میں دیکھا تھا۔ ضدی اور خود سر سی... وہ سوچنے لگا۔

"ارے بیٹا میں کرلوں گی تم مہمان ہو ادھر... میرا تو یہ روز کا کام ہے۔" بے بے ہچکچا رہی تھیں۔

"کوئی مہمان نہیں ہوں میں۔ میرا اتنی جلدی آپ لوگوں کی جان چھوڑنے کا ارادہ نہیں ہے۔" وہ شرارت سے بولی۔

"یہ مجھے دیں اور آپ یہاں بیٹھ جائیں۔" گل لالہ نے ان کے ہاتھ سے سبزی کی ٹوکری لے کر ان کے لیے ایک پیڑھا رکھ دیا۔ بے بے کے چہرے پہ انوکھی خوشی پھیل گئی۔ وہ بڑی دلچسپی سے لالہ کو کھانا بناتے ہوئے دیکھنے لگیں اور بار بار اس کی بلائیں بھی لیتی جارہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

سردی کی تیز لہر اس کے وجود کے آرپار ہوگئی۔ تکلیف سے گل لالہ کی آنکھ کھل گئی۔ نیند میں اس کی رضائی ایک طرف کھسک گئی تھی۔ باہر سے آتی تیز برفانی ہوائیں آری کی طرح اس کے جسم کو چیر رہی تھیں۔ آج سرما کی دوسری برف باری ہوئی تھی اور

ساتھ برفانی ہواؤں نے سردی کو انتہا تک پہنچادیا تھا۔ اچانک گل لالہ کی نظر کھڑکی پر گئی جس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ رات سونے سے پہلے اس نے کھڑکی بند کی تھی لیکن شاید کنڈی لگانا بھول گئی تھی۔ تیز ہوا نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے تھے۔ وہ ڈرتے ڈرتے کھڑکی کی طرف آئی۔ سرد ہوائیں اسے اپنے وجود کے آرپار ہوتی محسوس ہوئیں۔

آج چودھویں کی رات تھی۔ پورا منظر چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ ہر طرف برف کی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ پہاڑ، گھر، درخت، رستے سب برف میں ڈھکے ہوئے تھے وہ مبہوت کھڑی اس سارے منظر کو دیکھے گئی تب ہی اس کی نظر کھڑکی کے قریب دو سیاہ سایوں پہ پڑی۔ وہ سمجھ نہیں پائی یہ کیا چیز تھی۔ لالہ نے جلدی سے کھڑکی بند کردی اور رضائی میں دبک کر تھر تھر کانپنے لگی۔ باہر کون تھا۔ کوئی سایہ... جن بھوت... چور ڈاکو یا پھر کوئی جنگلی جانور... کوشش کے باوجود اسے اتنی ہمت نہیں ہو پارہی تھی کہ کمرے سے نکل کر ساتھ والے کمرے میں جاکر بے بے اور شاہ میر کو جگا سکتی۔ اگر ان کا دروازہ کھلنے سے پہلے وہ چیز صحن میں کود پڑی تو...

اس کا سوچ کے ہی حلق سوکھ گیا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور بھاگ چکی تھی۔ وہ بستر میں دبکی رہی۔ صبح فجر کی اذان کے ساتھ اسے باورچی خانے میں برتنوں کے کھنکھنے کی آواز سنائی دی۔ بے بے وضو کے لیے پانی گرم کر رہی ہوں گی۔ گل لالہ اٹھ کے باہر آگئی۔ بے بے نے پانی گرم کرنے کے لیے رکھا تھا اور خود وہیں بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ گل لالہ کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

"لالی تم اتنی سویرے خیر تو ہے طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔" وہ متفکر ہونے لگیں۔ لالہ ان کے قریب ہی پیڑھا کھینچ کے بیٹھ گئی۔

"نیند نہیں آرہی تھی کافی دیر سے آپ کے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔" وہ نحیف آواز میں بولی۔ بے بے نے اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا جو کافی گرم لگ رہی تھی۔

"تمہیں تو بخار ہے۔" وہ فکر مند ہو گئیں۔

"اسی لیے تمہیں کل منع کر رہی تھی پانی میں ہاتھ مت ڈالو اب لگ گئی نا ٹھنڈ۔" وہ اسے ڈانٹنے لگیں۔

"رات کھڑکی کھلی رہ گئی تھی پوری رات کانپتے گزری ہے۔" اس کی بات سن کے بے بے مزید پریشان نظر آنے لگیں۔

"آج تو شاہ میر بھی واپس جارہا ہے اگر تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو میں کیا کروں گی۔ تم ایسا کرو شاہ میر اٹھے تو پہلے ڈاکٹر کے پاس سے ہو آؤ۔ پھر بھلے وہ شہر چلا جائے۔" گل لالہ ان کی دوسری بات نہ سن سکی وہ تو شاہ میر کے جانے کا سن کے ہی اداس ہوگئی۔

"شاہ میر واپس جارہے ہیں۔" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں... کہہ رہا تھا چھٹی ختم ہوگئی ہے۔ اب ایک مہینے بعد ہی واپس آئے گا۔" اپنی بات ختم کرکے وہ اس سے پوچھنے لگیں۔

"تم چائے پیو گی..." لالہ کہیں اور گم تھی وہ سن نہ سکی۔

"شاہ میر ایک مہینے کے لیے واپس جارہا ہے۔ میں یہاں اکیلی کیسے رہوں گی۔ ایسا نہیں ہوسکتا میں بھی اس کے ساتھ اسلام آباد چلی جاؤں لیکن بابا کبھی نہیں مانیں گے۔" اسے یوں سوچوں میں گم دیکھ کر بے بے پھر پوچھنے لگیں۔

"تمہارے لیے چائے بناؤں۔" بے بے نے اپنی بات دہرائی۔

"آں..." وہ چونک پڑی۔ "نہیں میں سونا چاہتی ہوں... سر میں بہت درد ہے۔ شاہ میر اٹھ جائیں تو مجھے بھی جگا دیجیے گا۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے۔" وہ اپنے کمرے میں چلی آئی تکیے پر سر رکھتے ہی اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆ ☆ ☆

شاہ میر اسے ڈاکٹر کو دکھا آیا تھا۔ اسے ٹھنڈ لگ گئی

تھی ڈاکٹر نے چند دوائیں لکھ کے دی تھیں۔ شاہ میر میڈیکل اسٹور سے دوائیں لینے گیا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھی انتظار کرنے لگی۔ بات کہاں سے شروع کرے وہ الفاظ ترتیب دینے لگی۔ شاہ میر واپس آگیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے دوائیوں کا شاپر اس نے ہینڈ بریک کے قریب رکھ دیا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

"شاہ میر مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" وہ ہمت جمع کرکے بولی۔

"ہاں کہو۔" شاہ میر نرم لہجے میں پوچھنے لگا۔ لالہ کو مزید بات کرنے کی ہمت ہوئی۔

"آپ آج اسلام آباد جارہے ہیں۔"

"ہاں۔ تمہیں کچھ منگوانا ہو تو بتاؤ۔" وہ آپ' آپ کے تکلف سے آزاد ہوچکا تھا ویسے بھی گل لالہ عمر میں اس سے چار پانچ سال چھوٹی تھی۔

"میں بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔" وہ جلدی سے بولی۔ شاہ میر نے رک کر اسے دیکھا۔ وہ ہی ڈھاک کے تین پات۔ اس لڑکی میں عقل نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔

"آپ فی الحال کہیں نہیں جاسکتیں۔ ہاں اگر سر نے اجازت دے دی تو میں خود آپ کو واپس لے جاؤں گا۔" وہ سابقہ روکھے انداز میں بولا۔

"آپ میری پاپا سے بات کروائیں میں انہیں منالوں گی۔" وہ بے تابی سے بولی۔

"اس بار آیا تو ضرور بات کرواؤں گا ابھی نہیں۔"

گھر آچکا تھا شاہ میر نے گاڑی روک دی۔

گل لالہ کے دل میں ایک بار پھر شاہ میر کے لیے کدورت بھرنے لگی۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی اور تب تک نہ نکلی جب تک شاہ میر روانہ نہ ہوگیا۔

☆ ☆ ☆

شاہ میر کے جانے سے گھر میں جیسے سناٹا سا چھا گیا تھا۔ بے بے چپ چاپ اپنے کام میں مصروف رہتیں۔ ضرورت کے علاوہ وہ کم ہی بولتی تھیں۔ گل لالہ ادھر سے ادھر بولائی بولائی پھرنے لگی۔ لوگ سردی کی وجہ سے گھروں میں دبک کے بیٹھ گئے تھے راستے زیادہ تر سنسان پڑے رہتے وہ باہر چلی آئی۔ وہ بہت حد تک اس قصبے کے رستوں سے واقف ہوچکی تھی۔ باہر بھی وہ ہی سناٹا چھایا تھا۔ درخت پتنا ڈنڈیل بوٹے سب سر نیہوڑائے خاموش کھڑے تھے۔ جیسے کسی کے انتظار میں کھڑے ہوں۔ اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ اس نے ایک برف سے اٹی ٹہنی کو جھنجوڑ ڈالا برف جھڑ گئی اندر سے ایک مرجھائی ہوئی ٹہنی برآمد ہوئی اس میں وہ پہلی سی شگفتگی باقی نہیں رہی تھی۔ گل لالہ مایوس ہوگئی۔ بے بے کے مکان کے ساتھ ہی مکئی کی فصل تھی لیکن اب سوائے برف کے وہاں کچھ نہیں تھا۔ برف کی موٹی تہ میں اس کے پاؤں بار بار دھنس رہے تھے۔

اپنے باڑے میں مویشیوں کو چارہ ڈالتے فضل چاچا نے مڑ کر اسے دیکھا پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ وہ پہاڑی کی طرف جارہی تھی۔ اچانک اس کی نظر ایک ننھے سے ہرن کے بچے پر پڑی۔ جو اپنی ماں کو ڈھونڈھتا ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا۔ گل لالہ نے ہرن پہلی مرتبہ دیکھا تھا اسے وہ ننھا منا ہرن کا بچہ بہت اچھا لگا وہ اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھی۔ ننھا ہرن قلانچیں بھرتا ہوا پہاڑی کی جانب بڑھا گل لالہ اس کے تعاقب میں کافی آگے نکل آئی تھی۔ ہرن نے پہاڑی پہ چڑھنا شروع کردیا۔ گل لالہ نے بھی پہاڑی پر قدم رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

"بسم اللہ... ماں صدقے... میرا بچہ آگیا۔" بے بے شاہ میر کو یوں اچانک سامنے دیکھا تو نہال ہوگئیں۔

"سلام بے بے۔" شاہ میر نے جھک کر ان کے پاؤں چھوئے۔

"وعلیکم السلام... جیتا رہ... آج اچانک کیسے آگئے۔ فون پر اطلاع ہی دے دیتے فضل بھائی کو میں تمہاری پسند کا کھانا بنا لیتی۔" بے بے نے شاہ میر کے سر پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"آفس کی گاڑی آرہی تھی ادھر تو میں نے سوچا چکر لگا آؤں۔ گل لالہ کہاں ہے نظر نہیں آرہی۔ میں یہ کچھ سامان لایا تھا اس کے لیے۔" وہ ہاتھ میں پکڑے شاپرز تخت پہ رکھتے ہوئے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"ابھی تو یہیں تھی شاید ملالی اور شندانہ کے ساتھ کہیں گئی ہو۔ ان دونوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے روز اس بہانے دل لگا رہتا ہے اس کا۔ تم بیٹھو میں تمہارے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔" وہ کچن کی طرف مڑیں۔

"نہیں بے بے ابھی نہیں میں رات کو ہی کھانا کھاؤں گا۔ آپ بیٹھیں میں ذرا گل لالہ کو دیکھ کے آتا ہوں۔" وہ سیدھا احمد بھائی کے گھر کی طرف آیا۔ شندانہ ان کی بیٹی تھی۔ احمد بھائی بہت تپاک سے ملے۔

"شندانہ تو گھر پہ ہے کھانا بنا رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں اس سے۔" وہ شندانہ کو آوازیں دینے لگے۔ جلد ہی وہ باہر آگئی۔

"شندانہ گلالہ تمہارے ساتھ تھی۔" وہ پریشانی سے پوچھنے لگا۔

"نہیں لا آج تو ہم کہیں نہیں گئے۔ گل باجی تو اپنے گھر پر ہی تھیں۔ ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہیں جانے کو تو میں اور ملالی واپس آگئے۔" شندانہ کے جواب پر وہ الجھ گیا۔

"لیکن بے بے تو کہہ رہی تھیں وہ تم دونوں کے ساتھ گئی تھی۔"

"لالا (بھائی) بے بے اس وقت سوئی ہوئی تھیں جب ہم واپس آئے تھے۔ گل باجی گھر پر ہی تھیں۔"

شاہ میر وہاں سے سیدھا ملالی کے گھر گیا تھا لیکن وہاں سے بھی یہی جواب ملا۔ اب اس کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔

"کیا ہوا کچھ پتا چلا اس کا۔" گھر آتے ہی بے بے نے پہلا سوال یہی کیا۔ شاہ میر نے نفی میں گردن ہلائی۔

"بے بے آپ کو پتا تھا لالہ کو یہاں کے راستوں کا زیادہ علم نہیں ہے پھر کیوں اکیلے جانے دیا۔" وہ شدید غصے میں تھا۔ لالہ کو بغیر بتائے نہیں جانا چاہیے تھا۔ اگر اسے کوئی حادثہ پیش آگیا تو... اسے وسوسے ستانے لگے۔ شاہ میر کمرے میں آکر الماری سے پستول نکالنے لگا۔ بے بے اس کے پیچھے ہی چلی آئیں۔

"روز آتی جاتی تھی' اب میں اسے باندھ کے تو نہیں بٹھا سکتی۔ مجھے کیا پتا تھا وہ احمد کے گھر کی بجائے کہیں اور چلی جائے گی۔" بے بے کو شاہ میر کا اس طرح انہیں موردالزام ٹھہرانا قطعی اچھا نہیں لگا تھا۔

"پتا کرنا چاہیے تھا بے بے۔ میں یہاں اسے آپ کی ذمہ داری پہ چھوڑ کے گیا تھا۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو میں یوسف چاچا کو کیا جواب دوں گا۔" اسے ٹارچ مل گئی تھی وہ اب شال لپیٹ رہا تھا۔

خدا خیر کرے گا گھبراؤ نہیں یہیں کہیں ہوگی۔ تم نے پچھلی طرف دیکھا ہے۔ جہاں فضل بھائی کی بکریاں کھڑی ہیں۔ اسے بکری کے بچے بہت اچھے لگتے ہیں شاید وہ ہی دیکھنے چلی گئی ہو۔" شاہ میر تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

درختوں کی گھنی چھاؤں کی وجہ سے پہاڑی پر اندھیرا جلدی پھیل گیا تھا۔ ہرن کا بچہ بھاگتا ہوا دور نکل گیا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے لالہ کو واپس کا صحیح راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے اب اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہورہا تھا۔ شام کے گہرے سائے پھیل رہے تھے۔ اور وہ ایک سنسان پہاڑ پر اکیلی کھڑی تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کرپارہی تھی۔ کیا کرے تب ہی اسے اپنے نام کی بازگشت سنائی دی۔ اس لگا جیسے وہ شاہ میر کی آواز ہو۔ وہ تھوڑی دیر دم سادھے اس آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگی جب کافی دیر تک کوئی آواز نہیں آئی تو وہ اپنا وہم سمجھنے لگی۔

شام ہوتے ہی وہاں جنگلی جانور نکل آتے تھے۔ وہ سخت خوف زدہ تھی۔ وہ ڈرتے ڈرتے نیچے اترنے لگی۔ بہت احتیاط کرنے کے باوجود دو مرتبہ وہ گرتے گرتے بچی تھی۔ اس نے سہارے کے لیے ایک درخت کے

تنے کو تھا تب ہی اسے اپنے پیچھے کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ پیچھے مڑ کر دیکھتی اس نے بھاگنے کی کوشش کی اسی کوشش میں اس کا پاؤں پھسلا تھا۔ خوف سے اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ لڑکھڑاتی تیزی سے نیچے کی طرف پھسلتی جارہی تھی۔ گرنے سے پہلے اس نے آخری بار پھر اپنے نام کی بازگشت سنی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ سیدھا فضل چاچا کے گھر کی طرف آیا تھا اس کی بیوی مکان کے سامنے بنے مویشیوں کے چھپر میں بیٹھی حقہ پی رہی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے لکڑیوں کا الاؤ جلا رکھا تھا۔

"سلام ماسی... آپ نے گل لالہ کو تو کہیں نہیں دیکھا۔" وہ عجلت میں تھا۔

"وعلیکم السلام... گل لالہ تو اس طرف گئی تھی۔" ماسی حلیمہ نے پہاڑی کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا۔

"لیکن وہ تو کافی سویرے کی بات ہے۔ کیا وہ اب تک واپس نہیں آئی۔" شاہ میر کے بدترین خدشوں کی تصدیق ہو چکی تھی۔ اس کی چھٹی حس پہلے ہی کہہ رہی تھی وہ پہاڑی کی طرف گئی ہوگی۔ اس نے بہت پہلے لالہ کو کہتے سنا تھا۔

"مجھے پہاڑ بہت اچھے لگتے ہیں دل چاہتا ہے ان پر چڑھتی چلی جاؤں۔" شاہ میر تیزی سے اس طرف بھاگا تھا۔ وہ گل لالہ کو آوازیں دیتا جارہا تھا۔ اندھیرے میں اس کی آواز کی بازگشت پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آگئی۔ اس پہاڑی کی جانب سے کسی کی آواز سنائی دی تھی۔

شاہ میر نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو اسے دو آنکھیں چمکتی دکھائی دیں یہ تیندوے کی آنکھیں تھیں شاہ میر نے ہوائی فائر کیا۔ تیندوا فائر کی آواز سن کر بھاگ گیا تھا۔ شاہ میر نے ٹارچ سے اس کے بھاگ جانے کی تصدیق کرنا چاہی تب ہی اسے ایک درخت کے تنے کے ساتھ سرخ رنگ کی ایک شال نظر آئی۔

شاہ میر نے وہ شال پہچان لی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یا اللہ اسے کچھ نہ ہوا ہو۔ وہ زندہ ہو اور اسے خراش تک نہ آئی ہو۔ وہ بے تابی سے دعا میں کرتا اس طرف بھاگنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"تم گئی کس کی اجازت سے تھیں وہاں۔" شاہ میر دھاڑا گل لالہ نے گھبرا کر بے بے کو دیکھا۔

"شاہ میر اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا آئندہ ایسے نہیں جائے گی۔" بے بے نے مفاہمتی انداز میں بات ختم کرنی چاہی گل لالہ خود ہی بہت گھبرائی ہوئی تھی اس واقعے کے بعد۔

"بے بے آپ بیچ میں مت بولیں۔" شاہ میر نے ان کو مزید کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہے آج اگر میں وقت پر نہ پہنچ پاتا تو کیا ہو سکتا تھا تمہارے ساتھ۔" شاہ میر نے لالہ کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر پوچھا۔ وہ اور سہم گئی۔

"یہاں پر تم میری ذمہ داری ہو اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو کیا جواب دیتا میں سر یوسف کو۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔

اوہ تو اسے صرف اپنی ذمہ داری کی فکر ہے۔ میری نہیں۔ دل خوش فہم جو تھوڑی دیر پہلے اس کی پریشانی دیکھ کے خوش ہوا تھا۔ اس کی خوش فہمی جاتی رہی۔

"لالہ میں تم سے بات کر رہا ہوں۔" وہ تم پر زور دے کر بولا لالہ کی خاموشی اس کے غصے کو بڑھا رہی تھی۔

"میں تو بس چہل قدمی کے لیے نکلی تھی یہاں اکیلی بور ہو رہی تھی پھر..." شاہ میر نے اس کی بات بیچ میں کاٹ دی۔

"اوہ تو پھر بوریت اتری کچھ آپ کی... ورنہ ایک وزٹ اور کرلیں۔" شاہ میر کے لہجے میں طنز کی واضح کاٹ تھی۔ ہتک سے گل لالہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پاؤں پھسلنے کے بعد اسے صرف اتنا یاد تھا۔ وہ کسی سخت چیز سے ٹکرائی تھی اور پھر ایک فائر کی آواز سنی تھی اس سے آگے اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ شاہ میر کب اور کیسے وہاں پہنچا اور کیسے اسے گھر تک اٹھا کر لایا تھا یہ سب اسے شاہ میر کی زبانی معلوم ہوا تھا وہ سخت شرمندہ بھی تھی اپنی حرکت پہ اور خوف زدہ بھی آج اگر شاہ میر اتفاقیہ شہر سے نہ آتا تو وہ کسی جنگلی درندے کی خوراک بن چکی ہوتی۔ گل لالہ نے خوف سے جھرجھری لی۔

اس کی دائیں ٹانگ میں درد کی شدید لہر اٹھ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے ابتدائی طبی امداد تو دے دی تھی۔ لیکن چیک اپ کروانا باقی تھا۔ شاہ میر کو اس کی وجہ سے مزید رکنا پڑ گیا تھا۔ اسے چھٹی نہیں مل رہی تھی وہ سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ یہ ساری جھنجلاہٹ اس نے گل لالہ پہ نکالی تھی جو چپ چاپ سن رہی تھی۔

"بے بے آپ سوپ لے آئیں اس کے لیے۔ دوائی کا ٹائم ہو گیا ہے پہلے کچھ کھا لے پھر دوائی دیتا ہوں۔" وہ پہلے سے کچھ دھیمے لہجے میں بے بے سے مخاطب ہوا بے بے سوپ لینے چلی گئیں۔

شاہ میر نے ایک نظر گل لالہ کے مرجھائے چہرے پہ ڈال کر ٹھنڈی سانس بھری۔ لالہ کے دور جانے کے احساس نے اسے اندر تک ہلا کے رکھ دیا تھا۔ اسے احساس ہوا وہ لالہ کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو چکا تھا۔ اسے بالآخر اپنے دل کے آگے ہار ماننی پڑی تھی۔ وہ بیڈ کی پائنتی کی طرف لالہ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ لالہ نے ڈر کے مارے آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

گل لالہ اپنے بستر پہ نیم دراز چائے پی رہی تھی۔ بے بے ابھی ابھی وہاں سے گئی تھیں۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجائیں..." لالہ کو یقین تھا یہ شاہ میر ہی ہوگا۔ وہ شاہ میر کے دستک دینے کے مخصوص اسٹائل کو پہچانتی تھی۔ وہ سنبھل کے بیٹھ گئی۔ شاہ میر اندر داخل ہوا اس کے ہاتھوں میں کچھ شاپرز تھے۔

"یہ میں کچھ چیزیں لایا تھا تمہارے لیے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ تو دیکھ لینا۔ اگر کچھ پسند نہ آئے تو میں چینج کروا دوں گا۔" شاہ میر نے اس کے قریب شاپرز رکھ دیے۔

"اس کی کیا ضرورت تھی۔" وہ شرمندہ ہو گئی۔

"گرم کپڑے ہیں تمہیں ضرورت پڑے گی۔ میری طرف سے گفٹ سمجھ لو۔" وہ پہلی بار مسکرایا تھا گل لالہ اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹا نہیں پائی۔

"میں اسلام آباد واپس جا رہا ہوں۔ پندرہ دن بعد واپسی ہوگی۔" شاہ میر نے اطلاع دی گل لالہ کی آنکھوں میں مایوسی در آئی۔

"آپ نے کہا تھا اس بار آئیں گے تو مجھے اسلام آباد لے کر جائیں گے۔ میں واپس گھر جانا چاہتی ہوں۔ یہاں میرا دل نہیں لگ رہا۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"میں نے یوسف صاحب سے بات کی تھی اس بارے میں انہوں نے منع کر دیا ہے۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"کیا... اسے جھٹکا لگا... آپ میری بات کروائیں ان سے۔ میں منالوں گی۔" وہ بے تابی سے بولی۔

"اس وقت تو میں جلدی میں ہوں فرسٹ کو آؤں گا تو بات کروا دوں گا۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے عجلت میں بولا باہر اس کی آفس کی گاڑی انتظار کر رہی تھی۔

"آپ میرے لیے ایک سم لے آئیں میرا نمبر یہاں کام نہیں کر رہا۔" وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"اوکے..." وہ سر ہلانے لگا۔ "اللہ حافظ۔" شاہ میر باہر نکل گیا۔ اللہ حافظ... لالہ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

☼ ☼ ☼

"لالی ایک بات پوچھوں..." وہ اس وقت بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر فارغ ہوئی تھی۔ اور وہیں چارپائی پر ترچھی لیٹ کر پہاڑوں پہ گری برف کو بے دھیانی میں دیکھے جارہی تھی اس کی سوچ گزشتہ حالات اور واقعات کے گرد گھوم رہی تھی۔ ایسے میں بے بے کی آواز پر وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔

"جی پوچھیں..." اس نے ایک طرف کھسک کر بے بے کے لیے جگہ بنائی۔

”تمہاری امی کب فوت ہوئی تھیں اور انہیں کیا ہوا تھا۔“ بے بے کا سوال اس کے لیے خاصا غیر متوقع تھا۔ بھلا بے بے کو اس کی ماں میں کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔

”ان کی ڈیتھ ایک کار ایکسیڈنٹ میں ہوئی تھی۔ میں اس وقت اے لیولز میں تھی۔ آپ کو آج اچانک میری امی کیسے یاد آگئیں۔“ وہ خود کو پوچھنے سے نا روک پائی۔

”بس ایسے ہی ایک خیال آگیا تھا۔“ بے بے بات صاف ٹال گئیں۔

”اور تمہارے ننھیال والے تم ملتی تو ہوگی ان سے۔“ ایک اور غیر متوقع سوال۔ گل لالہ ایک لمحے کو خاموش ہوگئی۔ اپنی فیملی کے بارے میں بتانے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

”میرے ماں باپ نے پسند سے شادی کی تھی۔ دونوں کے گھر والے ان سے ناراض تھے۔ میں اپنے ننھیال یا ددھیال والوں میں سے کسی سے نہیں ملی۔ امی کی وفات کے بعد میں اور بابا اکیلے رہ گئے۔ بس ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا ہیں۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔

”تمہارے بابا نے کبھی ذکر تو کیا ہوگا اپنے گھر والوں کا...“ بے بے نجانے اس کے چہرے پہ کیا تلاش کرنے لگیں۔

”امی یاد کرتی تھیں اپنی فیملی کو ان کے پاس ان کی فیملی کی تصویریں بھی تھیں۔ ایک مرتبہ انہیں روتا دیکھ کر بابا نے وہ تصویریں اپنے پاس رکھ لیں وہ امی کو کہنے لگے۔ تم اس طرح پچھتاووں میں گھری رہیں تو بیمار پڑ جاؤ گی۔ ہم نے جو کیا اچھا کیا۔“ وہ خاموش ہوئی۔ بے بے کی ابھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

”اور تمہارے بابا انہوں نے کبھی اپنے ماں باپ کو یاد نہیں کیا۔“ وہ ایک آس دل میں چھپائے پوچھنے لگیں۔

”شاید تنہائی میں یاد کیا ہو ہمارے سامنے کبھی ذکر نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے انہوں نے جو فیصلہ کیا ٹھیک کیا اگر وہ امی سے شادی نا کرتے تو کبھی خوش نہ رہ پاتے۔“ بے بے کے چہرے پہ ایک سایہ آکر گزر گیا۔

☼ ☼ ☼

اس بار شاہ میر آیا تو اس کے لیے ایک نئی سم خرید لایا تھا۔ سم کارڈ دیکھ کر گل لالہ خوشی سے کھل اٹھی۔ باپ سے بات کرنے کو وہ کب سے بے تاب ہو رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی یہ سب ایک پلاننگ کا حصہ تھا یوسف ملک جان بوجھ کر اسے خود سے دور رکھ رہے تھے وہ چاہتے تھے وہ ان لوگوں کے ساتھ گھل مل جائے تو وہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر اسے شاہ میر کے ساتھ اس کے نکاح کے بارے میں بتادیں۔ وہ اب بوڑھے ہو رہے تھے اور اس کی شادی کے بارے میں فکر مند تھے۔

گل لالہ سے انہوں نے بہت سی باتیں چھپائی تھیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے وہ پریشان ہو۔ نیلم کے خاندان والوں نے کبھی ان کی شادی کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں ان سے چھپتے پھر رہے تھے۔ گل لالہ ابھی چار سال کی تھی جب انہیں دھمکی آمیز فون ملنے لگے جس میں ان دونوں کے قتل اور لالہ کے اغوا کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔ تب ہی انہوں نے ایک بہت بڑا قدم اٹھایا تھا انہوں نے محض چار سال کی بیٹی کا نکاح اپنے بھتیجے سے کردیا تھا تاکہ ان کی موت کی صورت میں بھی وہ گل لالہ کا کہیں اور نکاح نا کرسکیں۔ گل لالہ نے باپ کا نمبر ملایا۔

”ہیلو بابا... اس کی آواز بھیگ گئی۔ پورے دو مہینے بعد وہ بابا سے بات کر رہی تھی۔ دوسری طرف یوسف ملک کا حال بھی مختلف نہیں تھا۔ وہ پہلی بار اکلوتی بیٹی سے اتنا ٹائم دور رہے تھے وہ بھی بغیر کسی رابطے کے۔ شاہ میر اٹھ کر اندر چلا گیا۔

”جی میں ٹھیک ہوں... آپ کے آنے کا انتظار کر رہی ہوں، نہیں دل نہیں لگ رہا آپ کے بغیر... سب لوگ اچھے ہیں شاہ میر بھی... وہ یہاں نہیں ہوتے بس میں اور بے بے۔ بہت خیال رکھتے ہیں...

وہ یوسف ملک کے پوچھے گئے سوالوں کے مختصر جواب دیتی رہی۔ وہ باپ سے اپنی اور ان کی باتیں کرنا چاہ رہی تھی لیکن بابا کا ہر دوسرا سوال شاہ میر اور بے بے کے حوالے سے تھا۔ وہ اکتانے لگی۔

”بابا میں گھر کو بہت مس کر رہی ہوں... آپ شاہ میر کو کہیں نا وہ مجھے اسلام آباد لے جائے کچھ دنوں کے لیے میں پرامس کرتی ہوں واپس آجاؤں گی... نہیں چھ مہینے بہت زیادہ ہیں میں اتنا انتظار نہیں کرسکتی... ہیلو... ہیلو...“ فون منقطع ہوچکا تھا۔ لالہ مایوس ہو کر فون کو دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

آج احمد بھائی کی بڑی بیٹی پلوشہ کی شادی تھی۔ بابا کے چند فیملی فرینڈز کے علاوہ وہ کبھی کسی شادی میں نہیں گئی تھی۔ ان کے سرکل میں تقریباً سب ہی شادیاں میرج ہال میں ہوتی تھیں۔ ایک ہی اسٹائل کی شادیاں بھگتا بھگتا کر وہ اکتانے لگی تھی آج پہلی بار وہ کسی ایسی شادی میں شرکت کرنے جارہی تھی جو گھر میں منعقد کی گئی تھی۔ گل لالہ دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔ گہرے سبز رنگ کی فراک اور پاجامہ۔ جس کے گلے اور دوپٹے پر سلور کلر کا بھاری کام کیا ہوا تھا۔ اس کی دودھیا سفید رنگت پہ بہت کھل رہا تھا۔ لمبے سنہرے بال ہاف پن اپ کرکے کھلے چھوڑ دیے تھے اس نے۔ کڑھائی سے ہم رنگ سلور جیولری سیٹ میں گہرے سبز رنگ کے پتھر جڑے تھے۔ لائٹ پنک میک اپ اور گہرا کاجل۔ وہ سراپا قیامت بنی ہوئی تھی۔

شاہ میر نے اپنا پسندیدہ پرفیوم خود پر چھڑکا اور آخری نظر اپنے سراپے پہ ڈال کر باہر نکل آیا۔ برآمدے میں کھڑی گل لالہ پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک کر رکا۔ وہ گل لالہ سے نظر نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ بے بے اندر سے شال لپیٹتی باہر آئیں۔ گل لالہ کو بغیر کسی گرم کپڑے کے دیکھ کر وہ حیران ہوئیں۔

”تم کیا ایسے چلو گی۔ رات کا ٹائم ہے بلا کی سردی پڑے گی۔ جاؤ جاکر کوئی گرم کپڑا پہن کر آؤ۔“ گل لالہ کو اپنی حماقت کا احساس ہوا بے بے اور شاہ میر دونوں نے اپنی گرم شالیں لپیٹ رکھی تھیں۔

”اچھا میں لے کر آتی ہوں۔“ وہ کمرے کی طرف بھاگی۔ اس کے لمبے بال کمر تک بکھرے ہوئے تھے۔ شاہ میر کی نظروں نے دیر تک اس کا تعاقب کیا۔

”چلیں...“ وہ شال اپنے گرد پھیلائے باہر آئی۔ شاہ میر کا دل شادی سے اچاٹ ہوچکا تھا۔

”دوپٹا ٹھیک سے سر پر لو۔“ شاہ میر نے ڈپٹ کر کہا۔ گل لالہ نے چپ چاپ حکم کی تعمیل کی۔ احمد بھائی کے گھر میں صحن میں ہی مردوں کو بٹھانے کا اہتمام تھا۔ صحن کے وسط میں بڑا سا الاؤ دہکایا گیا تھا۔ جس کے چاروں طرف مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ قہوے اور کشمیری چائے کا دور چل رہا تھا۔ خواتین اندر کمروں میں بیٹھی ہوئی تھیں نکاح دن کو ہوچکا تھا اب دعوت کے بعد رخصتی تھی۔

چائے پی کر چند نوجوان روایتی کشمیری رقص کرنے اٹھے۔ کچھ لڑکے باہر خوشی میں فائرنگ کر رہے تھے۔ گل لالہ کے لیے یہ سب نیا تھا وہ بھرپور انجوائے کر رہی تھی۔ شاہ میر نے باقی لڑکوں کے ساتھ مل کر رقص کیا تو گل لالہ نے اس کی تصویر کھینچ لی۔ بے بے کا چہرہ ایک لمحے کو سپاٹ ہوگیا۔

رات دیر گئے وہ لوگ گھر لوٹے تھے۔ راستہ زیادہ نہیں تھا پھر بھی وہ ٹھٹھرنے لگی تھی۔ شاہ میر نے چولہا جلایا وہ ہاتھ سینکنے لگی۔ بے بے کمرے میں جاچکی تھیں۔

شاہ میر کی نظریں گل لالہ کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔ لالہ نے اس کی یہ حرکت نوٹ کی تھی وہ اچانک گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہوا...“ وہ بوکھلا گیا۔

”میں سونے جارہی ہوں۔“ لالہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکی اور دروازہ بند کردیا۔

”لالہ بات تو سنو...“ وہ پیچھے آیا تھا۔

”مجھے نیند آرہی ہے آپ کل بات کیجیے گا“ لالہ نے ہری جھنڈی دکھادی۔

☆ ☆ ☆

بے بے تخت پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ شاہ میر دروازے سے داخل ہوا۔ پورا گھر خاموش تھا۔ وہ بے بے کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"آج بچے نہیں آئے ٹیوشن پڑھنے۔" وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی نگاہیں لالہ کو تلاش کر رہی تھیں بے بے نے کچھ پڑھ کر اس پر پھونک ماری پھر بولیں۔

"سفیر کے گھر گئی ہے بلوشہ کو تیار کرنے۔" بے بے جانتی تھیں وہ بچوں کا کیوں پوچھ رہا تھا۔ شاہ میر کو غنیمت لگا وہ جو بات کرنے والا تھا بے بے نے اس کے لیے راہ ہموار کی تھی۔

"بے بے آپ اب چاچا یوسف سے رخصتی کی بات کرلیں۔" وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولا۔

"اتنی جلدی.... تم نے تو کہا تھا یوسف ایک سال تک رخصتی نہیں کرے گا۔" وہ اچنبھے سے بولیں۔

"ہاں انہیں ڈر تھا لالہ اتنی جلدی ذہنی طور پر اس شادی کو قبول نہیں کرے گی۔"

"تو کیا اب لالی کو پتا چل گیا ہے اس نکاح کا....."

"نہیں لیکن اگر پتا چل بھی گیا تو وہ زیادہ اعتراض نہیں کرے گی۔" وہ یقین سے بولا۔

"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ اعتراض نہیں کرنے گی۔" وہ کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔

"چاچا خود بات کریں گے تو وہ انکار نہیں کرے گی۔ اور ویسے بھی اس کے انکار یا اقرار سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بیوی تو وہ دونوں صورتوں میں میری رہے گی۔ جلد یا دیر اسے اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ بے بے کی نگاہیں کسی غیر مرئی نکتے پر مرکوز تھیں۔

ہوں.... انہوں نے ہنکارا بھرا.... اور جلدی جلدی تسبیح کے دانے گرانے لگیں۔

☆ ☆ ☆

باقر نے اس عورت سے چار ہزار اور ایک کاغذ کا پکڑ لیا۔ آج کے دن اسے یہ کاغذ اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچا کر کچھ دنوں کے لیے ادھر ادھر ہو جانا تھا۔ اس سے زیادہ اسے پتا نہیں تھا۔

وہ پچھلے کئی سالوں سے ایسے خفیہ پیغام لوگوں کو پہنچانے کا کام کرتا تھا۔ وہ لوگوں کی امانتیں، پیسے، پیغام بہت رازداری سے مطلوبہ جگہ پہنچاتا تھا یہی وجہ تھی کہ لوگ اب اس پر اعتماد کرنے لگے تھے۔ بدلے میں وہ اپنی منہ مانگی رقم فیس کے طور پر لے لیتا تھا۔

باقر نے دونوں چیزیں لے کر سائیکل کے پیڈل پہ پاؤں رکھا اور یہ جا وہ جا ہو گیا۔ اس کا رخ وادی نیل کی طرف تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں کب سے یہاں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ آج انہیں دوسرا دن تھا۔ کل کا سارا دن بھی وہ اس جگہ بیٹھے انتظار کرتے رہے تھے۔ لیکن وہ نہیں آئی تھی۔ آج پھر انہیں ناکام ہو کر واپس جانا پڑ رہا تھا۔

"اصغر کوئی اور طریقہ سوچو اس طرح ہم کتنے دن بیٹھیں گے۔ اس طرح تو ہم کسی کی بھی نظر میں آسکتے ہیں۔" طارق نے چاروں طرف پھیلتے اندھیرے کو دیکھ کر مایوسی سے کہا۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو ہمارا روز ادھر آنا خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی اور حل بھی تو نہیں ہمارے پاس۔ اگر ہم نے اس کے بارے میں کسی سے بات چیت کی یا پوچھ گچھ کی تو وہ سیدھا ہمارے سروں پہ آکھڑا ہوگا۔ اس کی طاقت کا تمہیں اندازہ نہیں۔ وہ چپ کر کے نہیں بیٹھے گا۔ ہم اس کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے بہتر ہو گا اس سارے معاملے کو خفیہ رکھا جائے۔" طارق کو اس کی بات سے متفق ہونا پڑا۔

"چلو پھر گھر چلتے ہیں کل دوبارہ آئیں گے۔" طارق اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت ایک لڑکی دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اس نے سرخ رنگ کی چادر پہنی ہوئی تھی۔ اس کا رخ ساتھ والے گھر کی طرف تھا۔

"ذرا رکو.... کام بن گیا۔" اصغر نے سرگوشی کی۔

☆ ☆ ☆

شاہ میر غصے اور پریشانی میں ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہا تھا۔ گل لالہ شام سے لاپتا تھی۔ وہ شندانہ کے گھر کا کہہ کر گئی تھی۔ لیکن وہاں نہیں گئی تھی۔

"منع بھی کیا تھا میں نے اسے بغیر بتائے کہیں جانے سے۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات آئی ہی نہیں۔ حد ہوتی ہے ہٹ دھرمی کی بھی۔ اپنی اسی ہٹ دھرمی کی وجہ سے وہ پہلے بھی ایک بار موت کے منہ سے بچی ہے۔ کچھ دن سکون سے کاٹ کر اب پھر وہی حرکت کی ہے اس نے۔ پورے گاؤں کا چپہ چپہ چھان مارا ہے پتا نہیں اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ ایک بار وہ مل جائے چھوڑوں گا نہیں اس بار۔" وہ غصے سے جو منہ میں آیا بولتا چلا گیا۔ بے بے اب تک خاموش بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

"یوسف چاچا کو کیا جواب دوں گا میں ایک لڑکی کو نہیں سنبھال سکا میں۔" وہ بڑبڑایا۔

"سنبھلنے والی ہوتی تو تمہارے گلے کیوں ڈالتے۔ اچانک بلایا اور بغیر رخصتی کے لڑکی تھما کر چل دیے۔ کچھ تو گڑبڑ تھی نا۔ ورنہ ایسے کوئی لاڈوں پلی بچی کو اتنی دور کیسے بھیج سکتا ہے۔" بے بے نے زہر اگلا۔ شاہ میر نے چونک کر بے بے کو دیکھا ان کی تیوری پر بل پڑے ہوئے تھے۔ بے بے جیسی عورت اتنی بڑی بات کیسے کہہ سکتی ہیں کسی کے لیے۔

"مجھے تو پہلے دن سے ہی شک تھا۔ اس کی حرکتیں کافی عجیب تھیں شاید کسی لڑکے کا چکر تھا۔ جب ہی تو یوسف نے اتنی عجلت کی۔ جیسی ماں ویسی بیٹی۔" بے بے نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ کی۔ اسے لگا بے بے نے گرم سیسہ اس کے کانوں میں انڈیلا ہو۔

"بس کردیں بے بے.... بس کردیں۔" وہ دونوں مٹھیوں سے بال بھینچ کر چیخ پڑا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا آپ لالہ کے بارے میں اتنی گری ہوئی بات کرسکتی ہیں۔" وہ بہت دکھ سے بولا۔

"سچ سے آنکھیں چرانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے جو دیکھا ہے وہ ہی بتا رہی ہوں۔" وہ اپنی بات پہ ڈٹی رہیں۔

"لالا ایسی لڑکی نہیں ہے۔" وہ کرب سے بولا۔

"تم کب سے جانتے ہو اسے جو اتنے وثوق سے کہہ رہے ہو۔" وہ تلملا اٹھیں۔

"جاننے کے لیے وقت کی نہیں آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اندھا نہیں ہوں میں وہ لڑکی کتنی ہی ضدی اور ہٹ دھرم کیوں نا ہو' بدکردار نہیں ہوسکتی۔"

"اور اس کی ماں کو بھول گئے۔ کیسے اس نے اپنی ماں اور باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بھاگ کر شادی کی تھی۔"

"وہ نیلم چاچی تھیں یہ گل لالہ ہے۔ آپ کیوں بار بار ماضی کو کرید رہی ہیں۔" وہ جھنجلایا۔

"ہے تو اسی ماں کی بیٹی۔" وہ نفرت سے بولیں۔ شاہ میر کے لیے بے بے کا یہ روپ بالکل نیا تھا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے اسے کوئی حادثہ پیش آگیا ہو۔" شاہ میر نے اس کے حق میں دلیل دی۔ لالہ کے لیے اس کی حمایت بے بے کو اور سلگا رہی تھی۔

"حادثہ پیش آتا تو وہ اب تک مل چکی ہوتی۔ شندانہ کا گھر ہم سے اتنا دور نہیں کہ اس بیچ اسے حادثہ پیش آئے۔ وہ اس طرف گئی ہی نہیں تھی۔ اس نے صرف گھر سے نکلنے کے لیے بہانا تراشا تھا۔"

"اگر ایسا ہوا تو مجھے آپ کی قسم اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" شاہ میر کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ پہلی مرتبہ بے بے سٹپٹائی تھیں۔

"دفع کر اس بدذات کو۔ تمہیں اس سے اچھی لڑکیاں مل جائیں گی۔ تم کیوں پرائی مصیبت اپنے گلے میں ڈال رہے ہو۔ اسے مار کر کیا ساری جوانی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارو گے۔" وہ اب بات کو سنبھالنا چاہ رہی تھیں۔ نیلم کی خاطر وہ اپنا شوہر کھو چکی تھیں۔ اب اس کی بیٹی کے لیے اپنا اکلوتا بیٹا کھونا نہیں چاہتی

تھیں۔

"بیوی ہے وہ میری اور میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں کہ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ جاؤں۔ وہ اگر کسی پاتال میں بھی چھپی ہو تو اسے ڈھونڈھ نکالوں گا وہاں سے۔" شاہ میر باہر چلا گیا۔ بے بے زرد چہرے کے ساتھ اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"کون ہے یہ... کسے اٹھا لائے ہو....؟" بی بی جان نے اصغر اور طارق سے پوچھا جو کسی لڑکی کو اٹھا کر لا رہے تھے۔ لڑکی بے ہوش لگ رہی تھی۔ برتن دھوتی جنت کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے پلٹ کر شوہر اور دیور کو دیکھا جو کسی لڑکی کو اٹھا کر کمرے کی طرف جا رہے تھے بی بی جان ان کے پیچھے پیچھے حواس باختہ سی پوچھے جا رہی تھیں۔

"ارے میں پوچھتی ہوں کون ہے یہ نمانی' کیوں لائے ہو اسے اصغر۔ طارق میں تم سے پوچھ رہی ہوں یہ سب کیا ہے۔" بی بی جان ان کے پیچھے ہی کمرے میں چلی آئیں۔

"کچھ نہیں مورے تم جاؤ یہاں سے۔" طارق نے جھڑک کر کہا۔

"ہرگز نہیں جاؤں گی جب تک تم بتاؤ گے نہیں کہ یہ کون ہے اور اسے یہاں لانے کا تمہارا کیا مقصد ہے۔" وہ غصے سے بولیں۔ ان کے لہجے میں اتنی مضبوطی تھی کہ اصغر کو ہار ماننا پڑی۔

"نیلم پھوپھو کی بیٹی ہے یہ یوسف کے گھر سے اٹھا کے لائے ہیں۔" طارق نے فاتحانہ انداز میں بتایا۔

"یا اللہ...." بی بی جان لڑکھڑا گئیں دروازے میں کھڑی جنت نے انہیں بروقت تھام لیا۔

نیلم کی بیٹی وہ بے یقینی سے اس بے ہوش پڑی لڑکی کا چہرہ دیکھنے لگیں جو ہو بہو نیلم کی جوانی کی تصویر تھی۔ بی بی جان نے لرزتے ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما اور چومنے لگیں۔ میری بچی۔ آنکھوں سے بہتا ہوا ایک سیل رواں ان کے چہرے کی جھریوں میں جذب ہونے لگا۔

"یہ بے ہوش کیوں ہے۔ اسے ہوش میں لاؤ...." بی بی جان فکر مندی سے کہنے لگیں۔

"آ جائے گی ہوش میں کچھ دیر تک۔ آپ اس کا خیال رکھیے گا۔ اگر شور مچائے تو مجھے بلوا لیجیے گا میں ساتھ والے کمرے میں ہوں اور خبردار اگر کسی نے اسے ہمدردی میں آ کر بھگانے کی کوشش کی تو میں کسی کا لحاظ نہیں کروں گا۔" اصغر نے انگلی اٹھا کر دونوں کو تنبیہہ کی۔

بی بی جان جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگیں آج بہت دنوں بعد وہ نیلم کو یاد کر کے روئی تھیں ورنہ روایتوں نے ان کی ماتا پہ بھی تالے لگا دیے تھے۔ "گھر سے بھاگی ہوئی بیٹی کو روتے نہیں اس کی موت کی دعا کرتے ہیں۔" ان کے شوہر نے انہیں بیٹی کے لیے روتا دیکھ کر کہا تھا۔ بی بی جان نے اسی دن اپنی ماتا کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ وہ ماں تھیں بیٹی کو موت کی بددعا نہ دے سکیں' لیکن شوہر کی لاج رکھ لی۔ آج اتنے عرصے بعد وہ نیلم کی بیٹی کو سامنے دیکھ کر ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھی تھیں۔ ساری روایتیں سارے اصول ان کے آنسوؤں میں بہہ گئے تھے۔ آج وہ صرف ایک ماں تھیں جو اپنی بیٹی کے بچھڑنے پر زار و قطار رو رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

جنت بی بی نے لالہ کے منہ پہ پانی کی چھینٹے مارے وہ ہوش میں آنے لگی تھی۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے خود کو ایک انجان جگہ پر پایا وہ اٹھ بیٹھی اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔

"میں کہاں ہوں...." وہ سامنے بیٹھی ہوئی عورت سے پوچھنے لگی۔

"گھبراؤ نہیں تم محفوظ جگہ پر ہو۔ اسے بھی اپنا گھر سمجھو۔" جنت بی بی نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کون ہیں... مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہیں۔ میں تو...." وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی'

لیکن اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا اس کے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ وہ شنزانہ کے گھر جانے کے لیے نکلی تھی تب کسی نے اس کے منہ پہ رومال رکھ دیا تھا۔ وہ اغوا ہو چکی تھی' لیکن کیوں اور کس نے اسے اغوا کیا تھا۔ وہ شدید خوف زدہ تھی۔

"میں جنت ہوں' اصغر کی بیوی۔ تم نیلم پھوپھو کی بیٹی ہو نا۔" وہ تصدیق چاہنے لگی۔

"کون اصغر... اور تم میری امی کو کیسے جانتی ہو۔" لالہ سخت الجھن کا شکار تھی۔ سامنے بیٹھی عورت اس کے لیے قطعی اجنبی تھی۔

"اصغر نیلم پھوپھو کا بھتیجا ہے تم اس وقت اپنے ننھیال میں ہو۔"

"میرا ننھیال...." وہ ششدر رہ گئی۔

"لیکن مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔" وہ پریشان ہو گئی۔ خطرے کی گھنٹیاں اسے آس پاس سنائی دے رہی تھیں۔

"اپنی عزت کا بدلہ لینے کے لیے۔" جنت نے آہستہ آواز میں کہا۔ جنت کی بات سن کے لالہ ہکا بکا رہ گئی۔

"یوسف ملک نے ان کی عزت کو گھر سے بھگا کے شادی کی تھی۔ اب یہ اس کی بیٹی سے شادی کر کے حساب برابر کرنا چاہتے ہیں۔" جنت نے اپنی بات پوری کی۔

"نن نہیں... میں... مجھے واپس جانا ہے خدا کے لیے مجھے جانے دو۔" وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگی۔

"شش... آہستہ بولو میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں' لیکن کسی کو ہم پر شک نہیں ہونا چاہیے ورنہ یہ لوگ مجھے جان سے مار دیں گے۔" گل لالہ سہم کر خاموش ہو گئی۔

"تمہیں جیسا کہتی ہوں ویسا کرو فی الحال' ان لوگوں کو یہ تاثر دو کہ تم اپنے ننھیال والوں سے مل کر بہت خوش ہو انہیں شک نہیں ہونا چاہیے تم پر ورنہ یہ تمہاری زندگی عذاب بنا دیں گے۔" جنت اسے سمجھانے لگی۔

"تم مجھے کسی طرح شاہ میر کے گھر تک پہنچا دو۔" لالہ نے ملتجیانہ انداز میں درخواست کی۔

"ہونہہ... تاکہ بے بے صاف صاف اصغر کو میرا نام بتا دے اور وہ مجھے جان سے مار دے۔" جنت کے لہجے میں طنز چھپا ہوا تھا۔

"کیا مطلب... بے بے ایسا کیوں کریں گی۔" وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

"تم نہیں جانتی اس عورت کو... تمہیں یہاں تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی وہ ہی ہے۔ اسی نے باقر کے ہاتھ طارق کو چٹھی بھیجی تھی تمہیں اٹھوانے کے لیے۔ میں نے اپنے کانوں سے یہ سب سنا تھا۔" گل لالہ بے یقینی سے جنت کو دیکھنے لگی۔

"لیکن بے بے ایسا کیوں کریں گی۔" وہ اب بھی الجھی ہوئی تھی۔

"کیوں کہ وہ تمہاری ماں سے سخت نفرت کرتی ہیں۔" جنت کو حیرت ہوئی گل لالہ کو ماضی کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔

"بے بے کا میکا اسی گاؤں میں ہے وہ اکثر یہاں آتی جاتی تھیں۔ شادی کے دس بارہ سال تک اولاد نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنے دیور کو بیٹے کی طرح پالا تھا۔ یوسف شہر سے پڑھ کر واپس آیا تھا۔ بے بے کی بھانجی کی شادی میں وہ یہاں آیا تھا۔ شادی کے دوران ہی اس نے نیلم پھوپھو کو دیکھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے تھے۔ یوسف نے نیلم کے گھر رشتہ لے جانے کی ضد پکڑی تھی۔ بے بے اپنی بھتیجی کے لیے بات کر چکی تھیں۔ انہیں کسی صورت یہ رشتہ منظور نہ تھا۔ انہوں نے یوسف سے وعدہ کر لیا کہ وہ نیلم کا ہاتھ مانگنے ضرور جائیں گی۔ یہاں آ کر انہوں نے پہلے تو دبے دبے لفظوں میں بی بی جان کو نیلم اور یوسف کی پسندیدگی جتائی۔ پھر یوسف اور اپنی بھتیجی کے رشتے کا ذکر کیا آخر میں بڑی بے زاری سے رشتے کی بات کی۔ بی بی جان کو بہت غصہ آیا انہوں نے بے بے کو یہ کہہ کر منع کر دیا کہ وہ ذات برادری سے باہر رشتہ

نہیں کریں گی۔ ان کے جانے کے بعد بی بی جان نے نیلم کو بہت برا بھلا کہا وہ روتی رہی' لیکن اپنی بے گناہی ثابت نہ کرپائی۔ بی بی جان نے دن رات طعنے دے دے کر اس کی زندگی اجیرن کردی تھی۔ ادھر یوسف کو پتا چلا تو وہ تڑپ اٹھا دونوں ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

بی بی جان نے آناً "فاناً" نیلم پھوپھو کی شادی اپنے بھانجے سے طے کردی۔ شادی میں ابھی پندرہ دن تھے جب ایک رات نیلم پھوپھو یوسف کے ساتھ بھاگ گئیں۔ دونوں گھروں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ گل شیر چاچا (جنت کا سسر) نے یوسف کا بدلہ اس کے بھائی کو قتل کرکے لیا۔ یوں بے بے کی سازش خود ان کی سزا بن گئی۔ گل شیر چاچا کو پھانسی لگ گئی۔" گل لالہ ساکن بیٹھی یہ سب سنتی رہی۔

اتنا بہت کچھ بابا نے اتنا عرصہ مجھ سے چھپائے رکھا۔ اتنا سب کچھ ہوجانے کے بعد بھی بابا نے مجھے پھر اس جگہ بھیج دیا۔ کیا وہ بے بے کی اصلیت سے واقف نہیں تھے۔ انہیں تو پتا بھی نہیں ہوگا بے بے کی نفرت کا' جس آگ نے اتنے سال پہلے ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا آج وہ ہی آگ ان کی بیٹی کے دامن کو جھلسا رہی تھی۔ بے بے کی نفرت خود ان کی بربادی کا سبب بن گئی' لیکن انہوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا وہ پھر سے وہ ہی کچھ دہرا رہی ہیں۔ اصغر نے جنت کو بلایا تو وہ اسے خاموش رہنے کی تلقین کرتی باہر نکل گئی اور باہر سے کنڈی لگادی۔

اور شاہ میر... کیا شاہ میر کو یہ سب پتا ہے۔ اک نئے سوال نے سر اٹھایا۔ گل لالہ نے اپنا سر دیوار سے ٹکا دیا۔

☼ ☼ ☼

علاقے کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں اس نے گل لالہ کو تلاش نہ کیا ہو۔ ایک ایک گھر' کھیت' باغات' پہاڑ' بازار کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جو اس نے چھوڑ دی ہو۔ علاقے کے ایک ایک شخص' بچے' بڑے' بوڑھے سب سے پوچھ لیا تھا' لیکن لالہ تو ایسے غائب ہوئی تھی جیسے اسے زمین نگل گئی ہو۔ بے بے کی باتیں اب اسے سچ لگنے لگی تھیں۔ جب تک کوئی خود نہ چاہے ایسے بغیر ثبوت پیچھے چھوڑے بھاگ نہیں سکتا۔

گل لالہ یہاں خوش نہیں تھی۔ وہ یہاں آنا نہیں چاہتی تھی یہ تو وہ خود بھی جانتا تھا' لیکن وہ اس حد تک جائے گی شاہ میر کو اندازہ نہیں تھا۔ وہ تو اس کے حوالے سے ابھی نئے نئے خواب بننے لگا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ خود کو لالہ سے محبت کرنے سے روک نہیں پایا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا جس گریز کو وہ شرم و حیا سمجھ رہا تھا اس کے پیچھے ایک ان دیکھی قیامت چھپی تھی۔ شاہ میر کی کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ وہ لالہ کو تلاش کرنے میں بری طرح ناکام رہا تھا۔ تب ہی اسے حاشر کا خیال آیا وہ اسمبلی جس میں تھا شاہ میر سے اس کی گہری دوستی تھی۔

"ڈھونڈ لوں گا تمہیں میں' چاہے تم زمین کی کسی تہ میں چھپی ہو یا آسمان کی وسعت میں' لیکن اس کے بعد جو میں تمہارے ساتھ کروں گا اس کا تم نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا۔" شاہ میر پھنکارنے لگا۔

کل تک جس دل میں گل لالہ کی محبت کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں آج اس کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ شاہ میر مایوس ہوکر لوٹ رہا تھا جب ایک بچے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔

"بھائی جان آپ کو وہ انکل بلا رہے ہیں۔" بچے نے ایک دکان دار کی طرف اشارہ کیا۔ دکان دار شاید ابھی آکر بیٹھا تھا۔ شاہ میر کو وہ تھوڑی دیر پہلے تک نظر نہیں آیا تھا۔ شاہ میر کچھ سوچتا اسی طرف آگیا۔

"آپ کسی کو تلاش کررہے ہیں' میں کافی دیر سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔" دکان دار نے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ایک لڑکی ہے۔" شاہ میر نے اس دن کا گل لالہ کا حلیہ اسے بتایا۔ دکان دار نفی میں سر ہلاتا رہا۔ پھر ایک دم سے بولا۔

"ایک گاڑی کل شام یہاں سے گزری تھی۔ اپنے

علاقے کی نہیں لگ رہی تھی ادھر کیل کی طرف سے آئی تھی اور اسی طرف واپس چلی گئی۔" شاہ میر کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

"گاڑی آئی تھی کب... آپ مجھے اس کے آنے اور جانے کا وقت بتاسکتے ہیں۔" شاہ میر نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں تقریباً" صبح گیارہ بجے کے قریب ادھر گاؤں کی طرف مڑتے دیکھی تھی اور مغرب کے وقت واپس گئی تھی' لیکن اس میں مجھے کوئی لڑکی نظر نہیں آئی تھی صرف دو مرد ہی تھے۔" یہ وہ ہی وقت تھا جب لالہ غائب ہوئی تھی۔

"آپ ان مردوں کو جانتے ہیں یا دیکھنے پر پہچان سکتے ہیں۔" شاہ میر نے ایک امید پر پوچھا اسے لگ رہا تھا اس گاڑی کا گل لالہ کے غائب ہونے سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔

"جانتا تو نہیں' لیکن پہچان ضرور لوں گا بازار کی وجہ سے ادھر گاڑی بہت آہستہ چل رہی تھی۔ میں نے ان کے چہرے اچھی طرح دیکھ لیے تھے۔" دکان دار بتاتا رہا شاہ میر نے حاشر کا نمبر ملایا۔

"ہیلو حاشر... مجھے تمہاری کچھ مدد کی ضرورت ہے۔" دکان دار اسے فون پہ باتیں کرتا دیکھ کر چیزوں کے ڈبے ترتیب سے رکھنے لگا شاہ میر اسے پھر ملنے کا اشارہ کرتا دکان سے اتر آیا۔

☼ ☼ ☼

اصغر کمرے کا دروازہ بند کرتی جنت بی بی کو مسلسل گھورے جارہا تھا۔ جنت شوہر کے اس طرح گھورنے سے گھبرا گئی تھی۔ "آپ نے بلایا۔" وہ خود کو لاپروا ظاہر کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تم ادھر اتنی دیر سے تھیں کیا کھچڑی پکا رہی تھیں۔" اصغر نے سیدھا اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر پوچھا۔ ایک لمحے کو جنت گڑبڑا گئی۔ کہیں اصغر نے کچھ سن تو نہیں لیا۔

"میں کیوں کھچڑی پکاؤں گی۔" جنت نے خود کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے بیٹے کو اٹھا کر ایک طرف سلایا جو نیند میں چارپائی کے بیچ میں لڑھک آیا تھا اور اپنے لیے جگہ بنائی۔

"میں تو بس اسے ہوش میں لانے کی کوشش کررہی تھی کچھ اونچ نیچ ہوگئی تو بات تمہارے گلے پڑسکتی ہے۔ یوسف کا بھتیجا فوج میں ہے چپ کرکے نہیں بیٹھے گا۔" جنت بی بی نے ڈھکے چھپے لفظوں میں شوہر کو دھمکایا۔

"تمہاری زبان کچھ زیادہ چلنے لگی ہے۔ لگام دو اسے ورنہ گدی سے کھینچ لوں گا۔" اصغر طیش میں آکر بولا۔

"میری ایک بات کان کھول کر سن لو..." اصغر نے جنت بی بی کا منہ اس زور سے پکڑا کہ اس کی آنکھیں پانی سے بھرنے لگیں۔ "اگر مجھے کسی بغاوت کی بو آئی تو سب سے پہلے تمہیں جان سے ماروں گا... پھر کسی اور کو..." اصغر کے لہجے میں چٹانوں کی سختی تھی جنت کی روح بھی کانپ اٹھی۔ اصغر ایک زہریلی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتا باہر چلا گیا۔ جنت نے سر تک رضائی تان لی۔

"زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں گل لالہ کو اس مشکل وقت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔" جنت کا حوصلہ بلند تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ سب کیا ہے۔" گل لالہ حیران سی سامنے رکھے عروسی جوڑے اور دوسری چیزوں کو دیکھنے لگی۔ اسے اب حقیقی معنوں میں حالات کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ تو سوچ رہی تھی شاہ میر اسے جلد ہی چھڑا لے گا' لیکن یہ محض اس کی خوش فہمی نکلی۔ دوسرے دن کا ڈوبتا سورج اس کی آس اور امید بھی ختم کررہا تھا۔ گل لالہ کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔ سامنے کھڑے شخص کی آنکھوں میں نفرت اور انتقام کے علاوہ کوئی جذبہ نہ تھا۔

"تمہاری شادی کا جوڑا... کل ہمارا نکاح ہے' میں یہ شادی صرف انتقام لینے کے لیے کررہا تھا' لیکن

تمہیں دیکھنے کے بعد مجھے تم سے سچ مچ محبت ہو گئی ہے۔ تم دیکھنا میں تمہیں اتنی محبت دوں گا کہ دنیا رشک کرے گی تم پہ۔" وہ گل لالہ کو گہری نظروں سے گھورتا خباثت سے بولا۔ گل لالہ کو خوف سے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہوتی محسوس ہوئی۔

وہ طارق کو کوئی منہ توڑ جواب دینا چاہتی تھی' لیکن اسے جنت کی ہدایت یاد آ گئی اس نے بمشکل خود کو کچھ بھی کہنے سے روکا۔

"مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا وقت چاہیے۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ اسے ڈر تھا طارق مشتعل نہ ہو جائے۔

"سوچ لو آج کی پوری رات تمہارے پاس ہے' لیکن میں تمہیں زیادہ ٹائم نہیں دے سکتا وہ تمہارا افسر چچا زاد کسی بھی وقت پہنچ سکتا ہے اس کے آنے سے پہلے ہمارا نکاح ہو جانا چاہیے تاکہ وہ تمہیں اپنے ساتھ نہ لے جاسکے۔ ایک بات اور یاد رکھنا اسے دیکھ کر ڈرمت جانا صاف صاف کہنا تم اپنی مرضی سے یہاں ہو۔" طارق ایسے کہہ رہا تھا جیسے لالہ سچ مچ اس کے ساتھ بھاگ کر آئی ہو۔

"کل شام چار بجے ہمارا نکاح ہے۔ اس کے بعد تم جتنا ٹائم چاہو مجھ سے لے لو' میں زبردستی نہیں کروں گا۔" وہ کمال فراغ دلی سے بولا۔ لالہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس کا منہ توڑ دیتی' لیکن اس وقت اسے یہاں سے بھاگنے کا راستہ سوچنا تھا۔ اس کے پاس چوبیس گھنٹے سے بھی کم وقت تھا۔ طارق سے شادی کی صورت میں وہ ایسی دلدل میں پھنس جاتی جہاں سے نکلنا ناممکن تھا۔

"تمہیں کچھ اور چاہیے تو بتاؤ۔" طارق نے چلتے چلتے پوچھا۔ لالہ کو بے ساختہ شاہ میر یاد آ گیا۔ ہر بار کہیں جاتے وہ گل لالہ سے پوچھنا نہیں بھولتا تھا۔ اور بہت دھیان سے اس کی ضرورت کی ایک ایک چیز لے آتا تھا جیسے وہ اس پہ بہت حق رکھتی ہو۔ ایک دو بار جھجکنے کے بعد وہ بھی بہت استحقاق سے چیزیں منگواتی تھی۔

"نہیں کچھ نہیں چاہیے۔ جنت بھابھی کو کہیں مجھے ایک کپ چائے لادیں۔" وہ آنسوؤں کا گولا نگلتے ہوئے بولی۔ طارق تو اس اپنائیت پر نہال ہو گیا۔ گل لالہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے جنت کا انتظار کرنے لگی۔ خوف سے اس کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔

گھر میں عورتوں کا ہجوم اکٹھا تھا باہر سے ہلکی ہلکی ڈھولک کی تھاپ سنائی دے رہی تھی۔ گل لالہ عروسی لباس پہنے شدت سے کسی کے آنے کی منتظر تھی۔ اس کے پاس ایک آخری امید تھی' جنت بی بی ابھی ابھی اسے تیار کرکے گئی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اگر طارق نے اس کی بات کا یقین نہ کیا تو اس نے جھرجھری لی۔ طارق جیسے جاہل شخص کے ساتھ شادی سے بہتر تھا وہ موت کو گلے لگا لیتی۔

شاہ میر اب تک خاموش کیوں بیٹھا تھا۔ اس نے گل لالہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ ایسے بہت سے سوال تھے جن کے جواب اس کے پاس نہیں تھے۔

کیا وہ بھی بے بے کے ساتھ اس سازش میں شامل تھا۔

کیا وہ جان بوجھ کر اسے ڈھونڈنے نہیں آیا۔ ہزاروں واہمے تھے جو لالہ کو ڈس رہے تھے۔ اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ سارے زمانے کی ستم ظریفی ایک طرف' لیکن جن کو چاہا جاتا ہے جن سے امیدیں وابستہ ہوتی ہیں ان کی ذرا سی بے رخی بھی گھائل کر دیتی ہے۔

دروازہ کھلنے پر طارق اندر آیا جنت بی بی بھی ساتھ تھی۔ گل لالہ نے لب کاٹتے ہوئے جنت کی طرف دیکھا جنت نے آنکھوں کے اشارے سے اسے تسلی دی۔ طارق اس کے بولنے کا منتظر کھڑا تھا۔ باہر نکاح شروع ہونے والا تھا۔

"لالہ جلدی بولو کیا کہنا ہے باہر سب میرا انتظار کر رہے ہیں۔" طارق عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا کہ کہیں علاقے کا ہی کوئی شخص

شاہ میر کو مخبری نہ کر دے۔ اس کے آنے سے پہلے پہلے وہ گل لالہ کو نکاح کے بندھن میں باندھ دینا چاہتا تھا۔

"مجھے یہ کہنا تھا کہ۔۔۔" وہ اٹک گئی اس کا لہجہ لڑکھڑا گیا تھا۔

"میں یہ شادی نہیں کر سکتی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا جملہ پورا کیا۔ طارق کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ شادی کا جوڑا پہنے سجی سنوری دلہن کے منہ سے یہ الفاظ سننا کتنا اذیت ناک کام تھا۔ اسے آج پتا چلا تھا۔ وہ جی بھر کے بدمزا ہوا تھا۔

"اب اس بات کا ٹائم نہیں بچا کہ تم شادی کرنا چاہتی ہو یا نہیں' باہر لوگ جمع ہیں نکاح شروع ہونے والا ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہنسی خوشی تیار ہو جاؤ۔ شادی تو تم سے میں کر کے رہوں گا' لیکن اگر تم ایسی باتیں کرو گی تو میرے دل سے اتر جاؤ گی۔ پھر تمہاری جگہ ہمیشہ کے لیے میرے قدموں میں ہو گی۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی برباد مت کرو۔ جو ہو رہا ہے اسے ہونے دو۔" طارق کا لہجہ سرد تھا۔

"مجھے آپ سے شادی پر اعتراض نہیں ہے' لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔" طارق نے تیوری پہ بل ڈال کر پوچھا۔

"اس کے لیے مجھے پہلے شاہ میر سے طلاق لینی پڑے گی۔" گل لالہ نے اتنے مضبوط لہجے میں جھوٹ بولا کہ اسے خود بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ طارق بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے گل لالہ کی بات کا یقین نہیں تھا۔

"میرا شاہ میر سے نکاح ہو چکا ہے۔ میں رضامند نہیں تھی یہ سراسر بابا کا یک طرفہ فیصلہ تھا میرے پاس سوائے سر جھکانے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا' میں اس سے طلاق لینا چاہتی ہوں تم میری مدد کرو۔۔۔" وہ بڑی روانی سے جھوٹ پہ جھوٹ بولے جا رہی تھی۔ طارق سخت الجھن میں مبتلا نظر آرہا تھا۔ وہ گل لالہ کی بات کا یقین کرے یا نہ کرے۔

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے۔" طارق کو اب بھی شک تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"ثبوت دینے کے لیے مجھے تھوڑا وقت چاہیے۔" وہ ہمت جمع کرکے بولی۔

"بہت چالاک سمجھتی ہو تم خود کو۔ تمہیں کیا لگتا ہے تم مجھے بے وقوف بنا کر بھاگ جاؤ گی۔ میں نے تمہیں کہا تھا اپنی زندگی کو زہر مت بناؤ جتنا جلدی مان جاؤ گی اتنا تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔" وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ گل لالہ کا چہرہ زرد پڑ گیا وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

باہر اچانک ہی شور اٹھا تھا۔ اس سے پہلے کہ کچھ پتا چلتا اندرونی دروازہ زور سے دھڑ دھڑانے لگا۔ ڈھولک کی آواز بند ہو چکی تھی۔ ایک لمحے کو پورے ماحول پر سناٹا چھا گیا۔ طارق کو خطرے کی آہٹ محسوس ہوئی تھی اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا تھا شاہ میر اسے دھکا دے کر اندر داخل ہوا تھا۔

"گرفتار کرلو اسے۔" اس کے لہجے سے اشتعال ٹپک رہا تھا۔ اس کے پیچھے پولیس اہلکاروں کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر طارق غرایا۔

"یہ تم اچھا نہیں کررہے۔" شاہ میر نے زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ پولیس اہلکار اسے گھسیٹتے باہر لے گئے۔ عورتوں میں افراتفری پھیل گئی سب اپنے اپنے گھروں کو بھاگیں۔ شاہ میر نے دھکے سے کمرے کا دروازہ کھولا۔ گل لالہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاہ میر کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

"اوہ تو یہاں یہ کھیل کھیلا جارہا تھا۔" شاہ میر کی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے اس کا لہجہ سلگ رہا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا تھا تم میری آنکھوں میں دھول جھونک کر بھاگ جاؤ گی اور میں تماشا دیکھتا رہوں گا۔" گل لالہ کو کسی دوسرے کے لیے دلہن کے روپ میں سجا دیکھ کر وہ غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ گل لالہ حیرت اور صدمے سے گنگ سی کھڑی تھی۔

"شاہ میر۔" اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا۔

لیکن شاہ میر نے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

"اب میرے ساتھ مزید کوئی ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری اصلیت میں جان چکا ہوں۔ چلو۔" شاہ میر نے بڑی درشتگی کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ "شاہ میر پلیز میری بات سنیں۔" وہ درد سے بلکنے لگی تھی۔

زندگی تماشا بن کے رہ گئی تھی۔ ایک سے دوسرے ہاتھ میں لڑھکتی وہ چاہتے ہوئے بھی خود کو حالات کے بے رحم دھارے سے بچا نہیں پا رہی تھی کوئی اسے سننے کو تیار نہیں تھا۔ سب اپنا اپنا حق جتا کر اس کا استعمال کررہے تھے۔ وہ حالات کے ہاتھوں مجبور کھلونا بنی ہوئی تھی۔ اس کے گال بھیگنے لگے۔ اسے شدت سے اپنا باپ یاد آرہا تھا۔ شاہ میر نے اسے غصے سے جیپ میں پٹخا۔ اس کے باپ نے کبھی اسے پھول کی چھڑی سے بھی نا مارا تھا۔ وہ اتنی ریش ڈرائیونگ کررہا تھا گل لالہ کو لگا وہ ابھی کسی کھائی میں گر جائیں گے۔

شاہ میر نے دھماکے سے دروازہ کھولا اور گل لالہ کو ہاتھ سے گھسیٹتا ہوا کمرے کی طرف بڑھا۔ گل لالہ کو کمرے میں دھکیل کر اس نے باہر سے کنڈی لگادی۔

"شاہ میر۔ شاہ میر دروازہ کھولیں پلیز میری بات سنیں۔" وہ روتے ہوئے مسلسل دروازہ دھڑ دھڑا رہی تھی۔ بے بے ہاتھ میں تسبیح لیے یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھیں۔

"خبردار جو کسی نے اسے کھولنے کی کوشش کی۔" شاہ میر نے بے بے کو وارن کیا۔ غصے سے اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ بے بے نے اس کے چہرے پہ پھونک ماری۔

"تم کیوں اس بدکردار لڑکی کے لیے اپنی جوانی برباد کررہے ہو۔" بے بے نے نفرت اور حقارت سے کہا۔

"اس لیے کہ بدقسمتی سے وہ میری بیوی ہے۔" شاہ میر دانت پیس کر بولا۔

"تو طلاق دے دو اسے ایسی لڑکی تمہاری بیوی بننے کے لائق نہیں ہے۔ بھاگ گئی تھی وہ تمہیں چھوڑ کے۔" بے بے نے سلگتی پہ تیل چھڑکا۔

"تاکہ وہ آزاد ہو کر اس کمینے کے ساتھ شادی کرلے۔ اتنا بے غیرت نہیں ہوں میں۔" وہ دھاڑا۔ بے بے سہم گئیں۔ اپنی ساری پلاننگ انہیں چوپٹ نظر آنے لگی۔

"تو پھر کیا کرو گے سارا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی اسے اس گھر میں رکھو گے۔ لوگ تھو تھو کریں گے ہم پر۔ میں تو کہتی ہوں ابھی طلاق دو اور فارغ کرو اسے۔ ایسی بدکردار عورت کو بیس سال بھی اپنے گھر میں رکھو گے تو تمہاری نہیں بنے گی۔ بھاگ جائے گی ایک دن۔" بے بے مسلسل اسے مشتعل کررہی تھیں۔ ان کا مقصد ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ نیلم کی بیٹی کو طلاق دلوا کر در در کی ٹھوکریں کھاتا ہوا دیکھنا چاہتی تھیں۔ نیلم جس نے اپنا گھر بسا لیا اور ان کو اجاڑ کے رکھ دیا۔ وہ کتنے سال سے نفرت کی اس آگ میں اکیلی سلگ رہی تھیں۔ صرف اس دن کے انتظار میں۔ آج وہ مختار تھیں اور نیلم کا جگر گوشہ ان کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ اپنی ساری محرومیوں کا بدلہ اس سے لینا چاہتی تھیں۔

"اس کے ساتھ کیا کرنا ہے یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔" وہ باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

حالات پوری بدصورتی کے ساتھ اس کے سامنے آگئے تھے۔ شاہ میر کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت اور حقارت دیکھ کر اسے اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جنت بی بی کی باتوں نے اس کا سر جھکا کے رکھ دیا تھا۔ بے بے کا مکروہ چہرہ، شاہ میر کا نفرت بھرا رویہ، بے بے اور شاہ میر سے نیا رشتہ 'بی بی جان' طارق' جنت یہ ساری حقیقتیں اس کے لیے کسی شاک سے کم نہیں تھیں۔ اس نے تھک کر سر گھٹنوں پہ ٹکا دیا۔ پچھلے چار گھنٹوں سے وہ اسی جگہ دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی تھی۔ اسے ایک ہی شخص کا انتظار تھا وہ جو کوئی صفائی لیے بغیر اسے سزا سنا کر گیا تھا۔

وہ اسے بتانا چاہتی تھی اپنی بے گناہی اور بے بے کی سازش سے آگاہ کرنا چاہتی تھی، لیکن شاہ میر نے اسے ایک موقع بھی نہیں دیا تھا اپنے حق میں بولنے کا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے پھر سسکنے لگی۔

☆ ☆ ☆

اس کی بینٹ پنڈلیوں تلک فولڈ کی ہوئی تھی۔ وہ کتنی دیر سے چشمے کے یخ بستہ پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھا تھا۔ اس کے پاؤں سن ہو چکے تھے۔ ٹھنڈا پانی کسی آری کی طرح اس کے جسم کو کاٹ رہا تھا، لیکن اسے جیسے خود کو اذیت دے کر سکون مل رہا تھا۔ گزشتہ تین دن سے جو حالات رہے تھے وہ کسی فلم اسکرین کی طرح اس کے دماغ میں چل رہے تھے۔ انہیں سوچ کر وہ پھر اسی اذیت سے گزر رہا تھا جو پہلے پہل ان حالات کا سامنا کرتے ہوئے اس پر گزری تھی۔ محبت کے معاملے میں وہ انتہا کا شدت پسند تھا اور وہ لالہ سے شدید محبت کرنے لگا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی شاہ میر ملک کی بیوی۔ اس کے ذہن، دل اور خیالات پر صرف شاہ میر ملک کا حق تھا۔ عجیب حاکمیت کا احساس بھرا تھا اس کے اندر۔ گل لالہ اس کی تھی اور اس کی سوچ اور محبت کا محور اس کے علاوہ کوئی اور ہو یہ وہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ طارق کو اسی وقت شوٹ کردیتا اور ساتھ میں لالہ کو بھی۔ اس کی ڈکشنری میں بے وفا عورت کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

جنت بڑی سی چادر میں چھپی دبے پاؤں اس کے قریب آکر رکی۔

"شاہ میر۔" اجنبی آواز پر شاہ میر نے پلٹ کر دیکھا۔

"میں جنت ہوں اصغر کی بیوی۔" جنت نے چہرے سے چادر ہٹادی۔ شاہ میر طیش کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"اگر تم یہ سوچ کر آئی ہو کہ تمہاری سفارش پہ میں اصغر کو جیل سے رہا کروا دوں گا تو ابھی واپس چلی جاؤ۔"

وہ قطعی لہجے میں بولا۔

"نہیں یہاں اصغر کی سفارش کرنے نہیں آئی میں صرف گل لالہ کے بارے میں تمہاری غلط فہمی دور کرنے آئی ہوں۔" وہ بہت اعتماد سے بولی شاہ میر نے پلٹ کر دیکھا۔

"اس کے بارے میں مجھے اب کوئی غلط فہمی نہیں رہی۔" شاہ میر کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"وہ بے قصور ہے شاہ میر۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا کہ تم اس کے چچازاد ہو یا اس کا کوئی ننھیال بھی ہے۔ اس کے خلاف سازش کی گئی ہے اور یہ سازش کسی اور نے نہیں تمہاری اپنی بے بے نے کی تھی۔"

"بس..." شاہ میر ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "مجھے بھٹکانے کی ضرورت نہیں ہے۔" جنت نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بے بے نے اصغر اور طارق کو لالہ کو اغوا کرنے کا کہا تھا۔ تمہیں یقین نہیں آتا تو باقر سے پوچھ لو وہ ہی پرچی دینے آیا تھا۔" جنت آج تہیہ کر کے آئی تھی شاہ میر کو سب کچھ بتانے کا۔ اسے گل لالہ پر بے تحاشا رحم آرہا تھا جو قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی سزا کاٹ رہی تھی۔

شاہ میر کی کنپٹیاں سلگنے لگیں اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ وہ سامنے کھڑی عورت کی زبان کاٹ دے۔ جو بے بے جیسی پاکیزہ عورت پر مسلسل الزام لگا رہی تھی۔

"جھوٹ بول رہی ہو تم۔" وہ اپنی پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔

"میں اپنے بچوں کی قسم کھاتی ہوں میں نے تم سے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہا۔" جنت اسے نرم پڑتا دیکھ کر ساری بات بتانے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ شکستہ قدموں سے گھر لوٹا تھا۔ بے بے اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تسبیح ان کے ہاتھ میں جھول رہی تھی۔

"شاہ میر کہاں تھے تم سارا دن... کچھ بتا کے بھی نہیں گئے۔ کتنے وہم ستاتے رہے مجھے..." شاہ میر بغیر کچھ کہے چلتا رہا۔ بے بے اس کے پیچھے پیچھے بولتی ہوئی آرہی تھیں۔ اس نے رک کر ایک نظر بے بے کے چہرے پر ڈالی کتنا مان تھا اسے اس چہرے پر۔ اس پاکیزہ چہرے کے پیچھے اتنا گھناؤنا کردار ہوگا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے گھن آنے لگی پاکیزگی کے اس بہروپ سے جسے وہ ماں سمجھتا تھا وہ تو بدلے کی آگ میں جھلستی ہوئی ایک سفاک عورت تھی جو اپنی نفرت کی آگ میں سب کچھ جلا کر راکھ کر دینا چاہتی تھی۔

"بے بے میں کل پنڈی جا رہا ہوں۔" اس کا لہجہ کسی بھی تاثر سے عاری تھا۔

"پنڈی جا رہے ہو یوں اچانک اور اس بے حیا لڑکی کا کیا سوچا ہے کیا میرے آسرے پہ چھوڑ کے جاؤ گے وہ تو موقع ملتے ہی پھر بھاگ جائے گی۔ مجھ بڑھیا میں اتنی طاقت کہاں کہ اسے سنبھال سکوں۔" بے بے کے الفاظ تھے یا زہر میں بجھے تیر شاہ میر کو اپنے دل سے درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئیں۔

"اس کے بارے میں میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں کسی اور کے کیے کی سزا اسے نہیں دوں گا۔ وہ میرے ساتھ جائے گی۔"

"شاہ میر یہ تم کیا کہہ رہے ہو تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے شاید۔" بے بے کو سخت جھٹکا لگا تھا شاہ میر کے منہ سے یہ سب سن کے۔ شاہ میر کو ان کی اصلیت کا پتا چل گیا تھا۔ وہ انہیں چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہ سخت ہراساں لگ رہی تھیں۔ شاہ میر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

"غلط فہمی ہوئی تھی۔ مجھے یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ میری ماں دنیا کی عظیم عورت ہے۔ نیک دل، پرہیزگار، انصاف پسند..." شاہ میر کا ایک ایک لفظ انہیں کوڑے کی طرح لگ رہا تھا۔

"اب کوئی غلط فہمی نہیں رہی۔" شاہ میر کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا وہ شاہ میر سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھیں۔ بہت سال پہلے حسد کی وجہ سے انہوں نے اپنا شوہر کھویا تھا

اور آج اسی حسد کی وجہ سے شاہ میر کو کھو رہی تھیں۔

"آپ کو پتا تھا میں لالہ سے کتنی محبت کرتا ہوں اس سے جدا ہو کر میں زندہ نہ رہ پاتا لیکن آپ کو میری پروا نہیں تھی۔ آپ کو تو بس اپنا بدلہ چکانا تھا۔ نیلم آنٹی سے رقابت نے آپ کو اندھا کر دیا تھا۔ آپ کو کچھ نظر نہ آیا نہ میں نہ لالی نہ ہماری محبت سب کچھ داؤ پہ لگا دیا آپ نے۔"

دروازے سے لگی گل لالہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ وہ رو رہی تھی اپنے لیے نہیں شاہ میر کے لیے۔ پچھلے دو تین دن سے وہ جس ذہنی اذیت کا شکار تھی وہ بیان کرنے سے قاصر تھی۔ شاہ میر نے اس کے کردار کے بارے میں جو الفاظ کہے تھے وہ اسے مارے دے رہے تھے۔ پچھلے دو دن سے وہ یہی دعا کر رہی تھی کہ شاہ میر اس کی پاکیزگی کی گواہی دے پھر چاہے وہ لالہ کی شکل بھی نہ دیکھے۔ اپنی دعاؤں کی اتنی جلدی قبولیت پر وہ احساس تشکر سے رو پڑی۔ باہر شاہ میر ہی تھا جو اس کی پاکیزگی کی گواہی دے رہا تھا۔ اس سے محبت کا اعتراف کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

گاڑی اسلام آباد کی طرف رواں دواں تھی۔ وہ سوچ رہی تھی ان پانچ مہینوں میں۔ وہ کیا کچھ دیکھ آئی تھی۔ کتنے اپنوں کو غیر ہوتے دیکھا تھا اور کتنے غیروں کو اپنوں سے بڑھ کر پایا تھا۔ اس کی نظروں میں جنت کا چہرہ گھوم گیا۔ شاہ میر نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"کچھ پوچھو گی نہیں مجھ سے..." شاہ میر نے حیرت سے کہا۔

"سن چکی ہوں سب کچھ..." وہ اداسی سے مسکرائی۔ مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

"تو پھر کوئی سزا سوچی ہے میرے لیے یا ایسے ہی کھلا چھوڑ دو گی۔" وہ شرارت سے بولا۔

"سزا تو آپ کو بابا سنائیں گے ان کی اتنی لاڈلی بیٹی پر اتنے ستم ڈھانے کی۔" وہ مصنوعی خفگی سے کہنے لگی۔

"ان کی طرف سے تو اجازت ہے۔ یہ رہا اس کا دستاویزی ثبوت۔" شاہ میر نے جیب سے نکاح نامے کی کاپی نکال کر لالہ کی طرف بڑھائی۔ لالہ آنکھیں پھاڑے نکاح نامے کو دیکھ رہی تھی۔

"تو گل لالہ ملک صاحبہ آپ کو شاہ میر ملک کا رشتہ بمعہ ظلم و ستم قبول ہے۔" وہ باقاعدہ کسی نکاح خواں کی طرح پوچھنے لگا۔

"قبول ہے۔" لالہ سچ مچ شرما گئی۔

شاہ میر کا بلند قہقہہ گونج اٹھا۔

☼ ☼

اقرا اعجاز

اہل وفا

"یار! تم کبھی یہ کاغذ قلم چھوڑو گی بھی یا نہیں؟"
میں جو اتنے دن بعد اپنے ذہن کو آمادہ کرکے لکھنے بیٹھی ہی تھی اپنے شوہر نامدار کا اکتایا ہوا لہجہ سن کے انہیں گھورنے لگی۔

"ہر وقت کاغذ قلم' حد ہوتی ہے کوئی! زندگی میں اور بھی بہت سے ایسے معاملات ہیں جن میں ہماری شمولیت ضروری ہوتی ہے؟" آج عادل کا غصہ سوا نیزے پر تھا۔

"میں جب اپنے دوستوں کی بیویاں دیکھتا ہوں تو ایمان سے اپنی قسمت پہ رونے کو دل چاہتا ہے' ایک تم ہو جسے یا تو لہسن' پیاز سے فرصت نہیں اور جو وقت بچ جائے اس میں یہ لکھنا لکھانا توبہ ہے بھئی....." عادل تو اپنا غبار نکال کے دوستوں میں چلے گئے' مگر میں یہ سوچتی رہ گئی کہ یہ مرد آخر کس طرح خوش ہوتے ہیں' مجھے وہ دن یاد آنے لگا جب ایک پارٹی سے واپس آکر عادل نے بہت پیار سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"یار بیوی تو تم جیسی ہونی چاہیے' مکمل گھریلو ٹائپ' اچھا کھانا بنانے والی' میرے دوستوں کی بیویاں تو چلتی پھرتی ماڈل ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میک اپ کے اشتہار میں کام کرنے آئی ہیں۔" عادل کے اس دوہرے معیار پہ میری آنکھیں بھر آئیں۔ آنکھوں کی دھند کو صاف کرکے دوبارہ لکھنے لگی۔ آخر کو مجھے بھی اپنا غبار کسی طرح تو نکالنا تھا۔

☼ ☼ ☼

عادل کا رویہ' روز بروز میرے ساتھ خراب ہوتا جا رہا تھا اور مجھے وجہ بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں جتنا کوشش کرتی وہ اتنا مجھ سے دور جا رہے تھے۔ مجھ پر آج کل قنوطیت سوار تھی۔ اداسی میرے پورے وجود پر ڈیرہ جمائے ہوئے تھی۔ پہروں بیٹھی سوچتی رہتی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ میری کہانیوں میں بھی میری اداسی کا عکس جھلکنے لگا تھا۔ ننھا ابراہیم بھی ماں' باپ کی بے اعتنائی کا شکار تھا۔ میرا بیٹا میرا راج دلارا ابراہیم شادی کے دو سال بعد بہت دعاؤں سے مانگا تھا' مگر عادل کو اب اس کی بھی پروا نہیں تھی۔

میں بھی آج کل یاسیت کا شکار تھی' سو پوری توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ میرے لکھنے کا شوق بدستور قائم تھا۔ اس میں کوئی کمی نہیں آرہی تھی۔ عادل اب زیادہ وقت گھر سے باہر گزراتے اور میرے پاس دو ہی کام تھے' ایک تو بیٹھی سوچتی رہتی یا لکھتی رہتی۔

میرا مزاج شروع سے ایسا تھا' کوئی بھی بات ہوتی اپنے اندر رکھ کر کڑھتی رہتی' اب بھی ایسا جاری تھا۔ بہت مرتبہ سوچا کہ عادل سے کھل کے بات کرلوں۔ ایک دن ہمت کرکے عادل کے پاس چلی گئی۔

"عادل میری بات سنیں۔"

"ہاں بولو!" عادل نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے گویا مجھے اپنے مصروف ہونے کا احساس دلایا۔

"عادل آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟"
میں نے اپنی آواز کی لرزش پہ قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"میں کچھ بھی نہیں کر رہا اور یہ سوال تم اپنے آپ سے پوچھو کہ تم آج کل کس نہج پہ جا رہی ہو۔" عادل نے میری بات کو چٹکی میں اڑا دیا۔

"او کے.... میں اب جا رہا ہوں۔ یزدانی صاحب کے ساتھ میٹنگ ہے' ہو سکتا ہے مجھے آنے میں دیر ہو جائے' تم سو جانا۔" عادل نے میری گود سے ابراہیم کو لے کر پیار کیا اور چلے گئے۔ میں وہیں کرسی پر ڈھے سی گئی۔ آنسو پلکوں کے کواڑ سے باہر آنے کو بے تاب تھے۔ ابراہیم کو شاید بھوک لگی تھی' وہ رو رو کر فریاد کر رہا تھا۔ میں نے ایک نظر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا' میری ممتا جاگ اٹھی۔ میں نے ابراہیم کو بانہوں میں بھینچ لیا۔ اب میرے اندر قدرے سکون تھا۔ ٹھیک کہتے ہیں' اولاد ہی عورت کی سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے اور اللہ کا لاکھ شکر تھا کہ میرے پاس اللہ کی یہ نعمت تھی۔ ویسے بھی میں بہت دیر سے آنسو بہا رہی تھی' مگر کوئی بھی راہ سجھائی نہ دے رہی تھی۔

"ٹھیک ہے عادل! اگر آپ کو کوئی پروا نہیں تو مجھے بھی آج سے کوئی پروا نہیں ہے۔" میں آنسو پونچھتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔

☼ ☼ ☼

عادل اس رات بہت دیر سے گھر آئے' کہنے کو تو میں اپنے آپ سے وعدہ کرچکی تھی کہ مجھے بھی اب پروا نہیں کرنی' مگر دل کو سمجھانا بہت مشکل تھا۔ میں اس رات بار بار دروازے پہ جاکے دیکھتی رہی' جانے کیوں میرا دل خدشات کا شکار تھا۔ خدا خدا کرکے عادل واپس گھر آگئے' ان کے پاس مین گیٹ کی ڈپلی کیٹ چابی تھی۔ وہ اندر آگئے' میں اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ ان سے کوئی سوال جواب کرتی' سو چپکے سے سوتی بن گئی۔ صبح ابراہیم کے رونے کی آواز سے میری آنکھ کھلی' ویسے تو میں فجر کی نماز پڑھنے کی عادی تھی' مگر آج نجانے کیسے میری آنکھ نہیں کھلی۔ شاید رات کو بہت زیادہ رونے کی وجہ سے سر اب بھی بوجھل تھا۔

عادل اپنے آفس ٹائم پہ اٹھے۔ میری سوجی سوجی آنکھیں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ان کے چہرے پہ شرمندگی کا عکس لہرایا' مگر دوسرے ہی پل انہوں نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ آخر کو مرد تھے نہ..... اپنی غلطی کبھی نہیں مانتے تھے۔ ہاں میں اگر منا لیتی' معافی مانگ لیتی تو مجھ پہ احسان عظیم کرتے ہوئے اپنا موڈ ٹھیک کرلیتے' مگر میں بھی اس بار ضدی بنی ہوئی تھی۔ مجھے کسی طور بھی اپنے لکھنے پہ سمجھوتا نہیں کرنا تھا۔ میں نے خیالوں میں اپنے دل کے ساتھ خاموش سا عہد کیا۔ عادل ناشتا کرکے آفس چلے گئے اور میں ابراہیم کو ناشتا کروانے لگی۔ اب وہ بڑا ہو رہا تھا' اس لیے کھانے پینے کے معاملے میں بہت تنگ کرنے لگا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ سو گیا اور میں گھر کے کام کرنے لگی۔ اچانک

دن کی گھنٹی بجی، مجھے کچھ کوفت سی ہوئی کیونکہ گھر کا سارا پھیلاوا بکھرا پڑا تھا اور اگر ابراہیم اٹھ جاتا تو کوئی بھی کام نہ کرنے دیتا۔ کئی کئی دن اسی سے بھی بات نہ ہو پاتی تھی۔

اب بھی میں نے اپنی کوفت کو سرزنش کی اور فون اٹھالیا۔ دوسری طرف لائن پہ میری سب سے پیاری دوست سعدیہ تھی۔ اس کی آواز سن کے ایک پل کے لیے میں خوش گوار احساسات میں گھر گئی۔ اچھے اور مخلص دوست بھی گھنے سایہ دار درخت کی مانند ہوتے ہیں۔ جن کی چھاؤں میں کچھ دیر ستانے کے بعد ہم پھر سے زندگی کی تلخیوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ سعدیہ بھی میری ایسی ہی دوست تھی۔ اف میں بھی ایک پل میں کیا سے کیا سوچنے لگتی ہوں۔ سعدیہ کی ہیلو ہیلو مجھے حال میں واپس لے آئی۔

"عائشہ تم ٹھیک تو ہو کہاں گم ہو؟" سعدیہ کے لہجے میں میرے لیے فکرمندی چھلک رہی تھی۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں، اللہ کا کرم ہے۔" میں نے بھی اپنی آواز میں مصنوعی بشاشت لاتے ہوئے کہا۔

"تم کیسی ہو؟ مجھے تم بہت یاد آتی ہو۔" میں نے اپنی سسکیوں کو دباتے ہوئے اس سے پوچھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نہ کہ ہم جو مضبوط پہاڑ کی طرح دکھائی دیتے ہیں، ایک پل میں بھربھری مٹی بن جاتے ہیں۔ خاص طور پر مقابل جب ہمارے اپنے ہمارے جان سے پیارے ہوں تو سب بندھ ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہماری ساری مضبوطی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ اتنے دن سے عادل کی بے رخی دیکھتے جو خول اپنے گرد چڑھایا تھا، وہ ایک پل میں چٹخ گیا۔ میری بھرائی ہوئی آواز سن کے وہ بہت پریشان ہو گئی۔

"یار میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں، تم مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتیں۔" اسپیکر میں سے اس کی آواز ابھری۔

"بتاؤ شاباش کیا مسئلہ ہے۔؟ کیا عادل بھائی سے کوئی لڑائی ہو گئی۔" میری عزیز از جان دوست، مجھے اچھی طرح جانتی تھی۔ میں ایسے ہی ذرا ذرا سی بات کو سر پر سوار کر لیتی تھی۔ یہ تو میرے محبوب شوہر کا معاملہ تھا۔

"بس یار! کیا بتاؤں، میں آج کل بہت پریشان ہوں۔" میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔ "عادل کا رویہ میرے ساتھ بہت خراب ہوتا جا رہا ہے۔" میں اسے ایک ایک بات بتاتی گئی۔ جسے سن کے وہ خاموش ہو گئی۔

"تم بھی تو بدھو ہو نا۔" کچھ دیر بعد مجھے اس کی آواز آئی، "جب سارا دن سر جھاڑ منہ پہاڑ بن کے پھرو گی تو کیا عادل بھائی تمہاری تعریفیں کریں گے۔ میری چندا! مرد کو اپنی بیوی کا پورا ٹائم اور پوری توجہ چاہیے ہوتی ہے، جو تم انہیں نہیں دے رہی۔ تب ہی وہ دوسری عورتوں کی مثالیں دے رہے ہیں۔" میں نے اپنی داستان امیر حمزہ سعدیہ کی ہمدردی لینے کے لیے سنائی تھی، مگر وہ میرے ہی لتے لینے لگی۔

"بھئی ٹھیک ہے، تمہیں لکھنے کا شوق ہے، مگر یہ سب شوق اس وقت میں پورا کرو جب عادل بھائی گھر نہ ہوں۔" سعدیہ نے مجھے ایک نئی راہ دکھائی۔

"ایک تو ہم عورتوں کا یہی مسئلہ ہوتا ہے شادی سے پہلے خوب بناؤ سنگھار اپنے آپ کو فٹ رکھنا وغیرہ وغیرہ، مگر جیسے ہی شادی ہوئی تو ماسیوں والے حلیے میں رہنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اللہ کی بندی ہوش کے ناخن لو۔ اس سے پہلے کہ واقعی دیر ہو جائے۔" اس نے مجھے مستقبل کی ہولناکیوں سے ڈرایا۔

"عقل مند عورت کبھی مرد سے ضد نہیں باندھتی، تمہیں لکھنے کا شوق ہے، ضرور پورا کرو، مگر اپنے میاں کو اعتماد میں لے کر۔" سعدیہ نے مجھے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے سعدیہ! میں واقعی غلط تھی جو سمجھتی تھی کہ عادل مجھے کبھی نہیں چھوڑ سکتے اور نہ ہی اگنور کر سکتے ہیں۔" میں اپنی شکست تسلیم کر چکی تھی۔

"اچھا یار! بچے اسکول سے آنے والے ہیں، پھر بات ہوگی۔" سعدیہ نے اجازت چاہی۔ "مگر میری بات پہ غور ضرور کرنا۔" جاتے جاتے بھی وہ تاکید کرنا نہ بھولی۔ سعدیہ نے میری سوچ کا محور بدل دیا تھا۔ میں جو

اتنے دن سے خود کو مظلوم سمجھ رہی تھی، مجھے آج معلوم ہوا کہ میں خود ہی اس سارے ماحول کی وجہ ہوں۔ مجھے ہر کام کو میانہ روی میں ٹائم دینا چاہیے تھا، یہ ہی میری غلطی تھی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ ابھی بہت دیر نہیں ہوئی تھی۔ مجھے عادل کو منانا تھا۔ یہ ہی سب سوچتے میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

آج اتوار تھا۔ عادل کی آفس سے چھٹی تھی۔ سو وہ اپنی نیند پوری کر رہے تھے۔ میں علی الصباح اٹھنے کی عادی تھی۔ اب بھی اٹھ گئی۔ سارے گھر کی صفائی کے بعد نہا کے عادل کی پسند کے کپڑے پہنے، ہلکے میک اپ میں، میں نک سک سے تیار تھی۔ عادل کی پسند کا ناشتا میں پہلے ہی بنا چکی تھی۔

"عادل اٹھیں نہ اب.... دیکھیں دن کے بارہ بج رہے ہیں۔ اب اٹھ بھی جائیں۔" میں نے اپنے میاں صاحب کا کندھا ہلا کے ان کو جگانے کی ایک مدھم سی کوشش کی۔

"کیا ہے یار! اب میرے سونے پہ بھی پابندی لگاؤ گی کیا۔" عادل کی نیند میں ڈوبی سرگوشی سنائی دی۔

"آپ اٹھیں آج ہم اکٹھے ناشتا کریں گے۔ پتا ہے میں نے آج آپ کی پسند کا ناشتا بنایا ہے۔" میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔

"لو بابا اٹھ گیا ہوں۔" عادل نے اپنے چہرے سے تکیہ ہٹا کے میری طرف دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ٹھٹک سے گئے۔ ان کی آنکھوں میں چاہت کے رنگ قوس قزح کی مانند چمک رہے تھے اور میں شادی کے تین سال گزر جانے کے بعد بھی روز اول کی طرح گلابی ہو رہی تھی۔

"یار! میں آج کہاں ہوں۔ لگتا ہے کہ کسی غلط گھر میں آ گیا۔" عادل نے مجھے چڑانے کے لیے کہا۔

"اب بس بھی کر دیں عادل، مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں آپ کو کتنا نظرانداز کرتی رہی ہوں۔" میں نے پیار بھری نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر میں وعدہ کرتی ہوں اب آپ کو مجھ سے کوئی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔" میں نے آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کرتے ہوئے یقین دلایا۔

"اوہو.... میری سوئٹ بیگم! اب یہ ٹریجڈی سین چھوڑو اور خوشی خوشی ناشتا لگاؤ میں تب تک فریش ہو لوں۔" عادل نے میری آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"جی! آپ فریش ہوں میں ناشتا لگاتی ہوں۔" میں نے بھی انہیں یقین دلایا۔ عادل واش روم کی طرف بڑھ گئے اور میں نے خوش گوار لمبا سا سانس لیا۔ میرا رواں رواں طمانیت کے جذبے سے سرشار تھا۔ اپنا افسانہ میں مکمل کر چکی تھی۔ اب عادل کو منانا تھا کہ وہ پوسٹ کر آئیں۔ آج عادل کا موڈ بھی ٹھیک ہو گیا تھا۔ اب سکون ہی سکون تھا۔ میں نے لکھنا نہیں چھوڑا تھا۔ ہاں مگر اب مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اپنے لکھنے کے شوق کو اور اپنی شادی شدہ زندگی کو ساتھ ساتھ کیسے لے کر چلنا ہے۔

ہم عورتوں کو یہ ہی گمان رہتا ہے کہ یہ گھر اور یہ مرد ہمیشہ ہمارے ہیں، یہ کبھی نہیں بدل سکتے، مگر یہ خوش گمانی کے سوا کچھ نہیں ہے، مرد کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ مجھے اب ایسا کوئی کام نہیں کرنا تھا جس سے عادل مجھ سے ناراض ہوتے، کیونکہ مرد عورت کا سائبان ہوتا ہے اور گھر کی چار دیواری میں ہی عورت کی عزت ہے۔ یکایک بیڈ روم سے ابراہیم کی قلقاریوں کی آواز آنے لگی، میں ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکنے لگی۔ اندر کا منظر نہایت مکمل تھا۔ عادل کے قہقہے اور ابراہیم کی قلقاریاں۔ مجھے بھی اس منظر کا حصہ بننا تھا۔ اب میں ذہنی طور پر پرسکون تھی اور مجھے ایک رومانٹک سی کہانی بھی لکھنی تھی، مگر آج سے نہیں کل سے.... میری ایڈیٹر صاحبہ کو مجھ سے یہ ہی شکایت تھی کہ میں دکھی کہانیاں ہی کیوں لکھ رہی ہوں۔ اب میں خوش تھی تو اس کا عکس میری کہانیوں میں بھی آنا تھا، کیونکہ ہمارے دل کا موسم ہی ہر چیز پر انداز ہوتا ہے، آپ کا کیا خیال ہے۔

☆ ☆

مکمل ناول

ام ایمان قاضی

گول کمرے میں اس وقت فضیلہ خانم کی ساری اولاد ہی موجود تھی سوائے ٹیپو کے اور جب سے فضیلہ خانم نے سب کو ٹیپو کی نئی فرمائش کی بابت بتایا تھا۔ سب کو ہی کچھ لمحوں کے لیے گویا سانپ سونگھ گیا تھا پھر ایک کے بولتے ہی گویا پینڈورا باکس کھل گیا تھا۔

"ہمارے چاند سے بھائی کے لیے وہی بونگی رہ گئی ہے دنیا میں' جس کی نہ شکل اچھی نہ ڈھنگ' پڑھ پڑھ کے شکل پر پھٹکار تو ویسے ہی برسنے لگی تھی اوپر سے رہی سہی کسر عینک نے پوری کردی۔" پہلی کے بعد یہ دوسری بہن کی رائے تھی اس کے بارے میں۔

"ٹیپو کا رنگ دیکھا ہے دودھ جیسا۔ اس چھپکلی کا مقابلہ ہے بھلا میرے بھائی کے ساتھ۔"

"ارے کمبختو! میں نے یہاں تمہیں ٹیپو اور اس کے درمیان مقابلے کے لیے نہیں بلایا' بلکہ اس لیے بلایا ہے کہ اپنے بھائی کی عادات سے واقف ہو جو بات کہہ دے پتھر پر لکیر ہوتی ہے' پھر چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے اپنی منوا کر چھوڑتا ہے۔ ابھی تو صرف فرمائش کی ہے اس نے' اگر جو ضد پر اڑ گیا اپنی تو میں کیا کروں گی؟" وہ بے حد پریشانی سے بولیں۔

"اس کا حل تو یہی ہے اماں کہ جو جو لڑکیاں ہمیں زیادہ پسند آئی تھیں' مگر کوئی بہن کسی پر راضی نہیں تھی تو کوئی کسی پر' اب ان میں سے ہی سب کسی ایک پر راضی ہو کے' جلدی سے بات پکی کر کے شادی کی تاریخ پکی کر دو۔" یہ سب سے بڑی آپا کی رائے تھی جو اس نے خاصے جوش سے دی تھی' مگر فضیلہ خانم کی ایک گھوری سے ہی اس کے منہ کے زاویے بگڑ گئے۔

"بات صرف راضی ہونے کی ہوتی تو بھلے تم لوگ راضی نہ بھی ہوتیں میں نے اپنے بیٹے کا ویاہ کر دینا تھا' مگر یہاں بات اس انوکھے لاڈلے کی ہے جو یاد نہیں موٹر سائیکل کی فرمائش نہ ماننے پہ پوری نیند کی گولیوں کی معدے میں انڈیل کے اسپتال جا پڑا تھا۔"

"ویسے اماں یشعرہ لگتی کیسی تھی اور میسنی ہے۔ اس نے کیسے پھنسالیا ہمارے بھائی کو۔" سب سے چھوٹی جو یشعرہ کی ہم عمر ہی تھی آنکھیں مٹکا کے بولی۔

"ارے دفع ہو کم بخت' ہر وقت یہ ڈرامے دیکھ کے وہی بکواس ہی آتی ہے تم لوگوں کے دل و دماغ میں' اس دیوانی لڑکی کو نہ کھانے کا ہوش نہ پہننے اور اوڑھنے' بننے سنورنے کا۔ کسی بات کا جواب مشکل سے دیتی ہے' اسے تو شاید تم لوگوں کے نام تک یاد نہیں ہوں گے۔ یہ میرے دل ہولانے کے عجیب عجیب خیالات تمہارے بھائی کے ذہن کے ہی کمالات ہیں۔ بچپن سے لے کر اب تک دیکھ لو کبھی کوئی ڈھنگ کا کھلونا پسند کیا ہو' کسی اچھی چیز کو اپنایا ہو' رنگ پسند ہیں تو وہ اوٹ پٹانگ جن کو یاد کرتے عمر گزر گئی پر بھیا ہمیں تو سمجھ نہ آئے۔ کپڑوں کی الماری بھری ہے جا کے دیکھ لو کیسی پسند ہے تمہارے بھائی کی' تو لڑکی بھی تو ایسی ہی پسند کرنی تھی نا اس نے۔" اب کے فضیلہ بیگم کا لہجہ بھی بجھا بجھا سا تھا۔

"ارے اماں! صبح سے ہمیں بھی پریشان کر رکھا ہے خود بھی ہولے جا رہی ہیں کرامت بابا کو بھول گئیں کیا۔" دوسرے نمبر والی چھوٹی آپا اپنے خیال پر خود ہی چہک اٹھی۔

"آیا تھا خیال فاری! پہلے پہلے ان ہی کا خیال آتا ہے ہر مشکل میں' مگر اپنے بیٹے کے بارے میں کوئی رسک لینے سے ڈرتی ہوں۔ جانتی نہیں ہو کیسے جلالی پیر ہیں منٹوں میں سب کچھ تہس نہس کر دینے والے۔ اگر اس لڑکی کا قصور ہوتا تو خود ہی نمٹا مکا چکی ہوتی کرامت بابا کو کہہ کے۔ اب بھی ان کو کہہ دوں تو فوراً ہی کچھ کریں گے' مگر جانتی ہو نا ان کے جلالی وظیفوں کو اگر جو میرا معصوم بچے پر کچھ اثر وثر ہو گیا تو میں نے تو جیتے جی مر جانا ہے۔" ان کے آنسو آنے کی دیر تھی کہ تائیداً سب کے تاثرات ہی رونے والے ہو گئے۔

"اچھا اماں آپ فکر نہ کریں۔ ٹیپو آجائے تو ہم سب بات کرتے ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہماری ہر بات ماننے والا زندگی کا سب سے اہم معاملے میں ہماری پسند کو نظرانداز کردے۔ اسے پتا نہیں ہے کہ اس کی ماں بہنیں کبھی بھی اس کا نقصان نہیں چاہ سکتیں۔" نمبر تیسرے نمبر والی کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوئی مگر اس کانفرنس کا کچھ حتمی نتیجہ نہ نکل سکا کہ تینوں شادی شدہ بہنوں کے بچوں کی فوج نے اچانک دھاوا بول کر ہر ایک کو بوکھلا کر رکھ دیا جنہیں وہ ڈرائیور کے ساتھ کچھ دیر قبل قریبی پارک بھیج چکی تھیں۔

یونیورسٹی سے باہر آتے یشعرہ نے آسمان کے دامن میں تیزی سے جمع ہوتے گہرے کالے بادلوں کا ہجوم دیکھا پھر گھبرا کر بائیں ہاتھ میں ڈالی نفیس سی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ پاپا کی گاڑی کل سے ہی ورکشاپ میں تھی وہ اس کے یونیورسٹی آنے جانے کے سلسلے میں فکر مند دکھائی دیے تو یشعرہ نے خود ہی ان کو کہہ دیا تھا کہ ان کے بلاک سے ایک اسپیشل وین لڑکیوں کو لے کر یونیورسٹی جاتی ہے وہ بھی ان کے ساتھ جائے گی اور واپس آئے گی کیونکہ اور وہ ایک آدھ بار پہلے بھی گاڑی لیٹ ہو جانے کی صورت میں ایسا کر چکی تھی سو وہ فکر مند نہ ہوں مگر کیا کیا جائے کہ اس کا پریکٹیکل تھا آج اور وین جا چکی تھی اس بات کا اسے خیال نہ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے قدم بڑھانے شروع ہی کیے تھے کہ ٹیپو کی چہیتی سواری ایک زوردار آواز کے ساتھ اس کے پاس آکر رکی۔

"تم؟" اس کو دیکھ کر بلاوجہ ہی غصہ آگیا اسے۔

"جی ہاں! میں... مامی جی پریشان تھیں کہ موسم خراب ہے تم کیسے آؤ گی؟ بس جی تمہیں تو پتا ہے کہ اپنے بہت قریبی لوگوں کو پریشان دیکھنا خاصا مشکل کام ہے میرے لیے... سو پیش کر دیں اپنی خدمات اور اب آپ کی خدمت میں شاہجہاں ٹیپو اپنی شاہی سواری کے ساتھ حاضر ہے۔" خاصی تفصیل سے جواب دیتے ہوئے اس نے سر خم کرتے ہوئے اپنی بائیک پر بڑی پیار بھری نظر ڈالی۔

"جلدی کریں محترمہ! کھانا کھائے بغیر اٹھ کے آیا ہوں اور یہاں محترمہ کے مزاج ہی نہیں ختم ہو رہے۔ پھر شوروم واپس جانا ہے مجھے، یہ تو مامی جی کے ہاتھ کا لذیذ کھانا روزانہ پانچ میل کا سفر طے کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔"

"ہاں تو یہی کھانے اور سونے سے محبت ہی تو تمہیں لے ڈوبی ہے جس نے معاشرے میں کوئی مقام نہیں حاصل کرنے دیا تمہیں۔" وہ اچک کر اس کے پیچھے بیٹھی اور اپنی عادت کے مطابق طنز بھی ساتھ جڑ دیا۔

"کیا بات ہے ڈیئر کزن تمہاری بھی! شہر کا سب سے بڑا شو روم اس وقت میری ملکیت ہے، جس میں کروڑوں کا مال موجود ہے مجھ سے۔ اپائنمنٹ لینے میں لوگوں کو کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا ہے اور تمہاری نظر میں کوئی مقام ہی نہیں تو افسوس ہی کر سکتے ہیں تمہاری حسن نظر پر اور اپنی قسمت پہ۔" بائیک کو تیزی سے بھگاتا ہوا وہ زور سے بولا۔

"یہی تو فرق ہے تمہاری اور میری سوچ میں۔ تم دولت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہو جس کی میرے نزدیک چنداں اہمیت نہیں ہے، میرے لیے تو وہ مقام اہم ہے جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد انسان اپنی قابلیت کے بل بوتے پر حاصل کرے۔" اپنی کئی بار کی ہوئی بات کو اس نے دوبارہ دہرایا جس کو سن کر ٹیپو کا دل جل گیا۔ اس کے خیالات سن کر وہ بڑبڑایا۔

"کیا کھیل ہیں قسمت کے یشعرہ بی بی! کہ میرے پاس تمہیں قائل کرنے کو ہزار دلائل ہیں، مگر تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے خیالات بھی تو دل و جان سے قبول ہیں۔ ہاں اگر تم سے ہونے والی محبت کا یہ احساس کچھ عرصہ قبل ہو جاتا تو ہو سکتا ہے تعلیمی میدان میں بھی جھنڈے گاڑ ہی لیتے کہ محبت چیز ہی ایسی ہے اپنے بس میں کر کے سب کچھ محبوب کی مرضی کا کروا لینے والی۔ تعلیم کی اہمیت سے انکار کس کافر کو ہے یشعرہ بی بی! بس دلچسپی ہی نہیں تھی یا یوں کہو کہ قسمت ہی اس حوالے سے کنی کترا گئی۔" اس کی قربت کو پورے احساس سے محسوس کرتا ہوا وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھا۔

"ہونہہ دو اور دو چار کر کے صرف پیسہ کمانے کو ہی لوگ اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ علم کی چاہ جس دل میں نہیں وہ زندہ کیسے ہے؟" یشعرہ نے بھی اس کے گھنے بالوں کو دیکھ کر ذہن میں اچانک در آنے والی سوچ کا سرا پکڑا۔

حنا آج فضیلہ بیگم کے گھر آئی ہوئی تھی اور جب سے آئی تھی دونوں خالہ زاد سر جوڑے پتا نہیں کن راز و نیاز میں مصروف تھیں تاہم حنا کا دھیان بار بار لاؤنج میں کھلتے بیرونی دروازے کی طرف ہی تھا۔

"کیا روز اتنا ہی لیٹ آتا ہے ٹیپو؟" اس سے رہا نہیں گیا تو سیما سے پوچھ ہی لیا۔

"نہیں پہلے تو دوپہر کا کھانا گھر آکے کھاتے تھے مگر جب سے گھر میں یشعرہ والی بات شروع ہوئی ہے تب سے ہی یا تو باہر کھا لیتے ہیں یا پھر ماموں کی طرف۔"

"کون سی بات؟" حنا کے کان کھڑے ہو گئے۔

"ارے بیٹا! کچھ نہیں... تم سناؤ۔ ماں کیسی ہے تمہاری؟ مجھے تو جوڑوں کے درد نے کہیں کا نہیں چھوڑا کہ کہیں آؤں جاؤں... وہ بھی نہیں خبر لیتی بہن کی۔ تم نکمی لڑکی اٹھو... کچن میں ملازمہ کو دیکھ لو جا کے۔ ورنہ پھر کھانے کے نام پر مغلوبہ لاکے دھر دے گی ٹیبل پر۔" فضیلہ بیگم کے کانوں میں اندر آتے ہوئے جیسے ہی بیٹی کے الفاظ ٹکرائے فوراً ہی حنا کا دھیان ہٹایا اور سیما کو گھورتے ہوئے وہاں سے اٹھ جانے کا حکم دیا جو منہ بناتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

جس پل ٹیپو نے اندر قدم دھرا دونوں خالہ بھانجی خاندان کے کسی مسئلے کو از خود حل کرنے کا طے کرتے ہوئے زور و شور سے باتوں میں مصروف تھیں کہ اس کے سلام کا جواب ہی نہیں دیا۔ وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھا تو فضیلہ خانم کی نظر اس پر پڑی۔

"ارے آگیا میرا چاند... میرا شہزادہ... سیما جلدی سے کچھ ٹھنڈا لاؤ بھائی کے لیے کتنی گرمی میں آیا ہے۔" فضیلہ بیگم نے ایک دو لمحے سیما کا انتظار کیا پھر اس کی کاہلی اور سستی کو کوستی خود ہی باہر نکل گئیں۔

"کیسے ہو ٹیپو؟ کیسے بے مروت ہو جب بھی چکر لگاؤں میں ہی لگاؤں تمہیں تو کبھی توفیق نہیں ہوتی ہمارے گھر آنے کی اور تو اور بندہ ایک آدھ کال ہی کر لیتا ہے مگر تم تو کال کرنا تو ایک طرف کبھی کال اٹینڈ کرنے کی زحمت بھی نہیں کرتے نہ میسجز کے جواب دیتے ہو، پتا نہیں حقیقت میں اتنے مصروف ہو یا ہمارے لیے سارے مصروفیات یاد آجاتی ہیں تمہیں؟"

"اف... ایک تو اتنی گرمی میں باہر سے آیا ہوں اوپر سے تمہارے منہ پر کلو آدھا کلو کے قریب چیختا چنگھاڑتا میک اپ دیکھ کر میرا دم گھٹ رہا ہے اب بندہ سانس ہی صحیح نہ لے پا رہا ہو تو دوسری بات کوئی خاک سمجھ میں آئے گی۔" ہمیشہ کی طرح اس کی بات اور انداز کو اس نے مذاق میں اڑا دیا۔

"ماں صدقے کیوں سانس نہیں آرہی؟ کیا ہو گیا میرے بچے کو...؟" فضیلہ خانم نے اسکواش کا بھرا جگ ٹیبل پر رکھ اور تشویش سے ٹیپو کے قریب چلی آئیں۔

"کچھ نہیں اماں... یہ آپ کی بھانجی نے پتا نہیں ایسے ہونٹوں اور جبڑوں کو تکلیف دے کر بولنا کہاں سے سیکھ لیا کہ مجھے دیکھ کر اذیت ہوتی ہے کہ پتا نہیں بے چاری کتنے عذاب جھیل کر بول رہی ہے تو خود اس کو بولتے ہوئے کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔ اس سے اس ٹریننگ سینٹر کا نام ضرور پتا کر کے رکھیے گا، کبھی ان کو سلامی دینے جاؤں گا جو بندے کو کیسے کیسے فطرت کے خلاف کام کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ کھانا میں مامی کے ہاتھوں کا بنا ہوا نوش کر کے آیا ہوں۔ اب اپنے کمرے میں ہوں۔ آدھا گھنٹہ ریسٹ کر کے پھر شوروم جانا ہے، دو بجے تک جگا دیجیے گا مجھے۔" ایک ہی نشست میں اس نے حنا کی مزید مٹی پلید کرتے ہوئے ماں کو بھگتایا، دو گلاس اسکواش کے چڑھائے اور

فضیلہ بیگم کو کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر یہ جا وہ جا۔

"دیکھا خالہ! یہ ہمیشہ ایسے کرتا ہے میرے ساتھ' آپ تو کہتی ہیں وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ میری تعریفیں کرتا ہے پھر میرے سامنے ایسی دل دکھانے والی باتیں کیوں کرتا ہے؟" حنا کے تو باقاعدہ آنسو بھی نکل آئے۔

"ارے۔ ارے میری جان۔ میری اچھی بیٹی تمہیں تو پتا ہے اس کی عادت کا زبان کا کڑوا ہے میرا بچہ ورنہ دل کا بہت اچھا ہے۔ بس کہنا کچھ اور چاہ رہا ہوتا ہے زبان سے کچھ اور ہی نکل جاتا ہے تو فکر نہ کر۔ ابھی اٹھتا ہے تو تیرے سامنے ہی پوچھتی ہوں اس کو۔ آؤ ہم کھانا کھالیں' شاباش۔ میرا پتر۔" فضیلہ خانم دل ہی دل میں ٹیپو پر غصہ ہوتیں اس کو بہلا پھسلا کر کھانے کی ٹیبل پر لے گئیں۔

☆ ☆ ☆

طلال کو اس کمپنی میں کام کرتے ہوئے محض سات ماہ کا قلیل عرصہ ہی ہوا تھا' مگر کمپنی کے مالک خلیل احمد نے ان کے اخلاق و کردار سے ان کی تربیت اور خاندانی نجابت کو جانچ لیا تھا اور باتوں باتوں میں ان کے خاندان کے متعلق چیدہ چیدہ معلومات بھی لے لیں اور جب دل کی بیماری سے زیادہ پریشان ہو اٹھے تو انہیں آفس میں بلا کر اپنا مدعا بھی بیان کر دیا اور ابھی وہ جواب دینے ہی والے تھے کہ خلیل احمد ایک بار پھر بول اٹھے۔

"ارے نہیں نہیں ابھی جواب مت دو گھر جاؤ' اچھی طرح سے سوچو' گھر والوں سے مشورہ کرو' ایسا ہو جائے تو میرے لیے خوشی کا مقام ہو گا' نہ بھی ہوا' اس سے تمہاری جاب اور ہمارے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔" وہ خلوص سے بولے تو طلال بھی پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان سے ہاتھ ملا کر آفس سے باہر آگئے۔

سارا دن ان سے مزید کام نہ ہو سکا انہوں نے سارا دن سوچ میں گزارا تھا۔ ایک پڑھی لکھی سلجھی ہوئی شریک حیات کا خواب انہوں نے بہت پہلے دیکھا تھا' مگر وہ خواب تعبیر بننے سے پہلے اس وقت مسمار ہو گیا تھا جب بہن بہنوئی کی طرف سے یہ مدعا لے کر آئیں کہ ان کی خواہش ہے کہ وہ اس رشتے کو مزید قریب لائیں اور ان کی بہن کو دلہن بنا کر لے جائیں۔

"مگر آپا! ایسا کیسے ہو سکتا ہے آپ کی شادی کے وقت ایسی کوئی شرط طے نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ہمارے ہاں وٹہ سٹہ کا رواج ہے۔ اماں! آپ کیوں چپ بیٹھی ہیں۔ بتائیں نہ ان کو کہ میں نے ہرگز بھی ان کی نند سے شادی نہیں کرنی۔ مجھے کسی پڑھی لکھی لڑکی کو اس گھر میں لانا ہے اور آج تک جس نند نے اپنی زبان اور عمل سے ان کا جینا حرام کر رکھا تھا آج اتنی اچھی ہو گئی کہ اسے یہ اپنی بھابھی بنانے پر تلی ہیں۔" ماں بہنوں کی بے حد عزت کرنے والے طلال اس وقت تلخ ہو گئے۔

بات ہی کچھ ایسی تھی کہ ماں بہنوں کے بے حد فرمانبردار ایسی بے تکی فرمائش سن کر غصے میں آگئے۔ بہن کی گرہستی بچانے کو ہاں کر بھی دیتے اگر جو اس کی نند سے واقف نہ ہوتے جو کہ ان کی بھی کزن تھی۔ تعلیم کی الف ب سے بھی نابلد۔ شائستہ تخریبی ذہن اور زبان درازی میں اول نمبر پر تھی پہلے اس کی زبان درازی اور لڑائی جھگڑا کرنے کی عادت کا صرف چرچا سنا تھا' مگر جب سے آپا بیاہ کر ان کے گھر گئی تھیں آئے روز ہی اپنی نند کی وجہ سے روتی نظر آتیں۔ انہوں نے بہت پہلے ہی اپنی ماں اور دونوں بہنوں کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ وہ کسی پڑھی لکھی سلجھی ہوئی لڑکی سے شادی کے خواہاں ہیں اور اسی مد میں ان کی بہنوں نے لڑکیوں کی تلاش بھی شروع کر دی تھی' مگر اچانک ہی بہنوئی کی طرف سے چھوڑا جانے والا شوشا ان سب کو پریشان کر گیا تھا' مگر ان کا احتجاج اس وقت دم توڑ گیا جب بہن طلاق کی دھمکی لیے گھر آئیں۔

تب انہوں نے بہن کی گرہستی بچانے کو منگنی تو کر لی تھی۔ شادی انہوں نے کہا تھا جب ان کی جاب ہو جائے گی تب ہو گی اور قسمت کی ستم ظریفی کہ خلیل احمد کی سنجیدہ اور سلجھی ہوئی بیٹی جو اکثر ہی اپنے باپ کے پاس دفتر آجاتی' ان کے دل کے تاروں کو انجانے میں چھیڑ گئی تھی۔ شاید ان کے آئیڈیل کے بے حد قریب ترین تھی اور قدرت اس کو ان کی جھولی میں ڈالنے پر مصر بھی تھی تو حالات کی سنگینی آڑے آگئی تھی پھر بھی انہوں نے ایک بار قسمت کو آزمانے کا سوچتے ہوئے اماں سے بات کی تو چند ماہ پہلے کھلنے والا پینڈورا باکس ایک بار پھر اپنا منہ کھول بیٹھا۔ اماں نے اس ڈر سے کہ وہ اس لڑکی کو بیاہ کر ہی نہ لے آئیں' ان کی شادی کی جلدی مچا دی وہ بھی شائستہ کے ساتھ۔

دوسری طرف خلیل احمد نے بھی طلال سے بات کرنے کے بعد بیٹی کو خوشی خوشی اپنی مرضی میں شریک کرنا چاہا تھا' مگر وہ تو باپ کی بات سن کر ہی حیران رہ گئی تھی۔

"آپ نے مجھے بتائے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا' وہ بھی میری مرضی جانے بغیر۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"بیٹا! میری حالت اور طبیعت تمہارے سامنے ہے اور میں تمہیں محفوظ ہاتھوں میں سونپ کر مرنا چاہتا ہوں۔" جس مایوسی سے انہوں نے کہا تھا سارہ تڑپ ہی گئی اور باپ کے بازو سے لگ کر رونے لگی۔

"مجھے آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا اور نہ ہی آپ اتنے بیمار ہیں ایسی باتیں کر کے خود کو اور مجھے پریشان کریں۔"

"بیماری کی بات نہ بھی ہو۔ تب بھی بیٹی کا فرض بہت اہم فریضہ ہوتا ہے۔ طلال بہت خوددار اور سیلف میڈ لڑکا ہے۔ اس کی ساری معلومات میں نے کروائی ہیں' تم بھی مل لینا۔"

"آپ نے بات شروع کی ہے تو۔ میں بھی آپ کو کسی سے ملوانا چاہتی ہوں۔" اس نے باپ کی بات کی جواب میں جھجکتے ہوئے کہا۔ خلیل احمد نے چونک کر اپنے پاس بیٹھی گھبرائی ہوئی بیٹی پر نظر ڈالی۔

"میں نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ یہ آج کے دور کی سمجھ دار اور باشعور بچی ہے' اس کی بھی کوئی پسند ہو سکتی ہے۔" انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔ وہ اب کسی بلال کا ذکر کر رہی تھی جو یونیورسٹی میں اس کے ساتھ ہی پڑھتا تھا اور آج کل ان ہی کے آفس کی دوسری برانچ میں کام کر رہا تھا۔ وہ اب آہستہ آہستہ اس کی خوبیاں گنوا رہی تھی۔ خلیل احمد کی نظر میں اس لڑکے کا سراپا گھوم گیا جو واقعی خوبرو تو تھا' مگر جتنا ان کا تجربہ کہتا تھا وہ لڑکا ہرگز بھی طلال جیسی خصوصیات نہیں رکھتا تھا۔

"او کے تم اس سے کہو مجھے کل صبح آکر ملے۔ باقی پھر دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے؟" وہ گہری سانس بھر کے بولے۔

دوسرے دن منیجر سے انہیں معلوم ہو گیا کہ اس لڑکے کا انتخاب کمپنی نے ہرگز نہیں کیا تھا اور کچھ عرصہ پہلے جب وہ بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر تھے اور اس کو سارہ نے بصد اصرار وہاں جاب دلوائی تھی۔ بلال ایک چرب زبان لڑکا تھا اور انہیں کسی حد تک لالچی بھی لگا تھا۔ دل ہی دل میں اسے مسترد کرتے انہوں نے جب سارہ کو اپنے خیالات بتائے تو اس نے فوراً" ان کے اس تجربے کی نفی کی تھی۔

"میرا اور بلال کا ساتھ کوئی آج کل کا نہیں ہے' میں اس کو کالج ٹائم سے جانتی ہوں' پورے کالج کا آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ اور تمام ٹیچرز کا منظور نظر جس نے کبھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ غریب ضرور تھا' مگر لالچ جیسا کوئی برا عنصر میں نے اس کی نیچر میں کبھی نہیں دیکھا۔ یونیورسٹی میں مجھے اس کی اچھی عادات نے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔" وہ اپنی مرضی کو باپ کی مرضی بنانے کے لیے دلائل دے رہی تھی۔ تعریفیں کر رہی تھی۔

"پاپا! میں صرف بلال سے شادی کروں گی۔" باپ کے چہرے پر کوئی تاثر نہ دیکھ کر اس نے کہا اور اٹھ گئی اور مسلسل کچھ دن باپ بیٹی کی اس ضد میں بیٹی جیت گئی تھی۔

خلیل احمد اپنی طرف سے دل ہی دل میں طلال سے بے حد شرمندہ تھے کہ ان سے کہہ کر پروپوزل دے کر وہ چپ ہو گئے تھے یہ جانے بغیر کہ وہ ماں بہنوں کے بے

خد دباؤ میں آکر کچھ دن پہلے ہی شائستہ سے شادی کر چکے تھے اور خلیل صاحب سے شرمندہ سے تھے پھر ایک دن جب صاحب کا بلاوا آیا وہ ڈرتے ڈرتے ان کے پاس گئے تھے یہ سوچتے ہوئے کہ اگر جواب مانگیں گے تو کیا جواب دیں گے۔ انہوں نے کسی آفس کے بندے تک کو شادی میں نہیں بلایا تھا ویسے بھی کون سا ان کی خوشی اس شادی میں شامل تھی جو ایسا کوئی تکلف کرتے۔ پھر ایک گہری اور طویل سانس بے ساختہ ان کے منہ سے خارج ہوئی جب صاحب نے بہت شرمندہ اور مجبور لہجے میں بتایا تھا کہ وہ اپنے اس پرپوزل پر معذرت خواں ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے دو دن بعد ہونے والی اپنی بیٹی کی شادی میں اسے انوائٹ بھی کرلیا۔ وہ بھی ان کی تسلی کراتے اٹھ گئے کہ وہ اس بات کو دل پر مت لیں کیونکہ رشتوں ناتوں کے فیصلے تو آسمانی فیصلے ہوتے ہیں اس میں انسانوں کی مرضی نہیں چلتی مگر دل میں پتا نہیں کیوں اس لڑکی کی شادی ہونے سے خوش نہیں تھے۔ جو بھی پہلی نظر میں ہی انہیں اچھی لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

جمعتہ المبارک کی خوب صورت صبح نے یشعرہ کے گھر پر اپنے پر پھیلا رکھے تھے جب کئی دنوں بعد اس نے وہاں قدم دھرا۔ یشعرہ اور پاپا کی کرنٹ افیئرز پر زور و شور سے بحث جاری تھی جب کہ لاؤنج سے ملحق کچن میں امی مسکراتے ہوئے ان کی بحث سننے کے ساتھ ساتھ ناشتے کے لوازمات میں بھی لگی ہوئی تھیں۔

''آہا مامی جی! لگتا ہے مجھے دل سے یاد کیا ہے آپ نے جب ہی میری پسندیدہ چنوں کی پوریوں کی خوشبو مجھے اپنے گھر کے ناشتے کی ٹیبل سے اٹھ کر یہاں آنے پر مجبور کر گئی۔'' یشعرہ کا منہ بن گیا۔

''ٹیپو کو بس کھانے پینے کی باتیں سوجھتی ہیں ہر وقت۔'' اس نے دل میں سوچا اور اس کے سلام کا جواب دیے بغیر اخبار پر جھک گئی۔ اسے اس قسم کے غیر سنجیدہ لوگوں سے بے حد چڑ تھی جن کا زندگی گزارنے کا مقصد صرف کھانا، سونا اور پلا گلا تھا۔ ماموں البتہ ٹیپو کو پسند کرتے تھے۔ مامی تو تھیں ہی اس کی شیدائی۔ اب بھی مامی کو چولہے سے ہٹا کر وہ مہارت سے پوریاں بنا بنا کے کڑاہی میں ڈال رہا تھا۔

''ارے سوئٹ مامی جی دیکھ کیا رہی ہیں؟ جلدی سے ناشتا ٹیبل پر لگانا شروع کریں۔ یہ میں لے کر آتا ہوں۔'' بلاشبہ وہ کوکنگ ایکسپرٹ تھا' اچھے کھانے پینے کے شوق نے اسے مامی سے کئی ڈشز بنانا سکھادیں تھیں اور کچھ چیزیں تو ایسی تھیں جن کو وہ مامی سے بھی اچھی بنالیا کرتا تھا۔ اس کی امی کو پکانے سے کچھ خاص رغبت نہیں تھی بس الٹا سیدھا پکا کر سامنے دھر دیتیں۔ یا زیادہ تر کھانا عموماً بازار سے ہی آتا تھا۔ اکثر ہی وہ کھانے کی شکل دیکھ کر اپنی ٹیبل چھوڑ کر اپنے اور ماموں جی کے گھر کی درمیانی باڑھ جو ایک قسم کے دروازے کا کام دیتی تھی پھلانگ کر ماموں کی طرف آجایا کرتا تھا۔

''اور میاں! کام کیسا چل رہا ہے آج کل؟'' ماموں جی نے مامی جی سے خاندان کے کسی مسئلے پر شدومد سے بحث کرتے ٹیپو کو مخاطب کیا۔

''فرسٹ کلاس ماموں جی! کبھی چکر لگائیں نا آپ۔''

''ہاں بھئی منیجر صاحب کافی دن سے کہہ رہے ہیں گاڑی لینی ہے ایک وزٹ کرچکے ہیں تمہارے شوروم کا۔ ایک دو گاڑیاں دیکھ کے بھی آئے ہیں اب مجھے ساتھ چلنے کو کہا ہے تو اسی بہانے تمہارے شوروم کا چکر بھی لگالیں گے۔''

''جی ماموں ضرور مجھے خوشی ہوگی۔ آج کل میں ہی تشریف لے آئیں کیونکہ ایک دو دن بعد میں نے نئی گاڑیوں کی ڈلیوری کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا ہے۔'' وہ ماموں جی سے بات کرتے ہوئے چھٹی پوری ختم کررہا تھا جبکہ یشعرہ نے ایک نظر اپنی پلیٹ میں پڑی آدھی بچی پوری کو پھر اس کی پلیٹ کو دیکھا اور ایک بار پھر دل ہی دل میں خود ہی غصہ ہوگئی۔

''ہونہہ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ ایسے ہی کھانے کی رفتار اگر رہی تو کھا کھا کے پھٹ جائے گا ایک دن۔''

''اور بھئی یشرہ۔ گاڑی تو نظر نہیں آرہی ماموں کی' میں نکل رہا ہوں پانچ دس منٹ میں شوروم کے لیے تیار ہو جاؤ' تمہیں بھی لیے چلتا ہوں۔''

''ارے بھئی اللہ بھلا کرے تمہارا' میں ابھی آفس سے گاڑی منگوانے کا سوچ بیٹھا ہوں اور گاڑی آنے تک اس نے لیٹ ہی ہو جانا تھا۔'' ماموں جی خوش ہو کر بولے۔

''ارے نہیں پاپا! میں چلی جاؤں گی کالونی سے ہو کر ہی جاتی ہے اسپیشل گاڑی جو کچھ اسٹوڈنٹس نے ارینج کی ہے۔'' یشعرہ کے ذہن میں بائیک والا پرسوں کا سفر گھوم گیا۔ وہ جلدی سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی اور کسی کی بات سنے بغیر چائے کا گھونٹ بھر کے وہاں سے باہر نکل گئی۔ ٹیپو اس کے اس طرح کنی کترانے پر گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''کوئی بات نہیں ماموں جی اصل میں اسے بائیک سے چڑ ہے اس لیے منع کردیا ہے' ویسے بھی میں کچھ ہی دنوں میں اپنی ذاتی گاڑی لینے کا سوچ رہا ہوں ورنہ مجھے تو بائیک ہی پسند ہے جبکہ گھر والی گاڑی بھی میرے ہی استعمال میں رہتی ہے اس لیے پہلے کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔'' اس کی اس قدر لمبی وضاحت پر مامی تو مسکرا دیں جبکہ ماموں یشعرہ سے اس کا التفات دیکھ کر کچھ سوچ میں پڑ گئے تھے کیونکہ اپنی بیٹی کی آنکھوں کے رنگ بھی بخوبی پہچانتے تھے جو اسے کچھ خاص پسند نہیں کرتی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسے یونیورسٹی آکر بے حد خوشی ہوئی جب پتا چلا پروفیسر حسن سیمینار سے واپس تشریف لا چکے تھے۔ پہلا لیکچر لینے کے بعد وہ فوراً ہی ایڈمن آفس آگئی کیونکہ کچھ دنوں سے چارج انہی کے پاس تھا اور ویسے بھی پچھلے کچھ دنوں میں جتنی وہ ان سے متاثر ہوئی تھی اتنا ہی ان کے قریب۔ آئی تھی سو کسی بھی اپائنمنٹ یا اجازت کی ضرورت ہی کہاں تھی۔

''ارے یشعرہ آئی ہیں۔۔۔ آئیے بھئی آئیے۔'' ان کی جانب سے بھی خاصی گرم جوشی کا مظاہرہ ہوا۔

''اس لیے آپ نے نہ اپنے جانے کے بارے میں انفارم کیا' نہ آنے کا بتایا۔ اوپر سے سیل بھی آف ملتا تھا جب بھی بات کرنے کی کوشش کی۔'' اس کی خفگی پر وہ مسکرا دیے۔

''یشعرہ! مجھے کہنے دیں کہ آپ سے بچنے کی' آپ سے بات نہ کرنے کی میری شعوری کوشش بھی ناکام گئی اور حقیقت تو یہ ہے کہ جتنی بے تابی آپ کے انداز میں' میں نے اپنے لیے دیکھی اس سے کہیں زیادہ بے چینی میں اپنے اندر تب سے محسوس کررہا ہوں جب سے آپ سے دور ہوا ہوں۔'' وہ پیپر ویٹ کو گھماتے اسی پر نظریں جمائے آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔

یشعرہ کی آنکھوں میں بے ساختہ نمی سی چمکی۔ اس پر یہاں بیٹھے بیٹھے ابھی اچانک انکشاف ہوا تھا کہ ساری زندگی محبت جیسے جذبے کو خرافات کا نام دے کر وہ اس سے دور رہی تھی کیونکہ اس کے نزدیک یہ صرف فالتو لوگوں کا کام تھا اور پروفیسر حسن اس کی آئیڈیل شخصیت سے بے حد میل کھاتے تھے۔ سنجیدہ' متین اور علم و تدریس کے موثر عمل کے لیے کوشاں' ان کی لگن اور محنت نے انہیں بہت جلد ترقی کی منازل طے کرنے میں مدد دی تھی۔ ان کے آفس میں سجے میڈلز ان کی قابلیت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ ہزاروں دوسرے طلبا کی طرح یشعرہ بھی ان سے بے حد متاثر تھی۔

چھ ماہ پہلے جب اچانک بیمار پڑ جانے کے باعث اسے ایک ہفتہ چھٹیاں کرنی پڑی تھیں۔ باقی سب کچھ تو اس نے جلدی کور کرلیا تھا۔ سر حسن کے کچھ لیکچرز کے لیے ان کی رہنمائی درکار تھی اور وہ چونکہ اپنی کلاس کی ایک ہونہار طالبہ تھی اور تقریباً'' تمام پروفیسرز کی منظور نظر بھی۔ اس لیے کلاس میں اس کی

کچھ اہم پوائنٹس سمجھانے کی درخواست کو خوش دلی سے قبول کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ کیا کوئی اسٹوڈنٹ بھی کسی بھی وقت، کسی بھی مسئلے کے لیے ان کے پاس آسکتا ہے۔ اس ایک ہفتہ میں مسلسل اس آدھے گھنٹے کی کلاس کے دوران ان کی شخصیت کے کئی خوب صورت پہلو پشعرہ پر کھلے تھے جنھوں نے اس کی پسندیدگی میں اضافہ کیا تھا۔ ان دنوں ہی ان کے درمیان نمبرز کا تبادلہ ہوا اگرچہ وجہ تدریس ہی تھی مگر کبھی کبھار ان کی طرف سے آجانے والے فارورڈ میسج اسے بے انتہا خوشی دیتے۔ اب ان کے درمیان ہلکی پھلکی چیٹنگ ہونے لگی تھی جس نے ان دونوں کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

اور ابھی ابھی یہ حقیقت کھلی تھی کہ وہ صرف ان سے متاثر ہونا نہیں تھا۔ وہ صرف ان کے لیے ایک اسٹوڈنٹ کی اپنی ٹیچر سے لگاؤ یا پسندیدگی نہیں تھی وہ ان سب سے بڑھ کر کچھ تھا۔ مسلسل ایک ہفتہ سے وہ شہر سے باہر ایک سیمینار میں شرکت کے لیے گئے تھے اس کے لیے گویا پورا شہر ہی ویران ہوگیا تھا۔ ان کا بند نمبر اس کو بڑی طرح سے خوف زدہ کر گیا کہ کیا وہ ان کو ٹیچر سے الگ جگہ دینے لگی تھی، ان کا بے چینی سے انتظار اور آج ان کی آمد کی بے پایاں خوشی اور ان کو دیکھ کر بے چینیوں کو قرار آنا ان کی حیثیت اس کے دل میں کیا ہے، واضح کر گیا۔

اس نے بے حد جھجکتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنی کیفیت کے بارے میں بہت سوچا ہے... خود کو بہت روکنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن...“ اس نے ہاتھوں کو مسلتے تھوک نگلا۔ ”میں... میں آپ کو پسند کرنے لگی ہوں۔“ پروفیسر حسن اس کے جھکے سر کو مسلسل دیکھ رہے تھے جو بتا رہی تھی کہ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے اور اس نے ہمیشہ اس قسم کی باتوں کو ہمیشہ لغو جانا ہے۔

”میں جانتا ہوں پشعرہ کہ آپ کیسی ہیں۔ اس لیے تو کلاس سے آفس اور پھر پروفیسر حسن کے دل تک کا سفر تیزی سے طے کیا ہے آپ نے، ورنہ آپ کیا جانیں کہ میں صنفِ مخالف سے کتنا دور بھاگنے والا شخص ہوں۔ میں آپ سے عمر میں بہت بڑا ہوں اور کبھی بہت خلوص سے کسی کا ہاتھ تھاما تھا، مگر اس نے میرے خالص جذبوں کی قدر ہی نہیں کی بس پھر کیا تھا میں گویا خود سے، دنیا سے، حتیٰ کہ اپنے جذبوں سے ناراض ہی ہوگیا۔ تیرہ سال بعد ان جذبوں میں کسی نے سیندھ لگائی ہے، میں مجبور ہوگیا اپنے جذبوں کے ہاتھوں، لیکن آپ ابھی کم عمر ہیں اور اس عمر میں لڑکیاں عموماً جذباتی ہوتی ہیں، ہر چیز سے متاثر ہوجانے والی۔ اچھی طرح سے سوچ لیجیے۔ میں دوسری بار کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا میری عمر اور اپنی عمر کے تفاوت کو ذہن میں رکھ کر سوچیں پھر مجھے بتایئے گا۔“ وہ فوری بولنا چاہتی تھی۔ اس نے جو بھی کہا ہے خوب سوچ سمجھ کر کہا ہے، مگر انہوں نے اسے روک دیا تھا۔

”آپ اچھی طرح سوچ لیں پشعرہ! آپ کا ہر فیصلہ مجھے دل و جان سے قبول ہوگا اور آپ کی حیثیت بھی دل میں ویسے ہی مسلم رہے گی جیسے تھی کیونکہ بہت عرصہ بعد اس دل میں کسی کو ایک اعزاز کے ساتھ اندر آنے کا موقع دیا ہے۔“ پشعرہ خوشی کے بے پایاں احساس کے ساتھ وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ یہ احساس ہی اس کو ہواؤں میں اڑائے دے رہا تھا کہ وہ محبت کے اس خوب صورت سفر میں اکیلی ہرگز نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

خلیل احمد اگر سارہ کے لیے پریشان تھے تو ان کی پریشانی بے جا ہرگز نہیں تھی۔ اس کی شادی کے محض دو ہفتہ بعد ہی ان کو پڑنے والا دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ وقت کسی کے لیے نہیں رکتا کہ اس کا کام ہے چلنا ہے جو قدرت کی طرف سے اس کو ودیعت کیا گیا ہے۔ اب باپ کی جگہ پر سارہ تھی جس کو تمام بزنس سنبھالنا تھا۔ طلال کے لیے مشکل یہ تھی کہ جب تک وہ سامنے نہیں تھی تو دل کو سمجھا بجھا لیا تھا کہ وہ ان کی

قسمت میں نہیں ہے، مگر اب تو دن کا بیشتر حصہ اس کے ساتھ گزارتا ان کے اندر عجیب سا احساس محرومی پیدا کر رہا تھا جس کو ہوا اس کی بیوی شائستہ بھی اپنے رویے کے باعث دے رہی تھی۔ وہ محض ان چند دنوں میں ہی اپنی بری فطرت کو کھول کر سامنے لے آئی تھی۔ صرف زبان کی ہی تیز نہیں تھی شائستہ اور بھی کئی اخلاقی برائیاں پائی جاتی تھیں اس میں، ان کی ماں سے دو تین بار اتنی بدتمیزی کی شائستہ نے کہ ہاتھ اٹھانے کی کسر رہ گئی تھی اس بیمار عورت پر۔ انہوں نے غصے میں اسے ڈانٹا تو وہ برقع پہن کر اپنے میکے چلی گئی تھی اور ایک گھنٹے بعد ہی کانوں کے کچے ان کے بہنوئی نے ان کی بہن کو ماں کے گھر بھجوا دیا تھا ایک بیٹی کے ہمراہ، نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں کڑوا گھونٹ پینا پڑا اور اس عورت کو گھر واپس لانا پڑا تھا۔ اس سے اگلے روز اس کی بہن بھی اپنے گھر چلی گئی تھی جبکہ دوسری بہن دوسرے شہر بیاہی ہوئی تھی۔

گزرتے وقت نے، جہاں سارہ پر ان کی اچھائی ثابت کردی تھی وہاں کچھ کچھ اپنے خاوند بلال کی خصلتیں بھی کھلی تھیں اس کے اوپر، جس کو اس نے دوسری برانچ کا سارا کام سونپ دیا تھا۔ طلال کی بہن جو کہ شائستہ کی نند بھی تھی کے یہاں ہونے والی اوپر تلے دو مزید بیٹیوں اور ایک بیٹے نے شائستہ کے اندر بھی بچے کی ہڑک پیدا کردی۔ اس نے نہ کوئی ڈاکٹر چھوڑا نہ پیر فقیر آستانہ، طلال کی ماں، طلال کے بچے کی حسرت لیے اس دنیا سے رخصت ہوگئی جبکہ طلال کی دوسری بہن کو بھی اللہ نے ایک بیٹی سے نوازا تھا۔

☼ ☼ ☼

پروفیسر ایک بار پھر کسی تدریسی سلسلے میں شہر سے باہر تھے اور اس بار پشعرہ کو نہ صرف بتا کر گئے تھے بلکہ مسلسل رابطے میں رہنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ ویسے بھی دو ماہ بعد ہونے والے پشعرہ کے امتحان کے بعد ان کا پشعرہ کے والدین سے ان کا ہاتھ مانگنے کا ارادہ تھا۔ وہ ابھی ابھی یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔ گھر میں گہری خاموشی طاری تھی ویسے بھی امی ہی ہوتی تھیں گھر مگر وہ بھی کہیں نظر نہیں آرہی تھیں آج۔ تمام رومز لاک تھے لاؤنج سے ہوتی ہوئی وہ کچن میں آئی۔

”پشعرہ...! تمہاری پھپھو کی چھوٹی بیٹی کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں، تمہاری پھپھو کی ہیلپ کے لیے ان کے گھر ہوں۔ آپ بھی یونیورسٹی سے لوٹتے ہی سیدھا وہیں آنا... کھانا اکٹھے وہیں کھائیں گے۔“ فریج پر لگی چٹ پڑھ کر پتا نہیں کیوں اسے غصہ آگیا۔

”ہونہہ... اتنی بڑی ہوگئیں پھپھو مگر کھانا بنانا آج تک نہیں آیا۔ ویسے امی کو کبھی اہمیت نہیں دی، مگر ایسے ہر موقع پر بھابھی ان کی جان بن جاتی ہیں اور ان کا پیٹو بیٹا تو تین ٹائم نہیں تو دو وقت کھانے کے ٹائم ضرور حاضر ہو جاتا ہے۔“ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر غصے سے منہ سے ہی لگالی۔ امی ہوتیں تو فوراً ڈانٹا تھا پہلے تو دل چاہا لمبی تان کے سوجائے، مگر پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے سو مرے قدموں سے درمیانی باڑھ کراس کرکے پھپھو کے پورشن کی طرف آگئی۔

”اف۔“ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی ایک طوفان بدتمیزی نظر آیا۔ پھپھو کی صاحبزادیوں کے تین لاڈلے اور پھپھو کا نور نظر آپس میں گتھم گتھا تھے۔ کبھی جو یہ شخص تمیز کے دائرے میں نظر آجائے۔ اسی پل بغل میں ایک بھانجے کو دبوچے ٹیپو کی نظر اس پر پڑی۔

”ارے... چھوڑو بھئی مجھے... دیکھو تو کون تشریف لایا ہے۔ ان کے صدقے تمہاری جان بخشی ہوئی۔ اسی خوشی میں آج میری طرف سے آئس کریم پکی۔“ وہ بے حد خوش تھا۔ تینوں بھانجے ”ہرا ماموں“ کہتے اس سے لپٹ گئے۔

آؤ بھئی پشعرہ... تمہاری تو شکل ہی نظر نہیں آتی کئی کئی مہینے گزر جاتے ہیں، اب ایسی بھی کیا پڑھائی کی انسان کے پاس رشتہ داروں کے دکھ سکھ کے لیے بھی وقت نہ ہو۔ میری شادی تک میں تم شریک نہیں تھیں اب بھی ہر ہفتہ یہاں چکر لگتا ہے ہمارا۔ مجال ہے جو کبھی جھانک کے دیکھا ہو تم نے...“ یہ پھپھو کی دوسری نمبر والی دختر نیک اختر تھیں جو لگتا تھا کافی دنوں

سے یشعرہ کی تلاش میں تھیں۔

"اچھا بھئی آپی! اب جان بخشی کر دیں۔ بے چاری بھوکی پیاسی آئی ہے خالی پیٹ تو بڑے سے بڑا سورما بھی جوابی فائر نہیں داغ سکتا' یہ تو پھر یشعرہ ہے۔" "اور بھئی یشعرہ! تم برا مت ماننا۔ یہ ہماری دونوں بہنوں کی اپنے اپنے میاں کے گھر آنے پر ان کی طبیعت صاف کرنے کی کچھ ایسی پکی عادت بن چکی ہے کہ ہر کوئی اس عادت کی زد میں آجاتا ہے' میں تو خیر عادی ہو گیا ہوں' مگر تمہیں پہلے پہلے تھوڑا عجیب لگے گا۔ کیوں بچو!" ٹیپو نے اپنی بہن اور یشعرہ دونوں کو مدبر بن کر سمجھایا' ساتھ ہی پاس کھڑے بھانجوں سے تائید چاہی۔ جنہوں نے شدومد سے سرہاں میں ہلا کر اپنے "گرو" کی بات کی تصدیق کی۔ یشعرہ کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے' پتا نہیں کیسے غیر سنجیدہ قسم کے لوگ تھے جن کے نزدیک ہر بات مذاق سے شروع' مذاق پر ختم تھی۔

"ارے ہے ٹیپو! پتا نہیں تم کب بڑے ہو گے؟ دیکھو تو کیسے گھر کو میدان جنگ بنا دیا ہے۔ مہمان آنے والے ہیں اور ذرا حال دیکھو۔" یشعرہ بھی آگئی اور کسی نے بتایا ہی نہیں اس کی ماں کو فکر کھائے جا رہی ہے کہ اتنی دیر کبھی نہیں ہوئی اس کو۔ جاؤ بچی۔۔۔ تم کہاں ان شیطانوں کے ٹولے کے ہتھے چڑھ گئیں۔ جاؤ کچن میں' کھانا کھالو' اسکول سے بھوکی آئی ہو گی۔" پھپھو ادھر ادھر بکھرے کشن سمیٹتے صوفے پر ماتھے پر شکنیں لیے بیٹھی یشرہ سے مخاطب ہوئیں۔ وہ جیسے انتظار میں ہی تھی کہ امی کا کوئی پتا جائے تو فوراً" وہاں جائے ویسے بھی اس چڑیا گھر والے ماحول سے اسے عجیب وحشت سی ہوتی تھی۔ امی اسے کچن میں مل گئیں' وہ جو اس مفت کی خدمت خلق کے لیے انہیں بہت کچھ سنانا چاہتی تھی' پھپھو کی کل وقتی ملازمہ کو ان کی مدد کراتا دیکھ چپ ہو گئی۔ امی نے اسے مختصراً" ساری صورت حال ایک بار پھر بتائی اور جلدی سے چھوٹی ٹیبل پر اس کے لیے کھانا بھی چن دیا۔ بیٹی کی نازک مزاجی سے واقف تھیں۔

"تمہارے بابا بھی آفس سے یہیں آئیں گے۔ تم کھانا کھا کے آرام کر و جا کے۔" وہ ایک بار پھر چولہے کی طرف متوجہ تھیں' مزے دار کھانا وہ بھی امی کے ہاتھ کا' ساری کوفت ڈھلنے لگی اور بھوک چمکنے پر وہ مزے سے کھا رہی تھی جب ٹیپو کی کچن میں آمد ہوئی۔

"اور بھئی عزیزی رشیدہ صاحبہ کیا حال ہیں؟ آج بہت دن بعد آپ نے اپنے رخ روشن کا دیدار کرایا ہے۔ مای کچھ اس غریب کو بھی عنایت کر دیں۔ صبح سے اماں نے دفع نافذ کر رکھی ہے کہ مہمانوں کے ساتھ کھانا اب مہمانوں کے آنے تک بندہ فوت ہی ہو جائے۔۔۔"

"اللہ سے خیر مانگیں ٹیپو صاحب! اللہ آپ کو میری عمر بھی لگا دے' آپ نہ ہوتے تو میری بیٹی نے کنوارا میری دہلیز پر ہی مر جانا تھا جی۔۔۔" اب رشیدہ بیگم مای کو بتا رہی تھی کہ کیسے اس کی بیٹی کے عین نکاح والے دن داماد نے موٹر سائیکل کی فرمائش رکھ دی وہ تو بھلا ہو ٹیپو کا جس کے پاس رشیدہ دوڑ کر گئی' وہیں اپنا کام چھوڑ کر اس کے ساتھ شادی والے گھر پہنچا اور اپنی ذاتی' کچھ دن پہلے کی لی گئی موٹر بائیک تو رشیدہ کے داماد کو دی تحفے میں' ساتھ ہی ایک معاہدہ لکھ کر بھی لڑکے سے سائن کروالیا جس میں پوری زندگی آئندہ کے لیے کسی بھی فضول قسم کی فرمائش سے توبہ کی گئی تھی اور حالات کیسے بھی ہوں' لڑکا کبھی اپنی گھریلو زندگی کو داؤ پر نہیں لگائے گا' زندگی میں پہلی بار یشعرہ کی آنکھوں میں اس کے لیے ستائش دکھائی دی۔ "اچھا تو یہ ٹیپو کھانے پینے کے علاوہ کچھ اور بھی سوچ اور کر سکتا ہے۔" اس نے دل میں سوچتے ہوئے اپنے بالکل سامنے مزے سے بریانی اڑاتے ٹیپو پر نگاہ کی۔

☆ ☆ ☆

گزرتے ان ماہ و سال میں طلال جیسے ڈھے سے گئے۔ حالات نے جیسے ان کے خلاف کمر کس لی تھی۔ ان کی بہن جہاں بیوہ ہو کر چار کم سن بچوں کے ہمراہ روتی ہوئی ان کے گھر آئی تھیں وہاں اپنی بیوی کے بے حد اصرار پر جب انہوں نے اپنے اور شائستہ کے ٹیسٹ کروائے تھے ان پر یہ ہولناک انکشاف سامنے آیا تھا کہ وہ باپ بننے کی صلاحیتوں سے محروم تھے۔ شائستہ بھی شاید موقع کے انتظار میں تھی اور ان سے جان چھڑانا چاہتی تھی پھر اب تو بھائی کا خوف بھی نہیں تھا۔ طلال کی بیوہ بہن کے گھر میں آجانے سے ایک بار پھر وہی ماحول تھا ہر وقت گھمسان کا رن پڑا رہتا۔ آخر شائستہ نے اپنے منہ سے خود ہی طلاق مانگ لی۔ طلال نے بھی بغیر کسی ردوقدح کے بعد اسے طلاق دے دی تھی۔

دوسری طرف سارہ پر بلال کی حقیقت پوری طرح کھل چکی تھی۔ اور وہ بھی کب جب وہ ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی اور آدھے سے زیادہ بزنس بلال کے حوالے کر چکی تھی اور ابھی بھی سمجھوتے کی راہ پر چلتے زندگی گزار لیتی اگر جو اس کی زندگی میں وہ واقعہ نہ ہوا ہوتا۔ اسے کسی اجنبی نمبر سے ایک کال موصول ہوئی تھی اور اسے سن کر پہلے تو اسے دوسرے کی بات کا یقین ہی نہ آیا تھا' مگر کچھ تھا جو اسے کھٹک گیا تھا اور اسی کھٹک کی تصدیق کے لیے وہ گاڑی چلا کر تیزی سے مطلوبہ جگہ پہنچی تھی۔ مگر اپنے اندازوں کی اتنی بری تصدیق پر اسے اپنے اوپر ترس آیا تھا۔ ماں باپ کی مرضی کے خلاف کیے جانے والے فیصلوں کا ایسا ہی انجام ہوا کرتا ہے۔ واپسی کے تھکا دینے والے سفر میں اس نے سوچا تھا اور ایک بار پھر وہ تلخ یاد اپنی تلخی کے باعث اسے یہ سوچ کر رلا گئی کہ اس شخص نے کس قدر' بری طرح اس کا استعمال کیا تھا۔

کچھ دیر قبل موصول ہونے والی فون کال میں اسے بتایا گیا تھا کہ اس کا خاوند بلال جو اس سے شہر سے باہر جانے کا کہہ کر گیا تھا اسی شہر میں موجود تھا اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے ہمراہ' آج اس کی بیوی کی سالگرہ تھی۔ اسے اس بات کا یقین نہیں آیا تھا تاہم وہ ذہن میں رینگنے والے اس شک کو ختم کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی جو ابھی ابھی اس کے دماغ میں پیدا ہو کر رینگنے لگا اور لمحوں ہی میں اس نے ڈسنے والے ایک زہریلے اژدھے کی صورت اختیار کر لی تھی۔

"تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا بلال۔ تم نے کہا تھا کہ میری اس سالگرہ پر تم اس عورت کو طلاق دے کر مجھے تحفے کی صورت یہ خوش خبری سناؤ گے۔ بے شک تمہیں وہ پسند نہیں بے شک تم نے اس سے دولت کے لیے شادی کی ہو' لیکن جب سے وہ ہماری زندگی میں آئی ہے۔ دولت تو آئی ہے مگر سکون ختم ہو کر گیا ہے میرا۔ پہلے تم کہتے تھے ایک دفعہ اس کے بزنس پر قبضہ جمالوں پھر اسے چھوڑنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ اب وہ سب بھی ہو گیا تو کس بات کی دیر ہے؟ تم۔۔۔ نے وعدہ کیا تھا کہ تمہارے بچوں کی ماں صرف میں ہوں۔ اب۔۔۔ اب اولاد بھی پیدا کر لی تم نے اس سے' مجھے خوف آنے لگا ہے اب اس سے" "عورت جو شاید نہیں یقیناً" بلال کی پہلی بیوی تھی جو بڑے ناز سے لاڈ سے اس مرد سے دوسری عورت کے قسمت کے فیصلے کرنے پر زور دے رہی تھی۔ وہ تھوڑا سا آگے ہوئی۔ بلال کا جواب سننا تھا اسے۔ وہ سننا چاہتی تھی کہ جس مرد نے مسلسل تین سال اس سے محبت کا راگ الاپتے ہوئے گزارے اور گزشتہ ڈھائی تین سال سے وہ اس کے پیسوں پر عیش کر رہا تھا۔ وہ کیا جواب دیتا ہے۔

بلال کو اپنی بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے شرمندگی کا اظہار کرتے وعدہ کرتے ہوئے اس نے سنا کہ وہ بس جلد ہی قانونی طور پر سارہ کا پورا بزنس اپنے ہاتھ میں لے کر پھر جلد ہی وہ اسے چھوڑ دے گا باقی رہی بیٹی تو وہ محض سارہ کی ضد ہے اور اسی کی خواہش پر دنیا میں آئی ہے سوائے سارہ اور اس کی بیٹی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے مزید وہ ان کا ذکر کے اتنا خوب صورت دن خراب کرنے کی کوشش نہ کرے۔

"بہت خوب مسٹر بلال۔۔۔ بہت خوب۔۔۔" خود کو سنبھالتے اس نے بھڑا ہوا دروازہ پورا کھولا اور تالی بجا کر کہا۔ بلال اور اس کی بیوی کے چہرے اس کو دیکھ کر یک دم فق پڑ گئے تھے۔

"سارہ میری بات سنو۔۔۔ تم۔۔۔" بلال نے آگے بڑھ کر شاید اسے تھامنا چاہا یا آنسو پونچھنے چاہے مگر اس

نے اسے وہیں پر روک دیا۔

"بس بلال صاحب محبت کے نام پر جتنا میں نے بے وقوف بننا تھا بن لیا اور آپ نے جتنا لوٹنا تھا لوٹ لیا... اب بس۔ آئندہ میرے آفس میں قدم مت رکھنا اور کورٹ میں جانے کی نوبت لائے بغیر مجھے طلاق دو ورنہ ایک بار اگر میں عدالت چلی گئی تو طلاق تو تمہیں مجھے دینی پڑے گی سو دینی پڑے گی اور بھی بہت کچھ دینا پڑے گا جو میں اپنی بچی کے صدقے تمہیں اور تمہارے لالچی خاندان کو دان کرتی ہوں..." تیز تیز بولنے کی کوشش میں وہ ہانپ ہانپ گئی۔ اس میں مزید وہاں رکنے کی تاب نہیں تھی کہ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دماغ اور وجود ایک دھماکے سے پھٹ جائے گا۔

"آئی ایم سوری پاپا!" اس نے دل ہی دل میں پاپا کو مخاطب کیا۔ "دیکھیں تو میں نے آپ کا کہنا نہ مان کر کتنے خسارے کا سودا کیا۔" اس نے دل ہی دل میں اپنے مرحوم باپ کو یاد کیا۔ پتا نہیں کیسے ڈرائیو کر کے وہ ابتر حالت میں گھر پہنچی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں تو سخت پریشان ہوں۔ ایک دفعہ چھوٹی سے ذکر کر دیا تھا کہ حنا کو اپنے ٹیپو کی دلہن بناؤں گی۔ مگر اس نے تو گرہ سے باندھ لی یہ بات اور اپنی لڑکی کے الگ دماغ میں بٹھا دی بات۔ اب تمہارے بھائی نے الگ شوشا چھوڑا ہے کہ شادی کروں گا تو بشعوہ سے ورنہ عمر بھر شادی کا نام نہیں لینا۔ ادھر چھوٹی باتوں باتوں میں الگ سنا جاتی ہے کہ حنا کے رشتے آرہے ہیں اور اس کے چچا کا بیٹا تو کسی طور نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے' تم سب کو بلوانے کا مقصد یہی ہے کہ خدارا مسئلے کا حل نکالو۔" فضیلہ خانم ایک بار پھر بیٹیوں کے ہمراہ محفل سجائے بیٹھی تھیں۔ "اب بہن کے سامنے الگ شرمساری کا سامنا ہے مجھے' بھانجی الگ روٹھے گی۔"

"تو آپ کو کس نے کہا تھا کہ اپنی مرضی کے رشتے گانٹھنے بیٹھ جائیں۔ پتا بھی ہے اپنی اولاد کا جو کہہ دے پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔" یہ ان کی بڑی صاحبزادی کے خیالات تھے۔ "اور اماں... ویسے بھی ہمارا ایک ہی لاڈلا بھائی ہے بظاہر لاپروا اور کھلنڈرا مگر اندر سے بہت محبت کرنے والا' خیال کرنے والا' اکلوتا تھا' اتنے لاڈ اٹھائے گئے' کیا ہی کسی نے اپنے بچے کے اٹھائے ہوں گے مگر دیکھو کیسے چھوٹی سی عمر سے سب کچھ سنبھال لیا... اب اگر وہ بشعوہ کا کہہ رہا ہے تو آپ اسی سے ہی اس کی شادی کریں بس۔" یہ چھوٹی والی کے خیالات تھے جس کی ابھی چند دن قبل منگنی ہوئی تھی۔

ٹیپو لاڈلا اور پیارا تو ان کو شروع سے تھا مگر اس کی سب بہنوں کا خیال رکھنے کی عادت نے بہنوں اور ماں کے دل میں اس کی محبت کچھ زیادہ ہی کر دی تھی۔ حالانکہ درمیان میں کچھ سال ایسے بھی گزرے تھے جب لڑکپن کے دور سے گزرتے اماں کے بے تحاشا لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا تھا۔ اماں اس کے منہ سے نکلی ہر بات پورا کرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں اس چیز نے اس کے اندر نا سننے کا حوصلہ ختم کر دیا وہ ہر صورت اپنی خواہش پوری کروانا اپنا فرض سمجھتا تھا اور ایسے ہی ایک دو دفعہ بات نہ ماننے پر اس نے اپنے آپ کو نقصان بھی پہنچایا تھا ایک بار بہت ساری گولیاں پھانک کر' دوسری بار موٹر بائیک درخت سے ٹکرا دی تھی۔ تب ماموں ہی اس کی مورل سپورٹ کو آگے آئے تھے۔ انہوں نے کئی کئی گھنٹے بیٹھ کر اسے سمجھایا تھا پھر اس کا مطمح نظر جاننے کی کوشش کی تھی۔ اس نے کہا تھا اس کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا مگر وہ فارغ بھی نہیں رہنا چاہتا۔ تب ماموں نے اس کی مرضی کا احترام کرتے ہوئے اسے اپنے دوست کے شوروم میں بھجوا دیا تھا۔ وہاں اس نے تین سال گاڑیوں کی لین دین کا کام کیا تھا۔ پھر ماموں کے ہی مشورے سے اپنے کاروبار کا چھوٹے پیمانے پر آغاز کیا تھا۔ کاروبار نے اس میں خود اعتمادی کے ساتھ احساس ذمہ داری کو پیدا کیا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ وہی پانچ چھ سال پرانا ٹیپو ہے جو اماں کے بے تحاشا لاڈ پیار اور پابندی سے گھبرا کر الٹی سیدھی حرکتیں کیا کرتا تھا۔

بشعوہ کے دل میں اس کے خلاف پہلی گرہ تب پڑی تھی جب اس نے بارے باندھے ماموں کے کہنے میں آکر بمشکل ایف اے کا امتحان دے کر تعلیم کو خیرباد کہہ کر کاروباری سوجھ بوجھ میں پڑ گیا تھا جبکہ بشعوہ کے نزدیک تعلیم کی اہمیت ایسی تھی گویا سانس لینا اسے تو زہر لگتا تھا وہ' جب اس کے بھی کسی کارنامے کی اطلاع ملتی' اور پاپا ہمیشہ اس کا ہاتھ پکڑے اسے کچھ سمجھاتے نظر آیا کرتے تھے اور امی خاطر مدارت کرنے میں مصروف' کچھ عرصے پہلے اس نے اس کی نظروں کا خود کے لیے بدلنا بھی محسوس کیا تھا مگر وہ ہونہہ نکما انسان کہہ کر نظر انداز کر گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کل اس کا آخری پیپر تھا آج لائبریری میں کچھ کتابیں واپس کرنی تھیں پھر حسن سر نے کہا تھا کہ انہوں نے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ وہ لائبریری سے فارغ ہو کر ان کے آفس آگئی تھی۔ پیون کو چائے لانے کا کہہ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کیا بات ہے بشعوہ؟ اتنی کنفیوز کیوں لگ رہی ہیں مجھے جبکہ میں جانتا ہوں کہ آپ ایک اچھی اسٹوڈنٹ ہیں اور اچھے طالب علم' امتحانات کو کبھی بھی سر پر سوار نہیں کرتے۔" ان کی اتنی توجہ پر وہ نہال ہی ہو گئی۔

"ٹھیک کہا آپ نے سر... امی بھی ایسے ہی کہتی ہیں مگر جب تک ایگزیم سے فری نہ جاؤں ایک ٹینشن سی لگی رہتی ہے ساتھ۔"

"دس از ناٹ فیئر بھئی۔ میں تو آپ سے رابطہ بھی نہیں رکھ رہا کہ آپ کو ڈسٹرب نہ کروں اور آپ ہیں کہ فضول ٹینشن لیے بیٹھی ہیں جبکہ میں گارنٹی سے کہہ رہا ہوں کہ اس بار فرسٹ فائیو ٹاپرز میں آپ شامل ہوں گی ان شاء اللہ۔"

"سچ سر..." وہ بے تحاشا خوش ہو گئی... اتنے میں پیون نے چائے لا کر رکھی اور سرو کرتے وقت پتا نہیں غلطی سے چائے تھوڑی سی چھلک کر بشعوہ کے ہاتھ کو جلا گئی۔

"سی..." اس کے لبوں سے نکلنے کی دیر تھی کہ لمحوں میں کمرے کا خوابناک ماحول بدل گیا۔

"ذلیل انسان... اندھے ہو گیا...؟" بشعوہ کو اپنے ہاتھ کی تکلیف نے اتنا پریشان نہیں کیا جتنا سر کے پیون کی تحقیر کے لیے انداز اور الفاظ نے۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا غصے میں اس کی عزت نفس کو مجروح کرنے کے بعد سے آفس سے دفع ہو جانے کو کہا وہ بزرگ شخص۔

"سوری سر... سوری سر آئندہ ایسا نہیں ہو گا غلطی ہو گئی۔" کی گردان کرتا ہوا آفس سے باہر چلا گیا۔

"کیا ہوا بشعوہ؟ بہت جلن ہو رہی ہے کیا؟ دکھائیں۔" انہوں نے تشویش سے اس کا ہاتھ تھامنے کو اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"نہیں سر' ٹھیک ہے۔" پتا نہیں کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو آگئے۔ آنکھوں کے سامنے ایک لمحے میں اس بزرگ کا چہرہ گھوم گیا۔

"آپ کو ان کو ایسے نہیں ڈانٹنا چاہیے تھا۔ غلطی میری تھی۔"

"ارے چھوڑو بھئی۔ ان غریب لوگوں کو سر پر نہیں چڑھانا چاہیے اس نے غلطی کی تھی اور اسے سزا ملنی چاہیے تھی ابھی تو میں آپ کی وجہ سے چپ کر گیا... سارا موڈ خراب کر دیا اس فضول شخص نے... آپ اپنا موڈ ٹھیک کریں پھر آپ کو بتاؤں کہ آپ کو کیوں بلایا تھا۔" وہ پھر سے وہی پہلے والے نرم خو سے سر حسن تھے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ چونکہ ان کے والد تو ہیں نہیں سو وہ اس کے امتحان کے فوری بعد اس کے پاپا سے ملنے آنے والے ہیں۔ اتنی بڑی اور خوشی کی خبر نے جس کا بشعوہ کو بے چینی سے انتظار تھا' ویسے خوش نہیں کیا جتنا ہونا چاہیے تھا۔

"میں اپنے پیرنٹس سے بات کر لوں پھر آپ کو بتا دوں گی کہ کب آئیں۔" پھر کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "میں چلتی ہوں سر اب... بہت

دیر ہو گئی ہے۔"

"کیا آپ کو میری بات سے خوشی نہیں ہوئی یشرہ؟"

"نن..... نہیں سر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس آج طبیعت ٹھیک نہیں تھی سر میں درد تھا۔"

"اوہ..... تو چلیں میں چھوڑ دیتا ہوں....." وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور میز پر سے گاڑی کی چابیاں اٹھالیں۔

"نہیں سر..... تھینکس آپ تکلیف نہ کریں۔ میں ڈرائیور کے ساتھ گاڑی پر آئی ہوں۔ وہ ویٹ کر رہا ہے باہر۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ مجھے آپ کی کال کا انتظار رہے گا۔" انہوں نے بے تابی سے کہا وہ پھیکا سا مسکرا کر باہر نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

سارہ ان کے پرپوزل پر ایک لمحے کو ششدر رہ گئیں۔ بلال ان کی توقع سے زیادہ بزدل نکلا تھا اور ایک ہفتے کے اندر اندر طلاق بھجوادی تھی شاید ان کے عدالت جانے کی دھمکی سے ڈر گیا تھا۔ اور آسانی سے حاصل کیا گیا وہ سب کچھ گنوانے کی ہمت نہیں تھی اس کے اندر۔ ایسی باتیں بھلا چھپتی کب ہیں اور اس رشتہ کے ختم ہونے کے ٹھیک دس ماہ بعد طلال احمد نے ان سے شادی کی درخواست کی تھی۔ وہ تو یہ جان کر حیران رہ گئی تھیں کہ وہ شخص کئی سال سے ان کی خاموش محبت میں گرفتار تھا۔ پھر انہوں نے سارہ کے والد کی خواہش، اپنی ان کے لیے محبت، مجبوری کی شادی سب کچھ سچ سچ بتادیا تھا۔

"میں ایک بار حالات کی زد میں آکر مجبور ہو گیا تھا اور آپ کو کھو دیا تھا اب دوسری بار یہ بزدلی نہیں دکھانا چاہتا۔" انہوں نے کہا تھا اور اپنی بیوی کی طلاق اور وجہ کو بھی ان کے سامنے عیاں کردیا تھا۔ اور پوری زندگی دوسری شادی نہ کرنے کا عہد پتا نہیں کیسے خود بخود ٹوٹ گیا تھا۔ اپنے پاپا کی نافرمانی کا ازالہ کرنا مقصود تھا یا طلال احمد کے لہجے میں بولتی سچائی کہ انہوں نے ہاں کردی تھی اور جلد ہی دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے تھے۔ طلال احمد نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے دوسرے پورشن میں ضروری ضروری تعمیرات کروا کے اپنی بہن کو بچوں سمیت وہاں منتقل کردیا تھا۔ اپنی بہن کی فطرت اور زبان کی تیزی سے واقف تھے سو اسی میں عافیت جانی تھی۔ مگر ان کی خبر گیری کرنا ہرگز نہیں بھولے تھے۔

شادی کے بعد سارہ نے اپنے پاپا کا بزنس خود ہی سنبھالے رکھا تھا کہ بلال کی طرف سے دیے گئے دھوکے کے زخم ابھی بھی ہوا دیتے تھے مگر جیسے ہی طلال احمد کی پرخلوص رفاقت اور محبت نے ان زخموں پر مرہم رکھا انہوں نے سب کچھ طلال احمد کے حوالے کر کے ساری توجہ اپنے گھر اور بیٹی کی پرورش پر مرکوز کردی۔

☼ ☼ ☼

"ہرگز نہیں امی، آپ میری نیچر کو جانتی ہیں پھر بھی ایسی بات کررہی ہیں مجھے وہ شخص ایک آنکھ نہیں بھاتا اور ان کے گھر کا ماحول دیکھ کر طبیعت گھبرانے لگتی ہے بڑی عجیب سی فطرت کے ہیں سب' شور مذاق' ہلا گلا۔ کھانا پینا بس یہی موٹو ہے اس فیملی کے ہر فرد کا۔ میں نہیں ایڈجسٹ کرسکتی ویسے بھی مجھے امی حوالے سے آپ کو کسی سے ملوانا تھا۔ اچھا ہوا آپ نے خود ہی بات کردی۔"

پھپھو ابھی کل ہی تو ٹیپو کے لیے بھائی کے پاس ہاتھ پھیلا کر یشعرہ کا ہاتھ مانگنے آئی تھیں' مگر ماموں نے متانت سے کہا تھا کہ ٹیپو ان کا اپنا بچہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی اور نہیں ہیں ان کے لیے' مگر وہ یشعرہ سے پوچھے بغیر' اس کی مرضی جانے بغیر ہاں نہیں کرسکتے۔ کل چونکہ وہ تھکی ہوئی تھی آکر فورا" کھانا کھا کر ایسی سوئی کہ شام کی خبر لائی تھی۔ آج امی نے اسے بتایا تو اس نے فورا" ہی ٹیپو کے لیے انکار کرتے ہوئے فورا" ہی پروفیسر حسن کا ذکر بھی کرڈالا تھا۔

"وہ بہت اچھے ہیں' امی! بالکل میرے آئیڈیل کے مطابق' سویلائزڈ۔ پولائٹ۔ کوالیفائیڈ۔" پتا نہیں

کون کون سی خوبیاں گنواتے ہوئے وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹی تھی۔

"ٹھیک ہے بیٹا' مل لیں گے' مگر آپا (پھپھو) کا گھر ہمارا دیکھا بھالا ہے اور ٹیپو ہمارا اپنا بچہ۔ سلجھا ہوا شریف' نیک اور باادب۔ سب سے بڑھ کر یہ امی کی خواہش ہے۔" اس کے نرم بالوں میں ہاتھ پھیرتے انہوں نے اسے قائل کرنا چاہا کہ بہرحال ٹیپو کے ساتھ یشعرہ کا رشتہ طے ہو جاتا' یہ بات وہ دل سے چاہتی تھی' مگر اب یشعرہ کسی پروفیسر سے ملنے پر زور دے رہی تھی اور اس کا لہجہ بتارہا تھا کہ معاملہ پسند سے بھی آگے کا تھا۔

"افوہ امی۔ آپ کے نزدیک جو خوبیاں ہیں اس شخص کی' میرے نزدیک سرے سے کچھ نہیں ہیں۔ کیا کہہ کر تعارف کراؤں گی اس کا' بالفرض اگر ہو بھی جاتا ہے ایسا تعلیم ہے اس کے پاس' کوئی ایک ڈگری معاشرے میں مقام بنانے کو نہ سہی نام کو ہی سہی۔ تعلیم ہے تو الیف اے وہ بھی رو پیٹ کے۔ سنجیدگی چھو کے نہیں گزری چھچھورپن اسی پہ شروع' اسی پر ختم ہے۔ کوئی ایک عادت بھی تو ایسی نہیں جس کے بارے میں سوچ کر میں ہاں کہہ دوں۔ آپ کو مجھ سے پوچھ کر جواب دینے کا کہنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ انکار کردینا چاہیے تھا۔" وہ اب اٹھ بیٹھی تھی اور خفگی سے ماں کو اپنی ناپسندیدگی کے متعلق بتارہی تھی۔

"اچھا بیٹا..... جیسی تمہاری مرضی..... بلالو پروفیسر صاحب کو کسی دن۔ میں آپ کے پاپا سے بات کرتی ہوں۔" انہوں نے آہستہ سے کہا۔ بیس سال پہلے کے وہ حالات اور الفاظ گویا مجسم ہو کر ان کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے جب انہوں نے یونہی پاپا سے بحث کر کے' دلائل دے کر اپنی بات منوالی تھی۔

"کاش یہ بات اگر بچے وقت پر جان جائیں کہ والدین کبھی بھی اولاد کا برا نہیں چاہتے اور ان کی دور رس نگاہیں وہ تک جانچ لیتی ہیں' جس پر بچے اپنی محبت کا پردہ ڈال کر چشم پوش بنے ہوتے ہیں تو ان کو وقت گزر جانے کے بعد پچھتانا نہ پڑے۔" انہوں نے سوچا اور اٹھ کر یشعرہ کے کمرے سے باہر آگئیں۔

شام کو انہوں نے طلال احمد کو بتا کر ان سے مشورہ مانگا تھا۔ وہ خود بھی فکر مند ہو گئے تھے۔ "میں تو یشعرہ کے حوالے سے ٹیپو کا سوچ کر بے حد مطمئن ہو گیا تھا کہ اپنی بچی اپنوں میں ہی' نظروں کے سامنے رہے گی۔" انہوں نے طویل سانس لی۔ مگر اب یشعرہ کی پسند کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ بہرحال مرضی اسی کی چلے گی۔

بچوں پر اپنی مرضی مسلط کر کے بعض دفعہ والدین انہیں ایک ان دیکھے برزخ میں دھکیل دیتے ہیں جس میں جلنے سے بعد میں نہ انسان خود کو روک سکتا ہے نہ ہی وہ چاہنے والے والدین' جنہوں نے اپنی دانست میں صحیح فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ میں نے گزارے ہیں اس برزخ میں وہ سال جنہوں نے روح کو ایسے جلایا تھا کہ دھواں آج بھی اٹھتا ہے....." وہ کسی غیر مرئی نقطے کو تکتے ہوئے بول رہے تھے۔ "اور میں اپنی بچی کو ایسے کسی عذاب میں نہیں ڈالوں گا۔ جیسا وہ چاہے گی ویسا ہی ہوگا' میری اماں' بیٹے پر اپنا فیصلہ مسلط کرنے کا احساس جرم اور اس کی ناکام زندگی کا غم لیے قبر میں اتر گئیں اور میں ایسا کوئی احساس جرم لیے مرنا نہیں چاہتا۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے یشعرہ کو اپنی اولاد کی طرح چاہا ہے' اسی نے آکر میری بے اولادی کے اس خلا کو پر کیا جو میرے نصیب میں ازل سے لکھ دیا گیا تھا' میں اس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہونے دوں گا۔" انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

یشعرہ نے پروفیسر حسن کو کال کر کے ساری صورت حال بتائی تھی اور کہا تھا کہ وہ جلد از جلد آکر اس کے پاپا سے ملیں۔ شام کو انہوں نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یشعرہ نے یونیورسٹی سے پریکٹیکلز سلپ لینے جانا تھا آج' پاپا کو جلدی تھی سو وہ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی جاچکے تھے' اس نے امی کو کہا تو انہوں نے ٹیپو کو فورا"

فون کردیا کہ اس کو بھی لے جائے۔ یشعرہ کو سخت غصہ آیا۔ "جب جانتی بھی ہیں زہر لگتا ہے مجھے وہ شخص پھر بھی۔۔۔" امی کو فون کرتے دیکھ وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔ "خیر آج آجائے ذرا اس نے حساب بھی برابر کرنا ہے۔" اس نے دل میں سوچا، کچھ ہی دیر بعد ہنستا، مسکراتا بے حد فریش نظر آتا ٹیپو سامنے تھا۔ وہ ناشتا کرکے آیا تھا، مگر پھر بھی امی کی بنی چائے پینے کے لیے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس کی گاڑی میں اس کے ساتھ موجود تھی۔

"گاڑی تو شان دار لی ہوئی ہے۔" توصیفی نظروں سے اس نے گاڑی کو دیکھا۔ ٹیپو نے اس کی نظروں میں چھپی ستائش کو جان لیا جب ہی خوش ہو کر بولا۔

"اچھی ہے نا! مجھے پتا تھا تمہیں پسند آئے گی۔ مجھے تو بائیک ہی پسند ہے، مگر تمہیں بائیک پر بیٹھنا نہیں پسند اس لیے لی ہے۔"

"تمہیں کوئی ضرورت نہیں میرے لیے اتنی تکلیف کرنے کی۔ میرے پیرنٹس الحمدللہ حیات ہیں، وہ سوچ سکتے ہیں میرے بارے اور میری خواہشات بھی پوری کرسکتے ہیں۔" وہ تڑخ کر بولی، مگر اس کی بات پر بجائے غصہ ہونے کے وہ ہنس پڑا۔

"افوہ بھئی یشعرہ! بڑی اسکالر بنی پھرتی ہو۔۔۔ یہ بھی نہیں پتا کہ شادی کے بعد لڑکی کی ذمہ داری اس کا شوہر اٹھاتا ہے اور خواہشات بھی وہی پوری کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں نے اس کام کا بیڑہ وقت سے ذرا پہلے اٹھالیا ہے۔"

یشعرہ کا دل چاہا اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ سے لے کر گاڑی کو کسی درخت میں دے مارے۔ "تم۔۔۔ تم پہلے گاڑی روکو۔۔۔ میری بات سنو۔" غصے سے لال پیلی ہوتے اس نے کہا۔

"کیوں بھئی گاڑی کیوں روکنی ہے۔۔۔ پھر غصہ کروگی کہ لیٹ ہوگئی ہوں۔" اس کا اطمینان اور سکون اسی طرح برقرار تھا۔

"تمہیں یہ خوش فہمی کب اور کیونکر لاحق ہوئی کہ میں تم سے شادی کروں گی۔" دانت پیس کر کہا گیا۔

"جب سے دل میں تمہاری محبت نے جنم لیا۔" جواب بے حد آسان اور سادہ تھا۔

"چلو پھر آج تمہاری اس خود ساختہ خوش فہمی کا خاتمہ میں خود کیے دیتی ہوں۔ تمہیں بھلے مجھ سے محبت ہے یا جو بھی۔۔۔ میرے دل میں تمہارے لیے رتی برابر بھی ایسی کوئی بات یا جگہ نہیں کہ میں تم سے شادی تو دور تمہارے بارے میں سوچ بھی سکوں۔ ویسے بھی تم جیسے غیر سنجیدہ لوگ مجھے سخت ناپسند ہیں۔ ان کے ساتھ میں کچھ وقت نہیں گزار سکتی کجا کہ اپنی پوری زندگی گزارنا۔" وہ ونڈ اسکرین کو دیکھتے بول رہی تھی، ساتھ بیٹھے شخص کے دل کی حالت کا اندازہ کیے بغیر۔

"دولت تمہاری زندگی میں فرسٹ چوائس ہوگی میرے لیے اس شخص کی اہمیت ہے جو تعلیم میں مجھ سے زیادہ نہیں تو میرے ہم پلہ ضرور ہو۔ زندگی کس کے ساتھ گزارنی چاہیے یا وہ شخص کیسا ہونا چاہیے؟ ہر شخص نے ہی اپنے ہمسفر کے حوالے سے ایک خاکہ تراش رکھا ہوتا ہے اور میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے اپنا آئیڈیل پالیا ہے۔" اپنے آئیڈیل کا ذکر کرتے اس کے لہجے کی تیزی، نرمی میں بدل گئی۔

"امید ہے تم نے میری بات کا برا نہیں منایا ہوگا۔ صرف دس منٹ کا کام ہے میرا۔ تم ویٹ کرو میں ابھی آتی ہوں۔" بغیر اس کی جانب دیکھے وہ نیچے اتر گئی۔ ٹیپو نے اپنے گلاسز اتار کر ڈیش بورڈ پر رکھے۔ سرخ ہوتی آنکھوں کو مسلا اور سیٹ بیک سے کمر ٹکا کر آنکھیں موندلیں۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ اسے اتنا ناپسند کرتی ہے کہ اگر کچھ وقت مجبوری میں گزارنا بھی پڑجائے، وہ اس پر گراں گزرتا ہے۔

"تو کیا انسان کا اخلاق، کردار، شخصیت کچھ نہیں ہے سب کچھ تعلیم ہی ہے۔" مانا کہ ایک کمی رہ گئی مجھ میں، مگر ایک کمی کو بہت سی خوبیوں پر حاوی کرلینا کہاں کا انصاف ہے یشعرہ بلال، مگر تمہاری نظر میں وہ خوبیاں ہوں تب نا۔" اس نے خود اذیتی سے سوچا۔

پروفیسر حسن بھی اپنے آفس سے نکلتے دکھائی دے گئے تھے۔ وہ رات ہی ان کو بتا چکی تھی کہ پاپا نے انہیں آج

بڑایا ہے۔

"آج کس کے ساتھ آئی ہیں یشعرہ؟" پارکنگ میں گاڑی پارک کرتے وقت انہوں نے یشعرہ کو اس خوبرو لڑکے کی گاڑی سے اترتے دیکھا تھا ان کے ماتھے پر اسی وقت شکنیں پڑی تھیں۔

"میرا کزن ہے سر۔ پاپا آج جلدی چلے گئے تو ان کے ساتھ آئی ہوں بلکہ جب جب پاپا کو آفس جلدی جانا ہو ٹیپو ہی ڈراپ کرتا ہے مجھے... کیوں خیریت؟" ان کے ساتھ چلتے چلتے رک کر اس نے پوچھا۔

"ہاں... نہیں کچھ بات تو نہیں لیکن جب سے آپ کو اپنے حوالے سے دیکھنا شروع کیا ہے۔ کسی دوسرے شخص کی آپ میں توجہ مجھے بہت ڈسٹرب کرتی ہے اور یقیناً" اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" انہوں نے کچھ الجھ کر کہا تو یشعرہ ان کی اتنی محبت کا سوچ کر مسرور ہو گئی۔

"ارے سر ایسی کوئی بات نہیں ہے وہ جسٹ میرا کزن ہے۔"

"اور آپ بھول گئیں کہ آپ کا امیدوار بھی ہے' یہ بھی آپ نے ہی بتایا تھا۔" وہ درخت سے ٹیک لگا کر سنجیدگی سے بولے۔

"اور میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں نے اپنے پیرنٹس کو منع کر دیا ہے کہ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اس لیے تو آپ کو بلایا ہے آج۔" وہ احتجاجاً" بولی۔

"اٹس اوکے' مگر آپ خیال رکھیے گا کہ میں اپنی چیزوں کے حوالے سے بہت پوزیسیو ہوں' امید کرتا ہوں آئندہ آپ مجھے اس شخص کے ساتھ نظر نہیں آئیں گی۔ آئیں آپ کو گھر چھوڑ دوں..." کہہ کر وہ اس سے دو قدم آگے ہو لیے۔ "تھینکس سر... مگر مجھے میرے کزن نے ہی گھر ڈراپ کرنا ہے۔ شام کو ملیں گے۔" ایک بار پھر ان کی بات سے الجھتی وہ پارکنگ کی طرف چل دی۔ جاتے ہوئے وہ جتنی خوش تھی آتے ہوئے اتنی ہی پژمردہ۔

"کیا خیال ہے؟ آئس کریم نہ کھائی جائے میری نئی گاڑی کی خوشی میں... تمہارا شاید کسی سے جھگڑا ہوا ہے جب ہی موڈ خراب ہے' موڈ بھی تھوڑا بہتر ہو جائے گا۔" اس پر ایک نظر ڈال کر ہی اس کے چہرے کی پژمردگی سے وہ بے چین ہو گیا اور اپنی سرخ آنکھوں پر گلاسز لگاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اور یشعرہ سے پوچھا۔ اس بات کو بھول کر کہ وہ اپنے سخت لہجے اور تلخ الفاظ سے اس کے دل کی کچھ دیر قبل کتنے ٹکڑے کرکے گئی تھی جن کی کرچیاں چنتے چنتے وہ کتنی ہی دیر بے حال رہا تھا' یہ خیال ہی روح کھینچ لینے والا تھا کہ اس کے دل میں اس کے لیے بے زاری کے سوا کچھ نہیں اور وہ اپنی زندگی کا ساتھی بھی چن چکی ہے۔

"نہیں ٹیپو! گھر چلیں... پھر تم اپنے کام سے لیٹ ہو جاؤ گے۔" اس کے تھکے تھکے لہجے پر وہ مزید پریشان ہو گیا۔

"نہیں بھئی میرے بغیر کام رکتا نہیں' ملازم ہیں وہاں... تم یہ بتاؤ کیا بات ہوئی ہے۔ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟" یشعرہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ "تو کیا سر کا جو رویہ مجھے الجھن میں ڈال رہا ہے اس کی پریشانی اتنی طاری ہے مجھ پر کہ میرے چہرے سے کھوج لیا اس نے۔" دل ہی دل میں سوچتے اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھپتھپایا۔

"نہیں کچھ نہیں ہے... اور..." وہ کہتے کہتے رکی۔

"آئم سوری ٹیپو! صبح میں کچھ زیادہ ہی بول گئی۔" شرمندگی سے سر جھکایا۔

"شرمندگی کیسی... انسان کو ایسا ہی صاف دل ہونا چاہیے دل کی ہر بات منہ پر کہنے والا' تم نے تو صرف اپنی پسند' ناپسند بتائی ہے' کوئی بدتمیزی نہیں کی جس پر تمہیں شرمندہ ہونا پڑے۔" اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا جب ہی ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر گاڑی کی اسپیڈ تیز کر دی۔

☆ ☆ ☆

شام کو پروفیسر صاحب اپنی والدہ کے ہمراہ چلے آنے پر

حاضر تھے۔ ان کی شخصیت سے قطع نظر ان کی والدہ بے حد کم گو اور سادہ تھیں سب کو دو گھنٹے کی اس نشست میں زیادہ تر پروفیسر صاحب ہی نے اپنی گفتگو' اپنی جاب' کام اور تعلیم سے ان کا عشق کے بارے میں ہی بات کرتے رہے تھے۔ بظاہر سب ٹھیک تھا' مگر طلال احمد نے پھر بھی رسمی طور پر وقت مانگا تھا ان سے۔ تاہم پروفیسر حسن' طلال صاحب کے رویے سے پرامید ہو کر گئے تھے اور اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دی تھی' جسے طلال صاحب نے خوش دلی سے قبول کر لیا تھا۔

"آپا بہت ناراض ہیں مجھ سے اور یشعرہ کا رشتہ کسی اور جگہ پر کرنے کی صورت میں قطع تعلق کی دھمکی بھی دی ہے۔ پروفیسر صاحب بھی عمر میں بڑے ہیں یشعرہ سے اس کے علاوہ اور کوئی پرابلم نہیں ہے... مگر میں نے ابھی صرف ہاں کی ہے... شادی میں تب کروں گا جب ٹیپو کی شادی کسی اچھی جگہ پر ہو جائے گی اور آپا کا غصہ بھی تھوڑا کم ہو گا۔ وہ ماں کی جگہ پر ہیں میرے لیے اور ان کے بغیر میں بیٹی کی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے پروفیسر صاحب سے کچھ وقت مانگ لیا ہے۔" طلال صاحب اور سارہ' پروفیسر حسن کے گھر ہو آئے تھے' پوش علاقے میں بنا وہ خوب صورت گھر انہیں پسند آیا تھا جہاں وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہتے تھے۔

"ٹھیک کہتے ہیں آپ... میں بھی سمجھاؤں گی آپا کو کہ جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں پھر اولاد کی مرضی جہاں نہ ہو وہاں ہم زور زبردستی سے کیسے کام لے سکتے ہیں۔ اگرچہ ٹیپو بہت پیارا بچہ ہے مجھے بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اس نے۔" سارہ نے کہا تو طلال احمد ہوں... کر کے رہ گئے۔

پروفیسر صاحب نے اسے ڈنر کے لیے انوائٹ کیا تھا' مگر یشعرہ نے انکار کر دیا تھا۔

"سوری سر... پاپا اس بات کو پسند نہیں کریں گے پھر ہمارے گھر کا ماحول بھی ایسا نہیں ہے۔"

"اوہ یار جب سے بات طے ہوئی ہے' تم ایک بار بھی نہیں ملیں۔ اکٹھے باہر جا کر کھانا کھانا کوئی ایسی معیوب بات نہیں کہ ان کو کوئی ایشو ہو گا' میں اس خوشی کو سیلیبریٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اور فوری شادی کے لیے کیوں منع کر دیا ہے جب کہ تمہاری ایجوکیشن بھی کمپلیٹ ہے اب..." وہ جھنجلائے۔

"پتا نہیں سر... مگر کیا آپ کو اس بات کی خوشی نہیں کہ کسی ظالم سماج کے درمیان میں آئے بغیر ہم ایک ہو گئے... شادی بھی بہت لیٹ نہیں بس چھ سات ماہ کا وقت مانگا ہے پاپا نے... کچھ فیملی ایشوز ہیں ان کو سولو کرنا ہے اس لیے۔" یشعرہ نے کہا۔

"اچھا بھئی ٹھیک ہے پھر یونیورسٹی آکر ملو مجھ سے... کوئی بھی بہانا کر کے... کچھ بھی... میں کل گیارہ بجے تمہارا منتظر رہوں گا۔" انہوں نے دھونس سے کہہ کر کال ڈراپ کر دی۔ یشعرہ نے بے بسی سے موبائل کو دیکھا۔ کبھی کبھی سر حسن کی اپنی من مانی کرنے والی عادت اسے بہت ناگوار گزرتی تھی۔ پہلے تو چلو کسی نہ کسی لیکچر کے پوائنٹس سمجھانے ہوتے یا اسٹڈیز کے حوالے سے کوئی اور کام ہوتا وہ بے دھڑک ان کے آفس میں چلی جایا کرتی تھی اور اسٹوڈنٹس بھی ہوتے تھے۔ اب جب یونیورسٹی کا بہانا ہی نہیں تھا وہ کیسے اور کس طرح جاتی۔ اگرچہ امی اور پاپا کی طرف سے اس پر کہیں بھی جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی' مگر یہ خود اس کو مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ خیر اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک دفعہ ان کو مل کر بتا دے گی کہ آج تو وہ آگئی ہے' آئندہ وہ محتاط رہے گی۔ سر حسن کی ٹیپو کے حوالے سے پچھلی تنبیہہ یاد تھی سو اس نے لوکل سے ہی جانے کو ترجیح دی تھی۔

پاپا کے جانے کے بعد اس نے امی سے کہا تھا کہ یونیورسٹی کے کچھ ڈیوز کلیئر کرانے رہ گئے ہیں وہ کرائے بغیر رزلٹ نہیں ملے گا۔ اور اپنی دوست کے ساتھ جانے کا بہانہ کر کے وہ باہر آگئی تھی۔ اگرچہ صرف ایک شخص کے لیے اسے اتنے جھوٹ بولنے میں عجیب سا محسوس ہو رہا تھا کہ ایسی اس کی فطرت تھی نہ تربیت' یونیورسٹی پہنچ کر اپنی کلاس کے ایک دو

اسٹوڈنٹس سے بھی ملاقات ہوئی تھی جو کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں یونیورسٹی آئے ہوئے تھے۔ حماد اس کی ٹکر کا ہی ٹاپر لڑکا تھا۔ اسی سے پانچ منٹ پیپرز اور رزلٹ کے حوالے سے بات ہوئی تھی اس کی اور وہ نہیں جانتی تھی کہ اس دن ٹیپو کے ساتھ آنے پر غصہ کرنے والے پروفیسر صاحب ایک کلاس فیلو سے رسمی سی ملاقات کو اتنا کا مسئلہ بنائے بیٹھے ہوں گے۔

"یہ اہمیت ہے آپ کے نزدیک میری کہ جس بات سے میں آپ کو منع کرتا ہوں آپ اسی کو بار بار کرکے بتا نہیں کیا ثابت کرتی ہیں۔ میں صبح سے انتظار کی گھڑیاں گن گن کر گزار رہا ہوں اور آپ ہیں کہ فضول لوگوں سے سرراہ آدھے گھنٹے سے گپ شپ میں مصروف ہیں' جانتی بھی ہیں اس لڑکے کی ریپوٹیشن کو۔ ایک نمبر کا فلرٹ لڑکا ہے وہ۔" وہ بڑی خوش خوش ان کے آفس میں داخل ہوئی تو اس کے سلام کے جواب میں اسے ایسی سخت سست سننے کو ملی کہ وہ کچھ دیر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ اپنے گھر میں بے حد لاڈلی بچی تھی کسی نے اس سے اس لہجے میں بات کرنا تو کجا اسے ڈانٹا تک نہ تھا مگر وہ تھے کہ ہر بار اس کے ساتھ کچھ ایسا کرتے کہ وہ سوچتی کہ وہ کیسے برداشت کر گئی اور کیوں؟ جواب بہت سیدھا اور واضح تھا کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کے لیے سب کچھ برداشت کر سکتا ہے۔

"آدھا گھنٹہ نہیں صرف پانچ سات منٹ کی تھی میں نے اس سے وہ مجھے وش کر رہا تھا کہ اللہ کرے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ٹاپ آپ ہی کریں۔ اور مجھے پتا نہیں تھا کہ اتنی شدت سے اور اصرار سے آپ مجھے جس بات کے لیے بلا رہے ہیں وہ یہ بات ہوگی تو میں ہر گز یہاں نہ آتی۔" کچھ دیر ان کی کلاسز میں جھانکتی۔ غصہ کے تاثر والی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور جانے کے لیے واپس مڑ گئی۔

"اف... ادھر آئیں آپ یشعرہ... ایک تو یہی جذباتی پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے نوجوان نسل میں... بتایا بھی آپ کو... اپنے سے منسلک لوگوں کے متعلق میں بہت حساس ہوں اور ان کی کسی بھی طرف غیر معمولی توجہ مجھے نہایت ناگوار گزرتی ہے۔ اور اس چیز پر میرا اپنا بس نہیں ہے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لائے اور کرسی پر بٹھا کر خود دوسری کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھ گئے۔

"مجھے آپ کا یہ رویہ پسند نہیں ہے سر انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کا اعتبار کرنا چاہیے کیونکہ اعتبار ہی محبت کا نقطہ آغاز اور نقطہ بنیاد ہے چاہے رشتہ کوئی بھی ہو۔ آپ بھی سارا دن مختلف اسٹوڈنٹس میں گھرے ہوتے ہیں جن میں لڑکیاں زیادہ ہوتی ہیں لیکن میں نے تو کبھی ایسی بات نہیں سوچی۔" اس نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کروالیا۔

حقیقت میں اسے سر حسن جیسے میچور اور سلجھے ہوئے شخص سے ایسے بچکانا رویے کی ہرگز امید نہیں تھی۔ سمندر کی طرح انسان کی گہرائی کا اندازہ بھی اس میں اترے بغیر' اس کی ذات کو کھوجے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس کے سامنے یہ اس سر حسن سے مختلف سر حسن تھے جن کو وہ سال بھر پہلے سے جانتی تھی اب ان سے رابطہ اور آشنائی بڑھائی تو ان کے رویوں کی ایک اترتی پرت اسے حیران کرتی تو دوسری پرت اترنے پر وہ پریشان رہ جاتی۔ ان باتوں سے قطع نظر ان سے اس کی محبت جوں کی توں تھی۔

"اوکے... اوکے آئی ایم سوری۔ مجھے اس طرح ہارش نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ٹھیک ہے آئندہ تھوڑا سا خیال تم میرے جذبات کا رکھنا' تھوڑا سا میں رکھوں گا۔ اب موڈ ٹھیک کرو تو میں نے ایک سرپرائز دینے کے لیے بلایا ہے تمہیں..." وہ اسی نرم اور خوب صورت لہجے میں بولے جو حصار میں لے کر اسے مسحور کردیا کرتا تھا۔ میں تو چاہتا تھا ہماری یہ ملاقات ایک خوب صورت سے خواب ناک ماحول میں ہوتی جہاں کینڈل لائٹ ڈنر میں ہمارے اس بندھن میں بندھنے کی خوشی میں میں تمہیں انگوٹھی پہناتا۔" ان کا مخمور لہجہ یشعرہ کا سارا غصہ بہا لے گیا۔ آج انہوں نے اسے پہلی بار "تم" بلایا تھا پھر دھیرے سے ایک نازک سی

رنگ اس کی انگلی کی زینت بنادی۔ صرف یہی نہیں انہوں نے اسے ڈراپ بھی کیا تھا اور دوبارہ جلدی ملنے کی درخواست بھی کی تھی۔

"میرا روز روز ایسے آپ سے چوری چھپے ملنا مجھے خود پسند نہیں ہے سر امید ہے آپ میری بات کو سمجھ لیں گے۔ ہاں اگر آپ گھر آکر ای پاپا کی موجودگی میں مجھ سے ملیں گے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" وہ آہستہ سے کہہ کر اتری تو پروفیسر حسن پہلے کچھ کہنے لگے مگر اس کا قطعی انداز دیکھ کر چپ رہ گئے۔

"ٹھیک ہے جناب۔ اور کوئی حکم۔" انہوں نے شگفتگی سے کہا۔

"نہیں... مجھے آپ کا انتظار رہے گا۔" اس نے کہا۔

"اوکے وش یو بیسٹ آف لک۔" انہوں نے کہا اور گاڑی اڑا لے گئے۔ یشعرہ اپنے گھر سے پہلے اتری تھی۔ آج کی ملاقات نے اسے پہلے افسردگی اور پھر سرشاری دی تھی۔

☆ ☆ ☆

پھپھو کی بیٹیاں آج پھر ان کے گھر جمع تھیں۔ ٹیپو آج کل بے حد چپ رہتا تھا اور جب طلال احمد نے مناسب لفظوں میں ان سے معذرت کرلی تھی کہ یشعرہ کی خواہش کسی تعلیم یافتہ بندے کی ہے اور ایک مناسب رشتہ ہے بھی سہی۔ وہ دل میں خوش ہو گئی تھیں مگر جب مسلسل گم صم ٹیپو کو دیکھا تب جا کر باقاعدہ بھائی سے اچھا خاصا جھگڑا کر کے آئی تھیں۔ یشعرہ جتنی بھی ناپسند سہی ٹیپو میں ان کی جان بند تھی کچھ بیٹیوں نے بھی سمجھایا تھا کہ زندگی اسی نے گزارنی ہے تو پسند بھی اسی کی ہونی چاہیے انہوں نے بہن سے ٹیپو کی مرضی نہیں ہے کہہ کر ناراضی بھی مول لی تھی۔ اب جب جب ٹیپو کو دیکھتیں' ہول کر کلیجے پر ہاتھ رکھ لیتیں وہ یشعرہ کی بات طے ہونے کی خبر سن کر جیسے بولنا اور ہنسنا بھول گیا تھا۔

"دیکھو تو ذرا میرے بچے کا اتنا سا منہ نکل آیا ہے۔ نہ کھانا پینا ٹھیک سے ہے' نہ بولتا ہنستا ہے پہلے کی طرح۔ اے یشعرہ خدا پوچھے گا تم سے کبھی خوش نہیں رہو گی تم میرے بچے کا دل دکھایا ہے' ایک ماں کا دل دکھایا ہے' یہ ایک دکھے دل کی ماں کی بددعا ہے۔" انہوں نے صوفے پر لیٹے ٹیپو کو دیکھا جو کافی دیر سے ایسے ہی لیٹا ہوا تھا۔ پاؤں کا مسلسل ہلنا اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ جاگ رہا ہے مگر آنکھوں پر ایک بازو دھرا تھا۔

"اوفوہ اماں' کتنی بار کہا ہے بددعائیں مت دیا کریں۔ ہر کسی کو حق ہوتا ہے اپنی زندگی مرضی سے جینے کا۔" یشعرہ کے بارے میں ایسے الفاظ کب گوارا تھے اسے۔ فوراً ہی اٹھ کر ٹوکا ماں کو۔

"اے بھیا! کیوں نہ دوں بددعائیں اس نامراد کو... کیا کمی ہے میرے شہزادے بیٹے میں۔ ارے تم نے نام نہ لیا ہوتا تو منہ نہ لگاتی اس کم بخت کو اب بھی... اب بھی چھوٹی کے پیر پکڑ کر منالوں گی۔ حنا بیاہ کے لے آؤں کیسی خوب صورت ہے میری بھانجی۔ کتنا پسند بھی کرتی ہے تمہیں... مگر اس یشعرہ کا بھوت سر سے اترے تب نا..." فضیلہ خانم نے ایک بار پھر اسے رام کرنا چاہا۔

"اماں... آپ نے میری ہر فرمائش پوری کی... منہ سے نکلنے سے پہلے ہر بات پوری ہوئی میری۔ کاش...! جب میں نے اسکول چھوڑا... آپ مجھے ڈانٹتیں' ٹوکتیں' سختی کرتیں تو ہو سکتا ہے میں بھی آج یشعرہ کے سامنے ڈٹ جاتا۔" اس نے فضیلہ خانم کے ہاتھ تھام کر ایسے کہا کہ وہ تو رونے والی ہو گئیں۔

"میں صدقے... میں قربان میری جان... اب بھی کوئی کمی نہیں ہے تم میں... اپنا گھر ہے' گاڑی ہے' لاکھوں کا کاروبار ہے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں سب گھر بار سنبھال لیا... اب دیکھنا کیسے اس سے زیادہ پڑھی لکھی لڑکی لاتی ہوں تمہارے لیے۔ نہ میرا چاند ہنس بول... باتیں کر۔ ویسا ہی پرانا ٹیپو بن جا... میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے تجھے ایسے دیکھ کر۔" وہ اس کا منہ چوم کر رونے لگیں۔ ٹیپو مسکرا دیا۔

''ارے پیاری ماں۔۔۔ کتنے کمزور دل کی ہیں آپ اتنے بہادر بیٹے کی ماں ہو کر۔ کچھ نہیں ہوا مجھے اور نہ ہی میں روگی اور جوگی بننے لگا ہوں' بس ذرا سستی سی ہو رہی ہے۔ آج کل موسم بھی تو ایسا ہو رہا ہے ناں۔ آپ فکر مت کریں۔ اس گھر میں آپ کے ٹیپو کی دلہن ضرور آئے گی بس مجھے کچھ ماہ دے دیں اس کے بعد۔ آپ جس سے چاہیں گی میں وہیں شادی کروں گا۔ اب ذرا موڈ درست کریں۔''

☼ ☼ ☼

سر حسن سے بات کرتے کرتے کب گیارہ بج گئے پتا ہی نہ چلا۔ ٹائم دیکھ کر اس نے ان کو خدا حافظ کہا تھا کہ امی نماز کی پابندی کے حوالے سے بہت سخت تھیں اور رات کو دیر سے سونے کی صورت میں صبح اٹھا ہی نہ جاتا تھا اس سے ورنہ ان کی باتوں کی دل فریبی سے اتنی جلدی نکلنا آسان نہیں تھا اس کے لیے۔

رات کا پتا نہیں کون سا پہر تھا جب زور سے دروازہ بجنے کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی۔ نائٹ بلب کی روشنی میں ٹائم دیکھا تو ڈھائی بجے تھے۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر حواس باختہ سی امی تھیں۔

''یشعرہ جلدی آؤ۔۔۔ تمہارے پاپا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ شاید انہیں اسپتال لے جانا پڑے۔ میں ٹیپو کو بلاتی ہوں۔'' روہانسی آواز میں اسے جلدی سے صورت حال بتا کر وہ وہیں سے لوٹ گئیں۔

یشعرہ نے لائٹ جلا کر دوپٹا گلے میں ڈالا چپل پہنے اور پاپا کے کمرے میں آگئی۔ آنکھیں موندے ان کا ایک ہاتھ سینے پر تھا۔ اور بھنچے لب اور زرد چہرہ ان کی تکلیف بیان کر رہا تھا۔

''کیا ہوا پاپا۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے ہم ابھی آپ کو اسپتال لے کر چلتے ہیں۔'' ان کے پاس بیٹھ کر ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھتے اس نے بھرائی آواز میں کہا۔ طلال احمد نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تاہم تکلیف کی شدت نے انہیں بولنے نہ دیا اور وہ ہونٹ سے سر کو اثبات

میں ہلا کر رہ گئے۔ اگلے پانچ منٹوں میں ٹیپو اور ان کے پیچھے حواس باختہ سی پھپھو بھی تھیں۔

''میں صدقے جاؤں۔۔۔ کیا ہو گیا میرے بھائی کو۔۔۔ یا میرے اللہ میری عمر میرے بھائی کو لگا دے۔'' وہ روتے ہوئے کہنے لگیں۔

''کچھ نہیں ہوا اماں ابھی اسپتال لے کے جاتا ہوں میں انہیں۔۔۔ آپ سب لوگ یہیں پر رہیں۔ اٹھیں ماموں ہمت کریں۔ ابھی تو آپ نے میری اور میرے بچوں کی شادیاں دیکھنی ہیں تو ابھی ان بیماریوں سیماریوں کو۔۔۔ دور ہی رکھیں خود سے۔'' ٹیپو انہیں سہارا دے کر اٹھاتا ہوا بولا۔

''میں ساتھ چلتی ہوں بیٹا! مجھے یہاں سکون نہیں ملے گا۔'' سارہ بیگم نے کہا۔

''میں بھی ساتھ جاؤں گی۔'' یشعرہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''شادی کی دعوت کھانے نہیں جا رہے کہ میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ اماں ہیں ادھر ان کے ساتھ گھر پر رہ کر دعا کرو۔ ہم بس یوں گئے اور یوں آئے۔ آئیں مامی آپ۔'' وہ اسے ڈپٹ کر کہتا مامی کو ساتھ چلنے کا اشارہ کرتا ماموں کو گاڑی تک لے آیا۔

اسپتال لانے پر معلوم ہوا کہ ماموں کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا اور معمولی سی تاخیر بھی جان لیوا ہو سکتی تھی تاہم انہیں ایڈمٹ کر لیا گیا۔ صبح پانچ بجے کے قریب جا کر ٹیپو نے گھر کال کر کے تمام صورت حال سے یشعرہ کو آگاہ کیا تھا اور کہا تھا کہ پھپھو کو بھی بتا دے۔ صبح آٹھ نو بجے تک وہ ان دونوں کو لے جائے گا کہ اب ماموں کافی بہتر ہیں لیکن ابھی انہیں کچھ دن اسپتال میں رہنا تھا۔ یشعرہ اور پھپھو نے فوراً ''اللہ کا شکر ادا کیا۔

''اچھا بیٹا! میں ذرا گھر جا رہی ہوں۔ ناشتا وغیرہ بنا کے تمہاری بہنوں کو بھی بتا دوں ان کے ماموں کی طبیعت کا۔ سیما کل سے آئی ہوئی ہے یہیں ٹھہری تھی کل۔ تم بھی ناشتا وہیں آ کر کر لو پھر چلیں گے اسپتال۔'' ماموں کی اچانک بیماری نے پھپھو کے دل

سے بی اگلال وہ سارا عناد ختم کر دیا تھا۔ یشعرہ نے فون کر کے سر حسن کو بھی پاپا کی طبیعت کا بتایا تھا۔

''وہ میرے رئیل فادر نہیں ہیں سر! مگر مجھے اتنی محبت اور شفقت دی کہ کیا ہی کوئی اصل والدین دیتے ہوں گے اپنی اولاد کو۔ ان کی اس محبت کو میں حق سمجھ کر وصول کرتی رہی ہوں۔ آج مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میری کسی نیکی کے عوض مجھے ایسے شخص کے زیر سایہ دیا گیا۔ میں ان سے بہت محبت کرتی ہوں۔۔۔ آپ دعا کیجیے گا۔ ان کا سایہ میری سر پر ہمیشہ سلامت رہے۔'' نم لہجے میں ایک جذب کی کیفیت میں اس نے کہا۔

''ہوں۔۔۔ اٹس او کے یشعرہ! آپ پریشان مت ہوں وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ ابھی تو پہلی کلاس ہے میری۔۔۔ یونیورسٹی کے لیے نکل رہا ہوں۔ فارغ ہو کر چکر لگاتا ہوں انکل کے پاس۔۔۔ ٹیک کیئر۔۔۔ اللہ حافظ۔'' جس بات کے بارے میں سوچ کر اس کی جان پہ بنی ہوئی تھی اس کو بہت رسمی سا لیا تھا سر حسن نے۔ یشعرہ نے دکھ سے موبائل کو آف کر کے پرس میں رکھا اور آہستہ سے پھپھو کے پورشن کی طرف چل دی۔ پھپھو کی ملازم دوبارہ اسے بلا کے جا چکی تھی۔ تھوڑی دیر میں ٹیپو انہیں لینے آ گیا۔ ایک ہی رات میں کتنے کمزور اور نڈھال نظر آ رہے تھے پاپا۔۔۔ وہ ان کا ہاتھ تھام کر سسک پڑی۔

''یشعرہ۔۔۔ روتے نہیں ہیں بیٹا۔۔۔ دیکھو تو بالکل ٹھیک ہوں اب' اپنی امی کو دلاسا دینے کی بجائے آپ خود رو رہی ہیں۔'' طلال صاحب نے اتنی سی بات کی اور اسی میں ہی ہانپ گئے۔

''ابھی زیادہ بولنے کی پرمیشن نہیں دی ڈاکٹر نے اور کسی بھی قسم کی ٹینشن والی بات سے منع کیا ہے۔ اس لیے ریلیکس اور باہر آ کر ذرا مامی کو کنوینس کرو کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے گھر چلی جائیں۔ بہت تھک گئی ہیں۔'' ٹیپو نے آہستہ سے اس کے پاس آ کر کہا۔ وہ اپنے آنسو صاف کرتی اس کے ساتھ باہر آ گئی اور زبردستی امی اور پھپھو کو ڈرائیور کے ساتھ گھر بھجوا دیا

تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ان کو دیکھ آتی تھی۔ بغیر کوشش' محنت اور دعا کے مل جانے والی نعمتوں کی قدر انسان کو تب ہی محسوس ہوتی ہے جب ان سے محروم کر دیا جاتا ہے یا ان سے محرومی کا احساس ہی ان کی اہمیت کو بڑھاتا ہے۔ پاپا کی بیماری نے ان کی محبت کو اس کے دل میں بڑھا دیا تھا۔

اس نے سر حسن کو سات بجے کال کر کے یہ ساری صورت حال بتائی تھی شام چار بجے جا کر ان کی شاہی سواری پہنچی تھی۔ ہاتھوں میں بوکے پکڑاتے ہوئے انہوں نے رسمی سا طلال احمد کا حال پوچھا تھا۔ وہ خود چونکہ مسکن دواؤں کے زیر اثر سوئے ہوئے تھے سو ان کو دیکھ کر ایک گہری نگاہ ٹیپو پر ڈال کر جتاتی نظروں سے یشعرہ کو دیکھا تھا۔ جبکہ ٹیپو ان کا تعارف جان کر خاصی گرم جوشی سے ملا تھا ان سے۔

''ویسے یشعرہ اچھے ہیں تمہارے ہونے والے وہ۔۔۔ تمہارے معیار کے۔۔۔ مگر مجھے اس گرمی میں بھی ان سے مل کر سردی کا احساس دوڑ گیا اندر۔ ایسے سرد سے لگے مجھے تو۔'' وہ ان کو جاتا ہوا دیکھ رہی تھی جب ٹیپو بالکل نزدیک آ کر بولا۔ ''خیر ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ جہاں اور جس کے ساتھ رہو۔۔۔ بہت خوش رہو۔'' جس خلوص سے اس نے کہا' یشعرہ خواہ مخواہ شرمندہ ہو گئی۔

''آؤ کچھ کھا لو تم بھی۔۔۔ صبح سے کچھ بھی تو نہیں کھایا۔'' وہ آگے بڑھتا ہوا بولا۔

''اور تم۔۔۔ تم نے کچھ کھایا ٹیپو۔۔۔ تم بھی تو رات سے یہیں ہو۔'' اس کے بے حد نرم لہجے پر وہ چونک کر دوبارہ اس کے پاس آیا۔

''یشعرہ جی۔۔۔ اوپر سے جتنا تنومند نظر آتا ہوں نا اندر سے اتنا ہی کمزور دل بندہ ہوں۔۔۔ ایسے لہجے میں بات کرو گی تو اس کمزور دل نے تاب کہاں سے لانی ہے۔۔۔ پلیز پہلے والے انداز میں بات کرو کیوں کسی غریب پر ظلم کرتی ہو۔'' وہ اتنی سنجیدگی سے ایک غیر سنجیدہ بات بولا کہ زندگی میں پہلی بار اس کی بے سروپا بات پر مسکراہٹ یشعرہ کے چہرے پر پھیل گئی۔

"چلو اکٹھے ہی کچھ کھاتے ہیں۔ امی نے بھی کچھ دیر قبل ڈرائیور کے ہاتھ کھانا بھجوایا ہے ابھی تھوڑی دیر میں خود بھی آئیں گی۔" زمین کو حرارت اور روشنی بخشتے سورج نے دونوں کو ایک ساتھ مسکراتے دیکھا اور اپنی روشنی کو تیز کردیا۔ مگر ڈاکٹرز نے اگلے چوبیس گھنٹے مزید اہم قرار دیے کہ ماموں کی طبیعت ایک بار پھر بگڑ گئی تھی۔

"سنیں ڈاکٹر۔ وہ کیسے ہیں؟ وہ ٹھیک تو ہوجائیں گے نا.....؟" ان کے روم سے نکلتے ڈاکٹر کے پیچھے دوڑ کر اس نے پوچھا۔

"دیکھیں بی بی پیشنٹ کی جو حالت ہے کچھ کہا نہیں جاسکتا ہم تو کوشش کرسکتے ہیں۔ باقی شفا تو اللہ نے دینی ہے۔ آپ دعا کیجیے۔" پیشہ ورانہ انداز میں کہہ کر ڈاکٹر چلا گیا۔ ٹیپو بھی ڈاکٹر سے مل کر آیا تھا اور بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا ورنہ وہ بڑی سے بڑی مشکل میں بھی اپنے حواس بحال رکھتے ہوئے خود بھی نارمل ہوتا اور دوسروں کو بھی تسلی دیتا۔ اس کے تاثرات نے بشعرہ کو ڈرا دیا۔

"ٹیپو۔" اس نے ڈرتے ڈرتے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ہوں۔" وہ جیسے کسی خیال سے چونکا۔

"وہ ٹھیک ہوجائیں گے نا۔"

"تم دعا کرو گی سچے دل سے تو ضرور ٹھیک ہوجائیں گے۔" بے حد نرمی سے کہے گئے اس جملے میں نجانے کیا تھا کہ وہ اس کے بازو سے سر ٹکائے روتی چلی گئی۔ ٹیپو نے آہستہ سے اسے تھام کر بینچ پر بٹھایا اور اس کا ایک ہاتھ تھام کر دوسرے سے اس کے سر کو سہلایا پتا نہیں کس کس بات کا رونا تھا جو آج اکٹھا ہی جمع ہو کر بہہ نکلا تھا۔ اتنے اچھے شخص کا دل توڑ کر اسے ٹھکرانے کا' سر حسن کے سرد مہر رویے کا' پاپا کی اچانک بیماری' ساری چیزوں نے مل کر اعصابی طور پر اسے کمزور کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سارہ اور فضیلہ خانم اپنی ساری بیٹیوں کے ہمراہ پہنچ چکی تھیں۔ سارا دن دعائیں مانگتے گزرا تھا تب کہیں جا کر ڈاکٹرز نے ان کی حالت کو خطرے سے باہر قرار دیا تھا۔ مزید تین دن اسپتال رہنے کے بعد طلال احمد کو ڈسچارج کردیا گیا تھا۔ ان تین دنوں میں بس سر حسن کی ایک کال آئی تھی وہ بھی بے حد مختصر.....

"بشعرہ کم از کم تم سے مجھے ایسی بات کی توقع نہیں تھی میری مصروفیات کو جاننے کے بعد بھی ایسا گلہ کررہی ہو..... خیر میں چکر لگاتا ہوں ایک آدھ دن میں۔ انکل کو پوچھ لینا میری طرف سے۔" کہہ کر بغیر کچھ کہے کال ڈراپ کردی تھی۔ بشعرہ نے ان کی بے رخی کا جتایا تھا وہ بات بھی ان کو بری لگی تھی۔

پاپا بیڈ ریسٹ پر تھے۔ سارا دن مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ پھپھو نے مستقل یہیں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور ٹیپو اس نے تو ایک کیئر ٹیکر کا پورا رول نبھانے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ ماموں کی دوائیاں' ان کی پرہیزی خوراک کس ٹائم دینی ہے' سب کچھ اسے ازبر تھا۔ تین چار چکر خود لگا لیا کرتا اور اگر جو کبھی ایک آدھ چکر مس ہوجاتا تو فون کی شامت بلائے رکھتا۔ حیرت انگیز طور پر بشعرہ کو یہ سب برا نہیں لگ رہا تھا۔ "اگر جو اس رات ٹیپو نہ آتا۔" یہ سوچ کر وہ لرز جاتی۔

گھر آجانے کے چوتھے روز سر حسن کو فرصت ملی تھی آنے کی۔ وہ اپنی والدہ کے ہمراہ بہت سے فروٹس اور دیگر لوازمات کے ہمراہ آئے تھے۔

"میرا بھانجا ہے مگر اولاد سے بڑھ کر خیال رکھتا ہے میرا..... پہلے تو کبھی احساس نہیں ہوا مگر اب بیماری میں پتا چلا کہ جوان اولاد جو ہمدرد بھی ہو کتنا بڑا سہارا ہے اور کتنی بڑی نعمت ہے۔" ماموں کے کوئی اور دوست بھی موجود تھے وہاں۔ طلال احمد نے سر حسن کا تعارف کرانے کے بعد جس انداز میں ٹیپو کا تعارف کرایا وہ پہلو بدل کر رہ گئے۔ حالانکہ طلال احمد نے اپنے احساسات بیان کیے تھے مگر سر حسن کو لگا کہ وہ انہیں سنا رہے ہوں۔ جلد ہی وہ اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆ ☆ ☆

طلال احمد آہستہ آہستہ ہی سہی سنبھل گئے تھے اور ان کی طبیعت نے بہتر ہوتے ہی پھپھو نے اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی کی تاریخ دے دی تھی۔ پھپھو کی بڑی بیٹیاں بھی رہنے کے لیے آگئی تھیں۔ باقی سب کچھ تو ویسے کا ویسا تھا مگر بشعرہ کے اندر بہت بڑی تبدیلی آگئی تھی اس نے اپنے مفروضات کی بنا پر لوگوں کو جج کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب امی کے کہے بغیر ہی کبھی امی کے ساتھ کبھی ویسے ہی پھپھو کے گھر چلی جاتی اور شادی کی مخصوص گہما گہمی کا حصہ بن جاتی۔ وہ جان گئی تھی کہ انسان اپنوں کے بنا کچھ بھی نہیں مخلص رشتے خوش نصیب لوگوں کو ہی نعمت کی صورت عطا کیے جاتے ہیں اور وہ خوش نصیب تھی۔

بہت دنوں بعد اس نے ٹیپو کو دیکھا تھا۔ غصہ آنے کی بجائے اسے اچھا لگا تھا اور جیسے ہی اس نے بشعرہ پر نگاہ کی' اس کا دل ایک خاص انداز میں دھڑک کر رہ گیا۔ وہ آج بھی ویسا ہی ٹیپو تھا محفل کی جان' ہنسنے ہنسانے اور محفل لوٹ لینے والا۔ بس بدلی تھی تو بشعرہ کے دل کی حالت بدلی تھی۔ لڑکیوں نے ڈھولکی اٹھائی ہوئی تھی جبکہ وہ ان کے درمیان بیٹھا بڑے مزے سے ان کے ساتھ تان میں تان ملا رہا تھا۔ وہ ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئی تھی لیکن صوفے پر بیٹھ کر ان کو دیکھنا اور تالیاں بجانا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

پتا نہیں کیوں جب جب ٹیپو پر اس کی نظر پڑتی' سر حسن کا تصور ذہن میں آجاتا۔ کیا میں ان دونوں کا موازنہ کررہی ہوں..... مگر کیوں؟" اس نے سوچا تو تالیاں بجاتے ہاتھ خود بخود سست پڑ گئے۔ ویسے ہی رات سر حسن سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ انہیں اسکالرشپ پر ہائر ایجوکیشن کے لیے باہر بھیجا جارہا ہے اور وہ جانے سے پہلے اسے نکاح جیسے مضبوط بندھن میں باندھ کر جانا چاہتے ہیں اور اسی سلسلے میں جلد ہی وہ اور ان کی والدہ طلال احمد سے ملنا چاہتے تھے۔ "مگر اتنی جلدی کیوں.....؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"جلدی..... یہ جلدی لگ رہی ہے آپ کو بشعرہ۔ میں ایک ایک گھڑی گن کر گزار رہا ہوں۔ دو ماہ ہوگئے ہماری بات طے ہوئے' میں پلک جھپکنے سے پہلے آپ کو اپنی زندگی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" وہ بے تابی سے بولے۔ مگر زندگی میں پہلی بار ان کی باتوں کی دل فریبی نے اس کے گرد ایک سحر طاری کرنے کی بجائے کچھ بے چینی سی دی تھی اسے۔

"مانا کہ اپنی کزن کی شادی میں بہت مصروف ہیں آپ مگر میں بھی کچھ حق رکھتا ہوں آپ کی زندگی پر' جب ہی تو کل کا سارا دن اسی انتظار میں گزرا کہ تحفہ نہ سہی کم از کم وش ہی کردیں گی آپ ایک فون کال کرکے.....؟" اس کا لہجہ شکوے سے بھرپور تھا۔

"اف..... میں کیسے بھول گئی بشعرہ نے سر پر ہاتھ مار کر خود کو کوسا وہ ان کو ان کی برتھ ڈے پر سرپرائز دینا چاہتی تھی اور گفٹ بھی ان کی پسندیدہ خوشبو اور ایک کتاب لے کر پیک کرکے بھی رکھ دیا تھا مگر نہ جانے کیسے بھول گئی تھی..... خیر میں آپ کو منالوں گی۔ دل ہی دل سوچتے اس نے ایک دو باتیں کرکے اس نے کال ڈراپ کردی تھی۔ امی کو اس نے صبح ہی بتادیا تھا کہ وہ سر حسن کی سالگرہ کا دن اور گفٹ بھول گئی تھی اور آج اسے یونیورسٹی جانا تھا اسی سلسلے میں..... حسب معمول پاپا آفس چلے گئے تھے۔ آج اس نے خود ہی ٹیپو کو کال کرکے کہا تھا کہ شوروم جاتے ہوئے اسے یونیورسٹی چھوڑ دے۔ نتیجتاً وہ اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں موجود تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اسے اپنی اس دن والی گفتگو اور لہجہ یاد آیا تو دل ہی دل میں بری طرح شرمندہ ہوتے ہوئے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ ہلکا ہلکا گنگناتے ہوئے وہ ڈرائیونگ کی طرف متوجہ تھا۔ آنکھوں پر حسب معمول بلیک گلاسز تھے۔

"ٹیپو"

"حکم فرمائیں بشعرہ بی بی!" ترنت جواب پر وہ پھر شرمندہ ہوئی۔

"وہ میں کہہ رہی تھی کہ تم شادی کرلو..... حنا بہت اچھی لڑکی ہے تمہیں پسند بھی کرتی ہے۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" احتیاط سے موڑ کاٹ کر

ایک نظراس پرڈال کر پوچھا گیا۔"

"وہ مجھے..... میں نے محسوس کیا۔" اس نے رک رک کر کہا۔

"جتنا سے ایک دو ملاقاتوں میں آپ کو اس کی پسند کا پتا چل گیا۔ میں دن میں دس بار آپ سے ملتا ہوں..... مجھے کون پسند ہے یہ کبھی محسوس نہیں کیا آپ نے۔" بے حد سنجیدگی بھرے لہجے میں سوال آیا۔ یشعرہ چپ بیٹھی رہ گئی۔

"دل کا صفحہ کوئی کتاب کا صفحہ تو ہے نہیں یشعرہ بی بی کہ جو سبق آپ کو پسند نہ آئے یا تو اسے پھاڑ کے پھینک دو' یا صفحہ موڑ کے آگے بڑھ جاؤ۔ دل کے صفحے پر جب کوئی تصویر کندہ ہو جائے کسی سیاہی سے نہیں مٹایا جا سکتا اسے' نہ پھاڑ کے پھینکا جا سکتا ہے' نہ موڑ کے آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ ہاں اس کو سمجھانے کے لیے تھوڑا وقت درکار ہوتا ہے۔ مجھے بھی وہی وقت چاہیے پھر جیسے آپ کی ہر فرمائش کو پورا کرنے کی دل و جان سے کوشش کی ہے اس فرمائش کو بھی بجالانے کی کوشش کریں گے..... اور کوئی حکم ہے؟" اس کا تفصیل سے دیا گیا جواب یشعرہ کا سانس روک گیا۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ اس کو مزید کیا کہے۔ "لیجیے جناب آپ کی یونیورسٹی آگئی۔ اب میرے لیے مزید کیا حکم ہے؟"

"دس پندرہ منٹ انتظار کر لو گے؟"

"ساری عمر بھی کر سکتا ہے یہ غلام' آپ حکم تو کریں؟" آج اس کی ہر بات یشعرہ کو عجیب سی یاسیت میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر آہستہ سے آگے بڑھ گئی۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ سر حسن آج چھٹی پر تھے۔

اف..... یہ سرپرائز دینے کا چکر..... کال کر کے پوچھ لیتی۔ دل ہی دل میں جھنجلاتی وہ خود کو کوس کر رہ گئی۔ بیگ میں سے موبائل نکال کر سر حسن کو کال کی۔ دوسری طرف سے پاور آف نمبر اس کی کوفت میں اضافہ کر گیا۔ اس نے فوری طور پر ان کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ امی اور پاپا دو تین دفعہ ان کے گھر جا چکے تھے مگر وہ آج تک نہیں گئی تھی۔

"وہ ٹیپو میری جس دوست سے مجھے کام تھا وہ آج نہیں آسکی اچانک طبیعت کی خرابی کی وجہ سے تم مجھے اس کے گھر چھوڑ کر چلے جانا۔ وہ مجھے واپسی پر ڈراپ کروا دے گی۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے عجیب لڑکی ہے پہلے خود بلایا اور اب گھر بیٹھ گئی کم از کم تمہیں انفارم کر دیتی۔" اس کے تبصرے کا یشعرہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور گاڑی کو سر حسن کے گھر سے کچھ پہلے رکوالیا اور جب تک گاڑی چلی نہیں گئی وہ وہیں کھڑی رہی۔ ایڈریس کا وہ آفس سے پتا کر کے آئی تھی۔ سو ڈھونڈنے میں کچھ خاص مشکل نہ ہوئی۔

بیل شاید خراب تھی تب ہی اس کو دروازہ ناک کرنا پڑا۔ چوکیدار نے منہ نکال کر گیٹ سے باہر جھانکا۔ اس نے اپنا تعارف ایک اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے کروایا۔ سر ہلا کر پورا گیٹ کھول کر اندر آنے کی اجازت مل گئی۔ وہ اندازے سے ہی اندر داخل ہوتی گئی مگر اپنا نام سن کر اسے رک جانا پڑا۔

"خبردار جو یشعرہ یا اس کے گھر والوں تک کوئی بات پہنچی تو زندہ زمین میں گاڑ دوں گا اماں! تمہاری بھتیجی کو اور چھوڑوں گا تو تمہیں بھی نہیں۔" آواز تو سو فیصد سر حسن کی تھی مگر لہجہ کسی گنوار اور جاہل شخص سے بھی بدتر تھا۔

"اب تمہاری بھتیجی ہو گئی ہے یہ معصوم۔ جب اس کی زمین اور جائداد کے لیے اس سے شادی کی تھی اس وقت تو بڑی سگی تھی تمہاری۔ اب جب زمین جائداد سب کچھ تو نے دھوکے سے اپنے نام کر لیا ہے تو اب تمہاری آنکھوں میں کھٹک رہی ہے یہ..... مت ظلم کرو حسن..... تمہاری بھی لگتی ہے یہ کچھ..... اور کچھ نہیں تو اپنے مرحوم ماموں کا ہی خیال کر لو۔" یہ یقیناً" ان کی والدہ تھیں۔

"ماموں کا ہی تو خیال کر رہا ہوں جو اسے طلاق نہیں دی مگر میں نے کہا تھا کہ یہ گاؤں میں ہی رہے گی یہاں قدم نہیں رکھے گی یہ ہر دوسرے روز میری زندگی خراب کرنے پہنچ جاتی ہے۔ دوسری شادی کر رہا ہوں کوئی گناہ نہیں کر رہا میرا حق ہے یہ جو میرے مذہب نے دیا ہے۔ ویسے بھی میں نے تمہارے دباؤ میں آکر شادی کی تھی اس سے۔ کیا رکھا ہے اس میں نہ شکل نہ عقل نہ تعلیم۔ میرے ساتھ معاشرے میں اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہے یہ..... "ان کا لہجہ تحقیر سے پر تھا۔

"کچھ تمہارے قابل نہیں تھا تو اسی وقت کیوں نہیں انکار کر دیا جب شادی کی تھی۔ اس وقت اس کی جائداد نے اندھا بنا دیا تجھے۔ اب جب تو نے سب کچھ ہتھیا لیا ہے۔ اب یہ کھٹکنے لگی ہے تجھے۔ ارے بدنصیب! اس بچے کا ہی خیال کر لے جو اس دنیا میں آنے والا ہے۔" یشعرہ نے لڑکھڑا کر دروازے کو تھاما۔

"میں نے کسی بات سے انکار نہیں کیا مگر میری شرط یہی ہے کہ یہ گاؤں میں رہے گی۔ اسے اس کا خرچا پانی ملتا رہے گا۔ یہ بس یہاں نہ آئے اور تم بھی میرے ساتھ ایک دو دن میں چلو یشعرہ کے والد سے نکاح کی بات کرنے۔" اب کے سر حسن کا لہجہ کچھ نرم تھا۔ دوسری طرف بھی عورت جواب میں کچھ کہہ رہی تھی مگر اس سے زیادہ مزید سننے کی اس میں نہ تاب تھی نہ حوصلہ' وہ وہیں سے پلٹ آئی تھی۔ وہ کیسے اور کس حال سے گھر واپس آئی تھی اس کا دل جانتا تھا۔ خوب رو لینے پچھتا لینے کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا جس نے اس کے جلتے دل کو بہت قرار بخشا تھا۔

اگلے دن وہ سکون سے تھی۔ امی کو اس نے کہا تھا کہ اس نے رزلٹ کا پتا کرنے جانا ہے۔ اور حسب معمول اسے لے جانے والا ٹیپو ہی تھا۔

"آج تو پتا کر لیا نا کہ وہ محترمہ آگئی ہیں۔" ٹیپو کے سوال پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بہت زیادہ نہیں ٹیپو صرف پانچ منٹ اور پر اس کے بعد کبھی تمہیں تنگ نہیں کروں گی۔" گاڑی سے اترتے اس نے جس نرمی سے کہا وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ "یہ کسی دن میری جان لے کر چھوڑے گی۔" وہ بڑبڑایا۔ یشعرہ نے سیدھا ان کے آفس میں جا کر دم لیا۔ وہ اس کی شکل دیکھ کر کھل اٹھے اور وہ بھی ان کے تاثرات دیکھ کر کھل اٹھتی اگر جوان کی اصلیت اس پر نہ کھل چکی ہوتی۔

"آپ کی امانت واپس کرنے آئی ہوں سر۔ یہ آپ کی بیوی کا حق ہے جس سے نجانے کیوں آپ نظریں

چرائے پھر رہے ہیں۔" ایک بم پھوڑا تھا اس نے اس کی سماعتوں پر۔ ہاتھ کی انگلی سے انگوٹھی اتار کر ٹیبل پر رکھ دی۔

"کسی کی خامی کو اس کا عیب بنا کر اپنی اور دوسروں کی زندگی خراب کرنا بہت بڑی بے وقوفی ہے۔ میں نے یہ بات سمجھ لی ہے۔ آپ بھی سمجھ لیں۔ آپ کی بیوی میں تعلیم کی کمی ہے' کم صورت ہے تب بھی اس میں بہت سی خوبیاں بھی ہوں گی۔ جس طرح آپ کے پاس بہت سی ڈگریاں ہیں مگر بزرگوں سے کیسے بات کرنی ہے آپ نہیں جانتے' رشتوں کا مان کیسے رکھا جاتا ہے اس سے نابلد ہیں آپ۔ امید ہے میری باتوں پر غور کریں گے آپ۔" کہہ کر وہ رکی نہیں ان کو ہکا بکا چھوڑ کر وہاں سے نکل آئی۔ گاڑی میں آکر اس نے سکون کی سانس لی۔

"ویسے بشعرہ بی بی۔ کچھ دنوں سے آپ کی حرکات و سکنات ایک کریکٹر ہے جیمز بانڈ اس سے بے حد میل کھانے لگی ہیں۔ وجہ پوچھ سکتا ہوں ایسا کیوں ہے؟" گاڑی کو پارکنگ سے نکال کر مین روڈ پر لاتے اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"اور میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم نے کب سے مجھے آئس کریم کھلانے کی آفر کیوں نہیں کی۔" مسکرا کر اس نے سوال کا جواب سوال سے دیا۔ ٹیپو نے حیرت سے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"کیا آپ نے طے کرلیا ہے کہ کسی دن مجھے بے ہوش کر کے چھوڑنا ہے۔"

"نہیں نہیں ابھی رکو صبر کرو۔ مجھے پوری بات کرنے دو پھر ایک ہی دفعہ بے ہوش ہو جانا۔" بشعرہ کا جواب سن کر ٹیپو نے گاڑی ایک سائڈ پر روک دی۔

"یار تم تو جھٹکے پہ جھٹکا دے رہی ہو یہ نہ ہو میں گاڑی کہیں سچ مچ دے ماروں اب کہو۔" گاڑی کو بند کرتا وہ پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ بشعرہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے نظریں اپنے ہاتھوں پر مرکوز کرلیں۔

"میں نے بہت بار تمہارا دل دکھایا اس کے لیے میں تم سے ایک بار پھر سوری کرتی ہوں اور۔۔۔" وہ کہتے کہتے رکی۔ "پھپھو کو ایک بار پھر پاپا کے پاس بھیجنا اس بار انہیں مایوسی نہیں ہو گی۔۔۔" اتنی آہستہ سے کہا گیا فقرہ ٹیپو بمشکل ہی سن سکا۔ مگر جب اس جملے کا متن سمجھا تو بے اختیار منہ سے "یاہو" کا نعرہ نکلا تھا۔

"ویسے یہ کایا پلٹ ہوئی کیسے۔۔۔ یار مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اپنی خوشی کا اظہار کیسے کروں؟ تمہیں زور زور سے جھنجوڑ ڈالوں۔۔۔ کپڑے پھاڑ کر سڑکوں پر نکل جاؤں یا۔۔۔ یا۔۔۔ بس مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ ویسے خوشی میں انسان کچھ کچھ پاگل ہو جاتا ہے نا۔۔۔" وہ بہت خوش تھا۔

"ٹیپو کے بچے تم بالکل پاگل ہو۔۔۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

"ٹیپو کے بچے۔۔۔ واہ واہ بشعرہ کیا خوب صورت اور کلاسیکل الفاظ منہ سے نکالتی ہو ویسے وہ دن دور نہیں جب ٹیپو کے بچے بھی مجھے جلدی جلدی معرض وجود میں آتے دکھائی دے رہے ہیں۔" اس کا لہجہ جو خواب ناک ہو چلا تھا کہ بشعرہ نے ایک دھمو کا مار کر ختم کیا۔

"ویسے بشعرہ پہلے تم زبانی گولا باری کرتی تھی اب ہاتھ بھی چلانے لگی ہو اچھی پروگریس ہے میری لائف میں۔ آنے سے پہلے پہلے اس میں مزید پروگریس لاؤ تاکہ میری اماں بڑے فخر سے اپنے بیٹے اور بہو کا تعارف یوں کرائیں کہ یہ ہے میرا بیٹا شاہجہان ٹیپو حیدر جو کھانا پکانے سے لے کر سینا پرونا سب جانتا ہے اور یہ ہے میری بہو بشعرہ بلال جسے پڑھائی لکھائی سے مار کٹائی تک میں مہارت حاصل ہے۔" گاڑی کو دوبارہ سے اسٹارٹ کرتے ہوئے اس کی زبان کی تیز رفتاری عروج پر تھی جو کہ اس کی بے تحاشا خوشی کا پتا دے رہی تھی۔ بشعرہ بیٹھی بس اس انوکھے لاڈلے کے خیالات پر مسکرائے جا رہی تھی آگے کا سفر نہایت روشن اور حسین تھا۔

☆ ☆

صبا ممتاز

تہی دست

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

"زندگی اکیلے رہنے سے نہیں، کسی کے ساتھ سے حسین ہوتی ہے۔"

یہ فقرہ اس نے ہی مجھ سے پہلی دفعہ نہیں بولا تھا، یہ تو کئی لوگ مجھ سے کہہ چکے تھے کہ زندگی کا مزا اکیلے پن میں نہیں۔ مگر جب یہ فقرہ اس نے کہا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس طرح کے فقرے بول کر دراصل وہ مجھے سمجھاتا تھا کہ میں اس سے شادی کر لوں۔ مجھے پتا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے بے شک ضرورت کے لبادے میں لپٹی ہوئی مگر تھی تو محبت۔ وہ کہتا تھا کہ تم ان عورتوں میں سے ہو جن کے لیے مرد جنت کی حوروں کو ٹھکرا سکتا ہے۔ وہ عورت جسے مرد کے لیے تحفہ کہا گیا ہے وہ تم جیسی ہی ہوتی ہیں۔

اس کا مجھے دوسری عورتوں سے مقابلہ بھی اپنی توہین لگتا تھا کہ میں خود کو کسی جیسا نہیں سمجھتی تھی، میں تو بس ایک تھی۔ مجھ جیسی کوئی ایک آدھ تو ہو سکتی ہے مگر میں کسی جیسی نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ بات نہیں تھی کہ مجھے تعریف اچھی نہیں لگتی تھی۔ تعریف کسے اچھی نہیں لگتی اور وہ بھی عورت کو۔ اگر کوئی عورت یہ کہتی ہے کہ اسے تعریف پسند نہیں تو وہ صریحاً "جھوٹ بولتی ہے۔ تعریف تو عورت کے سر پر ایسا چڑھ کر بولتی ہے کہ اس کے ذہن کو سحر زدہ کر دیتی ہے۔

اسے بھی تعریف اچھی لگتی تھی مگر اس تعریف کے بدلے وہ کسی کم تر بندے سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ پل دو پل کا ساتھ یا پھر کچھ گھنٹوں کا سفر علیحدہ بات ہے۔

وہ اسے سمجھاتا رہتا تھا کہ "عمر گزر رہی ہے جلد شادی کر لو" وہ اس سے عمر میں بڑی تھی مگر وہ کہتا تھا کہ مجھے پروا نہیں۔ جب وہ یہ کہتا تھا کہ اسے پروا نہیں تو وہ زہرخندی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اس پر طنز کرتی۔

"مجھے تم سے شادی کیوں کرنا چاہیے۔ کوئی ایک چیز تو ایسی ہو جو میرے معیار کے مطابق ہو۔"

"اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، بے انتہا محبت۔" وہ ہر دفعہ اپنے دعوے پر اصرار کرتا اور وہ ہنس پڑتی۔

"محبت ایک لفظ ہے مگر اس ایک لفظ کا یقین دلانے کے لیے بہت پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں خود کو مارنا پڑتا ہے تم تو آج تک میرے کسی کام نہیں آئے۔ اخلاقی، مالی کسی بھی لحاظ سے میری کوئی مدد نہیں کی۔ محبت کی ابتدا خیال رکھنے سے ہوتی ہے۔ تمہاری محبت کی ابتدا بھی ضرورت ہے اور انتہا بھی ضرورت۔"

اس کی بات سن کر وہ سر پٹختا اور چلانے لگتا "ہاں ہاں تمہیں کبھی میری محبت کا یقین نہیں آئے گا، تم ایک متکبر، خود سر اور خود پسند عورت ہو۔"

اور وہ سوچ میں پڑ جاتی کیا واقعی وہ ایسی ہی تھی؟

کتنے تکلیف وہ دن گزارے تھے اس نے، جب اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ انشورنس جمع کرانی تھی۔ گھر کے اخراجات تھے۔ گھر کی تعمیر کے لیے، داخلے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی اور وہ تھا کہ محبت محبت کا راگ الاپ کر اپنا من ہلکا کر لیتا۔ اس نے کبھی اس کے مسائل کو توجہ سے سنا بھی نہیں تھا اس کی وجہ وہ یہ بتاتا کہ اس کی جیب میں کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ تہی داماں تھا۔

"دیکھنا، ایک دن میں سیٹل ہو جاؤں گا تب میں نہ صرف تمہاری ضرورتیں پوری کروں گا بلکہ اپنی خواہش بھی۔"

وہ ہنس دیتی کئی بار تو اس نے کہا تھا کہ میں نے تمہاری برتھ ڈے پر چاندی کا لاکٹ بننے دیا ہے، فلاں بوتیک سے سوٹ خریدنے چلیں گے، گھر کے لیے مچھلی کا ٹوکرا لے کر دوں گا (جی بھر کھانا) بہن کی شادی پر مٹھائی کا ڈبا۔ اور اس دفعہ کے سیزن میں حاصل ہونے والی آمدنی میں سے سونے کا سیٹ، پتا نہیں کتنے خواب دکھاتا تھا وہ۔

اتنی ساری باتیں کرنے والا اس کی برتھ ڈے پر ایک معمولی سا کیک لے کر نہ آسکا۔ وہ سب سمجھتی تھی اسی لیے کبھی اس کے محبت کے دعوے پر یقین نہیں کر سکی تھی۔ بلاشبہ اس میں خوبیاں بھی تھیں

مہمان نواز تھا، ملنسار تھا، باصلاحیت تھا، باشعور تھا مگر اس کی خامیاں اتنی شدید، اتنی بدصورت تھیں کہ اس کی خوبیوں پر نگاہ ہی نہیں جاتی تھی۔

وہ پہاڑوں جیسے دعوے کرتا اور زمین پر ماتھا ٹیک دیتا آسمان سے برستے اولے جیسے زمین میں گر کر اپنا وجود کھو دیتے ہیں۔ پھر بھی اس کی نگاہوں میں رتی بھر شرمندگی نہیں ہوتی تھی۔

پہلے وہ اس کی باتیں سن کر جرح کرتی تھی۔ پھر اس پر طنز کرنے لگی اور اب آہستہ آہستہ اس نے چپ سادھ لی تھی۔

ایک جھوٹے شخص سے کیا بحث کرنا۔ ایسا شخص جس کی کسی بات کا اعتبار ہی نہ ہو۔

وقت جوں جوں گزر رہا تھا۔ اس کا فضا سے شادی کے لیے اصرار بڑھ رہا تھا۔

فضا کے اندر کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے کیا بڑے بڑے دعوے کرنے والا یہ شخص اسے تحفظ دے سکتا ہے۔ کیا اس کی بیوی بن کر وہ سکھی زندگی گزار سکے گی۔ وہ خود سے سوال کرتی اور اس کا دماغ اس کے سوال کا تجزیہ کر کے جواب دیتا "نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔"

دل اس کے معاملے میں تو کبھی دماغ سے ٹکرایا ہی نہیں تھا کیونکہ دل گم صم رہتا تھا وہ تو کبھی اس پر ایمان ہی نہیں لایا تھا۔

"مجھے تم سے شادی نہیں کرنی۔ مجھے تمہاری محبت پر یقین نہیں ہے۔" اس کے بار بار اصرار پر اس نے صاف جواب دے دیا۔

شادی کے لیے تو وہ کب کا مان چکا تھا بس فضا سے کہتا رہتا کہ دیکھو بس بات چلی ہے کشیدگی رہتی ہے کب رشتہ ٹوٹ جائے کب سب ختم ہو جائے۔

اس کا خیال تھا اس طرح فضا اس کے ساتھ بندھی رہے گی۔ فضا تو خود چاہتی تھی کہ وہ شادی کر لے وہ جانتی تھی کہ جوگ کا روگ مرد کے بس کی بات نہیں۔

پھر اس کی شادی کا دن آپہنچا۔

جنوری میں اس کی شادی تھی۔ وہ اتنی دور گاؤں، شادی میں شرکت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے گفٹ لیا، سلامی کے پیسے لفافے میں ڈالا اور اس کے آفس پہنچ گئی۔ اس کی اچانک آمد پر وہ بوکھلا سا گیا۔

وہ اپنے ایک دوست کو شادی، ولیمہ کا سوٹ، اچھے کپڑے دکھا رہا تھا۔ سب قیمتی تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔

وہ بیٹھی ہی تھی کہ فون آگیا۔

"او اچھا، بھائی کو بھیجو، پیسے لے جائے۔ اپنی پسند کے کپڑے بنا لو۔" غالباً "اس کی ہونے والی بیوی کا فون تھا۔

"یار، فرصت ہی فرصت ہے تمہارے لیے بھابھی کے ساتھ آجاؤ ساتھ چلیں گے۔"

اس کی بیوی اس کے ساتھ شاپنگ کرنا چاہ رہی تھی۔ کتنے اعتماد سے بول رہا تھا وہ۔

اب اس کے پاس اس کی بیوی کے لیے فرصت بھی تھی اور پیسے بھی۔ ہونے والی بیوی پر پیسہ خرچ کیا جا رہا تھا۔ اور جس سے محبت کے دعوے تھے اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔

ایک دوسرے کے جذبات کا چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھنا۔ اہم ہے یا محبت کے بڑے بڑے دعوے کرنا۔ اس کے دل نے پہلے بھی کبھی اس کی محبت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ آج اس کا یقین پختہ ہو گیا تھا۔ وہ صرف اسے جھکانا چاہتا تھا۔ وہ جیت کا تمغہ اپنے سینے سجانا چاہتا تھا اسے ہرا کر۔ ہار جیت کے اس کھیل میں اسے افسوس ضرور ہوا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی وہ مطمئن تھی۔

☆ ☆

مکمل ناول

دستِ مسیحا

نگہت سیما

میں نے ان بچوں کے لیے انہیں روتے' دعائیں مانگتے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ہلکان ہوتے دیکھا ہے۔" وہ جذباتی ہوگئی تھی۔

"وہ بہت سوشل تھیں۔ بہت خوب صورت تھیں لیکن انہوں نے ان بچوں کے لیے اپنا آپ رلا دیا۔"

ڈاکٹر احسن کے لبوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"بیٹا آپ سنی سنائی باتیں نہ کریں۔ اپنا آپ رلا دیا اور وہ بھی ابنارمل بچوں کے لیے امپاسبل۔ ناممکن۔"

"یہ سنی سنائی باتیں نہیں ہیں میں اپنے بچپن سے انہیں دیکھ رہی ہوں۔ میری بڑی ممانی ہیں ہر دم بچوں کی فکر میں گھلتی ہوئی۔ اپنے آپ سے بے گانہ ان کی بہتی رالوں کو اپنے ہاتھوں سے پونچھتی ہوئی۔ رال سے لتھڑے چہروں کو چومتی ہوئی۔" ڈاکٹر احسن کی آنکھوں میں لحہ بھر کے لیے حیرت ابھری۔

"یہ صحیح کہہ رہی ہے احسن۔" ڈاکٹر عثمان نے اس کی تائید کی۔

"میں نے خود دیکھا ہے بھابھی کو بجو کو ایک لمحہ کے لیے خود سے جدا نہیں کرتیں اور جب عفان کا ذکر کرتی

چوتھی قسط

ہیں تو ان کے آنسو رکتے نہیں۔ عفان میرے بھتیجے کا کچھ عرصہ پہلے ہی انتقال ہوا ہے۔"

"اور اگر میں آپ سے کہوں کہ میں ایک ایسی ماں کو جانتا ہوں جس نے اپنے جائز بیٹے... سگے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے مرنے کے لیے رات کے اندھیرے میں کسی گھر کے سامنے پھینک دیا۔ صرف اس لیے کہ اسے ڈر تھا کہ لوگ اس کے بیٹے کو دیکھ کر مایوس ہوں گے کیونکہ وہ اپنے والدین کی طرح خوب صورت نہیں تھا۔"

"نہیں..." امل کے لبوں سے نکلا۔

"یہ حقیقت ہے۔" ڈاکٹر احسن کا لہجہ بے حد تلخ تھا اور اس تلخی کو سب نے ہی محسوس کیا۔

"کوئی ماں اتنی ظالم کیسے ہو سکتی ہے اور بچے تو جیسے بھی ہوں ماں باپ کو بہت پیارے ہوتے ہیں۔" اہل کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"میں بھی آج تک اس سوال کا جواب نہیں پا سکا کہ کوئی ماں اتنی ظالم کیسے ہو سکتی ہے۔" ڈاکٹر احسن کی آواز آہستہ تھی۔

"لیکن یہ سچ ہے۔" برسوں بعد آج دل کا درد لبوں پر آیا تھا۔

"وہ جب پیدا ہوا تو اس کے سر پر بال نہیں تھے۔ اس کا ایک ہونٹ کٹا ہوا تھا پیشانی اور رخساروں پر رسولیاں تھیں۔" وہ سر جھکائے ہولے ہولے کہہ رہے تھے۔

"میں ان دنوں جہلم میں تھا۔ وہ بہت طوفانی رات تھی بارش، اولے، جھکڑ... میں ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے اسپتال میں بزی تھا۔ اور اس نے۔ میری بیوی نے اس رات برستی بارش میں چند دن کے بچے کو کسی گھر کے برآمدے میں چھوڑ دیا۔ وہ میرا بیٹا تھا۔" ڈاکٹر احسن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اور جب مجھے پتا چلا تو میں نے اسے بہت تلاش کیا کالونی کے ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مہینوں وہاں جاتا رہا کہ شاید کسی نے ترس کھا کر اٹھا لیا ہو لیکن جب سگی ماں نے ترس نہیں کھایا تو..."

سب خاموش بیٹھے تھے اہل کے آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے تھے۔ ڈاکٹر عثمان مضطرب سے اپنی انگلیاں چٹخا رہے تھے۔ ان کی نظریں بار بار ڈاکٹر احسن کی طرف اٹھتی تھیں اور پھر موحد کی طرف۔

"کیا محسنہ آنٹی۔" اہل کے لبوں سے نکلا۔

"نہیں۔" ڈاکٹر احسن نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے اسے طلاق دے دی۔ میں اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ ہم نے بہت مشکلات کے بعد ایک دوسرے کو پایا تھا۔ لیکن میں اسے معاف نہیں کر سکا۔ بہت کوشش کی کہ معاف کر سکوں لیکن میں ایک ایسی عورت کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا تھا جسے میں اپنے بچے کی قاتل سمجھتا تھا۔ محسنہ سے شادی میں نے اپنی والدہ کے اصرار پر کی ہے لیکن بچوں کے معاملے میں اس پر اعتبار نہیں کر سکتا میں کرنا چاہتا ہوں پر نہیں کر پاتا... بہت بے اعتبار ہو گیا ہوں میں۔"

"محسنہ آنٹی ایسی نہیں ہیں انکل۔" اہل نے اپنے آنسو پونچھے۔

"آپ کسی اور کے جرم کی سزا انہیں مت دیں۔ ان سے ان کے ماں ہونے کا فخر مت چھینیں ایک ماں کی غلطی پر آپ پوری دنیا کی ماؤں کو الزام نہیں دے سکتے۔ لاکھوں، کروڑوں مثالیں ہیں ماؤں کی ان قربانیوں کی جو انہوں نے اپنے بچوں کے لیے دیں۔ انسان بہت کمزور ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس کی بشری خامیاں اس پر حاوی ہو جاتی ہیں، ہو سکتا ہے وہ بھی کسی ایسے ہی لمحے کی زد میں آ گئی ہوں اور اب تڑپتی ہوں، روتی ہوں اس کے لیے جسے انہوں نے خود گنوا دیا تھا۔"

ڈاکٹر عثمان نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ یہ اہل کتنی سمجھ داری کی بات کر رہی تھی۔

"میں نے جب محسنہ آنٹی کو پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے لگا تھا کہ ان کے ساتھ کہیں کچھ غلط ہے لیکن اب میں نے جانا وہ اندر سے ٹوٹ رہی ہیں۔ آپ کی بے اعتباری انہیں ہولے ہولے مار رہی ہے۔ آپ بھی غور سے ان کے چہرے پر بکھرے کرب کو دیکھیے گا اور سوچیے گا کہ آپ جیسا رفیق زندگی اور اتنے پیارے بچے ہوتے ہوئے بھی یہ کرب ان کے چہرے سے کیوں جھلکتا ہے۔ اپنے بچوں سے ان کی ماں مت چھینیے۔ بن ماں کے بچوں کے لیے زندگی خالی محل کی طرح ہوتی ہے۔ ویران اور بے رونق۔" ڈاکٹر احسن خاموشی سے اسے سن رہے تھے تب ہی ان کا فون بج اٹھا۔ انہوں نے فون اٹینڈ کیا دوسری طرف محسنہ تھیں، جو پوچھ رہی تھیں کہ بچوں کو کب لینے جانا ہے۔ وہ جائیں گے یا وہ چلی جائیں۔"

"تم چلی جاؤ محسنہ بچوں کو لے آؤ میں ذرا بزی ہوں۔" ڈاکٹر احسن نے کہا تو اہل نے جتاتی نظروں سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے نظریں چرا لیں اور فون آف کر کے ڈاکٹر عثمان سے مخاطب ہوئے جو کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"آپ یہ گھر کیوں فروخت کرنا چاہتے ہیں کیا پھر واپس آنے کا ارادہ نہیں ہے۔"

"ہاں۔" وہ چونکے۔

"میں اپنے گاؤں میں ایک چھوٹا سا اسپتال بنوانا چاہتا ہوں۔ وہاں علاج کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایک ڈسپنسری ہے جہاں ضرورت پڑنے پر ادویات ملتی ہیں نہ ڈاکٹر میسر آتا ہے۔ عبدالرحمن بھائی سے میری بات ہو گئی تھی۔ زمین بھی ہم نے منتخب کر لی ہے۔ عبدالرحمن بھائی نے کسی آرکیٹیکٹ سے بھی نقشے کی بات کر لی ہے۔"

"یہ آپ نے اچھا سوچا بابا۔" موحد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اہل بھی ستائشی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے لاؤنج سے نکل کر کچن میں چلے گئے۔

"لیکن ڈاکٹر عثمان وہاں آپ کو علاج کی وہ سہولتیں میسر نہیں آ سکیں گی جو یہاں حاصل ہیں۔" ڈاکٹر احسن کے لہجے میں تشویش تھی۔

ڈاکٹر عثمان نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ موحد اور اہل جا چکے تھے۔

"موحد میری بیماری کے متعلق نہیں جانتا۔ میں اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا اور ڈاکٹر احسن زینی کی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ مرنے کے بعد مجھے اپنی زمین کی مٹی نصیب ہو۔ میں اپنی باقی ماندہ زندگی وہاں ہی گزارنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن..." ڈاکٹر احسن کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ڈاکٹر عثمان نے ان کی بات کاٹ دی۔

"ڈاکٹر جان اور ایک دو لوگ اور بھی یہ گھر خریدنے میں انٹرسٹڈ ہیں بلکہ ڈاکٹر جان تو میری منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہیں لیکن جب آپ نے خواہش ظاہر کی کہ آپ بھی گھر خریدنا چاہ رہے ہیں تو پتا نہیں کیوں میرے دل میں خیال آیا کہ پہلے یہ گھر آپ کو دکھا دوں۔ تب میں نہیں جانتا تھا کہ آپ کو یہ گھر پسند آئے گا بھی یا نہیں اور آپ میری مرضی کی قیمت لگائیں گے یا نہیں۔ میں نے یونہی آپ سے ذکر کر دیا حالانکہ آپ نسبتاً" چھوٹا گھر خریدنا چاہ رہے تھے۔ لیکن کچھ باتیں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ گھر میں آپ کو ہی فروخت کروں گا آپ جو بھی قیمت لگائیں گے مجھے منظور ہو گی۔"

ڈاکٹر احسن کی آنکھوں کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں یہ گھر ایسے ہی فرنشڈ آپ کو دے رہا ہوں۔ جو چیز آپ کو ضرورت نہ ہو وہ کسی کو دے دیجیے گا۔ چلیے آپ کو پورا گھر دکھا دوں آپ نے تو صرف کچھ حصہ دیکھ رکھا ہے۔" ڈاکٹر احسن یونہی حیران حیران سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"جب میں اور زینی لندن سے یہاں منتقل ہوئے تھے تو زینی نے بہت سارے گھر دیکھنے کے بعد اسے پسند کیا تھا اور بہت شوق سے اس کی زیبائش و آرائش کی تھی۔ وہ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بتا رہے تھے۔

"یہ موحد کا بیڈ روم ہے۔" انہوں نے دروازے کو ہلکا سا پش کیا۔

"ہم جب یہاں آئے تھے تو موحد آٹھ نو سال کا تھا اور زینی نے اس کا بیڈ روم اس کی عمر کے حساب سے ہی ڈیکوریٹ کیا تھا اور عمر کے لحاظ سے ہی وہ اس میں تبدیلی کرتی رہتی تھی۔ موحد تقریباً" چودہ سال کا تھا

جب زینی کے ساتھ وہ حادثہ پیش آیا۔

اور موحد نے آٹھ نو سالوں میں اپنے بیڈ روم میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا زینی نے سیٹ کیا تھا۔ اس لیے یہ تمہیں بائیس تئیس سال کے لڑکے کا نہیں تیرہ چودہ سال کے بچے کا کمرہ لگے گا۔ دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے کے دیوانے تھے۔ زینی کی جان اٹکی ہوئی تھی اس میں "یہ بیڈ روم کے ساتھ والے روم کو موحد نے اپنی اسٹڈی بنا رکھا ہے اور ضرورت کے مطابق سیٹ کر رکھا ہے۔"
انہوں نے بیڈ روم میں قدم رکھتے ہوئے ساتھ والے روم کے متعلق بتایا۔ سامنے ہی دیوار پر موحد کی بارہ تیرہ سال کی عمر کی تصویر سنہری چوکھٹے والے فریم میں لگی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں ڈاکٹر عثمان اور ڈاکٹر زینب تھیں۔ ڈاکٹر احسن کمرے میں ایک نظر ڈال کر تصویر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"یہ حادثے سے تقریباً" سال بھر پہلے کی تصویر ہے۔" ڈاکٹر احسن بہت غور سے تصویر دیکھ رہے تھے جب ڈاکٹر عثمان نے انہیں مخاطب کیا۔

"ڈاکٹر احسن کبھی آپ کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ آپ کا بیٹا زندہ ہو گا۔ کہیں کسی اور گھر میں پل رہا ہو گا۔"

"جسے اس کی سگی ماں نے قبول نہیں کیا اسے کسی اور نے کیا قبول کرنا ہے۔" وہ مڑ کر ڈاکٹر عثمان کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں پھر بھی ایک باپ کے دل سے بیٹے کے ملنے کی امید ختم نہیں ہوتی۔ میں جب بھی سال دو سال بعد پاکستان جاتا ہوں ہر گزرتے شخص کو غور سے دیکھتا ہوں۔ خاص طور پر بھکاریوں کو اس لیے کہ میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ زندہ ہے تو ایسے کسی گروہ کے پاس ہو گا۔ دوسری صورت میں وہ نہیں رہا۔ پاکستان جاتا ہوں تو ایک چکر جہلم کا بھی ضرور لگاتا ہوں۔ حالانکہ اتنے برس گزر گئے پھر بھی امید نہیں مرتی ڈاکٹر عثمان۔ خواب میں اکثر مجھے وہ نظر آتا ہے.... روتا ہوا مجھے پکارتا ہوا۔

بابا مجھے سردی لگ رہی ہے۔ ڈر لگ رہا ہے۔ وہ چھوٹا سا بچہ جو بول نہیں سکتا تھا خواب میں مجھے بولتا نظر آتا ہے۔ میں دیوانوں کی طرح اس کی طرف لپکتا ہوں تو وہ نہیں ہوتا۔ کوئی مجھے اس کی موت کی یقینی خبر دے دے تو شاید مجھے سکون آجائے۔"

"اللہ نہ کرے۔ آپ کے بچے کی لمبی زندگی ہو۔" ڈاکٹر عثمان کے لبوں سے بے اختیار نکلا اور انہوں نے ڈاکٹر احسن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"آپ اللہ سے دعا کیا کریں۔ کیا خبر آپ کی گم شدہ متاع آپ کو کبھی مل جائے۔"

"میری دعاؤں میں اثر ہوتا تو ڈاکٹر عثمان وہ اسی وقت مجھے مل جاتا۔ آپ بھی میرے لیے دعا کریں کہ اگر وہ ہے تو مجھے مل جائے نہیں رہا تو اس کا خیال میرے دل سے نکل جائے اور مجھے سکون مل جائے۔" ڈاکٹر احسن نے ڈاکٹر عثمان کی روشن پیشانی کی طرف دیکھا جہاں سجدوں کا نشان دمکتا تھا۔

"وہ ایک بار مجھے مل جائے تو میں اسے بتاؤں کہ میں نے اسے رد نہیں کیا تھا۔ وہ میرے پاس ہوتا تو میں اسے سینے سے لگا کر رکھتا کبھی اسے خود سے دور نہ کرتا وہ میرے لیے سب سے اہم ہوتا۔"
ڈاکٹر احسن کی آواز میں کمی گھل گئی تو ڈاکٹر عثمان ان کا کندھا تھپتھپا کر وہاں ہی پڑی چیئر پر بیٹھ گئے۔ ان کی اپنی آنکھیں جانے کس خیال سے نم ہو رہی تھیں.... اور وہ سر جھکائے بیٹھے بیٹھے کسی سوچ میں گم ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

ثمرین نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور اس کی نظر بیڈ کے پاس کھڑے ہشام پر پڑی جو بے حد پریشانی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"ہشام مجھے کیا ہوا تھا۔"

"آپ اچانک بے ہوش ہو گئی تھیں۔"
ہشام نے انہیں ہوش میں آتے دیکھ کر اطمینان بھرا سانس لیا۔

"ہاں شاید چکر آگیا تھا۔"

"بی پی لو تھا لیکن زیادہ نہیں۔" ہشام نے بتایا۔

"اب گھر چلیں۔" وہ بیڈ سے اتر پڑیں۔

"ہاں چلتے ہیں ڈاکٹر صاحب سے بات کر لوں میں۔" یہ ایک پرائیویٹ کلینک تھا جو قبرستان سے نزدیک تھا ہشام ثمرین کو لے کر ادھر ہی آیا تھا۔

وہ دونوں اس چھوٹے سے کمرے سے باہر نکلے جس میں صرف ایک ہی بیڈ تھا.... لیڈی ڈاکٹر اپنے روم میں فارغ بیٹھی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مسکرائیں۔

"آیئے آیئے مسز عبدالرحمن اب کیسا فیل کر رہی ہیں۔"

"بہت بہتر ہوں۔"

"دراصل آپ اپنی ڈائٹ کا خیال نہیں رکھتیں۔"

"یہی بات میں نے بھی ماما سے کہی ہے۔" ہشام نے جتاتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"آپ بہت لکی ہیں مسز عبدالرحمن۔ آپ کا بیٹا آپ کے لیے اتنا پریشان تھا کہ مجھے رشک آیا آپ پر۔ بہت محبت کرتا ہے آپ سے۔"

"ہاں لکی تو وہ تھی.... اللہ نے اسے جو چاہا اسے دیا اس نے احسن کا ساتھ چاہا اللہ نے اس کی خواہش پوری کی۔ اور پھر اسے بیٹے جیسی نعمت سے نوازا لیکن اس نے کیا کیا۔"

وہ کھوسی گئی تھی پتا نہیں ڈاکٹر نے اور کیا کیا کچھ کہا تھا اور ہشام نے کیا بات کی تھی وہ تو جب ہشام نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی تھیں اور اس کے ساتھ چلتی ہوئی باہر گاڑی میں آکر بیٹھ گئی تھیں۔

ونڈ اسکرین پر نگاہیں جمائے وہ سامنے دیکھ رہی تھیں کہ ونڈ اسکرین سے وہ جھانکنے لگا۔ جسے دیکھ کر وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی تھیں پتا نہیں کیوں انہیں گمان گزرا تھا کہ....

پتا نہیں وہ اسے آج بھی یاد کرتا ہو گا یا دوسرے بچوں میں کھو کر بھول گیا ہو گا یقیناً" اس نے شادی کر لی ہو گی اور اس کے بچے بھی ہوں گے۔

وہ اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی اور گاڑی ملک ہاؤس پہنچ گئی۔

"ارے ہم گھر آگئے۔" اس نے ہشام کی طرف دیکھا۔

"جی اہل کی دادی کے ہاں۔ ہم کل چلے جائیں گے۔ جب آپ بے ہوش تھیں تو پاپا کا فون آیا تھا کہ وہ گھر آئے ہوئے ہیں۔ میں نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ ہم گھر ہی آ رہے ہیں۔" گاڑی سے اتر کر ان سے ہولے ہولے باتیں کرتا ہوا وہ ان کے ساتھ لاؤنج میں آیا تو عبدالرحمن ملک لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہے تھے انہوں نے مڑ کر ثمرین اور ہشام کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔

"کہاں چلے گئے تھے تم لوگ۔"

"یونہی کچھ شاپنگ کا ارادہ تھا پھر دل نہیں چاہا تو واپس آگئے۔" ثمرین نے جان بوجھ کر نہیں بتایا کہ وہ قبرستان گئی تھی۔

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے رینا جی مان لیں آپ کے دل نے آپ کو بتا دیا کہ میں یہاں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔" ان کی مسکراہٹ گہری ہوئی تو ہشام اپنی مسکراہٹ چھپاتا ہوا اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

ایسے ہی منظر دیکھنے کی اس نے ہمیشہ چاہ کی تھی۔ ماما اور ڈیڈی کی محبت بھری نوک جھونک ایک مکمل خوش گھرانا۔

"کیوں کیا آج میڈم نیلوفر...." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں تو عبدالرحمن ملک کھل کر ہنسے۔

"کہو.... کہو جو دل میں آتا ہے کہو یہ تمہارا خالص بیویوں والا انداز اچھا لگ رہا ہے۔ بلکہ دل میں اتر گیا ہے۔" ثمرین جھینپتے ہوئے دائیں طرف والے صوفے پر بیٹھ گئیں تو وہ ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو گئے۔

"میں نے نیلوفر سے شادی کی تو تم نے کوئی احتجاج نہیں کیا؟"

"آپ نے شادی کر لی تھی احتجاج کا کیا فائدہ تھا۔"

"ہاں لیکن شادی سے پہلے بھی جب میں نے نیلوفر کا ذکر کیا۔ ارادہ ظاہر کیا اس سے شادی کا تب بھی تم خاموش رہیں۔ مجھے بہت شدت سے احساس ہوا تھا جیسے میں تمہارے لیے بالکل بھی اہم نہیں تھا۔ تمہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا میرے شادی کرنے سے۔ میں نے غلطی کی رینا اور میں اس پر کئی بار پچھتایا بھی ... لیکن ..." تب ہی ان کا موبائل بج اٹھا اور وہ بات ادھوری چھوڑ کر فون سننے لگے ثمرین اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ ملازمہ کو ہدایت دے کر وہ مجو کے کمرے میں آئی۔ وہ کھلونوں سے کھیل رہی تھی اسے دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجانے لگی۔ "ا... ما... ں۔

ثمرین نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کا چہرہ صاف کیا اور اس کے ماتھے پر پیار کر کے باہر آگئی۔ عبدالرحمٰن نے فون بند کر کے اس کی طرف دیکھا۔
"تم کہاں چلی گئی تھیں۔"
"آپ کے لیے انار کا فریش جوس لانے کو کہا ہے میں نے...."

"تمہیں یاد ہے مجھے انار کا فریش جوس پسند ہے۔ میں تو سمجھتا تھا اپنے بچوں میں کھو کر مجھے تم نے بالکل ہی بھلا دیا ہے۔" وہ مسکرائے اور ثمرین کی طرف دیکھا۔

"عثمان کا فون تھا۔ اگلے مہینے آرہا ہے۔"
"کیا اکیلے آرہے ہیں۔" ثمرین نے پوچھا۔
"نہیں موحد بھی ساتھ آئے گا لیکن وہ چھٹیوں کے بعد چلا جائے گا۔ جبکہ عثمان اب حویلی میں ہی رہے گا۔ اسپتال بنوائے گا وہاں۔ واپس نہیں جائے گا۔" عبدالرحمٰن ملک نے بتایا۔
"عثمان بھائی نے واپس آنے کا صحیح فیصلہ کیا ہے۔" ثمرین نے خوشی کا اظہار کیا۔
"ہاں مجھے بھی اس کے آنے سے بہت تقویت ملی ہے۔ لگتا ہے میں بہت مضبوط ہو گیا ہوں ورنہ کبھی کبھی عثمان کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی بہت تنہا محسوس کرتا میں خود کو تب ہی ڈور بیل ہوئی۔ شفو نے سی سی ٹی وی کیمرے میں دیکھ کر بتایا۔

"چھوٹی بیگم صاحبہ ہیں۔"
"کون نیلوفر!" عبدالرحمٰن جیسے اس کے آنے سے بہت بدمزا ہوئے تھے شفو نے اثبات میں سر ہلایا۔
"یہ اس وقت یہاں کیا کرنے آئی ہے۔" وہ بڑبڑائے۔
"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے نا۔"
نچلے ہونٹ کا کونا دانتوں تلے دبا کر ثمرین مسکرائی تو عبدالرحمٰن کے لبوں پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کتنے عرصے بعد انہوں نے ثمرین کا یہ موڈ اور انداز دیکھا تھا۔ ثمرین کے لبوں پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بہت لگاوٹ اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے کبھی اس کا یہ انداز بہت قاتل لگتا تھا انہیں۔ اور آج بھی انہیں ایسا ہی لگ رہا تھا۔ بیرونی گیٹ چوکیدار نے کھول دیا تھا شفو نے اندرونی دروازہ کھولا اور نیلوفر سرخ ساڑھی میں قیامت بنی اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا بھائی تھا۔ عبدالرحمٰن نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ اور اپنے کمرے سے باہر آتے آتے

ہشام واپس پلٹ گیا۔ ڈیڈی کے سامنے وہ مسعود سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بہت سختی سے اسے یہاں آنے سے منع کیا تھا اور وہ ڈھیٹ بنا پھر آگیا تھا۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے نیلوفر کی چیختی ہوئی آواز سنی۔
"تو تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔ میں بھی کہوں حویلی سے نکل کر کہاں غائب ہو گئے۔ ابھی تو ایک پاگل مرا ہے۔ دوسری مرے گی تو یہاں ہی ڈیرے ڈال لو گے۔"

"بکو مت۔" عبدالرحمٰن دھاڑے۔
"اور تم یہاں کیوں آئی ہو۔"
"چھاپہ مارنے۔" مسعود عرف سودے نے دانت نکالے۔ "اور بڑا کامیاب چھاپا مارا ہے بھائی جان۔"
ملک عبدالرحمٰن نے گھور کر اسے دیکھا اور قدرے نرمی سے نیلوفر سے مخاطب ہوئے۔

"پلیز نیلو تم گھر جاؤ۔ میں یہاں کوئی بدمزگی نہیں چاہتا۔ کل گھر آؤں گا تو جو بات کرنی ہے کرلینا۔"
"اور کل کس نے دیکھی ہے ملک صاحب اور یہ بڈھی گھوڑی اب جوان ہو گئی ہے کیا جو بھاگ بھاگ کر ادھر آتے ہو۔ ارے میں تو۔"
"خبردار ایک لفظ بھی مزید کہا ورنہ...." عبدالرحمٰن کا رنگ غصے سے سرخ پڑ گیا۔
"ورنہ کیا کرلو گے تم!" وہ دائیں پہلو پر ہاتھ رکھ کر تمسخر سے انہیں دیکھنے لگی۔
"ورنہ تین حرف کہہ کر فارغ کردوں گا۔"
"اتنا آسان نہیں ہے ملک صاحب نیلوفر کو فارغ کرنا۔"

وہ پہلو سے ہاتھ اٹھا کر لہراتی ہوئی ثمرین کے قریب آئی اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی غرائی۔
"تمہارا دور گزر گیا ہے اب میرا دور ہے سمجھیں۔" اور ہشام جو کمرے سے باہر آگیا تھا اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا۔
"شٹ اپ جسٹ شٹ اپ۔ ابھی اسی وقت ہمارے گھر سے نکل جائیں اور پھر کبھی یہاں قدم رکھا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔"
نیلوفر نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرائی۔ تب ہی عبدالرحمٰن نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً "کھینچتے ہوئے باہر کی طرف بڑھے۔ ہشام تیزی سے ثمرین کی طرف بڑھا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اپنا بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے پوچھا۔
"ماما آپ ٹھیک ہیں۔ پریشان نہ ہوں وعدہ کرتا ہوں وہ آئندہ یہاں قدم نہیں رکھ سکیں گی۔ میں ابھی گارڈ سے بات کرتا ہوں۔"
وہ ہولے ہولے کہہ رہا تھا اور ثمرین اپنے سجیلے بیٹے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کیا میں کبھی اپنے رب کا شکر ادا کر پاؤں گی۔ ایسے ہی جیسا کہ اس کا شکر ادا کرنے کا حق ہے۔

"سوری رینا۔ آج رات میں نہیں رک سکوں گا۔ مجھے اس وقت جانا ہی ہو گا۔ دراصل ..." انہوں نے جھجکتے ہوئے بات پوری کی۔
"حویلی سے نکلتے ہوئے میں نے نیلوفر سے کہا تھا آرہا ہوں۔ لیکن جب کراچی پہنچا تو بے اختیار دل نے تمہیں دیکھنا چاہا تو ادھر آگیا۔ شامی کے لیے بھی دل اداس ہو رہا تھا۔"
"کوئی بات نہیں ڈیڈی آپ جائیں۔"
ہشام بہت بدمزا ہو رہا تھا۔ اس نے تھوڑی سی دیر میں کیا کیا پروگرام نہ بنا ڈالے تھے کہ آج وہ باہر ڈنر کریں گے۔ کتنا عرصہ ہو گیا تھا انہیں باہر اکٹھے گئے ہوئے۔
"لیکن...." لمحہ بھر بعد اس نے کہا۔
"آپ ان کو اچھی طرح سمجھا دیجئے گا کہ وہ آئندہ یہاں نہ آئیں۔"
"نہیں آئے گی۔" انہوں نے ہشام کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"سوری بیٹا بہت جلد میں اس مسئلے کو حل کروں گا۔" انہوں نے ایک معذرت طلب کرتی نظر ثمرین پر ڈالی۔
"وہ خواہ مخواہ باہر ہنگامہ کرتی رہے گی اور لوگ تماشا دیکھیں گے۔"
"ٹھیک ہے آپ جائیں۔"
ثمرین نے خوش دلی سے کہا تو وہ شکریہ ادا کرتے تیزی سے باہر نکل گئے کیونکہ باہر نیلوفر نے جو ہارن پر ہاتھ رکھا تھا تو پھر اٹھانا ہی بھول گئی تھی۔
کاش ماما نے اسی وقت ڈیڈی کو روک لیا ہوتا جب انہوں نے نیلوفر میڈم سے شادی کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ ہنگامہ کیا ہوتا شور مچایا ہوتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ ہشام نے سوچا اور ایک گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ شفو جوس بنا کر لے آئی تھی لیکن جوس پینے والا جا چکا تھا۔
"تم لے لو شامی۔"
"جی نہیں چاہ رہا ماما۔ یوں بھی میں ایک دوست کی طرف جا رہا ہوں۔"

"جلدی آنا شامی۔" انہوں نے تاکید کی۔

"جی جلدی آجاؤں گا۔"

"شفو یہ جوس عجو کے لیے لے جاؤ شوق سے پیتی ہے۔" ثمرین نے شفو سے کہا اور ہشام کے جانے کے بعد پھر وہیں صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کی پشت سے سر ٹیکتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں کے سامنے وہ قبرستان میں نظر آنے والا ملنگ آگیا تھا۔

وہ بے چین ہو کر اٹھ گئیں... کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتیں کبھی بیٹھ جاتیں۔ کھانا کھائے بغیر آرام کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ہشام نے اصرار بھی کیا کہ کچھ کھالیں تو انہوں نے انکار کر دیا۔

"اور میں آپ کے لیے اپنے دوست کے اصرار پر بھی کھانے کے لیے نہیں رکا۔" ہشام نے گلہ کیا۔

"سوری شامی میرا بالکل بھی جی نہیں چاہ رہا۔ نیند آ رہی ہے اور تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔" وہ معذرت کر کے آگئی تھیں۔ لیکن پوری رات سو نہیں پائی تھیں۔ ذرا دیر کے لیے آنکھ لگتی تو وہی منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا۔

تیز برستی بارش... نیم دائرے کی شکل کا برآمدہ۔ کیری کاٹ میں لیٹا بچہ اور اس کے رونے کی آوازیں وہ گھبرا کر اٹھ جاتیں... پوری رات یونہی گزری تھی اور پھر صبح ہشام کے یونیورسٹی جانے کے فوراً بعد انہوں نے ڈرائیور کو قبرستان چلنے کے لیے کہا تھا اور پھر قبرستان کے سامنے کی طرف گاڑی اور ڈرائیور کو چھوڑ کر وہ اکیلی اس طرف چلی گئیں جدھر بگا نامی اس ملنگ نے اپنی جھگی کا پتا بتایا تھا اور کچھ ہی دیر بعد وہ ایک جھگی کے باہر کھڑی تھیں۔ یہاں ایک نہیں چھ سات جھگیاں تھیں۔ اب پتا نہیں وہ کس جھگی میں رہتا ہے۔

اور کیا یہ وہی ہے... اگر وہی ہوا تو میں کیا کروں گی... کیا میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی... نہیں کیسے لے جا سکتی ہوں کیا بتاؤں گی یہ کون ہے۔ ہشام عبدالرحمٰن سب کیا کہیں گے۔ سب مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے۔ پھر میں یہاں کیوں آئی ہوں۔ کیا صرف اپنے شک کی تصدیق کرنے... اور اگر تصدیق ہو گئی تو کیا میں اسے بتا سکوں گی کہ تم... میرے بیٹے ہو۔ اس نے پیشانی پر آئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے جھگی کی طرف دیکھا۔

نہیں... اب یہ ممکن نہیں ہے۔

جہلم اور کراچی اتنا فاصلہ ہے۔ کیا خبر جن لوگوں نے اسے اٹھایا ہو وہ اسے کراچی لے آئے ہوں۔ تب ہی تو وہاں کہیں سے اس کی خبر نہیں ملی تھی۔ کتنا ڈھونڈا تھا احسن نے۔ وہاں ہوتا تو کوئی تو بتاتا... یقیناً" یہ لوگ راتوں رات اسے لے کر جہلم سے نکل گئے ہوں گے ایسے بچوں کو یہ لوگ کمائی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ احسن کی آواز کانوں میں گونجی اور دل میں جیسے کسی نے چٹکی سی بھری۔

ایک نظر دیکھ تو لوں۔ وہ عفان کی طرح نہیں تھا۔ نارمل تھا۔ صحیح بات کر رہا تھا۔ اگر وہ ہمارے پاس ہوتا تو شاید کسی اچھے انسٹیٹیوٹ میں پڑھ رہا ہوتا۔

نہیں یہ میں کیا کرنے لگی ہوں۔ نہیں مجھے اس سے کچھ نہیں پوچھنا... مجھے کچھ نہیں جاننا۔ وہ تیزی سے پیچھے مڑیں۔ تب ہی اس کے دائیں طرف والی جھگی کا پردہ ہٹا کر کوئی باہر نکلا۔

"ہے... کون ہیں آپ کدھر آئی تھیں کدھر واپس جا رہی ہیں۔"

اس نے اپنے دائیں طرف مڑ کر دیکھا یہ تو وہی تھا جس نے اپنا نام بگا بتایا تھا۔ وہ اسے ایک ٹک دیکھنے لگیں۔

"ارے آپ بیگم صاحبہ۔" وہ اس کی طرف بڑھا۔

"سلام بیگم صاحبہ..." قریب آکر اس نے کہا تو اس نے سر ہلایا وہ اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"تم ہمیشہ سے یہاں ہی رہتے ہو۔"

"نہ جی ہم پنجاب سے آئے ہیں ادھر جہلم کے پاس ہی ہمارا گاؤں ہے۔ سنا تھا کراچی میں بہت کاروبار ہے سو ادھر آگئے۔"

اور ثمرین کو لگا جیسے وہ یونہی گر جائے گی۔ اس نے ادھر ادھر سہارے کے لیے دیکھا لیکن آس پاس ایسا کچھ نہ تھا جس کا سہارا لیتی۔

"خیریت ہے بیگم صاحبہ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ آپ یہاں کیسے۔ کسی سے کوئی کام تھا۔ آپ ضرور۔ کھانو بابا سے ملنے آئی ہوں گی۔ اس کے دم میں بڑی جان ہے۔ بس ایک بار دم کرتا ہے تو چھوٹی موٹی بیماری یوں غائب ہوتی ہے۔" اس نے چٹکی بجائی۔

"نہیں۔"

ثمرین نے نفی میں سرہلایا۔

"تم نے اپنا نام بگا بتایا تھا نا۔"

"ہاں جی۔"

"اور تمہارے ماں باپ سگے ہیں کیا۔"

"آہو جی! بالکل سگے۔"

وہ اپنی داڑھی کھجا رہا تھا۔

"یہ۔ یہ کیا ہوا ہے۔"

ثمرین نے ڈرتے ڈرتے اس کی ناک کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ پھوڑا نکل آیا تھا۔ بڑا درد کرتا تھا۔ رات چیرا لگوایا ہے۔"

"اور یہ۔"

اس نے اس کی پیشانی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ جو رسولی ہے تمہاری پیشانی پر پیدائشی ہے کیا۔"

"نہ جی سال بھر پہلے یہ ذرا سی چنے کے دانے کے برابر ابھری تھی اور اب اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ بڑے اسپتال والوں نے کہا ہے کہ کسی دن آجانا آپریشن کردیں گے۔" ثمرین نے ایک گہرا اطمینان بھرا سانس لے کر اس کے نچلے ہونٹ کو بغور دیکھا۔ جو بالکل صحیح تھا۔ کہیں کوئی ٹانکا وغیرہ نہیں لگا تھا۔

"تمہارے سر پر بال نہیں ہیں کیا۔"

"گرمی لگتی ہے اور پھر جوئیں بھی پڑ جاتی ہیں۔ دو تین ماہ بعد سر صاف کروا دیتا ہوں۔"

"بگے۔ یہ کچھ پیسے رکھ لو آپریشن کروا لینا رسولی کا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے پاؤچ سے کچھ رقم نکال کر بغیر گنے اس کی طرف بڑھائی۔

میں دراصل تمہارا ہی شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ اس روز میری طبیعت خراب ہو گئی تھی تو تم نے میرے بیٹے کی مدد کی تھی۔"

"شکریہ! مہربانی بیگم صاحبہ۔" اس کے دانت بڑے نوٹ دیکھ کر نکل آئے تھے ثمرین واپس مڑی اس کے اندر اطمینان تھا۔

"شکر ہے یہ وہ نہیں ہے۔"

اس نے دل ہی دل میں کہا اور پھر ٹھٹک کر رک گئی۔ "کیا میں نہیں چاہتی کہ وہ زندگی کے کسی موڑ پر مجھے ملے... پھر... پھر بے چین کیوں ہوتی ہوں' تڑپتی کیوں ہوں۔ دعائیں کیوں مانگتی ہوں اس کی سلامتی کی... اگر وہ زندہ ہوا اور یوں ہی کسی روز میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا بگے کی طرح تو کیا میں اس سے نظریں چرا سکوں گی۔ کیا میں اعتراف کرسکوں گی کہ اسے میں نے جنم دیا تھا اور ایک گناہ کی طرح رات کے اندھیرے میں پھینک دیا۔

نہیں... میرے اللہ نہیں... مجھے کسی آزمائش میں مت ڈالنا... مجھے بس معاف کردے میرے اس جرم کو... اس غلطی کو۔" اس کے آنسو اس کے رخساروں پر پھیل رہے تھے اور اس کے لبوں سے نہیں... نہیں نکل رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دادی آپ کو موحد کیسا لگا۔" امل دادی کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔

"اپنے شامی جیسا ہی لگا ہے مجھے۔" دادی نے اس کی پیشانی پر بکھرے بال پیچھے کیے۔

"لیکن کچھ کم گو سا ہے۔ دکھ بھی تو بہت جھیلا ہے نا اس نے۔ سات سال تک ماں کو یوں بستر پر پڑے دیکھنا آسان تو نہیں ہے۔"

"جی دادی وہ اپنی ماں کی وجہ سے بہت پریشان رہتا تھا۔ لیکن وہ بہت اچھا ہے۔ بہت کیئرنگ ہے۔ میرا بہت خیال رکھتا تھا وہاں۔ حالانکہ تب اسے پتا بھی نہیں تھا کہ میں اس کی اکلوتی پھوپھی کی بیٹی ہوں۔"

"اللہ اسے صحت و زندگی دے عثمان کے لیے تو وہی ہے سب کچھ۔"

"دادی، شامی اور موحد دونوں ہی کہہ رہے ہیں حویلی چلنے کو آپ بھی چلیں نا میرے ساتھ۔" اس نے دادی کی طرف دیکھا۔

وہ ایک ہفتہ پہلے ہی بولٹن سے پاپا کے ساتھ آئی تھی' ہشام اور موحد کل رات اسے ملنے آئے تھے۔ انکل عثمان اور موحد کے آنے پر ماں اور ہشام بھی حویلی گئے ہوئے تھے۔ یوں بھی چھٹیاں تھیں۔ اور اب وہ دونوں اسے حویلی ساتھ چلنے کا کہہ رہے تھے۔

"ماں جی تمہیں بہت یاد کرتی ہیں اور انہوں نے خاص طور پر تاکید کی تھی مجھے کہ تمہیں ساتھ لے کر آؤں۔ غالباً" تین سال ہو گئے ہیں تمہیں ان سے ملے۔ ان کی مرحوم بیٹی کی نشانی ہو۔ ملنے کو دل تو چاہتا ہے نا ان کا۔"

ہشام نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خود بھی جانا چاہتی تھی لیکن دادی کا خیال اسے روکتا تھا۔ دس ماہ بعد وہ آئی تھی اور دادی بھی اس کے لیے بے حد اداس تھیں۔

"دادی چلیں نا ساتھ۔" اس نے پھر کہا تو انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں بیٹا تم جاؤ۔ نانی سے مل کر آجانا۔ میں نے تو شفیق سے بھی کہا ہے کہ مل آئے جاکر تمہاری ماں کے بعد شاید ایک دوبار ہی گیا ہو گا وہاں۔ داماد بھی تو بیٹوں کی طرح ہوتے ہیں۔"

"تو۔" اس نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ "انہوں نے کیا کہا۔"

"دراصل وہ پہلے ہی زویا کی طرف جانے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ تم شامی اور موحد کے ساتھ حویلی چلی جاؤ۔ میں اور شفیق زویا کی طرف جائیں گے اور واپسی پر ایک دن تمہارے پاس رک کر تمہیں ساتھ لیتے ہوئے آجائیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آپ کتنے دن زویا پھپھو کی طرف رہیں گی۔"

"میرا ارادہ تو ہفتہ بھر رہنے کا ہے۔ زویا بھی اصرار کررہی ہے لیکن دیکھو اب شفیق کی کیا مرضی ہے۔"

"شامی تو کل واپس جانے کو کہہ رہا ہے۔ آپ کب جائیں گی۔"

"دیکھو اب شفیق کیا کہتا ہے۔ ایک دو دن میں ہم بھی نکل جائیں گے۔" لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد دادی نے امل کی طرف دیکھا اور کہا۔ "امل!"

"جی دادی۔" امل چونکی وہ سوچ رہی تھی کہ حویلی میں کیا کیا لے کر جائے۔

"بیٹی تم سے ایک بات کرنا تھی۔ اب زویا کی طرف جائیں گے تو وہ ضرور پھر بات کرے گی۔ ویسے تو مجھے اندازہ ہے لیکن پھر بھی شفیق نے کہا تھا تم سے ضرور پوچھ لوں۔"

"کیا بات دادی۔" امل نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہاری پھپھو نے ایک دوبار پہلے بھی ذکر کیا تھا بلال کے لیے۔ اب پھر کہا ہے کہ شفیق سے بلال کے لیے تمہارے رشتے کی بات کروں۔"

"کون... وہ بلو۔" وہ ایک دم اچھل پڑی۔ "ہائے دادی پھپھو نے ایسا سوچا بھی کیسے ایک تو وہ مجھ سے دو سال چھوٹا ہے۔ ابھی تو ایف۔ ایس میں ہے اور میں اس بلونگڑے سے شادی کروں۔" اسے ایک دم ہنسی آگئی۔

"دراصل یہ تمہاری پھپھو کی محبت ہے کہ وہ اپنے بھائی کی اکلوتی بیٹی کو بہو بنانا چاہتی ہے۔ عمر میں تو دو سال بے شک چھوٹا ہے تم سے لیکن دیکھنے میں تم سے دو سال بڑا ہی لگتا ہے۔ خوب قد نکالا ہے اس نے۔"

"ہاں تو قد نکالنے سے وہ بڑا تو نہیں ہو جائے گا مجھ سے۔" وہ جھلا کر بولی۔ دادی نے بغور اسے دیکھا۔

"نو۔ نیور دادی جان ایسا سو[illegible] گا بھی مت اور پھپھو کو بھی صاف صاف بتادیں مجھے ہرگز یہ شادی نہیں کرنی۔" دادی کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"میں تمہیں جانتی ہوں میری جان اس لیے تو میں نے تمہاری پھپھو کو کوئی امید نہیں دلائی تھی۔"

"تھینک یو دادی یو آر سو سوئٹ۔" اس نے دادی کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کا رخسار چوم لیا۔

"میں نے شفیق کو جتایا ہے کہ تمہارا رجحان ہشام کی طرف ہے۔ بہت بنتی ہے تمہاری اس سے اور دونوں ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں۔"

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے دادی۔۔۔" اس نے ان کے گلے سے بانہیں نکالتے ہوئے پریشانی سے ان کی طرف دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ تمہارا اور ہشام کا جوڑا اچھا رہے گا۔ زوبیا کو بھی میں نے دبے لفظوں میں بتا دیا تھا کہ تم شامی کو پسند کرتی ہو۔" انہوں نے وضاحت کی۔

"آپ کا مطلب ہے میری اور ہشام کی شادی؟؟"

"ہاں۔" دادی مسکرائیں۔

"بچپن سے تم دونوں کا ساتھ ہے اور میں تمہارے دل کا حال جانتی ہوں۔"

"نہیں۔ بالکل نہیں آپ میرے دل کا حال بالکل نہیں جانتیں۔" اس کے لہجے میں ناراضی جھلک رہی تھی اور سبز آنکھوں کی چمک دھندلی ہوئی تھی۔ دادی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"کیا تم اور ہشام۔۔۔"

"میں اور شامی۔۔۔" اس نے ان کی بات کاٹی۔

"ہم دونوں بہت اچھے دوست ہیں اور ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اسے کانٹا بھی چبھے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے اور میرا ایک آنسو اسے تڑپا دیتا ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ ہمیشہ میرے ساتھ میرا محافظ بنا رہا' لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ اس کی اور میری شادی کے متعلق سوچیں میں نے تو ایسا کبھی نہیں سوچا ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں کہ میری شادی شامی سے ہو اور اس نے بھی یقیناً" کبھی بھی ایسا نہیں سوچا ہوگا۔ وہ تو میرا بھائی ہے دادی سگا بھائی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"میں تو سمجھی تھی تم شامی سے۔۔۔ اسی لیے تو میں نے زوبیا کو بھی ٹال دیا تھا کہ شفیق اور تم سے بات کروں گی۔" دادی ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھیں۔

"ہاں تو ٹھیک کیا آپ نے۔" اس نے ننھے بچوں کی طرح ہاتھوں کی مٹھیوں سے اپنے رخسار صاف کیے۔

"مجھے اس بلو بلو گڑے سے بھی شادی نہیں کرنی اور پھر آپ کو جلدی بھی کیا ہے۔ پہلے پڑھ تو لوں جتنا پڑھنا ہے۔ پھر سوچیے گا میری شادی کے متعلق اور ہاں میں نے جب بھی شادی کی تو موحد سے کروں گی۔ نہ ہشام' نہ بلال۔" اور ہشام جو گاؤں جانے کے متعلق اس کا پروگرام پتا کرنے آیا تھا وہاں سے ہی واپس پلٹ گیا۔ اس کے اندر کہیں کچھ ہوا تھا اس نے کبھی اپنی اور امل کی شادی کے متعلق نہیں سوچا تھا' اس کے ذہن میں یہ بھی کہیں نہیں تھا کہ وہ اور امل کبھی الگ ہو سکتے ہیں اس نے اپنے لیے جتنے خواب دیکھے تھے ان سب میں امل اس کے ساتھ ہی تو تھی پھر یہ امل۔۔۔ اس کا دل جیسے نیچے ہی نیچے پاتال میں گرتا جا رہا تھا وہ ابھی پورے بیس سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں پا رہا تھا' لیکن اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر روئے جیسے اس سے اس کی قیمتی متاع چھن گئی ہو۔

وہ اپنے اور امل کے درمیان موجود محبت کے جذبے کو سمجھ نہیں پایا تھا۔

وہ امل سے محبت کرتا تھا۔۔۔ اسے ہر وقت امل کا خیال رہتا تھا وہ اس کی دل جوئی کرتا تھا۔ اس کی ناراضی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی یہ وہ جانتا تھا' لیکن وہ اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہے اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔۔۔ اس کا ادراک اسے ابھی ابھی ہوا تھا۔ وہ اس کے بغیر کیسے رہے گا۔

سڑک کراس کر کے جب اس نے اپنے گھر میں قدم رکھا تو وہ یہی سوچ رہا تھا اور اس کے حلق میں نمک گھلتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں جانے کے بجائے لیونگ میں ہی بیٹھ گیا۔ جیسے ٹانگوں سے طاقت ختم ہو رہی تھی۔ ضبط کرنے کی کوشش میں اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آنسو جو حلق میں گر رہے تھے انہوں نے حلق میں کڑواہٹ بھر دی تھی۔ پتا نہیں کتنی دیر تک وہ یونہی ہونٹ بھینچے بیٹھا رہا۔ امل کے ساتھ گزرے بہت سارے منظر آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ بچپن' لڑکپن اور اسکول میں اگر

ٹیچر اسے کسی اور سیٹ پر بٹھا دیتی تھیں تو وہ کیسے حلق پھاڑ پھاڑ کر روتی تھی کہ اسے شامی کے ساتھ ہی بیٹھنا ہے اور ٹیچر کو اسے اس کی سیٹ پر بٹھانا پڑتا تھا۔ پانچویں جماعت تک وہ دونوں اکٹھے بیٹھتے رہے تھے۔ چھٹی میں لڑکیوں کا سیکشن الگ ہوا تو تب محب سے اس کی دوستی ہوئی تھی۔ پانچویں تک وہ کسی کو دوست نہیں بنا سکا تھا' لیکن امل پھر بھی اس کی کلاس کے چکر لگاتی رہتی تھی۔

"شامی ربڑ دے دو۔"

"شامی پنسل چاہیے۔"

"شامی تم یہاں بیٹھے ہو یار۔"

موحد اسے ڈھونڈتا ہوا لیونگ روم میں گیا تو اس نے چونک کر موحد کی طرف دیکھا اور اس کے سر پر جیسے ایک جملہ ہتھوڑے کی طرح آ کر لگا۔

"اور ہاں میں نے جب بھی شادی کی تو موحد سے کروں گی۔"

"اور کیا موحد بھی۔۔۔ کیا پتا موحد اس سے شادی نہ کرنا چاہے۔" ایک لمحہ کے لیے اس کے دل میں خیال آیا تھا اور موحد میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ عمر میں مجھ سے تین سال بڑا ہے اور کیا وہ امل سے اتنی محبت کر سکے گا جتنی میں کرتا ہوں اور کیا وہ اس کا خیال رکھ سکے گا جتنا میں رکھتا ہوں۔

"کیا ہوا ہشام تم ٹھیک تو ہو نا۔" موحد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے تو اس نے پلکیں جھپکائیں۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔"

"نہیں تم ٹھیک نہیں لگ رہے۔" موحد اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"ہاں سر بوجھل ہو رہا ہے۔ درد ہے شاید۔"

"تو یہاں کیوں بیٹھ گئے ہو کمرے میں آ کر آرام کرتے۔ سر درد کی ٹیبلٹ لے لو میرے پاس ہوگی میں ابھی دیتا ہوں۔"

"موحد۔" اس نے موحد کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

"میرے سر میں بہت درد ہے۔"

"ارے۔" موحد حیران ہوا۔ اس نے بے اختیار ایک بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"شامی میرے بھائی جتنا امل کے توسط سے میں نے تمہیں جانا ہے۔ تم سر درد پر رونے والے نہیں ہو۔ کیا بات ہے مجھے نہیں بتاؤ گے۔ میں تمہارا بھائی ہوں ہشام!" موحد کا لہجہ بے حد نرم تھا۔ ہشام کو اپنی بے اختیاری پر غصہ آیا اتنی دیر سے ضبط کر رہا تھا تو اب کیوں ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھا تھا۔

"عفان۔۔۔ عفان یاد آ رہا تھا۔"

"اوہ۔" موحد نے ایک گہری سانس لی اور اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

"شامی ہم اپنے پیاروں کو کبھی بھول نہیں پاتے۔ کیا میں ماما کو بھول پاؤں گا؟ نہیں کبھی بھی نہیں۔ اور تم بھی عفان کو کبھی نہیں بھول پاؤ گے۔ کبھی کبھی اپنے ان پیاروں کی یادیں اتنی شدت سے آتی ہیں کہ ہم اپنے آنسو نہیں روک پاتے تو انہیں بہنے دیا کرو۔ یہ آنسو دراصل اس محبت کا خراج ہے جو ہم نے ان سے کی' جو وہ ہم سے کرتے تھے۔ انہیں بہنے دو ہشام روکو مت۔" اور ہشام کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے اور وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ موحد اسے اپنے ساتھ لگائے ہولے ہولے تھپکنے لگا' لیکن خود اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"گاؤں جانے کے لیے کتنے بجے نکلنا ہے ہشام۔" موحد نے اپنی پلیٹ میں آملیٹ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"بس ناشتا کر کے نکل جانا۔" ہشام کسی خیال سے چونکا۔

"امل کو بتا دیا تھا۔" موحد نے بغور اسے دیکھا۔ کتنی دیر سے وہ ذرا سا آملیٹ پلیٹ میں رکھے کسی خیال میں گم تھا۔

"ہاں رات کو اس کا فون آیا تھا تو بتا دیا تھا میں

نے۔" موحد کو ہشام بے حد سنجیدہ اور خاموش سا لگا۔ جب سے وہ آیا تھا اس نے ہشام کو اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ ضرور کوئی بات تھی کل وہ عفان کو یاد کر کے رو رہا تھا اور آج جب سے وہ ناشتے کی ٹیبل پر آیا تھا بے حد سنجیدہ تھا، لیکن وہ اس سے اتنا بے تکلف نہیں تھا کہ اپنا دکھ یا پریشانی اس کے ساتھ شیئر کرتا۔ ہاں امل... امل سے وہ ہر بات شیئر کرتا تھا۔ ضرور اسے اپنی پریشانی کی وجہ بتائے گا۔ بھائی کی یاد آنا اور اس کی یاد میں آنسو آجانا فطری بات تھی، لیکن رات سے ہی وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا اور اداس لگتا تھا۔ ضرور اسے کوئی دکھ پہنچا ہے۔ رات کو وہ اس کے ساتھ ڈنر کے لیے بیٹھا تو تھا، لیکن اس نے کھانا برائے نام ہی کھایا تھا اور اب بھی وہ کچھ نہیں لے رہا تھا۔

تین ہفتے پہلے وہ گاؤں آئے تھے اور ان کے آنے کے ایک ہفتے بعد ہشام کا کالج بھی بند ہو گیا تھا اور ہشام اپنی ماما کے ساتھ حویلی آگیا تھا جب کہ عبدالرحمٰن انکل پہلے ہی وہاں تھے۔ ماں جی بہت خوش تھیں۔ عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر عثمان اسپتال کے سلسلے میں بہت مصروف تھے پھر بھی کھانا سب اکٹھے ہی کھاتے تھے۔ صبح یا شام وہ ایک بار ضرور ماما کی قبر پر جاتا تھا۔ کبھی ہشام اور کبھی بابا اس کے ساتھ ہوتے۔ امل سے بھی تقریباً" روز ہی بات ہوتی تھی جس روز امل سے بات نہ ہو پاتی اس روز اسے لگتا زندگی میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے۔

پھر امل اور انکل شفیق بھی کراچی آگئے امل نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ماں جی سے ملنے گاؤں آئے گی اور اب ہشام کو کسی کام سے کراچی آنا تھا تو ماں جی نے تاکید کی تھی کہ وہ امل کو ساتھ لے کر آئے۔ ہشام اسے بھی ساتھ لے آیا تھا کہ تمہیں کراچی کی سیر کرا دوں گا اور آج ان کی واپسی تھی امل بھی ساتھ ہی جا رہی تھی۔

"انکل شفیق بھی ساتھ چلیں گے؟" موحد نے پوچھا تو ہشام نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں وہ ہفتے تک امل کو لینے آئیں گے تو ماں جی اور ڈیڈی سے مل لیں گے۔" ہشام نے ٹشو سے ہاتھ صاف کیے موحد نے دیکھا تو اس نے رات کی طرح اب بھی برائے نام ناشتا کیا تھا۔

"شامی تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" چند دنوں میں ہی اسے اپنا یہ کزن بہت عزیز ہو گیا تھا۔ امل اس کی بالکل صحیح تعریف کرتی تھی وہ ایسا ہی تھا کیرنگ (خیال کرنے والا) اور لونگ (محبت کرنے والا)

"ہاں۔" ہشام نے مسکرانے کی کوشش کی اور شفو کو آواز دے کر چائے لانے کے لیے کہا۔

"یہ تم نے پراٹھا نہیں لیا۔ شفو بہت زبردست پراٹھا بناتی ہے۔"

"نہیں... یہ پھر بہت ہیوی ہو جائے گا۔ میں نے سلائس لے لیا تھا، لیکن تم نے تو کچھ بھی نہیں لیا۔"

"جی نہیں چاہ رہا موحد ایسا لگتا ہے جو کھاؤں گا متلی ہو جائے گی۔" ہشام کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ساری رات اس نے جاگ کر گزاری تھی اور پوری رات وہ خود کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا تھا، لیکن دل تھا کہ سمجھتا ہی نہیں تھا۔

"چلو اٹھو کسی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" موحد نے تشویش سے اسے دیکھا۔

"اب ایسی بھی طبیعت خراب نہیں ہے کہ ڈاکٹر کی ضرورت پڑے۔" وہ زبردستی ہنسا۔

"دراصل رات نیند نہیں آئی اس وجہ سے۔"

"نیند نہ آنے کی بھی تو کوئی وجہ ہوگی نا ہشام۔" موحد نے پیار سے کہا تو ہشام نے نظریں چرا لیں۔

"نہیں کوئی خاص وجہ نہیں بس کبھی کبھی نیند نہیں آتی مجھے۔"

"کبھی کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔"

"نہیں۔" ہشام نے پوچھا۔

"حویلی جا کر بابا سے بات کروں گا۔" تب ہی ڈور بیل ہوئی اور ساتھ ہی گیٹ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی شفو کی آواز آئی۔

"امل باجی آئی ہیں۔" اس نے اندرونی گیٹ کھولا موحد اور ہشام نے ایک ساتھ گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں ڈائننگ روم کے بجائے ٹی وی لاؤنج میں ہی

ناشتا کر رہے تھے امل اپنا بیگ گھسیٹتے ہوئے لاؤنج میں آئی۔ ہشام نے نظریں جھکا لیں اور قہوہ پیالی میں ڈالنے لگا۔

"واہ... تو ابھی تک ناشتا ہو رہا ہے اور مجھے فرمایا جا رہا تھا جلدی اٹھنا سویرے نکلیں گے، لیکن گیارہ بجے تک ناشتا نہ کرتی رہنا اور میں کب سے ناشتا کر کے انتظار کر رہی تھی۔ تنگ آکر آگئی ادھر ہی کہ کہیں سوتے ہی نہ رہ جاؤ۔" موحد نے اشتیاق سے اسے دیکھا۔ شلوار قمیص کے ساتھ بڑا سا دوپٹا اوڑھے وہ اسے بہت منفرد لگی۔ اس سے پہلے اس نے وہاں بولٹن میں اسے ہمیشہ جینز میں ہی دیکھا تھا۔

"ہاں ناشتا تو تقریباً" کر چکے ہیں۔" موحد نے امل سے نظریں ہٹا کر ہشام کی طرف دیکھا۔

"کب تک جانا ہے ہشام۔"

"بس چائے پی کر اگر چینج کرنا ہے کر لو اور چلے جانا۔" ہشام کی نظریں چائے کی پیالی پر مرکوز تھیں۔

"چلے جانا، کیا مطلب؟" امل نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے ہشام کی طرف دیکھا۔

"کیا تم نہیں جا رہے۔"

"نہیں۔" ہشام نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا یہ وہ لڑکی تھی جس کے متعلق آج سے پہلے اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کوئی الگ زندگی جیے گی اور وہ اس کی اس الگ زندگی میں نہیں ہوگا۔

"مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ دو تین روز میں آجاؤں گا۔"

"تو ہم بھی تمہارے ساتھ دو تین روز تک چلیں جائیں گے۔ ایسی کون سی ایمرجنسی ہے کوئی ابھی تو ساری چھٹیاں پڑی ہیں۔ ماں جی سے بھی مل لوں گی۔ تم اپنا کام کرنا اور میں موحد کو اپنا کراچی دکھاؤں گی۔ کیا بات ہے ہمارے شہر کراچی کی۔ کبھی یہ روشنیوں کا شہر ہوا کرتا تھا، لیکن اسے نظر لگ گئی۔" لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑی تھی۔

"تمہاری تو ساری چھٹیاں پڑی ہیں، لیکن اگر ماں جی کی چھٹی ختم ہو گئی تو..." ہشام کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"اللہ نہ کرے۔" موحد اور امل کے لبوں سے ایک ساتھ نکلا۔

موحد نے اس رشتے کی حلاوت اور خوب صورتی پہلی دفعہ محسوس کی تھی اور وہ اس رشتے کو جی بھر کے انجوائے کرنا چاہتا تھا۔ وہ جتنے دن حویلی رہا ماں جی کا معمول تھا کہ صبح صبح نماز کے بعد اٹھ کر اس کے کمرے میں آتیں۔ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر جانے کیا کیا پڑھ کر پھونکتیں۔ اس کی پیشانی چومتیں اور اللہ کا شکر ادا کرتیں کہ اللہ نے انہیں اس کی شکل دکھائی اور پھر کتنی ہی دیر تک پاس بیٹھی باتیں کرتی رہتیں۔ ناشتے، لنچ، ڈنر، تینوں وقت اصرار کر کر کے کھلاتیں۔ اور یہ سب اس کے لیے بہت انوکھا اور بہت دلکش تھا۔

"سوری۔" ہشام نے نظریں جھکا لیں۔

"دراصل ماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی انہوں نے بہت تاکید کی تھی کہ تمہیں جلدی لے کر آؤں۔"

"ماں جی کی طبیعت اب ایسی بھی خراب نہیں تھی۔" موحد نے سوچا۔

یوں تو زندگی کا کچھ پتا نہیں کہ ابھی ہنستا کھیلتا بندہ آنکھیں بند کر کے رخصت ہو جائے، لیکن ماں جی بظاہر اسے خاصی چاق و چوبند نظر آتی تھیں۔

"ہشام تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔" امل بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔" اس نے نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔

"نہیں تم ٹھیک نہیں لگ رہے۔ کیا بات ہے شامی، ماما، بجو اور ڈیڈی تو ٹھیک ہیں نا۔"

"ہاں سب ٹھیک ہیں بس سر میں ہلکا درد ہے۔"

"لیکن مجھے یوں لگا کہ سب ٹھیک نہیں ہے اور یہ صرف سر درد تو نہیں ہے شامی تم کچھ چھپا رہے ہو مجھ سے۔" امل کی نظریں اب بھی اسی پر تھیں۔

"کیا ہے امل تم بھی پیچھے ہی پڑ جاتی ہو۔" وہ جھنجلایا۔

"رات نیند نہیں آئی تھی اس وجہ سے سر بوجھل ہے۔ کچھ دیر آرام کروں گا تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

"تو ٹھیک ہے پھر میں چلتی ہوں تم آرام کرو۔" امل اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ مسئلہ ضرور ہے شاید وہ موحد کے سامنے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا۔ شاید ابھی ان میں اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنے مسائل اس کے سامنے بیان کرتا۔

"کیا مطلب کہاں جا رہی ہو تم۔" ہشام بوکھلایا۔

"کیا جانا نہیں ہے تمہیں۔ میں نے رات ڈیڈی کو بتا دیا تھا کہ صبح روانہ ہوں گے۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"تو اب بتا دو نا ہم تمہارے ساتھ ہی آئیں گے۔" امل نے لاپروائی سے کہا۔

"لیکن میں تو کچھ دیر بعد حیدر آباد جا رہا ہوں۔" اسے بروقت سوجھا تھا۔

"ہمارا ایک کلاس فیلو ہے جواد اس کے فادر کی ڈیتھ ہو گئی ہے تو ہم سات لڑکے تعزیت کے لیے جا رہے ہیں اور میں وہاں سے ہی حویلی آجاؤں گا۔" جواد کے ساتھ اس کی کوئی خاص دوستی نہ تھی' لیکن وہ کلاس فیلو تھے اور اس کے کافی کلاس فیلو آج تعزیت کے لیے جا رہے تھے اس سے بھی انہوں نے فون کر کے پوچھا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ فون پر ہی تعزیت کر دے گا' لیکن ابھی ابھی اس نے جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ اسے سنبھلنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا وہ کم از کم چند دن امل کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اوہ... سوری۔" امل بیٹھ گئی۔

"بہت افسوس ہوا۔ کیا ہوا تھا انہیں۔"

"ہارٹ اٹیک۔" اس نے مختصراً" کہا اور کھڑا ہو گیا۔

"موحد تم تیار ہو جاؤ میں خان چاچا کو کہتا ہوں۔" وہ فوراً" ہی باہر چلا گیا اور امل نے موحد کی طرف دیکھا۔

"شانی بہت حساس ہے اس نے یقیناً" اپنے دوست کے والد کی ڈیتھ کا اثر دل پر لیا ہوا ہے۔"

"ہاں کل سے ہی وہ کچھ اپ سیٹ ہے شاید اس لیے۔" موحد نے بھی تائید کی۔

"ہاں وہ ایسا ہی ہے۔ ہر ایک کے لیے حساس' ہمدرد' سب کے دکھوں کو محسوس کرنے والا۔" امل کے لہجے میں ستائش تھی۔ موحد نے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی۔

"اچھی لگ رہی ہو۔"

"تھینکس۔" امل مسکرائی اسے موحد کی تعریف بہت اچھی لگی تھی۔ رخساروں پر شفق پھوٹی اور آنکھوں میں جگمگاہٹیں اتر آئیں۔

"اب کیا دیکھ رہے ہو اٹھو جا کر تیار ہو جاؤ تاکہ وقت پر پہنچ جائیں۔"

"اوکے سر۔" موحد نے کھڑے ہوتے ہوئے ذرا سا سر خم کیا تو وہ مسکرا کر شفو کو آواز دینے لگی کہ وہ آکر میز سمیٹ دے۔ موحد اس پر ایک بھرپور نظر ڈال کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

اسپتال کا نقشہ منظور ہو گیا تھا۔ عبدالرحمٰن ملک نے دو تین کنسٹرکشن کمپنیوں سے رابطہ کیا تھا اور پھر کراچی کی ایک فرم کو ٹھیکا دے دیا تھا' سب کچھ فائنل کر کے عثمان ملک اور عبدالرحمٰن حویلی پہنچے تو ڈاکٹر عثمان خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ عبدالرحمٰن تو اپنے کمرے میں چلے گئے تھے' لیکن ان کی عادت تھی جب بھی باہر سے آتے پہلے ماں جی کے پاس آتے۔ اس وقت بھی وہ سیدھے ماں جی کے کمرے میں آئے تھے۔ پچھلے دنوں وہ بے تحاشا مصروف رہے تھے اس لیے ماں جی کے پاس بیٹھنے کا وقت کم ہی ملا تھا۔ اس وقت وہ لیٹی ہوئی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

"بیٹا آؤ بیٹھو۔" وہ اٹھنے لگی تھیں' لیکن انہوں نے منع کر دیا۔

"نہیں ماں جی لیٹی رہیے آپ۔" وہ ان کی پائنتی بیٹھ کر ان کے پاؤں دبانے لگے۔

"ماں جی آپ مجھ سے ناراض ہیں۔"

"نہیں تو پتر میں نے تم سے کس لیے ناراض ہونا ہے اور یہ تو کیا کر رہا ہے۔ چھوڑ دے پتر۔" انہوں نے پاؤں کھینچے۔

"نہیں ماں جی مجھے اس سعادت سے محروم نہ کریں۔" ماں نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔

"اچھا جیسے تیری خوشی۔"

"ماں جی مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کا بہت دل دکھایا۔ اپنی جدائی کا دکھ دیا آپ کو۔ اب جب کہ خود باپ ہوں تو سمجھتا ہوں کہ اولاد کی جدائی کا دکھ کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔"

"تم بھی مجھے معاف کر دے بیٹا۔ میں نے خواہ مخواہ تمہیں مجبور کیا شادی کے لیے نہ مجبور کرتی تو تم یوں ملک چھوڑ کر نہ جاتے پر کیا کرتی یہ دکھ مارے جاتا تھا مجھے کہ ہم سب بے نام و نشان چلے جائیں گے۔ تمہارے باپ دادا کا نام تمہارے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔ عبدالرحمٰن' چاچے کی وجہ سے مجبور تھا۔ گھر' زمینیں سب سانجھی تھیں اور چاچے نے بھائی کے بعد تم لوگوں کو اولاد کی طرح ہی پالا تھا۔ کیسے اس کی بیٹی پر سوکن لانے کا سوچتی۔ بس تجھے ہی مجبور کرتی تھی۔ بس معاف کر دے مجھے پتر۔"

"نہیں ماں جی کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ اس طرح معافی مانگ کر مجھے گناہ گار مت کریں۔ معافی تو مجھے ہی مانگنی ہے آپ سے۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں زینی کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ اس کے لیے تو راضی تھی کہ میں شادی کر لوں' لیکن وہ میرے ساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اور مجھ سے الگ ہو کر کہاں جاتی وہ۔ بہن اور بہنوئی کے علاوہ اور کون تھا اس کا اس دنیا میں' نہ ماں' نہ باپ' نہ بھائی۔"

"بس پتر ہم انسان بڑے بے صبرے ہوتے ہیں۔ مجھ میں بھی صبر نہیں تھا چاہتی تھی فوراً" ہی میرا آنگن تم دونوں کے بچوں سے بھر جائے۔ ذرا صبر کر لیتی تو موحد کی خوشی دیکھ لیتی اور تم بھی پردیس کے دکھ نہ اٹھاتے۔ ہشام اور موحد کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں اللہ نے مجھ بے صبری کو کیسے ہیروں سے نوازا۔ اللہ انہیں لمبی حیاتی دے اور تم دونوں اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھو۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"پھر بھی ماں جی آپ مجھے سچے دل سے معاف کر دیں۔ میں بہت بے چین رہتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ نے اتنے سال میری جدائی کا دکھ سہا۔ موحد سے جدائی کا خیال کبھی لمحہ بھر کے لیے بھی دل میں آتا ہے تو جیسے دل پھٹنے لگتا ہے۔ آپ نے کیسے سہا ہو گا یہ دکھ۔ مجھ سے ناراض مت ہوں ناں جی معاف کر دیں مجھے۔"

"مائیں بیٹوں سے کب ناراض ہوتی ہیں پتر۔ میرے لبوں سے ہر لمحہ تیرے لیے دعائیں ہی نکلتی تھیں۔ پھر بھی تمہاری خوشی اسی میں ہے تو میں نے تمہیں معاف کیا۔"

"ماں جی۔" ڈاکٹر عثمان نے ان کے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔ تب ہی عبدالرحمٰن نے اندر قدم رکھا۔

"السلام علیکم ماں جی۔"

"وعلیکم السلام پتر جیتے رہو لمبی حیاتی ہو۔" انہوں نے ملک عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا۔

"ماں جی آپ نے سنا نصیر ماموں اور منیر ماموں دونوں بھائیوں کی اولادیں آپس میں لڑ پڑیں۔ گولیاں وغیرہ بھی چلی ہیں۔" ملک عبدالرحمٰن بیٹھ گئے۔

"ائے ہے کیوں؟" ماں جی نے بوکھلا کر پوچھا۔

"جائیداد کا جھگڑا ہے نصیر ماموں اور منیر ماموں جب تک زندہ رہے سب کچھ اکٹھا ہی تھا۔ اب بٹوارے کے لیے جھگڑے ہو رہے ہیں۔ سنا ہے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے دونوں طرف کے بندوں کو۔ مجھے کامے رشید نے ابھی بتایا ہے سب۔" عبدالرحمٰن ملک نے ماں جی کو بتا کر ڈاکٹر عثمان کی طرف دیکھا۔

"تمہیں یاد ہے عثمان ماں جی کے ماموں عبدالخالق نانا۔"

"ہاں یاد ہیں لمبے سے دبلے پتلے سے۔ گھوڑے

پالنے کا شوق تھا انہیں اور جب میں سیونتھ میں تھا تو فوت ہوگئے تھے۔"

"ان کے دو ہی بیٹے تھے نصیر ماموں اور منیر ماموں۔" عبدالرحمٰن ملک نے بتایا۔

"وہ بھی یاد ہیں جب نانو کے ساتھ ہم ان کے گاؤں جاتے تھے تو نصیر ماموں ہمیں گھوڑے پر بٹھا کر سیر کرواتے تھے اور میں ہر بار ان سے وعدہ لیتا تھا کہ جب مجھے گھڑسواری آجائے گی تو وہ اپنے ابا کا گھوڑا مجھے تحفہ دیں گے۔"

"تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے عثمان۔" ملک عبدالرحمٰن نے انہیں سراہا۔

"ایک سال کے فرق سے دونوں بھائی فوت ہوگئے تھے نصیر ماموں کے دو بیٹے ہیں اور منیر ماموں کے تین بیٹے دو بیٹیاں تو بس زمین جائیداد کے بٹوارے میں۔ ایک دفعہ پہلے بھی سر وغیرہ پھاڑے ہیں اب پھر۔ خیر اللہ ان کو عقل دے۔ ان کے حالات دیکھ کر میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی زندگی میں ہی ہم دونوں بھائی جائیداد بانٹ لیں' تاکہ ہمارے بعد لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ وہ ہی تو بچے ہیں ہمارے۔ خدانخواستہ! شیدا کہہ رہا تھا نصیر ماموں کے بیٹے کی حالت ٹھیک نہیں' دو گولیاں لگی ہیں اسے۔ یوں تو شامی اور موحد دونوں پڑھے لکھے سمجھ دار بچے ہیں۔ نصیر ماموں وغیرہ کے بچوں کی طرح نرے ان پڑھ جاہل نہیں پھر بھی اچھا ہے نا جھگڑے کی جڑ ہی ختم کردیں۔"

"بھائی صاحب۔" ڈاکٹر عثمان نے مضطرب سا ہو کر پہلو بدلا۔

"موحد تو شاید پاکستان میں سیٹل نہ ہو۔ میری زندگی تک ہی وہ یہاں آئے گا جو کچھ بھی ہے سب شامی کا ہی ہے۔ جس زمین پر اسپتال بنے گا بس مجھے اس زمین کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے۔ یہ زمینیں' یہ گھر آپ نے سنبھال کر رکھا۔ محنت کی ہے اس پر۔ سب آپ کا ہی ہے میرا کوئی حق نہیں ہے اس پر نہ ہی موحد کا کوئی حق ہے۔"

"کیسے حق نہیں ہے عثمان۔ باپ دادا کی جائیداد پر۔ ہم تینوں بہن بھائیوں کا اور ہمارے بعد ہماری اولاد کا حق ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ شرعی لحاظ سے جس کا جو حصہ بنتا ہے اس کے حوالے کردیا جائے۔ ناہید کا حصہ اس کی بیٹی کو ملے گا۔" وہ ہولے سے ہنسے۔

"اور میری تو دو بیویاں ہیں۔ نیلو بڑی فسادی ہے میرے بعد تو ضرور فساد ڈالے گی۔"

"یہ کیسی باتیں کررہے ہو تم عبدالرحمٰن۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے۔" ماں جی نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔

"موت تو ایک دن آنی ہے ماں جی۔ آج۔ کل کسی وقت بھی آسکتی ہے سو میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔"

"ایک تو مجھے تمہاری اس دوسری شادی کی سمجھ نہیں آئی۔ اللہ نے اولاد دی تھی۔ شہزادیوں جیسی بیوی تھی۔"

"بس ماں جی غلطی ہوگئی۔" ملک عبدالرحمٰن نے جھینپ کر عثمان کی طرف دیکھا اور پھر ماں جی سے مخاطب ہوئے۔

"آپ کی شہزادیوں جیسی بہو ان دنوں لفٹ نہیں کرواتی تھی۔ بس اپنے بچوں میں مگن رہتی تھی ایسے وقت میں نیلوفر ٹکرا گئی اور میں شادی کر بیٹھا۔ اب پچھتا رہا ہوں۔"

"بچے صرف میری بہو کے نہیں تمہارے بھی تو تھے عبدالرحمٰن! جان کھپا دی بچوں کی خاطر اس نے' قدر کرو اپنی بیوی کی۔"

"دیکھا عثمان' ماں جی کیسی عجیب ساس ہیں' اپنی بہو کی طرف داری کررہی ہیں۔"

"میری بہو ہے ہی لاکھوں میں ایک۔" ماں جی مسکرائیں۔

"اور نیلوفر بھابھی سے ابھی تک آپ نے ملاقات نہیں کروائی بھائی۔۔۔ زبی کی موت پر بھی نہیں دیکھا۔"

"وہ دراصل کراچی میں رہتی ہے عثمان میں اسے حویلی کبھی نہیں لایا۔"

"وہ آپ کی بیوی ہیں بھائی صاحب۔ شادی کی ہے آپ نے ان سے تو انہیں ان کے حقوق بھی دینے چاہئیں جو ثمرین بھابھی کے ہیں۔" عثمان ملک کا لہجہ نرم تھا۔ شروع سے ہی وہ مذہبی رجحان رکھتے تھے' لیکن زبی کے کوسے میں جلنے کے بعد تو ان کا مذہب کی طرف رجحان بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ برمنگھم کے اسلامی مرکز میں وہ ہر جمعے کو باقاعدگی سے جاتے تھے اور تفسیر وغیرہ کے درس میں ضرور شامل ہوتے تھے۔"

"خیر میں نیلوفر کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا ہوں اور اس کے پورے حقوق ادا کرتا ہوں۔" عبدالرحمٰن مسکرائے۔

"بات کہاں سے کہاں چلی گئی' میں زمین اور جائیداد کی تقسیم کی بات کررہا تھا اور بہت سیریس ہوں میں۔ ابھی موحد یہاں ہے تو یہ کام اس کے سامنے ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ اس کے دستخطوں کی بھی ضرورت ہوگی۔" عثمان ملک پھر مضطرب سے نظر آنے لگے۔

"ہاں تو کردو تقسیم۔۔۔ لیکن میں موحد کی طرف سے اپنے حصے سے دستبردار ہوتا ہوں۔ باقی جو حصہ دار ہیں ان میں تقسیم کردو۔"

"یہ کیسی باتیں کررہے ہو عثمان؟" عبدالرحمٰن الجھے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے کہ ثمرین بجو کا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر آئی۔ بجو سب کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ثمرین سلام کرکے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی اس نے بجو کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اپنے پاس بٹھاتے ہوئے عبدالرحمٰن سے پوچھا۔

"آپ کی شامی سے ملاقات ہوتی۔ جب سے گیا ہے ایک بار بھی میری بات نہیں ہوئی۔ اس نے تو کہا تھا ساری چھٹیاں یہاں ہی گزارے گا۔ موحد کی وجہ سے رک جاتا وہ اکیلا بور ہوتا رہتا ہے۔" وہ پریشان سی کہہ رہی تھیں۔

"ہاں ہوئی تھی۔"

"وہ کیسا ہے کب آئے گا؟" اس نے پوچھا۔

"بیوی ہمارا حال بھی پوچھ لیا کرو ابھی سفر سے لوٹے ہیں۔" عبدالرحمٰن کے لہجے میں شوخی تھی۔ عثمان ملک کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی۔

"بہرحال آپ کے صاحبزادے خیریت سے ہیں۔ وہ چار دنوں تک آنے کا کہہ رہا تھا اور آپ ان کی فکر نہ کریں۔ امل چکر لگاتی رہتی ہے اور کھانے وغیرہ کا مینیو شفو کو خود بتاتی ہے۔"

"امل سے بھی کتنا کہا کہ رک جائے کچھ دن' لیکن وہ بھی تو نہیں رکی۔" ماں جی نے بھی شکوہ کیا۔

"سالوں بعد آئی تھی اور ہفتہ ایسے پلک جھپکتے گزر گیا۔ اسے دیکھ کر ناہید سامنے آکھڑی ہوتی۔ بالکل وہی انداز بات کرنے کا' وہی شوق۔"

"دادی اور باپ کو چھوڑ کر کیسے رک جاتی ماں جی!" ثمرین نے آہستہ سے کہا۔

"بہت چاہتی ہے اپنی دادی کو۔ بولٹن سے بھی فون کرکر کے شامی سے کہتی رہتی تھی کہ دادی کا خیال رکھا کرو۔"

"اور۔۔۔" ثمرین نے سوچا۔

"کیا خبر شامی بھی اسی کی وجہ سے کراچی رکا ہوا ہو۔ اس کے بولٹن جانے کے بعد بہت اداس بھی تو رہنے لگا تھا۔"

"ویسے آپ کے صاحبزادے گھر پر کم ہی ٹکتے ہیں امل بھی شکایت کررہی تھی کہ صبح کا نکلا رات کو گھر آتا ہے۔"

"تو آپ نے پوچھا نہیں وہ تو کبھی گھر سے اس طرح باہر نہیں رہا۔" ثمرین پریشان ہوگئی۔

"کوئی کام ہوگا نکل جاتا ہوگا گھر سے۔" عبدالرحمٰن نے لاپروائی سے کہا۔

"اگر کوئی کام ہے تو مجھے بھی بھجوا دیں۔ واپس کراچی وہاں اکیلا رہ رہا ہے۔"

"بچہ نہیں ہے ریٹا بہت سمجھ دار ہے پھر سب ملازم ہیں گھر میں۔" عبدالرحمٰن نے سمجھایا۔

"لیکن۔۔۔" تب ہی بجو نے ان کا دوپٹا کھینچا اور اسماس اسماس کی آواز نکال کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور زبان نکال کر زور سے ادھر ادھر مارنے لگی تو

ثمرین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوما' گال سہلایا اور بات مکمل کیے بغیر کھڑی ہو گئی۔

"اسے بھوک لگی ہے کچھ کھلا دوں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر چلی گئی اور عثمان ملک نے سوچا۔

ایک یہ ماں ہے اور ایک وہ ماں تھی جس نے برستی بارش میں اپنے بچے کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ تب ہی ان کا فون بج اٹھا۔ انہوں نے فون آن کیا دوسری طرف ڈاکٹر احسن تھے۔

"ارے آپ... آپ کیسے یاد کیا۔" وہ فون پر بات کرتے کرتے باہر چلے گئے۔

☼ ☼ ☼
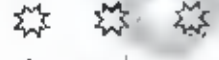
بادل اچانک ہی آئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے پہلے ہلکی ہلکی بوندا باندی ہوئی اور تیز بارش ہونے لگی۔ ڈاکٹر عثمان اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس کھڑے باہر دیکھ رہے تھے سارے میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی برستی بارش کو دیکھتے رہے۔ انہیں ایسی ہی ایک رات یاد آ رہی تھی اس رات بھی وہ یونہی کھڑکی کے پاس کھڑے باہر برستی بارش کو دیکھ رہے تھے جس نے دیکھتے دیکھتے طوفانی صورت اختیار کر لی تھی۔

زینی سامنے ہی کرسی پر بیٹھی تھی۔ خاموش' اداس اور بے قرار وہ ایک نظر اس پر ڈال کر پھر باہر دیکھنے لگے تھے باہر سخت طوفانی بارش ہو رہی تھی اور جھکڑ چل رہے تھے اور ایسا ہی ایک طوفان ان کے اندر بھی اٹھ رہا تھا۔ انہیں زینی سے محبت تھی بہت شدید محبت وہ جس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور انہیں ماں جی کی خواہش کا احترام بھی تھا وہ اپنے طور پر حق بجانب تھیں۔ بہت بار انکار کرنے کے بعد وہ ماں جی کے آنسوؤں کے سامنے ہارنے لگتے تھے۔

"ماں جی آپ عبدالرحمٰن بھائی کی شادی کر دیں۔ یوں بھی بھابھی ان سے عمر میں کافی بڑی ہیں اور وہ اس شادی سے زیادہ خوش بھی نہیں ہیں' لیکن میں زینی کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن ہوں مجھے بچے کی چاہ نہیں ہے۔"

"عبدالرحمٰن کے گھر تیرے چاچے کی بیٹی ہے۔ تیرا چاچا اجازت نہیں دیتا۔"

"زینی بھی تو کسی کی بیٹی ہے ناماں جی!" وہ جتنی بحث کر سکتے تھے انہوں نے ماں جی سے کی' لیکن جب ماں جی نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے تو وہ ان کے آنسوؤں سے ہار گئے۔

"ٹھیک ہے ماں جی میں زینی سے بات کروں گا۔" اور گاؤں سے واپس آکر جب انہوں نے زینی سے بات کی تو زینی نے بہت خاموشی سے ان کی ساری بات سنی۔

"ٹھیک ہے آپ ماں جی کی بات مان لیں۔" انہوں نے حیران ہو کر زینی کی طرف دیکھا تھا۔

"لیکن میں کسی کے ساتھ آپ کو شیئر نہیں کر سکتی۔" اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"میرے جانے کے بعد آپ ماں جی کی خواہش پوری کر دیں۔"

"یہ آپ کا حق ہے عثمان۔ میرے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی تو آپ کیوں محروم رہیں۔"

"تم... تم کہاں جاؤ گی؟"

"آپا کے پاس۔"

"نہیں میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا پلیز تم تھوڑا سا دل کشادہ کر لو۔ وہ جو کوئی بھی ہو گی حویلی میں رہے گی ماں جی کے پاس۔"

"اس طرح آپ اس کی حق تلفی کر کے گناہ گار ہوں گے۔"

"پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ ماں جی میری بات نہیں سمجھتیں اور تم..."

"جس روز آپ کسی دوسری عورت کے پاس جائیں گے عثمان شاید اسی روز میرا دل بند ہو جائے گا۔" اب وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"زینی پلیز مت رو۔ میں ایسا کچھ نہیں کروں گا جس سے تمہیں تکلیف ہو۔"

اور انہوں نے ناہید کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ وہ ماں جی کو بتا دے کہ وہ خود کو دوسری شادی کے لیے تیار نہیں پاتے۔ وہ خود ماں جی کو مایوس کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے اور آج ناہید کا فون آیا تھا کہ کل وہ اور ماں جی جہلم آ رہے ہیں۔ وہ کیوں آ رہی تھیں انہیں پوچھنے کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی زینی کو۔ وہ بھی جانتی تھی کہ ماں جی کی آمد کا مقصد کیا ہے اور وہ اپنا سامان باندھے بیٹھی تھی۔ وہ ماں جی کے آنے سے پہلے ہی اپنی آپا کے پاس جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

"زینی پلیز میں ماں جی کو سمجھا لوں گا۔ بات کر لوں گا ان سے۔" انہوں نے زینی سے کہا تھا' لیکن زینی جانتی تھی کہ نہ وہ ماں جی کو سمجھا سکیں گے اور نہ ہی وہ ماں جی کے سامنے بول پائیں گے۔

"اگر انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ انہوں نے اپنا دوپٹا میرے سامنے پھیلا دیا تو میں کیا کروں گی عثمان اور وہ ایسا کر سکتی ہیں اور وہ ایسا ہی کریں گی۔" وہ جانتے تھے کہ زینی صحیح کہہ رہی ہے۔ وہ ماں جی کے جڑے ہاتھوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے انہیں زینی کا فیصلہ صحیح لگا تھا۔

"ٹھیک ہے زینی صبح میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔" انہوں نے جیسے فیصلہ کر کے کہا تھا اور پھر رخ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے تھے بارش اسی تواتر سے برس رہی تھی۔ ان دنوں وہ جہلم میں تھے اور ایک کالونی میں رہائش پذیر یہ سجا سجایا گھر انہیں اسپتال کی طرف سے ہی ملا تھا۔

"نہیں عثمان آپ ماں جی کی بات مان لیں۔" زینی کی آواز میں ہزاروں آنسوؤں کی نمی تھی۔ وہ مڑ کر زینی سے کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ان کی نظر باہر سڑک پر پڑی برآمدوں میں جلتے مدھم بلبوں کی روشنی میں وہ تیز تیز چلتی ہوئی بالکل سامنے غنی صاحب کے گھر کے اس نیم دائرے کی شکل میں بنے برآمدے میں آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔

"اتنی برستی بارش میں کیا غنی صاحب کے گھر کوئی مہمان آئے ہیں؟" انہوں نے غیر ارادی طور پر کھڑکی کے شیشے کے ساتھ چہرہ لگا کر غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ کوئی عورت تھی۔ یک دم ہی بجلی چمکی تھی جس نے ارد گرد کی ہر چیز کو روشن کر دیا تھا۔ انہوں نے یک دم کھڑکی کھول دی تھی وہ عورت جھک کر برآمدے میں کچھ رکھ رہی تھی۔ بادل زور سے گرجا تھا۔ عورت خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی بلب کی مدھم روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی' لیکن پھر بھی وہ واضح طور پر اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکے تھے۔ اب وہ عورت واپس مڑ رہی تھی۔ اس نے برآمدے میں کچھ رکھا تھا کیا وہ نہیں دیکھ سکے تھے اب وہ تقریباً" بھاگ رہی تھی۔

وہ کھڑکی بند کر کے بھاگتے ہوئے باہر آئے تھے۔ ان کے گھر کے بالکل سامنے عبدالغنی صاحب کا گھر تھا رات کے اس پہر برستی بارش میں ہر طرف خاموشی اور سناٹا تھا لوگ اپنے اپنے گھروں میں گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ وہ اس عورت کے پیچھے جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے قدم کالونی کے گیٹ کی طرف بڑھائے ہی تھے' لیکن پھر ایک آواز نے ان کے اٹھتے قدم روک دیے۔ یہ بچے کے رونے کی آواز تھی۔ کیا وہ عورت یہاں بچہ چھوڑ کر گئی ہے۔ وہ ٹھٹک کر رک گئے اور عبدالغنی صاحب کے ڈرائنگ روم کے باہر برآمدے کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ بچے کے رونے کی آواز وہاں سے ہی آ رہی تھی۔ سڑک پر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تھی وہ جو بھی تھی گاڑی میں بیٹھ کر جا چکی تھی۔ وہ مڑ کر برآمدے میں آئے تھے۔ بچہ رو رہا تھا بالکل غیر ارادی طور پر انہوں نے جھک کر بچے کی کیری کاٹ اور پاس پڑی باسکٹ اٹھالی تھی اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف بڑھ گئے تھے۔ آدھی رات کے وقت وہ اتنی تیزی سے باہر کہاں گئے تھے۔ زینی پریشان سی دروازے کے پاس کھڑی تھی۔

"یہ... یہ کیا ہے عثمان...؟"

"بچہ ہے کوئی عورت عبدالغنی صاحب کے گھر کے برآمدے میں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔" کمرے میں آکر انہوں نے کیری کاٹ نیچے رکھی۔ بچہ اب حلق پھاڑ پھاڑ کر رو رہا تھا۔ انہوں نے اسٹریپ کھولے اور وہ نیچے

ماہنامہ کرن 25 اگست 2016

جھکے کہ بچے کو اٹھالیں اور پھر یک دم پیچھے ہٹے تھے بس ایک لمحہ کے لیے انہوں نے زینی کی طرف دیکھا تھا جس کی آنکھوں میں خوف تھا۔

"یہ... یہ بچہ... رات کے اس پہر... کیا وہ واقعی کوئی انسان تھا یا... خدا کے لیے عثمان اسے وہاں ہی چھوڑ آئیں۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" ان کے اندر کا ڈاکٹر بیدار ہو گیا تھا۔ انہوں نے جھک کر بچے کو اٹھا لیا۔ کاٹ میں پاس ہی فیڈر بھی پڑا تھا۔ انہوں نے فیڈر بھی اٹھا لیا تھا۔ بچہ ان کے ہاتھوں میں آتے ہی خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بے حد خوب صورت تھیں سنہری سنہری مڑی ہوئی پلکوں والی۔ اس کی رنگت گلابی تھی' لیکن... انہوں نے جھرجھری لے کر زینی کی طرف دیکھا تھا جو آنکھوں میں خوف لیے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"کیسی ظالم ماں تھی۔" بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا تھا۔ بچہ پھر رونے لگا تھا اس کی مہین آواز جیسے دل کو گرفت میں لے رہی تھی۔

"بھوکا ہے۔" زینی نے بے اختیار آگے بڑھ کر بچہ ان سے لے لیا تھا اور اسے گود میں لٹا کر فیڈر اس کے منہ سے لگا لیا تھا۔ کیری کٹ' بچے کا لباس' باسکٹ میں رکھا اس کی ضرورت کا سامان' فیڈر' ہر چیز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ کسی اچھے گھرانے کا ہے۔ بچہ چند دن کا تھا۔

"کیا وہ کسی امیر خاندان کی لڑکی کا ناجائز بچہ ہے۔" ایک لمحہ کے لیے ان کے دل میں خیال آیا تھا' لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا وہ صرف ایک معصوم بچہ تھا۔

"کیسی ظالم ماں تھی۔" بچہ دودھ پی کر سو گیا تو اسے لٹانے کے بعد انہوں نے عثمان ملک کی طرف دیکھ کر ان کی ہی بات دہرائی تھی۔

"پتا نہیں ماں تھی یا کوئی اور..." انہوں نے خیال ظاہر کیا تھا۔ بچے کے ساتھ بہت سارے مسائل تھے وہ دونوں ڈاکٹر تھے اور انہوں نے بہت دیر تک بچے کا اس نقطہ نظر سے مشاہدہ کیا تھا۔ پھر باقی کی رات وہ سو نہیں سکے تھے۔

کل ماں جی اور ناہید بھی آ رہی تھیں اور ماں جی کے آنے سے پہلے انہیں یہ گھر چھوڑ دینا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے وہ فیصلہ کر چکے تھے۔

"زینی! اس کی ماں یا جس کسی نے بھی اس بچے کو یہاں اس طوفانی رات میں چھوڑا ہے وہ اسے واپس ڈھونڈنے نہیں آئے گی۔ اگر تم کہو تو ہم اس بچے کو اللہ کی طرف سے تحفہ سمجھ کر اپنا لیں۔ شاید اللہ نے اسے تمہاری خالی گود میں اس لیے ڈالا ہے کہ ہم اس کی پرورش کریں' لیکن اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو صبح ہم اسے کسی ادارے کے حوالے کر کے چلے جاتے ہیں... میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا اور ماں جی کے آنسو بھی میرے دل پر گرتے ہیں' میں ان کے بندھے ہاتھوں کی درخواست رد نہیں کر سکتا... اس لیے میں نے یہاں سے جانے اور ان کا سامنا نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" زینی بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور اللہ نے اس کے دل میں اس بچے کے لیے ممتا اتار دی تھی۔

"نہیں عثمان ہم اسے کسی ادارے کے حوالے نہیں کریں گے۔ اللہ نے یہ بچہ ہمارے لیے بھیجا ہے۔ ہم اس کا علاج کروائیں گے۔ یہ ہماری سونی زندگی میں رنگ بھرے گا۔ ہم اس کی دیکھ بھال کریں گے۔ کیا خبر یہ ہماری بخشش کا ذریعہ بن جائے۔"

"زینی اللہ نے تمہیں بہت خوب صورت دل دیا ہے۔ ہم اس بچے کے لیے وہ سب کچھ کریں گے جو ممکن ہوا۔"

یوں وہ بچے کو لے کر صبح ہی مری آ گئے تھے جہاں ان دنوں زینی کے بہنوئی کی پوسٹنگ تھی۔ مری پہنچتے ہی انہوں نے ناہید کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ انہوں نے جاب سے ریزائن دے کر جہلم والا گھر چھوڑ دیا ہے کیونکہ وہ ماں جی کو بھی انکار نہیں کر سکتے اور زینی کو بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ اس لیے ماں جی کے آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ناہید پوچھتی ہی رہ گئی تھی کہ وہ کہاں ہیں' لیکن انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

چند دن زینی کی آپا کے ہاں رہنے کے بعد انہوں نے مری سے آگے ایک چھوٹے سے قصبے میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ ایک دوست نے انہیں کچھ عرصہ پہلے انگلینڈ میں جاب کرنے کے لیے کہا تھا وہ خود بھی وہاں تھا۔ یوں اس کے توسط سے انہیں وہاں جاب مل گئی تھی۔ کئی ماہ سے پراسس چل رہا تھا چند ماہ بعد وہ انگلینڈ چلے گئے تھے۔

گھر والوں سے انہوں نے پھر رابطہ نہیں کیا تھا ایک وجہ تو ظاہر تھی کہ ان پر پھر شادی کے لیے دباؤ ڈالا جاتا۔ دوسری وجہ یہ بچہ تھا جسے انہوں نے اپنا نام دیا تھا اور چاہتے تھے کہ یہ بچہ ہمیشہ ان کے نام سے جانا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ عرصہ بعد وہ پاکستان لوٹ کر آئیں گے تو سب کو یہی بتائیں گے کہ یہ ان کا اور زینی کا بچہ ہے' لیکن ان سے جو ایک غلطی ہو گئی تھی کہ وہ بچے کو لے کر زینی کی آپا کے گھر گئے تھے اور وہ سب جانتے تھے کہ بچہ ان کا نہیں ہے۔ یوں وہ پھر پاکستان پلٹ ہی نہ سکے۔ وہاں کی مصروف زندگی' بچے کا علاج ماہر ڈاکٹروں کی نگرانی میں ہو رہا تھا ذہنی طور پر وہ نارمل تھا۔ جسمانی مسائل کو دور کیا جا سکتا تھا۔ پہلے اس کے چہرے سے یک بعد دیگرے رسولیاں ختم کی گئیں۔ پھر کئی اور سخت مراحل تھے جن سے وہ گزرا تھا۔ گرافٹنگ کے عمل اور سلیکون تھراپی کے بعد اس کی ناک کا سوراخ اور کٹا ہوا ہونٹ صحیح ہو گیا تھا۔ بال اگنے میں کچھ وقت لگا تھا' لیکن سات سال بعد جب وہ لندن سے برمنگھم جا رہے تھے تو موحد عثمان ایسا بچہ تھا جسے راہ چلتے لوگ رک کر پیار کرتے تھے۔ کوئی مسکرا کر دیکھتا کوئی دو انگلیوں سے گالوں کو چھوتا' وہ تھا ہی اتنا پیارا کہ نگاہ اس پر ٹھہر جاتی تھی۔ لائٹ براؤن گھنے بال' خوب صورت آنکھیں جن پر گہری گھنی پلکیں زینی تو اس پر نثار ہوتی رہتی اور اس پر نظر کی دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہتی تھی۔ وہ بے حد ذہین تھا۔ بے حد سلجھا ہوا تھا اور زینی اور عثمان سے بہت محبت کرتا تھا۔

"ہم کتنے خوش نصیب ہیں عثمان کہ اللہ نے ہمیں موحد دیا۔" وہ اکثر کہتی تھیں دونوں کی جان موحد میں تھی۔ وہ پاکستان چھوڑ کر آ گئے تھے اور پاکستان چھوڑتے ہوئے انہوں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ پھر پاکستان نہیں آئیں گے' لیکن یہاں آ کر پھر انہوں نے واپس جانے کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی موحد کے متعلق جان سکے کہ وہ ان کی اولاد نہیں ہے۔ پاکستان میں صرف زینی کی آپا کا خاندان جانتا تھا کہ موحد ان کا نہیں ہے۔ کاش وہ اس وقت ادھر جانے کے بجائے کسی ہوٹل میں چلے جاتے اور کوئی نہ جان پاتا کہ موحد کون ہے۔

کئی بار انہوں نے سوچا تھا کہ وہ عبدالرحمٰن بھائی' ناہید اور ماں جی کو فون کریں اور انہیں موحد کے متعلق بتائیں' لیکن پھر نہ جانے کیوں وہ فون نہیں کر پائے۔ پہلے تو موحد کا طویل اور صبر آزما علاج تھا اور پھر... ایک دو بار بے اختیار نمبر ملایا بھی تو ریکارڈنگ آواز سنائی دی۔ یہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے... سات آٹھ سالوں میں نمبر یقیناً" بدل چکے ہوں گے اور پھر انہوں نے کوشش ہی نہیں کی۔ شاید تقدیر میں ایسے ہی لکھا تھا انہیں اس طرح زینی کی ڈیڈ باڈی کے ساتھ ہی لوٹنا تھا۔

زینی کے کومے میں جانے کے بعد تو درحقیقت انہوں نے واپسی کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ حالانکہ زینی کے کومے میں جانے کے چند دن پہلے ان کی ملاقات ڈاکٹر ظفر وغیرہ سے ہوئی تھی جو کسی سیمینار میں شرکت کے لیے آئے تھے اور ڈاکٹروں کے اس وفد میں ان کے چند کلاس فیلو بھی تھے اور انہی میں نہ صرف نمبروں کا تبادلہ ہوا تھا بلکہ انہوں نے عبدالرحمٰن ملک کا نیا نمبر بھی ان سے لے لیا تھا' لیکن پھر زینی کا حادثہ ہوا اور...

انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی اور اپنے وطن کی بارش دیکھے بھی کتنی مدت گزر گئی تھی انہوں نے بارش کے قطروں کو اپنے دل پر گرتے محسوس کیا۔ موحد کو اگر اس حقیقت کا علم ہوا تو اس کا کیا ردعمل ہو گا وہ نہیں جانتے تھے' لیکن ایک خوف تھا جو دل کو

جکڑے ہوئے تھا اور انہیں ہولے ہولے بھینچتا تھا اگر وہ چھوڑ کر چلا گیا تو زندگی کے باقی ماندہ دن کیسے گزریں گے اس کے بنا اور زندگی باقی ہی کتنی رہ گئی تھی۔ بس اسے میری زندگی میں علم نہ ہو۔ ان کے دل نے شدت سے چاہ کی‘ لیکن عبدالرحمٰن بھائی وہ جو بضد تھے جائیداد کی تقسیم پر اور ان کی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھے جب کہ وہ جانتے تھے موحد کا اس جائیداد پر کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن ماں جی اور عبدالرحمٰن نہیں جانتے تھے۔

یہ مذہب سے ان کی آگاہی اور آشنائی تھی جو رہ رہ کر انہیں اکساتی تھی کہ وہ عبدالرحمٰن ملک کو حقیقت بتا دیں کہ موحد ان کا بیٹا نہیں ہے اور لے پالک بیٹے کا ان کے باپ دادا کی جائیداد پر کوئی حق نہیں ہے۔ اور مذہب تو یہ بھی کہتا ہے کہ لے پالکوں کو ان کے باپوں کے ناموں سے محروم مت کرو۔ دل میں جیسے کسی نے سرگوشی کی تھی۔

پہلے وہ نہیں جانتے تھے کہ اس طوفانی رات میں عبدالغنی کے برآمدے میں پڑے بچے کے باپ کا کیا نام ہے... لیکن کیا وہ اب بھی نہیں جانتے تھے کہ موحد کا باپ کون ہے۔ انہوں نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر کھڑکی کے پاس ہی پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سر تھام لیا۔

☆ ☆ ☆

موحد نے کھڑکی سے برستی بارش کو دیکھا۔ بارش بہت خوب صورتی سے برس رہی تھی۔ بہت تواتر سے قطرے پیاسی زمین پر گر رہے تھے۔ بارش نے موسم کو بے حد خوش گوار بنا دیا تھا ورنہ یہاں کی گرمی نے اسے بوکھلا دیا تھا۔

بارشوں کے موسم میں
ایک بے نمو خواہش
کھڑکیوں سے لگ لگ کر
ایک ایسے لمحے کا انتظار کرتی ہے
جو کبھی نہیں آتا

اس نے امل کو میسج کیا اور کھڑکی سے بایاں ہاتھ باہر نکال کر بارش کے قطروں کو اپنی ہتھیلی پر لیا۔ تب ہی اس کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑے فون کی اسکرین کی طرف دیکھا اور امل کا نام دیکھ کر مسکرایا اور فون کان سے لگاتے ہوئے بایاں ہاتھ اندر کر کے جینز سے رگڑ کر پونچھا۔

"ہیلو... یہ تم ہو نا موحد یہ اشعار تم نے ہی سینڈ کیے ہیں نا۔" دوسری طرف امل پوچھ رہی تھی۔

"کیوں تمہیں شک ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے حیرت ہو رہی ہے تمہیں اردو کے اشعار آتے ہیں اور تمہیں بھی شاعری سے دلچسپی ہے۔" وہ اپنی حیرت چھپا نہیں پا رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"میں نے فیض اور اقبال کو پڑھا ہے۔ بابا کے پاس ان کی کتابیں تھیں۔"

"لیکن یہ فیض اور اقبال کی شاعری تو نہیں ہے۔" حیرت بدستور موجود تھی۔ اس نے تصور میں امل کی سبز آنکھوں میں حیرتوں کو ابھرتے دیکھا۔

"ہاں تو یہ میں نے آج ایک اخبار کے ادبی صفحہ پر پڑھے ہیں۔"

"واؤ۔" اس کے لہجے میں چہچہاہٹ تھی۔

"مجھے اچھا شعر بہت اٹریکٹ کرتا ہے موحد‘ میرے پاس ڈھیروں ڈائریاں ہیں جن میں خوب صورت اشعار اور نظمیں لکھ رکھی ہیں میں نے۔"

"تو کیا اب اشعار بھی رٹنے پڑیں گے۔" وہ مسکرایا۔

"نہیں موحد اشعار رٹنے سے یاد نہیں ہوتے یہ تو خود بخود دل میں اتر جاتے ہیں۔ اچھا شعر ایک بار پڑھنے یا سننے سے میرے دل پر رقم ہو جاتا ہے۔"

"جو شخص اپنی خشک پڑھائی کے باوجود کیٹس اور ورڈز ورتھ کا دیوانہ ہو جس نے شیلے اور لانگ فیلو کو گھول کر پی رکھا ہو اس کے لیے اردو شاعری بھی ضرور اٹریکشن رکھتی ہوگی۔ تم مجھے اردو کے اشعار سنایا کرنا فارغ وقت میں۔ دیکھنا وہ کیسے میرے دل پر رقم ہوتے ہیں۔"

"رئیلی موحد؟" وہ یک دم خوش ہو گئی تھی۔

"آج میں نے ایک غزل پڑھی تھی بہت اچھی لگی تھی تمہیں سناؤں۔"

"ضرور۔"

میں خزاں کی دھوپ کا آئینہ کہ میں ایک دن کہ ہزار ہوں
کہیں آنسوؤں کا ہوں قافلہ کہیں جگنوؤں کی قطار ہوں
کوئی تارا ٹوٹ کے گر گیا کوئی چاند چھت سے اتر گیا
کسی آسمان کی چال ہوں‘ جو بکھر گیا وہی ہار ہوں

"ارے یہ تو بہت افسردہ کر دینے والے شعر ہیں میں تو کچھ رومانٹک سے اشعار کا منتظر تھا۔" اس کے لہجے کی اس شوخی نے امل کو حیران کیا۔

"یہ تم ہی ہو نا موحد؟"

"ہاں تمہیں کچھ شک ہے؟"

"لیکن تم پہلے تو اس طرح کے نہ تھے۔"

"کس طرح کا؟" موحد مزا لے رہا تھا۔

"یہی... میرا مطلب ہے اس طرح کی بات تو کبھی نہیں کی تھی تم نے..."

"تو پہلے میں اس طرح کے جذبے سے آشنا بھی تو نہیں تھا اور آج تو موسم بھی بہت غضب کا ہو رہا ہے اور اس ظالم موسم میں تم اگر یہاں ہوتیں تو... سچی بہت بور ہو رہا ہوں۔ بہت فضول لڑکی ہو تم۔ ایک ہفتہ بھی نہیں ٹھہریں تم یہاں۔ بابا اور انکل عبدالرحمٰن بہت مصروف رہتے ہیں۔"

"سوری موحد۔" امل سنجیدہ ہوئی۔

"میں وہاں زیادہ نہیں ٹھہر سکتی تھی جانتے ہو نا دادی میرے بغیر کتنی اداس اور اکیلی تھیں۔ تم سے تو وہاں بھی ملاقات رہے گی نا اور دادی سے تو پھر اگلی چھٹیوں میں ہی ملنا ہوگا نا اور میں یہ سارا وقت ان کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ دو تین دن رک جائیں‘ لیکن انہیں اپنے گھر کے سوا کہیں سکون نہیں ملتا۔ زویا پھپھو کے گھر بھی تین چار دن سے زیادہ نہیں رہ پاتیں وہ۔ موحد میں ساری چھٹیاں ان کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں ان کی خدمت کر کے ان کا خیال رکھ کر بالکل ایسے ہی جیسے اب تک انہوں نے میرا خیال رکھا ہے۔ تم پلیز ناراض نہ ہونا۔"

"تم بہت اچھی ہو امل۔" موحد متاثر ہوا۔

"اور میں تم سے ناراض بھی نہیں۔ یہ ہشام بھی تو کراچی جا کر بیٹھ گیا ہے۔ وہ ہوتا تو بوریت نہ ہوتی۔ کیسا ہے وہ اور آ کیوں نہیں رہا یہاں۔"

"پتا نہیں... شای کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔" امل نے پریشانی سے کہا۔

"اتنے سارے دن ہو گئے اسے حویلی سے آئے اور صرف ایک بار دادی سے ملنے آیا ہے اور مجھ سے تو اس نے بات تک نہیں کی۔ بس کھڑے کھڑے دادی سے بات کر کے چلا گیا۔ روکنے پر بھی نہیں رکا اور میں ملک ہاؤس جاؤں تو وہ ہوتا ہی نہیں۔ شفو بتاتی ہے صبح کا نکلا رات کو گھر آتا ہے۔ جانے کن کاموں میں الجھا ہوا ہے۔" وہ تیز تیز بول رہی تھی بغیر رکے۔

"میں شفو سے اپنے سامنے کھانا بنواتی ہوں' لیکن صبح جاؤں تو پتا چلتا ہے کہ وہ باہر سے ہی کھا آیا ہے۔ کل میں نے بریانی بنائی تھی ادھر بھی دے آئی تھی' لیکن اس نے کھائی ہی نہیں حالانکہ اسے بریانی بہت پسند ہے۔ آج صبح میں ناشتے سے پہلے ہی چلی گئی تھی وہ سو رہا تھا۔ میں نے جا کر اسے جگایا' لیکن اس نے زیادہ بات نہیں کی۔ میں نے اس سے پوچھا اسے کیا پرابلم ہے' لیکن اس نے نہیں بتایا۔ وہ ایسا نہیں تھا موحد وہ ہر بات مجھ سے کرتا تھا اس نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں چھپایا' لیکن اب چھپا رہا ہے۔" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"ہو سکتا ہے اہل وہ تم سے اپنا پرابلم ڈسکس کر کے تمہیں پریشان نہ کرنا چاہتا ہو۔"

"لیکن اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے نا موحد اپنوں سے ہی اگر بندہ اپنی پریشانیاں شیئر نہ کرے تو کس سے کرے۔"

"ہاں یہ تو ہے تم ایک بار پھر بات کرنا ہشام سے۔" موحد نے مشورہ دیا۔

"وہ ملے تو تب نا۔" اہل نے شکوہ کیا۔

"اتنی صبح چھاپہ مارا لیکن فورا" ہی واش روم میں گھس گیا اور تیار ہو کر بجائے میری بات سننے کے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اسے جگا دیا اسے ضروری کام سے جانا تھا۔۔۔ اور بغیر ناشتے کے مجھے وہاں ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ ایسا نہیں تھا موحد لیکن ایسا ہو گیا ہے۔"

"وہ تمہارا دوست ہے نا اہل ضرور تمہیں اپنی پرابلم بتائے گا۔ ہو سکتا ہے ابھی وہ جھجک رہا ہو تمہیں بتانے سے۔"

"جھجک رہا ہے۔ اوہ مائی گاڈ کہیں اسے محبت تو نہیں ہو گئی۔" اس نے اندازہ لگایا تھا۔

"ایک یہی ایسی بات ہو سکتی ہے جو مجھے بتاتے ہوئے وہ جھجک رہا ہے ورنہ تو۔۔۔ حالانکہ یہ بات بھی اسے مجھے بتانی چاہیے تھی۔"

"تم نے اسے بتایا۔" موحد نے پوچھا۔

"نہیں۔" اہل نے جواب دیا۔

"حالانکہ تم ہر بات اس سے شیئر کرتی ہو لیکن یہ بات نہیں بتا سکیں۔۔۔ تو وہ بھی۔۔"

"ہاں بالکل۔۔۔ یہی بات ہو گی۔" وہ خوش ہو گئی تھی لیکن ساتھ ہی اسے ایک اور فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اسے کس سے محبت ہوئی ہو گی۔

"اللہ۔۔۔ موحد کہیں وہ میڈم نیلوفر کی اس چپٹی ناک والی کزن سے تو محبت نہیں کرنے لگا۔ شفو نے مجھے بتایا تھا انکل کے منع کرنے کے باوجود میڈم نیلوفر اپنی اس چپٹی ناک والی کزن کے ساتھ چند دن پہلے آئی تھی۔ حالانکہ شاہ نے کہا تھا کہ اب اگر نیلوفر میڈم نے اس کے گھر میں قدم رکھا تو وہ اس کی ٹانگیں توڑ دے گا لیکن اس نے ٹانگیں نہیں توڑیں نا تو۔۔۔ ہائے موحد اگر شاہ کو سچ مچ اسی سے محبت ہوئی تو۔"

"تو کیا۔" موحد نے پوچھا۔

"اسے کسی سے بھی محبت ہو جائے لیکن اس سے نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیوں۔"

"وہ میڈم نیلوفر۔" وہ ذرا سا جھجکی۔ "ان کا بیک گراؤنڈ کچھ اچھا نہیں ہے ایک بار شاہ نے ہی مجھے بتایا تھا۔"

"محبت سوچ سمجھ کر تھوڑی ہوتی ہے اہل۔ وہ تو ہو جاتی ہے۔ وہ نہ تو بیک گراؤنڈ دیکھتی ہے۔ نہ شکل و صورت نہ عمروں کا تفاوت بس جب ہونی ہوتی ہے۔ ہو جاتی ہے۔ محبت' سود و زیاں حساب و کتاب سے ماورا ہوتی ہے اہل۔"

"موحد۔" اس کے لہجے سے حیرت نمایاں تھی۔

"یہ تم ہی ہو نا موحد کیا یہ پاکستان کی ہواؤں کا اثر ہے۔"

"شاید پاکستان کی ہوا کا اثر ہے یا اس جذبے کا جس نے چپکے سے میرے دل نمو پائی اور تناور درخت بن گیا۔"

"اچھا موحد پھر بات کروں گی دادی آواز دے رہی ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے رات فون کروں گا۔"

"او کے۔ اللہ حافظ۔"

"ایک منٹ اہل۔" اہل نے اللہ حافظ کہا تو ایک دم سے موحد کو یاد آیا کہ اسے اہل کو کچھ اور بھی بتانا تھا۔

"تمہیں ایک بات بتانی تھی مجھے خالہ کی فیملی کے متعلق پتا چلا ہے وہ لوگ آج کل کراچی میں سیٹل ہیں۔۔۔ میں ایک دو روز تک کراچی آ رہا ہوں۔"

"رئیلی کیسے پتا چلا۔" اہل خوش ہو گئی۔

"یہاں گاؤں میں ایک ریٹائرڈ صوبے دار صاحب سے ملاقات ہوئی تھی انہی سے پتا چلا وہ جانتے تھے کہ بابا کی شادی بریگیڈیئر اقبال کی مسز ان لا سے ہوئی تھی۔ وہ تب میجر تھے۔ اور اب بریگیڈیئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ میں نے ابھی بابا کو نہیں بتایا پہلے خود مل لوں پھر انہیں سرپرائز دوں گا۔"

خوشی اس کی آواز سے چھلکتی تھی۔ "پتا ہے اہل میرے پاس صرف دو رشتے تھے ماما اور بابا کا۔ میں نے کبھی کسی اور رشتے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن اب جب میری زندگی میں یکایک' تم' ماں جی' شاہ' عبدالرحمن انکل بہت سارے رشتے آ گئے تو مجھے لگا میں اس سے پہلے کتنے پیارے رشتوں کی حلاوتوں سے محروم تھا۔ ان رشتوں کی خوشبو مجھے مست کیے دیتی ہے اہل اور اب میں باقی کے رشتوں کی حلاوتوں اور مٹھاس کو بھی محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اب محسوس ہوا ہے کہ رشتوں کے بغیر آدمی کسی ایسے پودے کی طرح ہوتا ہے جسے اپنی زمین سے اکھیڑ کر پانی کی بوتل میں ڈال دیا جائے جیسے منی پلانٹ۔ وہ سروائیو تو کر لیتا ہے لیکن اس طرح پھلتا پھولتا نہیں ہے جس طرح زمین سے جڑے رہ کر۔"

"موحد تمہاری باتیں مجھے حیران کر رہی ہیں۔ تم نے ابھی رشتوں کی محبت کا ذائقہ چکھا ہے۔ اللہ کرے تمہارے رشتے ہمیشہ ایسے ہی اپنی محبتیں تم پر لٹاتے رہیں۔ ورنہ میں نے تو سنا ہے کبھی کبھی یہ بڑے زہریلے بھی ہو جاتے ہیں۔ بہت پہلے ایک شعر پڑھا تھا۔

عجب سلگتی ہوئی لکڑیاں ہیں رشتہ دار
جو دور ہوں تو دھواں دیں قریب ہوں تو جلیں

کہیں تو رشتے مان بڑھاتے ہیں اور کہیں بوجھ بن جاتے ہیں لیکن اس موضوع پر ہم پھر بات کریں گے دادی پھر بلا رہی ہیں۔ او کے بائے۔"

اس نے فون بند کر دیا تو وہ فون کو پاکٹ میں ڈالتا ہوا باہر نکل آیا۔ بارش تھم چکی تھی۔ وہ گیٹ سے باہر جا رہا تھا اسے صوبے دار فتح علی خان سے ملنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تو۔" عبدالرحمن ملک نے ڈاکٹر عثمان کی ساری بات سن کر ان کی طرف دیکھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے عثمان۔ وہ تمہارا بیٹا ہے تم نے اور بھابھی نے چند دن کے بچے کو لے کر پالا' بڑا کیا' اپنا نام دیا تو وہ تمہارا ہی بیٹا ہوا نا اور اس جائیداد میں جو تمہارا حصہ ہے اس کا وہی مالک ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ تمہارا بیٹا ہے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی مجھے نہیں لگا کہ وہ کسی اور کی اولاد ہے۔ ہشام اور وہ' جب ساتھ ساتھ ہوتے ہیں تو بالکل ایک فیملی کے لگتے ہیں' الگ خاندان کا نہیں لگتا وہ۔"

"آپ میری بات نہیں سمجھ رہے عبدالرحمن بھائی؟" ڈاکٹر عثمان نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ایک دن اور رات کی کشمکش کے بعد گھبرا کر عبدالرحمن کے پاس آئے تھے اور انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔

"میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں عثمان لیکن جب مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے تو تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔"

آپ کو بھلے اعتراض نہ ہو لیکن اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ایسا ہی ہے۔ پلیز عبدالرحمن بھائی آپ جائیداد تقسیم ضرور کریں لیکن اس میں موحد کا حصہ نہیں ہو گا۔ میرے بعد جائیداد شرعا" میرے وارثوں میں ہی تقسیم ہو گی۔ جس میں آپ' ہشام' ماں جی اور ناہید کی اولاد ہے؟" ان کا لہجہ حتمی تھا۔

"اور آپ سے ایک درخواست بھی ہے کہ اس بات کا ذکر ماں جی اور کسی دوسرے سے نہ کریں۔ موحد

کو دیکھ کر ہاں جی جس طرح خوش ہوتی ہیں میں یہ خوشی ان سے چھیننا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ موحد کو بھی اس کا علم نہ ہو۔ میرے بعد چاہیں تو موحد کو بتادیں۔ لیکن اگر نہ بھی بتائیں تو میں جانتا ہوں۔ اسے جائیداد سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ وہ میرا بیٹا ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں عبدالرحمٰن بھائی۔ اگر وہ میرا اپنا بیٹا ہوتا تب بھی میں شاید اس سے زیادہ محبت نہ کرپاتا۔ میں نے اپنا برمنگھم والا گھر فروخت کرکے رقم موحد کے اکاؤنٹ میں جمع کروادی ہے۔ لندن میں میرے پاس اپنا گھر تھا جو ایک پاکستانی فیملی کو کرائے پر دے رکھا ہے وہ گھر موحد کے نام ہے اس کا کرایہ بھی موحد کے اکاؤنٹ میں جاتا ہے۔ گو یہ میری ذاتی کمائی ہے لیکن شریعت کے مطابق اس میں بھی مرنے کے بعد وارثوں کا حصہ ہے اگر میں آپ سے درخواست کروں کہ آپ مجھے اس کی اجازت دیں اور اپنا حق معاف کردیں۔ موحد کی خاطر۔"

"عثمان کیسی باتیں کررہے ہو تم؟" عبدالرحمٰن ملک نے حیران ہو کر عثمان ملک کی طرف دیکھا۔ "تمہارا سب کچھ تمہارے بیٹے کا ہی ہے۔"

"ہاں لیکن شریعت کے مطابق میں کچھ حصہ ہی اسے دے سکتا ہوں۔۔۔ میں حق داروں کا حق مار کر۔۔۔"

"عثمان۔" عبدالرحمٰن کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ عثمان ملک کا فون بج اٹھا دوسری طرف ڈاکٹر احسن تھے۔

"او ڈاکٹر احسن! کیا بات ہے میں نے رپورٹس بھجوا تو دی تھیں۔"

"رپورٹ مل گئی تھیں۔" دوسری طرف ڈاکٹر احسن کہہ رہے تھے۔ "رپورٹس تو توقع کے مطابق ہی ہیں لیکن آپ کو یہاں آنا ہوگا ڈاکٹر عثمان آپ کا پراپر چیک اپ اور علاج ضروری ہے۔"

"میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا ڈاکٹر احسن۔ تم ہی بتاؤ حالیہ رپورٹس سے کیا پتا چلا میرے پاس کتنا وقت ہے۔" ڈاکٹر احسن نے جانے کیا کہا تھا۔ عبدالرحمٰن نہیں جانتے تھے لیکن لائن ڈراپ ہوگئی تھی اور عثمان ملک نے فون بند کردیا تھا۔

"عثمان۔" عبدالرحمٰن ملک نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہے تھے تم۔ کسی رپورٹ کا ذکر کررہے تھے اور تم نے وقت کی بات کیوں کی۔"

"عبدالرحمٰن بھائی۔" ڈاکٹر عثمان نے ایک گہری سانس لے کر عبدالرحمٰن کی طرف دیکھا۔

"مجھے بلڈ کینسر ہے۔ تقریباً" ساڑھے تین سال پہلے پتا چلا تھا۔ اس لیے میں نے موحد کو بولٹن بھیجا تھا کہ اسے پتا نہ چلے۔ زینی کی حالت سے پہلے ہی پریشان رہتا تھا۔ میرا سن کر تو جانے کیا حال ہوتا اس کا۔" وہ ہولے ہولے کہہ رہے تھے اور عبدالرحمٰن پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"نہیں عثمان ایسا مت کہو۔ تم اس طرح میرا دل نوچ کر نہیں پھینک سکتے۔ تم جانتے ہو نا میں تمہارے بغیر خود کو کتنا اکیلا اور کمزور محسوس کرتا تھا۔ عفان اور عجو نے مجھے اندر سے ڈھا دیا تھا۔ تم آئے تو مجھے لگا جیسے میں مضبوط ہو گیا ہوں اور اب نہیں عثمان کہہ دو یہ غلط ہے۔ مجھے پھر سے چھوڑ جانے اور اکیلا کرنے کے لیے آئے ہو۔" وہ اس گلے سے لگائے رو رہے تھے اور ڈاکٹر عثمان ضبط کیے ہولے ہولے انہیں تھپک رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"میں مر رہا ہوں بابا۔۔۔ ختم ہو رہا ہوں۔" اس نے ان کے سینے سے سر اٹھا کر آنسو بھری آنکھوں سے ڈاکٹر عثمان کی طرف دیکھا۔

"حوصلہ کرو میری جان سنبھالو اپنے آپ کو۔ کچھ حقیقتیں بہت تلخ ہوتی ہیں لیکن انہیں قبول کرنا پڑتا ہے۔ وہ نو دن بعد آج اسپتال سے ملک ہاؤس آیا تھا تو دن پہلے اس کے وجود کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ وہ صوبے دار فتح علی سے ایڈریس لے کر بابا کو شاہی سے ملنے کا بتا کر کراچی آیا تھا اور بہت اشتیاق سے اس دروازے تک پہنچا تھا۔ اور ڈرائنگ روم میں منتظر بیٹھا تھا۔ یہ اس کی ماما کی بہن کا گھر تھا اور وہ اس سے ملنے والا تھا۔ اپنی ماں کے بھانجے بھانجیوں سے وہ جو اس کی ماما کی ماں جائی کے بچے تھے وہ بہت اشتیاق سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ملک ہاؤس کے گیٹ پر ہی وہ چوکیدار کو بیگ پکڑا کر واپس اسی ٹیکسی میں صوبے دار فتح علی کے بتائے ہوئے پتے پر آیا تھا۔ بابا اور عبدالرحمٰن کے اصرار کے باوجود وہ گاڑی لے کر نہیں آیا تھا۔ بلکہ کوچ پر آیا تھا کہ واپسی پر شاہی کے ساتھ اس کی گاڑی میں آجائے گا۔ اس نے دھڑکتے دل سے ڈرائنگ روم میں آنے والی شخصیت کو دیکھا اور کھڑا ہوگیا۔ آنے والے یقیناً" بریگیڈیئر اقبال تھے اور ماما نے ہمیشہ ہی ان کی تعریف کی تھی۔

"میں موحد۔۔۔ موحد عثمان ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا تھا لیکن بریگیڈیئر اقبال اسے اجنبی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ "ڈاکٹر عثمان ملک اور ڈاکٹر زینب عثمان کا بیٹا۔"

"او تم زینی اور عثمان کے بیٹے ہو بیٹھو پلیز۔" انہوں نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا لیکن ان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"ماما کے کومے میں جانے کے کچھ عرصہ بعد ہی آپ لوگوں سے رابطہ ختم ہوگیا تھا۔ بابا نے کئی بار فون کیا تھا لیکن شاید آپ لوگوں نے وہ گھر چھوڑ دیا تھا۔"

"ہاں۔ زینی اب کیسی ہے۔" انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "سات سال کومے میں رہنے کے بعد چند ماہ پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ ہم ان کی ڈیڈ باڈی لے کر بابا کے گاؤں آئے تھے۔ لیکن آپ کے متعلق کچھ علم نہیں تھا کہ کہاں ہیں۔ چند دن پہلے اتفاق سے آپ کا پتا ملا تو میں ملنے چلا آیا۔" وہ ماما کی بات کرتے ہوئے اداس ہوگیا تھا اور اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی تھی۔ تب ہی دروازے سے ایک لڑکی نے جھانکا۔

"پاپا میں ڈرائیور کے ساتھ جا رہی ہوں مرتضیٰ بہت مصروف ہیں لینے نہیں آسکتے۔"

"ٹھیک ہے عینی تم ڈرائیور کو لے جاؤ لیکن گاڑی جلدی واپس بھیج دینا مجھے بھی کہیں جانا ہے اور ہاں یہ تمہاری زینی خالہ کے بیٹے ہیں۔ موحد عثمان ہم سے ملنے آئے ہیں۔" اس نے بے حد اشتیاق سے اس کی طرف دیکھا اس میں ماما کی کافی مشابہت تھی۔

"او۔۔۔ اچھا۔" اس نے ایک سرسری سے نظر اس پر ڈالی۔ "وہی تایا پاپا جو خالہ کے لے پالک ہیں۔" اسے لگا جیسے اس کے کانوں نے غلط سنا تھا۔ وہ تردید کرنا چاہتا تھا۔ نہیں وہ لے پالک نہیں تھا اگر ماما نے کسی بچے کو پالا بھی تھا تو وہ بچہ وہ نہیں تھا۔ لیکن ابھی اس نے کچھ کہا نہیں تھا کہ دو لڑکے اندر آئے وہ دونوں ہی عمر میں اس سے کافی بڑے لگ رہے تھے ایک نے پونی بنا رکھی تھی جبکہ دوسرے کے بال بھی کندھوں کو چھو رہے تھے۔ اب کے بریگیڈیئر اقبال نے بغیر کسی حوالے کے کہا تھا۔

"مانی یہ موحد ہے۔ ہم سے ملنے آیا۔"

"موحد۔" مانی نامی لڑکے نے بغور اسے دیکھا جیسے پہچاننا چاہتا ہو۔ اس نے کھڑے ہو کر ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھایا۔ اور مسکرایا۔

"موحد عثمان آپ کی زینی خالہ کا بیٹا۔ خالہ جان کے بعد آپ لوگوں نے رابطہ ہی نہیں رکھا۔ اپنوں سے یوں بھی کوئی دور ہوتا ہے۔" وہ اپنائیت سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"اپنوں سے۔" مانی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"سوری بھائی جن سے رشتہ تھا وہ تو تقریباً" مر ہی چکی تھیں۔" اس کا لہجہ موحد کو بہت سفاک لگا تھا پھر بھی اس نے نرمی سے کہا تھا۔

لیکن میرا بھی تو کوئی رشتہ بنتا تھا نا آپ سے ہم کزن تھے۔"

"کزن۔" بڑا لڑکا تمسخر سے ہنسا تھا۔ "تمہیں خالہ نے نہیں بتایا تھا کہ تم ہمارے کزن نہیں ہو۔ تمہیں تو کوئی ان کے دروازے پر پھینک گیا تھا۔ ہمارا تم سے بھلا کیا رشتہ۔" اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

"مجھے یاد ہے خالہ جب تمہیں لائیں تو تم بڑے عجیب و غریب ہوا کرتے تھے اور خالہ تمہیں ہر وقت اٹھائے پھرتی تھیں۔ پتا ہے شانی۔" وہ چھوٹے بھائی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ "ان دنوں مجھے اس پر بہت غصہ آتا تھا اور میں موقع دیکھ کر اس کی چٹکی کاٹ لیتا تھا کہ اس نے میری خالہ پر قبضہ کر لیا ہے' تم تو تب چھوٹے تھے نا چھ سات سال کے تمہیں یاد نہیں ہوگا۔" وہ کیا کہہ رہا تھا اس نے نہیں سنا تھا اس کے کانوں میں صرف ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔

تمہیں تو کوئی ان کے دروازے پر چھوڑ گیا تھا ہمارا تم سے کوئی رشتہ نہیں۔

وہ ڈگمگاتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا تھا شاید بریگیڈیئر اقبال نے اسے بلایا بھی تھا۔ کچھ کہا بھی تھا۔ شاید وہ اسے روک رہے تھے لیکن وہ کچھ نہیں سن رہا تھا اس کی تو ساری پونجی یکایک لٹ گئی تھی۔ وہ تو بالکل تہی داماں ہو گیا تھا۔ بالکل خالی۔ وہ لٹے ہوئے مسافر کی طرح چلتا ہوا گیٹ تک آیا تھا۔ وہ کیسے گھر تک پہنچا تھا اسے یاد نہیں تھا۔ وہ کون تھا اسے یہ بھی یاد نہیں تھا۔

"موحد.... موحد۔" ہشام نے اسے پکارا تھا۔ ملک ہاؤس کے گیٹ کے اندر قدم رکھنے کے بعد گرنے سے پہلے جو آخری آواز اس نے سنی تھی وہ ہشام کی تھی وہ ہوش و بے ہوشی کے عالم میں اسپتال میں ایڈمٹ رہا تھا اور پورے نو دن بعد بابا آج اسے ملک ہاؤس لائے تھے۔ حویلی سے سب ہی آ گئے تھے سب اس کے لیے پریشان تھے وہ اس کے لیے رو رہے تھے' دعائیں مانگ رہے تھے۔ ہشام' امل' بابا' عبدالرحمن تو اسپتال میں ہی رہتے تھے۔ اس کے آس پاس.... وہ جو ان کا کوئی نہیں تھا۔

"کیسے حوصلہ کروں بابا کیسے سمجھاؤں خود کو کہ اب تک جن محبتوں اور شفقتوں کے سائے میں رہا میں ان کا کوئی نہیں ہوں.... بابا میں آپ کا کوئی نہیں ہوں۔" اس کے آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ ایک ہاتھ اس کے گرد حمائل کیے اسے اپنے ساتھ لپٹائے دوسرے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے ڈاکٹر عثمان کے آنسو خود بھی ان کے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور انہیں لگ رہا تھا جیسے ان کا دل پھٹ جائے گا۔

"تم میرے سب کچھ ہو۔ میری زندگی کا حاصل۔ میری عمر بھر کا سرمایہ.... کل بھی تم میری زندگی تھے آج بھی ہو اور ہمیشہ رہو گے۔"

"یہ آپ کی عظمت ہے آپ کی بڑائی ہے بابا کہ آپ نے ایک بے نام و نشان بچے کو اپنا نام دیا۔ محبت دی لیکن یہ حقیقت آپ نہیں بدل سکتے کہ میں جو کل تک موحد عثمان تھا۔ ڈاکٹر عثمان ملک کا بیٹا۔ آج کچھ بھی نہیں۔ ایک بے نام و نشان وجود.... میرا فخر خاک ہوا میرا وجود مٹی میں مل گیا.... میری ذات آسمان سے زمین پر گر کر کرچی کرچی ہو گئی ہے بابا میرا وجود ختم ہو گیا۔" وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔

"آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ کیوں چھپایا مجھ سے کہ میں ایک حقیر بے وقعت وجود ہوں۔ میں تو تنکے سے بھی زیادہ ہلکا ہو گیا ہوں بابا.... آپ نے اور ماما نے مجھے۔ مجھ گلیوں کے کوڑے کو زمین کی خاک کو اپنے سینے سے لگا کر اپنے برابر کھڑا کیا میں تو آپ کے قدموں میں بیٹھنے کے بھی قابل نہیں تھا۔" وہ کیا کہہ رہا تھا اسے خبر نہیں تھی بس لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلتے جا رہے تھے۔

"ابھی تو زندگی میرے اندر ہنسی تھی۔ مجھے جینا اچھا لگنے لگا تھا اور سب کچھ ختم ہو گیا مٹی میں مل گیا۔"

"کچھ بھی ختم نہیں ہوا میری جان تم اب بھی میرے بیٹے ہو جیسے پہلے تھے۔ میرے دل کے قریب تم سے بڑھ کر کوئی نہیں موحد۔"

"آپ بڑے دل والے اور بڑے ظرف والے ہیں بابا۔ لیکن میں کیسے آپ سب سے نظریں ملا سکوں گا۔ بابا آپ نے مجھے زندگی دی تھی آپ ہی مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دیں۔"

"نہیں ایسا مت کہو میری جان یہ کفر ہے۔ زندگی دینے والی تو اس رب کی ذات ہے۔ مجھے تو اس نے

وسیلہ بنایا۔" انہوں نے اور زیادہ شدت سے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ "ایسی باتیں مت کرو موحد میری جان۔ کیوں اپنے کمزور بوڑھے اور بیمار باپ کو آزما رہے ہو۔ میرا دل پھٹ جائے گا ایسی باتیں مت کرو۔"

"میرا دل بھی تو پھٹ رہا ہے بابا۔ لخت لخت ہو گیا ہے لیکن آپ مجھے معاف کر دیں بابا میری باتوں سے آپ کو تکلیف ہو رہی ہے۔" اس نے ایک بار پھر سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنسو بھری آنکھوں میں جو کیفیت تھی اس نے عثمان ملک کو توڑ دیا۔

"بریگیڈیئر اقبال میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا تم نے میرے دل پر وار کیا ہے۔"

وہاں آپا کے گھر میں زینی اور موحد کے ساتھ جتنے دن بھی رہے تھے کسی نے بھی پسند نہیں کیا تھا کہ زینی اس بیمار بچے کو اپنا لے۔ اگر انہیں خبر ہوتی کہ موحد ان کے گھر جا رہا ہے تو وہ اسے روک لیتے' اسی خوف سے تو آج تک انہوں نے کبھی بریگیڈیئر اقبال کی فیملی سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"بابا مجھے معاف کر دیں۔" اس نے پھر کہتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"میری جان۔" انہوں نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ہونٹوں سے لگایا۔

ہشام نے انہیں فون کر کے موحد کے اسپتال میں ایڈمٹ ہونے کا بتایا تھا.... وہ رو رہا تھا۔

"چاچو وہ چار گھنٹے سے بے ہوش ہے۔" اور عبدالرحمن کے ساتھ کیسے وہ اسپتال پہنچے تھے انہیں خبر نہیں تھی۔ اور پھر بے ہوشی کے درمیان اس کی بے ربط گفتگو سے انہیں اندازہ ہوا تھا کہ وہ کسی اذیت ناک راز کے انکشاف سے ریزہ ریزہ ہو رہا ہے۔ ہشام اور امل کچھ نہیں سمجھے تھے لیکن عبدالرحمن سمجھ گئے تھے۔ لیکن مکمل ہوش میں آتے ہی اس نے خود ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔

"بابا میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں واپس انگلینڈ کہیں بھی دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جاؤں گا۔ میں کبھی آپ کو بھول نہیں پاؤں گا۔ میں ہر دن صبح ہر شام' ہر رات آپ کو اور ماما کو یاد کروں گا۔ میں آپ سے جدا ہو کر تڑپوں گا لیکن بابا میں یہاں نہیں رہ سکتا میں اپنے ماتھے پر بے نام و نشان کا ٹیگ لگا کر کسی کا سامنا نہیں کر سکتا۔ شانی۔ امل' ثمرین آنٹی انکل کسی کا نہیں میں جانتا ہوں میرے بغیر آپ کے لیے رہنا مشکل ہوگا۔ اور میں.... میں پتا نہیں کیسے جی پاؤں گا آپ کے بغیر لیکن مجھے اس کے لیے معاف کر دیں۔ بابا آپ خود بتائیں جب آپ کو اپنے باپ کا نام تک معلوم نہ ہوا اور آپ کے ارد گرد کے لوگ جانتے ہوں کہ رات کے اندھیرے میں ایک گناہ گار ماں نے آپ کو کسی دروازے پر پھینک دیا ہو تو کیا آپ ان لوگوں کے درمیان۔ سر اٹھا کر جی سکتے ہیں۔ نہیں نا بابا میں بھی نہیں جی سکتا۔ میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا لیکن میں یہاں بھی نہیں رہ سکتا بابا۔"

"تم جہاں جاؤ گے میرے بچے میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ میرے لیے تم سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔"

"بابا۔" وہ ایک بار پھر ان کے گلے لگ گیا۔

"ہم کہیں دور کسی اور ملک میں اپنی زندگی کا آغاز کریں گے بابا! جہاں کوئی ہمیں جانتا نہ ہو۔" وہ ہولے ہولے اسے تھپک رہے تھے۔

"تم جیسا چاہو گے موحد میں ویسا ہی کروں گا۔ تم جہاں جانا چاہو گے ہم وہاں چلے جائیں گے۔" وہ ان سے الگ ہو کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"بابا جب ڈاکٹر احسن نے بتایا تھا کہ ان کی مسز نے اپنے بچے کو صرف اس لیے پھینک دیا تھا کہ وہ اس جیسا خوب صورت نہیں تھا تو مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی ماں اتنی ظالم بھی ہو سکتی ہے' لیکن اب مجھے یقین آ گیا ہے بابا۔ ہر ماں' ماما اور ثمرین آنٹی کی طرح نہیں ہوتی کچھ مائیں ڈاکٹر احسن کی بیوی جیسی بھی ہوتی ہیں جو محض ذرا سی بات پر اپنے بچے کو خود سے جدا کر دیتی ہیں اور کچھ مائیں میری ماما جیسی بھی ہوتی ہیں اپنا گناہ چھپانے کے لیے اپنے جگر کے ٹکڑے کو

کچرے کے ڈھیر پر پھینک دیتی ہیں۔" اور اس کے لیے گرم دودھ لاتی ہوئی ثمرین جو ڈاکٹر احسن کا نام سن کر ٹھٹک کر رک گئی تھی دودھ اس کے ہاتھ سے چھلک پڑا تھا۔

"ڈاکٹر احسن۔" اس کے لبوں سے آہستہ سے نکلا تھا اور اس نے سہارے کے لیے دیوار پر ہاتھ رکھا۔

"ڈاکٹر احسن۔" ڈاکٹر عثمان بھی چونکے تھے اور انہوں نے بغور موحد کو دیکھتے ہوئے اس میں ڈاکٹر احسن کی مشابہت کو محسوس کیا تھا۔ وہ مشابہت جسے وہ اس روز سے دانستہ نظر انداز کر رہے تھے جس روز ڈاکٹر احسن نے اپنے بچے کے متعلق بتایا تھا۔ موحد بہت ٹوٹا ہوا اور بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے بسی تھی۔ آنکھوں میں وہ فخر و غرور نہ تھا جو اس کی خوب صورت آنکھوں کا حسن تھا۔ وہ سچ مچ مٹی میں مل گیا تھا۔

"اور اپنے لے پالکوں کو ان کے باپوں کے ناموں سے محروم مت کرو اگر تم جانتے ہو تو۔"

ان کے اندر سرگوشی کی طرح گونجا تھا۔

"بابا کیا آپ کو یقین ہے کہ ہم کہیں کسی اور جگہ لوگوں سے چھپ کر رہیں گے تو میں سروائیو کر پاؤں گا' نہیں بابا... میں گناہ کی پیداوار ہوں۔ اس احساس کے ساتھ میں کہیں بھی۔ جی نہیں پاؤں گا چاہے دنیا کے آخری کونے میں چلا جاؤں۔ میں مر جاؤں گا بابا... میں مرنا نہیں چاہتا بابا... آپ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا لیکن میں جی بھی نہیں پاؤں گا۔ یہ بوجھ میری ہمت اور برداشت سے باہر ہے۔"

"نہیں۔" انہوں نے تڑپ کو موحد کی طرف دیکھا۔

"تم گناہ کی پیداوار نہیں ہو۔ میں تمہیں تمہارے باپ کا نام بتاتا ہوں... ان دنوں میں اور زینی جہلم کے ایک اسپتال میں کام کرتے تھے۔" وہ ہولے ہولے بتا رہے تھے اور موحد دم بخود سن رہا تھا جس روز ڈاکٹر احسن نے اپنی بیوی اور بچے کے متعلق بتایا تھا تو مجھے ایک لمحہ بھی تخمین لگا تھا یہ جاننے میں کہ تم ڈاکٹر احسن کے بیٹے ہو۔ ان کی گم شدہ متاع ان کے جگر کے ٹکڑے جس کے ملنے کی امید آج بھی ان کے دل میں زندہ ہے۔"

"نہیں۔" دیوار کے سہارے کھڑی ثمرین کے لب ذرا سے وا ہوئے تھے وہ ہولے ہولے بڑبڑاتی جا رہی تھی۔ اس نے اس بچے کو ٹھکرایا تھا۔ اس موحد عثمان کو' جو ہشام کے ساتھ کھڑا اس سے بھی زیادہ شاندار اور خوب صورت لگتا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"سوری بیٹا اس وقت میں ڈاکٹر احسن کو نہیں بتا سکا مجھ میں تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں تھا۔ زینی کے بعد صرف تم ہی تو تھے میرے جینے کی آس۔ تم بھی چلے جاتے تو میں تمہارے بنا کیسے زندہ رہتا' موحد میں خود غرض ہو گیا تھا تمہاری محبت میں۔" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

"جب تک میں تھا' تمہیں اپنے پاس اپنی نظروں کے سامنے دیکھنا چاہتا تھا لیکن میری موت کے بعد تم جان جاتے کہ تم ڈاکٹر احسن کے گم شدہ بیٹے ہو۔ میں نے تمہارے اور ڈاکٹر احسن کے نام خط لکھ کر اپنے وکیل کو دے دیا تھا جو میرے بعد تمہیں اور ڈاکٹر احسن کو ملتا... میں نے اس لیے اپنا گھر ڈاکٹر احسن کے پاس فروخت کیا تھا۔ ورنہ تم جانتے ہو ڈاکٹر احسن کے مقابلے میں دوسروں کی آفر بہت زیادہ تھی۔"

"بابا آپ نے سوچا بھی کیسے کہ میں آپ کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔" موحد جیسے سکتے کی کیفیت سے باہر آیا تھا۔ "میرے لیے یہ جان لینا کافی ہے کہ میں گناہ کی پیداوار نہیں ہوں۔ میرے دل سے بوجھ سرک گیا ہے اور اب میں اپنا جھکا ہوا سر اٹھا سکتا ہوں۔ میری ماں کون ہے مجھے جاننے کی ضرورت نہیں ہے... میرے لیے آپ ہی سب کچھ ہیں میرے باپ... میری ماں مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"میں ڈاکٹر احسن کو بتاتا ہوں کہ ان کی گم شدہ متاع ۔"

"نہیں پلیز بابا نہیں آپ ڈاکٹر احسن کو فون مت کریں مجھے خود سے جدا مت کریں۔ میں نے جان لیا کافی ہے اب میں کہیں بھی آپ کے ساتھ جا کر سروائیو کر سکوں گا بابا... ہماری اپنی ایک چھوٹی سی دنیا ہو گی۔ مجھے کہیں نہیں جانا میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں گا۔" وہ ان سے لپٹ گیا۔ اسے ہولے سے تھپک کر ریلیکس ہونے کے لیے انہوں نے تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

باہر ثمرین دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے کتنی دعائیں کی تھیں کہ وہ زندہ ہو تو وہ احسن کے سامنے سرخرو ہو جائے۔ لیکن اب وہ زندہ تھا نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت تھا اور وہ سوچ رہی تھی وہ کیسے اس کا سامنا کرے گی کیسے اسے بتائے گی کہ وہ ہی اس کی بدنصیب ظالم ماں ہے... اور ہشام عبدالرحمٰن... نہیں وہ اسے کبھی سینے سے لگا نہیں سکے گی کبھی اسے بتا نہیں سکے گی۔ اسے لگا جیسے اس کا دل بند ہو رہا ہو۔ اور سانس سینے میں الجھ رہا ہو۔

"ڈاکٹر احسن۔" عثمان ملک نے چند لمحوں بعد خود کو کمپوز کر کے ڈاکٹر احسن کا نمبر ملایا تھا۔

"کیسے ہیں آپ۔"

"نہیں بابا پلیز کچھ مت بتائیں۔" وہ انہیں اشارے سے منع کر رہا تھا کہ وہ فون بند کر دیں لیکن وہ دانستہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کا بیٹا تھا وہ انہیں چھوڑ کر نہیں جائے گا انہیں یقین تھا۔ وہ اپنے اندر سرخرو ہو گیا تھا لیکن وہ چاہتے تھے کہ وہ دوسروں کی نظروں میں بھی بے شناخت نہ رہے۔

"ڈاکٹر احسن اگر آپ کو اچانک اپنا گم شدہ بیٹا مل جائے تو...." وہ پوچھ رہے تھے۔

"وہ گم کہاں ہوا تھا ڈاکٹر عثمان۔" ڈاکٹر احسن کے لہجے سے دکھ جھلکتا تھا۔ "اسے تو اس کی ماں نے مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔"

"اگر میں کہوں آپ کا بچہ زندہ ہے اللہ نے اسے بچا لیا ہے تو۔"

"ا... ما... ں۔" پہلے عجو کی باریک آواز آئی اور ساتھ ہی اس کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ وہ چیخیں مار رہی تھی۔ موحد بے اختیار اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا تھا۔ ڈاکٹر عثمان احسن کو موحد کے متعلق بتا رہے تھے جب موحد دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ ہشام بھی عجو کی چیخیں سن کر اپنے کمرے سے دوڑتا ہوا باہر آیا تھا۔ عفان پر جب دورا پڑتا تھا تو وہ بھی یوں ہی چیخیں مارتا تھا۔ لیکن عجو ثمرین کے پاس کھڑی چیخ رہی تھی۔

"ماما۔" ہشام نے زمین پر بیٹھتے ہوئے ثمرین کا سر گود میں رکھا اور زور زور سے اسے ہلاتے ہوئے اس کے گال تھپتھپانے لگا۔ بالکل غیر ارادی طور پر موحد نے عجو کا ہاتھ پکڑ کر اسے قریب آتی شفو کو پکڑایا اور پھر عقیدت سے ثمرین کو دیکھنے لگا تھا۔ ثمرین جو بقول اہل کے دنیا کی سب سے عظیم ماؤں میں سے ایک تھی اور ایک اس کی ماں تھی۔ وہ پھر ثمرین کی طرف دیکھنے لگا جس کی پلکیں اب لرز رہی تھیں... اس کی آنکھوں میں عقیدت تھی۔ احترام تھا اور نہیں جانتا تھا کہ صرف چند دنوں بعد وہ ان کی طرف عقیدت سے دیکھنا تو کجا دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ اس نے ذرا دیر کو آنکھیں کھولی تھیں پھر بند کر لی تھیں۔

"موحد ماما کو کیا ہو گیا ہے۔" ہشام نے نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "انکل کہاں ہیں۔"

"وہ اندر ہیں فون پر بات کر رہے تھے میں بلاتا ہوں۔" وہ تیزی سے دروازے دھکیلتا ہوا کمرے میں آیا۔ عثمان ملک صوفے کی پشت پر سر رکھے گہری گہری سانسیں لے رہے تھے اور صوفے پر پڑے فون کی رنگ ہو رہی تھی۔

"بابا... بابا کیا ہوا۔" وہ انہیں جھنجوڑنے لگا لیکن ان کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"بابا میں بہت کمزور ہوں۔" وہ ان کے بیڈ کے پاس کرسی رکھ کے بیٹھا تھا اور اس کی نظریں عثمان ملک پر تھیں جو آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔

"میں آپ کو کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ پہلے ماما چلی گئیں... پھر یہ اذیت ناک انکشاف... اور اب آپ بیمار پڑ گئے۔ آپ نے اور ماما نے مجھے کبھی کوئی

تکلیف نہیں ہونے دی۔ ہر دکھ سے بچایا اور اب یک دم اتنا سب کچھ۔ میں مزید کوئی دکھ برداشت نہیں کرپاؤں گا بابا۔" اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، چہرا ستا ہوا تھا۔ وہ کئی راتوں سے جاگ رہا تھا۔ عثمان ملک کی طبیعت خراب تھی۔ بار بار ان کا سانس اکھڑ جاتا تھا لیکن وہ اسپتال جانے اور کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے تیار نہ تھے۔

"میں خود ڈاکٹر ہوں موحد اور میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا تکلیف ہے۔ پہلے بھی کبھی تکلیف ہو جاتی تھی ایسی اور میرے پاس میڈیسن ہیں لے رہا ہوں کچھ دنوں تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔" لیکن ان کا رنگ کس قدر زرد ہو رہا ہے اور وہ کتنے کمزور ہو گئے ہیں۔ اس نے بدستور ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

"کیا دیکھ رہے ہو جان پدر۔" عثمان ملک نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

"بابا آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ بلکہ ماما کے بعد سے تو آپ بہت تیزی سے کمزور ہو رہے ہیں۔ بابا پلیز واپس چلیں یہاں کی ہوائیں ہمیں راس نہیں آئیں وہاں چل کر کسی اسپیشلسٹ کو چیک کرواتے ہیں مجھے لگتا ہے میرے بولٹن جانے کے بعد آپ نے اپنا خیال نہیں رکھا اور یہ سانس کی تکلیف بھی تب ہی ہوئی ہوگی اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔"

"اب تو وقت رخصت قریب آگیا ہے اب کیا واپس جانا ہے۔" انہوں نے سوچا اور موحد کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

"ڈاکٹر احسن کہہ رہے تھے وہ پہلی دستیاب فلائٹ سے آرہے ہیں ان کا فون نہیں آیا پھر؟"

"آیا ہوگا۔۔۔ ضرور آیا ہوگا لیکن میں نے آپ کے فون کال پاور آف کر دیا تھا۔"

"غلط ہے بیٹا احسن پریشان ہو رہا ہوگا۔ وہ مجھے فون۔۔۔ یوں تو میں نے اسے ایڈریس سمجھا دیا تھا۔ لیکن اس نے کہا تھا وہ آنے سے پہلے فون کرے گا۔"

"ڈاکٹر احسن میرے والد ہیں۔ میں نے جانا اور مان لیا لیکن مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں کسی ڈاکٹر احسن کو نہیں جانتا۔ میں صرف آپ کو جانتا ہوں۔ آپ میرے بابا ہیں مجھے بتائیں ہم کب یہاں سے جا رہے ہیں۔" وہ روٹھا روٹھا سا کہہ رہا تھا۔

"ہم کسی ایسی جگہ چلے جائیں گے جہاں کوئی مخل نہ ہو صرف میں اور آپ اور ماما کی یادیں۔ ہمیں کسی تیسرے کی ضرورت نہیں ہے بابا۔" انہوں نے اپنے اس بے حد خوب صورت بیٹے پر نظر ڈالی ان چند دنوں میں ہونے والے پے در پے انکشافات نے جسے تھکا ڈالا تھا توڑ دیا تھا اور اب کیا وہ اسے اپنی موت کا ڈراوا دے کر مزید ٹوٹتے دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے کہنیاں بیڈ پر ٹیکتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی۔ تب ہی دراوزے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ۔" موحد نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ امل ٹرے میں جوس کے گلاس رکھے اندر آئی تھی۔

"ادھر شامی کی ماما بیمار ہیں اور ادھر تمہارے بابا۔" اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھا اور جوس کا گلاس اٹھا کر عثمان ملک کی طرف بڑھایا۔

"انکل جوس لے لیں اور موحد تم بھی لے لو۔ میں نے ابھی ابھی فریش بنایا ہے سیب اور انار کا مکس۔۔۔ اور پلیز موحد تم کچھ دیر آرام کر لو میں انکل کے پاس بیٹھتی ہوں۔"

"نہیں میں فریش ہوں۔" اس نے جوس اٹھا لیا۔

"یہ صرف تمہارے بابا نہیں میرے بھی ماموں ہیں۔ ٹرسٹ کرو مجھ پر میں بہت خیال رکھوں گی ان کا اور پلیز جوس پی کر آرام کر لو۔"

"بھابھی کی طبیعت کیسی ہے۔" ڈاکٹر عثمان نے پوچھا۔

"کافی بہتر ہے۔ شامی اور انکل عبدالرحمٰن ابھی ان کے پاس ہی ہیں۔ شامی بھی بالکل موحد کی طرح ضدی ہے اتنی دفعہ کہا انکل نے کہ آرام کر لو لیکن مجال ہے جو وہ کسی کی بات مان لے۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تم نے اپنے لیے جوس نہیں بنایا۔"

وہ امل کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس نے امل کی

طرف اب تک دیکھا ہی نہیں تھا بلکہ وہ اس روز سے اس سے کترا رہا تھا جب اسپتال سے آنے کے بعد اس نے امل سے کہا تھا کہ وہ اس کی محبت سے دستبردار ہوا وہ ایک بے نام و نشان شخص ہے اور وہ خود کو امل کی محبت کے قابل نہیں سمجھتا اور ابھی تک کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ ڈاکٹر احسن کا گم شدہ بیٹا ہے۔ اس نے کسی سے ذکر نہیں کیا تھا اور بابا کو شاید ڈاکٹر احسن کا انتظار تھا یوں بھی اس روز سے وہ بیمار تھے۔

"نہیں میرا موڈ نہیں تھا۔" امل نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ وہ کیوں اس کی طرف نہیں دیکھتا کیوں اس سے نظریں چرا رہا ہے اس نے بغیر اس کی بات سنے اور دل کا احوال جانے اپنا فیصلہ سنا دیا وہ ایسے کیسے اس کی محبت سے دستبردار ہو سکتا ہے۔ کیا محبت اتنی ہی کمزور ہوتی ہے کہ ذرا سی آزمائش پر ختم ہو جائے۔ وہ موحد سے باتیں کرنا چاہتی تھی بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی جاننا چاہتی تھی، لیکن جب سے وہ اسپتال سے آیا تھا اسے اکیلا نہیں مل رہا تھا۔ پہلے عثمان ملک اسے تنہا نہیں چھوڑ رہے تھے اور اب وہ عثمان ملک کو نہیں چھوڑ رہا تھا۔ وہ اس سے لڑنا چاہتی تھی گلہ کرنا چاہتی تھی کہ کیسے اس نے اس کی محبت کو اتنا کمزور جانا، لیکن وہ بے حد اپ سیٹ تھا اور بہت کمزور بھی ہو رہا تھا اس لیے وہ اس کے ذرا بہتر ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

"موحد پلیز کچھ دیر ریسٹ کر لو بات مان لو پلیز کتنی راتوں سے ٹھیک طرح سے نہیں سوئے ہو، جب سے انکل کی طبیعت خراب ہوئی ہے۔ حالانکہ ابھی تم خود بھی پوری طرح صحت مند نہیں ہوئے تھے۔" امل نے اپنی بات دہرائی تو ڈاکٹر عثمان نے موحد کی طرف دیکھا اس کی وجیہہ چہرے پر زردیاں کھنڈی ہوئی تھیں۔

"امل ٹھیک کہہ رہی ہے بیٹا تم کچھ دیر ریسٹ کر لو پھر ہم باپ بیٹا مل کر پروگرام بناتے ہیں۔ پرامس میری جان تم جو کہو گے وہی کروں گا میں۔" اس کی حالت دیکھ کر ان کا دل پگھل کر پانی ہوا تھا۔ وہ اپنی مٹی میں دفن ہونا چاہتے تھے، لیکن اگر موحد ایسا نہیں چاہتا تھا تو اس کی خوشی کی خاطر اپنی خواہش قربان کر سکتے تھے۔

"تھینک یو بابا۔" اس نے آدھا جوس پی کر گلاس ٹیبل پر رکھا اور کھڑا ہو گیا موحد کیا کرنا چاہتا ہے اور وہ کیا پروگرام بنانے والے ہیں۔ امل نے پریشان ہو کر باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

"امل بیٹا تم بھی گھر جا کر آرام کر لو۔ میں بھی کچھ دیر سو جاؤں گا۔" انہوں نے بے حد محبت سے امل کی طرف دیکھا جو کبھی ان کے کمرے میں آکر بیٹھتی اور کبھی ثمرین کی طرف جاتی۔ ثمرین کا بی پی خطرناک حد تک لو ہو گیا تھا اور وہ ایک دن اسپتال بھی ایڈمٹ رہی تھی۔

"ہاں امل بابا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اتنی دیر میں پہلی بار موحد نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے کون سا ریسٹ کیا ہے گھر جا کر آرام کر لو۔" وہ ڈاکٹر عثمان کو سونے کی تلقین کرتا ہوا باہر نکلا تو امل بھی اس کے پیچھے ہی آئی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

مسلمانوں کی بنیادی ذمہ داری

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی سورۃ مائدہ میں ارشاد فرمایا ہے "اور تم نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ ہرگز تعاون مت کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً" اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔"

(سورۃ مائدہ)

باہمی جھگڑا

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا "کیا میں تمہیں نفلی روزے، نماز اور صدقہ سے زیادہ افضل چیز نہ بتاؤں؟ صحابہ رضی اللہ نے عرض کیا "ضرور بتایئے" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "باہمی تعلقات کو خوش گوار بنانا (یعنی جھگڑوں کو ختم کرنا) اس لیے کہ باہمی تعلقات کا بگاڑ مونڈنے والی چیز ہے، میرا مطلب نہیں کہ یہ بگاڑ بال مونڈتا ہے بلکہ یہ دین کو مونڈتا ہے۔

(ابوداؤد جمع الفوائد ص ۱۳۴، ج ۲)

جواہر پارے

☆ انصاف وہاں ہی حاصل ہوتا ہے جہاں طالب انصاف اپنے بازوؤں میں حصول انصاف کی طاقت رکھتا ہو۔

☆ حکمت عملی قوت بازو سے زیادہ کام کرتی ہے۔

☆ جب ہم میں سے دولت اور شہرت کی ہوس ختم ہو جائے گی ہم بہترین انسان بن جائیں گے۔

☆ کامیابی کا زینہ بہت سی ناکامیوں کی سیڑھیوں سے بنا ہوا ہے۔

☆ محبت ایک ایسی چیز ہے جو سیکھنے اور کسی کو بتانے کی نہیں ہے۔

نوشابہ اسد..... بھریا روڈ

جہاندیدہ

ٹرین روانہ ہونے والی تھی۔ سگنل ہو چکا تھا۔ ایک شخص دوڑتا ہوا اسٹیشن پر پہنچا اور گارڈ سے پوچھنے لگا۔ "میری بیوی میکے جا رہی ہے۔ وہ میری آمد سے قبل ٹرین میں سوار ہو چکی ہے کیا اتنا وقت ہے کہ میں اس کے کمپارٹمنٹ میں جا کر اسے الوداع کہہ سکوں؟"

گارڈ نے کہا "اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے۔ اگر حال ہی میں شادی ہوئی ہے تو پھر بالکل وقت نہیں اور شادی کو کئی سال گزر چکے ہیں تو پھر وقت ہی وقت ہے۔"

اسما سیف اللہ..... چکوال

نامہ اعمال

اے روز محشر مجھے تیری قسم
عمر بھر میں نے تیری عبادت کی ہے
تو میرا نامہ اعمال تو دیکھ
میں نے انسان سے محبت کی ہے

(احمد ندیم قاسمی)

فوزیہ ثمرت۔ گجرات

گرہ

ایک دفعہ علامہ اقبال ایک محفل میں شریک تھے وہاں پر موجود کچھ شریر نوجوان جو کہ علامہ کی شہرت سے جلتے تھے، انہوں نے منصوبہ بنایا کہ کچھ ایسا کیا جائے جس سے علامہ کی بھری محفل میں سبکی ہو جائے، لہٰذا انہوں نے ایک مصرعہ سوچا اور علامہ سے گرہ لگانے کا مطالبہ کیا، مصرعہ یہ تھا۔

مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں، ہرن پانی میں

نوجوان کا خیال تھا کہ جب علامہ اس پر گرہ لگانے میں ناکام ہو جائیں گے تو ان کی شعر گوئی کی صلاحیت کی پول سب کے سامنے کھل جائے گی۔

علامہ نے پہلے تو معذرت کی کہ میں طرحیں لگانے میں دل چسپی نہیں رکھتا لہٰذا مجھے معاف رکھیں۔ نوجوان سمجھے کہ علامہ راہ فرار اختیار کر رہے ہیں، سو ان کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ جب اصرار زیادہ ہو گیا تو علامہ نے صرف چند ساعتوں کے لیے سر کو جھکایا اور مصرعے پر لافانی طرح لگا کر یوں مکمل کیا۔

اشک سے دشت بھریں، آہ سے سوکھیں دریا
مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں، ہرن پانی میں

یہ بہترین گرہ سن کر پوری محفل عش عش کر اٹھی۔

لبنیٰ خاور..... فیصل آباد

حضرت علی کی ذہانت

حضرت علی سے پوچھا گیا۔

"یا امیر المومنین! آسمان اور زمین کے درمیان کیا کچھ ہے؟"

آپ نے فرمایا۔ "قبول ہونے والی دعا۔"

آپ سے پوچھا گیا۔ "مشرق اور مغرب کے درمیان کتنی مسافت ہے؟"

آپ نے فرمایا۔ "سورج کے ایک دن رات چلنے کی مسافت"

آپ سے پوچھا گیا "پانی کا ذائقہ کیا ہے؟"

آپ نے فرمایا۔ "جو زندگی کا ذائقہ ہے۔"

رفعت۔ ملتان

عقل اور خواہش

جانوروں میں خواہش پائی جاتی ہے لیکن عقل نہیں ہوتی۔

فرشتوں میں عقل ہوتی ہے لیکن خواہش نہیں پائی جاتی۔

انسان میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ اس میں عقل بھی ہے اور خواہش بھی اگر انسان خواہش سے عقل کو دبا لیتا ہے تو جانوروں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے اور اگر عقل سے خواہش کو دبا لیتا ہے تو اس کا شمار فرشتوں کی صف میں کیا جائے گا۔

قرۃ العین ملک..... منڈی بہاؤالدین

دعا

میں ہر روز تڑپوں عشق میں مجنوں کی طرح
اور تڑپتی ہے میرے پیار میں لیلیٰ میری
اس کے ابا کو تو دنیا سے اٹھا لے یارب!
لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

(ضیاءالحق قاسمی)

ریما نور رضوان..... کراچی

میٹھا پھل

شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ بزرگوں کے ایک گروہ کے ساتھ میں کشتی میں بیٹھا تھا۔ ہمارے پیچھے ایک چھوٹی کشتی ڈوب گئی اور اس میں سوار دو بھائی ایک بھنور میں پھنس گئے۔ میرے ساتھی بزرگوں میں سے ایک نے ملاح سے کہا کہ جلدی سے دونوں بھائیوں کو بچاؤ۔ تجھے ہر اک کے عوض پچاس دینار دوں گا۔۔ ملاح پانی میں کود پڑا اور ایک بھائی کو بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن دوسرا ہلاک ہو گیا میں نے کہا کہ اس کی زندگی باقی نہ رہی تھی، اسی لیے تو نے اسے پکڑنے میں سستی کی اور دوسرے کو پکڑنے میں بڑی پھرتی دکھائی۔ ملاح ہنس پڑا اور کہا کہ جو کچھ تو نے کہا ہے درست ہے لیکن ایک دوسرا سبب بھی ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کیا؟ کہنے لگا کہ اس کو بچانے کی خواہش میرے دل میں زیادہ تھی کیونکہ ایک دفعہ میں جنگل میں سخت تھک گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے اونٹ پر بٹھا لیا اور دوسرے ہاتھ سے میں نے لڑکپن میں ایک کوڑا کھایا تھا۔

میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے کہ جو شخص نیک کام کرتا ہے وہ اس کی اپنی ذات کے لیے (فائدہ مند) ہے اور جو شخص برا کام کرتا ہے اس کی برائی بھی اسی پر۔

دانیہ عامر..... کراچی

بشریٰ محمود

سیدہ نسبت زہرا کی ڈائری میں تحریر
قتیل شفائی کی غزل

اپنے ہونٹوں پہ سجانا چاہتا ہوں
آ تجھے میں گنگنانا چاہتا ہوں

کوئی آنسو تیرے دامن پر گرا کر
بوند کو موتی بنانا چاہتا ہوں

بڑھ گئی اس حد تلک بے اعتمادی
تجھ کو تجھ سے بھی چھپانا چاہتا ہوں

تھک گیا ہوں کرتے کرتے یاد تجھ کو
اب تجھے میں یاد آنا چاہتا ہوں

آخری ہچکی ترے زانو پہ آئے
موت بھی میں شاعرانہ چاہتا ہوں

رہ گئی تھی کچھ کمی رسوائیوں میں
پھر قتیل اس در پہ جانا چاہتا ہوں

توشابہ اسد کی ڈائری میں تحریر
فرحت عباس شاہ کی نظم

محبت ذات ہوتی ہے

محبت ذات ہوتی ہے
محبت ذات کی تکمیل ہوتی ہے
کوئی جنگل میں جا ٹھہرے کسی بستی میں بس جائے
محبت ساتھ ہوتی ہے
محبت موسموں کی دھن
محبت آبشاروں کے نکھرتے پانیوں کا من
محبت جنگلوں میں رقص کرتی مورنی کا تن
محبت برف پڑتی سردیوں میں دھوپ بنتی
محبت چلچلاتے گرم صحراؤں میں ٹھنڈی چھاؤں کی مانند
محبت اجنبی دنیا میں اپنے گاؤں کی مانند
محبت دل
محبت جاں
محبت روح کا درماں
محبت مورتی ہے
فضاؤں میں کسی کے ہاتھ سے گر چھوٹ جائے تو
محبت آبلہ ہے کرب کا
اور پھوٹ جائے تو
محبت روگ ہوتی ہے
محبت سوگ ہوتی ہے
محبت شام ہوتی ہے
محبت رات ہوتی ہے
محبت جھلملاتی آنکھ میں برسات ہوتی ہے
محبت نیند کی رات میں حسیں خوابوں کے رستوں پر
سلگتے، جاں کو آتے رت جگوں کی گھات ہوتی ہے
محبت جیت ہوتی ہے
محبت مات ہوتی ہے
محبت ذات ہوتی ہے

خوذیہ ثمر بٹ کی ڈائری میں تحریر
اجمل سراج کی غزل

اور تو خیر کیا رہ گیا
ہاں مگر اک خلا رہ گیا

غم سبھی دل کے رخصت ہوئے
درد بے انتہا رہ گیا

زخم سب مندمل ہو گئے
اک دریچہ کھلا رہ گیا

رنگ جانے کہاں اڑ گئے
صرف اک داغ سا رہ گیا

آرزوؤں کا مرکز تھا دل
حسرتوں سے گھرا رہ گیا

زندگی سے تعلق مرا
ٹوٹ کر بھی جڑا رہ گیا

کس کو چھوڑا خزاں نے مگر
زخم دل کا ہرا رہ گیا

کام اجمل بہت تھے ہمیں
ہاتھ دل پر دھرا رہ گیا

سیدہ لوبا سجاد کی ڈائری میں تحریر
وصی شاہ کی نظم

تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا؟

بے سبب تو نہ تھیں تیری یادیں
تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا
ضبط کا حوصلہ بڑھا لینا
آنسوؤں کو کہیں چھپا لینا
کانپتی ڈولتی صداؤں کو
چپ کی چادر میں ڈھانپ کر رکھنا
بے سبب بھی کبھی کبھی ہنسنا
جب بھی ہو بات کوئی تلخی کی
موضوعِ گفتگو بدل دینا
بے سبب تو نہیں تیری یادیں
تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا؟

رباب راجپوت کی ڈائری میں تحریر
شمیم منظر کی نظم

مگر کب تک؟

مجھے تم کیوں نہیں میری طرح سے سوچ سکتے ہو
مری باتیں، مری سوچیں
شروع ہوتی ہیں تم سے
اور
ہوتی ہیں ختم بھی تم پر
اگر تم میری باتوں کو، چھپی تنہائیوں میں
خود کو دیکھو گے
چرا لو گے نظر مجھ سے
مٹانا چاہو گے ہستی میری
مجھ سے لڑو گے
اور
سوچو گے بچھڑنے کی وہ ترکیبیں
جنہیں تم آزماتے ہو سدا سب پر
مگر کب تک
مگر کب تک چھپاؤ گے حقیقت کو
تمہارے خواب ایسے ہیں
جنہیں انسانیت سے زیست کرنے کا
کبھی موقع نہیں ملتا
تمہارے عہد و پیماں میں نہ جانے کتنے کانٹے ہیں
جنہیں تم خود ہی بوتے ہو
نوید صبح دیتے
جلا کر آشیانوں کو
میں سمجھا تھا
کہ
تم میری طرح سے سوچ سکتے ہو
مگر تم کیوں نہیں میری طرح سے سوچ سکتے ہو

شگفتہ سلیمان

گڑیا شاہ ——— کھروڑپکا

دل کو تو پہلے ہی درد کی دیمک چاٹ گئی تھی
روح کو بھی اب کھا جائے تنہائی کا دیمک

طاہرہ ملک ——— جلال پور پیر والا

میں خواب بن کر اسے نیند میں دکھائی دوں
وہ میرا قرب جو چاہے تو میں جدائی دوں
کچھ اس طرح سے مجھے چاہیے کہ ہر گھڑی اس کو میں
دھڑکنوں کی طرح قلب میں سنائی دوں

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ——— کراچی

عمر رواں گزر رہی ہے یاد خدا سے غافل
اے دل ناداں سنبھل جا یہاں خدا کے سوا کوئی نہیں اپنا

سعدیہ ملک ——— جلال پور پیر والا

مجھے احباب کی لمبی قطاروں سے نہیں مطلب
ہو جو دل سے ہمارا وہ اک شخص ہی کافی ہے

سیدہ ثوبا سجاد ——— کھروڑپکا

جو مجھ سے منسلک ہوئیں کہانیاں کچھ اور تھیں
جو دل کو پیش آئی ہے وہ داستاں اور ہے
یہ مرحلہ تو سہل تھا محبتوں میں وصل کا
ابھی تمہیں خبر نہیں اک امتحان اور ہے

حورین زینب ——— کھروڑپکا

ترک دنیا کا سماں، ختم ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے

گیلانی سسٹرز ——— کھروڑپکا

یہ اداسیوں کے موسم یونہی رائیگاں نہ جائیں
کسی یاد کو پکارو، کسی درد کو جگاؤ

ثمرہ، اقرا ——— کراچی

ہر جرم میری ذات سے منسوب ہے محسن
کیا میرے سوا شہر میں معصوم ہیں سارے

شازیہ گلزار بھٹی ——— بھکر

آنکھوں میں تیرے کچھ ارمان چھوڑ جائیں گے
زندگی میں تیری نشان چھوڑ جائیں گے
لے جائیں گے تو بس تیری اک یاد دنیا سے
تیرے لیے سارا جہان چھوڑ جائیں گے

سعدیہ، سدرہ ——— کراچی

یہ آرزو تھی کہ ایسا ہی ہوا ہوتا
میری کمی نے تجھے بھی رلا دیا ہوتا
میں لوٹ آتا تیرے پاس اک لمحے میں
تیرے لبوں نے میرا نام تو لیا ہوتا

ارم طاہرہ ——— ٹنڈو آدم

غم میں ڈوبا ہے سفر میری زندگی کا
زخمی مسکان پہ لوگ مجھے خوش مزاج کہتے ہیں

سیدہ نسبت زہرا ——— کھروڑپکا

سلیقہ عشق میں میرا، کمال کا تھا
کہ اختیار بھی دل پر عجب مثال کا تھا
محبتوں میں، میں قائل تھی لب نہ کھلنے کی
جواب ورنہ میرے پاس ہر سوال کا تھا

ندا، فضہ، ایمان ——— کراچی

ایک ہی بات ہے محبت میں
چاہے میں جیت جاؤں، چاہے وہ

صدف عمران ——— کے ڈی اے

جو چل سکو تو کوئی ایسی چال چل جانا
مجھے گماں بھی نہ ہو اور تم بدل جانا

فرحین ظفر ——— کراچی

رات بھر چاندنی گنگناتی رہی
رات بھر کوئی تنہا سسکتا رہا
اشک پلکوں پہ آ کر بکھرتے رہے
نام لب پہ کسی کا لرزتا رہا

اربیہ شمشاد، منیبہ شمشاد ——— آزاد کشمیر

اپنے انعام حسن کے بدلے
ہم تہی دامنوں سے کیا لینا
آج فرقت زدوں پہ لطف کرو
پھر کبھی صبر آزما لینا

سنبرت طارق ——— مظفر آباد

نگاہ عشق کا عجب ہی مشغلہ دیکھا
اسے ہی دیکھنا چاہے، جسے بے پناہ دیکھا

صائمہ جبیں ——— کراچی

سنا تھا دل سمندر سے بھی گہرا ہوتا ہے ناصر
پھر کیوں نہیں سمایا اس میں کوئی اور اس کے سوا

خدیجہ سلیم ——— کے ڈی اے

سوچ میں فاصلے در آئیں تو پھر چاہت بھی
پاس لے آنے میں ہو جاتی ہے ناکام بہت

رابعہ عمران چوہدری ——— رحیم یار خان

مجھے خلا میں بھٹکنے کی آرزو ہی سہی
کہ تو ملے نہ ملے تیری جستجو ہی سہی
بڑے خلوص سے ملتا ہے جب بھی ملتا ہے
وہ بے وفا تو نہیں ہے، بہانہ جو ہی سہی

عاصمہ ندیم ——— کراچی

ایک موہوم تصور کے لیے
روح کی آب گنوادی ہم نے
کیسی آباد تھی دنیا دل
کیسی سنسان بنا دی ہم نے

نازش ریحان ——— کراچی

یہ حدیں نہ توڑ دینا میرے دائرے میں رہنا
مجھے اپنے دل میں رکھنا میرے حافظے میں رہنا
میرے ہاتھ کی لکیریں تیرا نام بن کے چمکیں
مری خواہشوں کی خوشبو میرے زائچے میں رہنا

گیلانی سسٹرز ——— کھروڑپکا

راز الفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا
وہ میرے ہو کے بھی میرے نہ ہوئے
ان کو اپنا بنا کر دیکھ لیا

عظمیٰ شفیق ———

ہم تسلیم کرتے ہیں ہمیں فرصت نہیں ملتی
مگر جب یاد کرتے ہیں تو زمانہ بھول جاتے ہیں

ناہید راشد ——— کراچی

حشر میں اسے خدا نہیں دینا
پھر سزا کوئی زندگی جیسی

آسیہ جاوید ——— (بارہ دری) علی پور چٹھہ

آس و امید کی شمع روشن رہی
گھر کی دہلیز کو کوئی تکتا رہا
آج پھر رات بسر ہو ہی گئی
آج پھر کوئی خود سے الجھتا رہا

عائشہ، تحریم ——— گوجرہ

تیرا وجود رواجوں کے اعتکاف میں ہے
میرا وجود تیرے ع، ش، ق میں ہے

نوشابہ اسد ——— بہاول پور

رونے سے نہیں حاصل کچھ اے دل سودائی
آنکھوں کی بھی بربادی، دامن کی بھی رسوائی
ہم لوگ سمندر کے بچھڑے ہوئے ساحل ہیں
اس پار بھی تنہائی، اس پار بھی تنہائی

صائمہ سندھو ——— گوجرہ

یہی معیار دیانت ہے تو کل کا تاجر
برف کے باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

ثمرہ ——— کراچی

میں دھوپ دھوپ مسافت میں جس کے ساتھ رہا
ذرا سی چھاؤں میں اس نے بھلا دیا ہے مجھے

مدیحہ، ایمان ——— کراچی

ہے نمایاں تیرے جذبوں کی صداقت محسن
ایک شخص کا برسوں تجھے پاگل رکھنا

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

منفی مقصد

اس جلوس کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ اتنا بڑا جلوس ننگی کرپانیں سکھ انہیں لہرا رہے تھے۔ ہندنیاں سیاپا کر رہی تھیں۔ وہ سب چلا رہے تھے "نہیں بننے دیں گے پاکستان۔" یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ نہیں بننے دیں گے تو ایک منفی مقصد ہے' مثبت نہیں۔ منفی مقصد کے لیے اتنا شور شرابا' تشدد کی ننگی دھمکی۔ منفی مقصد کے لیے تو لوگ شرماتے ہیں۔ اسے چھپا کر رکھتے ہیں کہ کوئی جان نہ لے' لیکن وہ لوگ تو منفی مقصد کو جھنڈا بنا کر لہرا رہے تھے۔ دھمکی دے رہے تھے کہ پاکستان بن گیا تو خون کی ندیاں بہا دیں گے۔ ان کا نعرہ تو اکھنڈ ہندوستان ہونا چاہیے تھا۔ انہیں پاکستان سے نفرت کیوں ہے؟ وہ پہلا دن تھا جب میرے دل میں پاکستان کے مطالبے سے ہمدردی پیدا ہوئی تھی اور میں نے یہ جانا تھا کہ ہندو' ہندوستان کی عظمت نہیں چاہتے بلکہ ہندو کی عظمت کے خواہاں ہیں۔

(ممتاز مفتی۔۔۔ الکھ نگری)
انعم نور۔۔۔ لاہور

لو اسٹوری

چاندنی چٹکی ہوئی ہے۔ میں کلب کے باغ میں ٹہل رہا ہوں۔ ایک خوش نما کنج سے کچھ آوازیں آرہی ہیں۔ میں دبے پاؤں جا کر دیکھتا ہوں۔ بنچ پر لڑکی بیٹھی ہے سامنے گھٹنا گھاس پر ٹیکے ایک لڑکا ہے۔ اس کا ہاتھ اپنے دل پر ہے اور دوسرا ہوا میں لہرا رہا ہے نہایت رومان انگیز فضا ہے۔

"میں شادی کا وعدہ تو نہیں کرتی۔ صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ آپ بھی فائنلز میں آگئے ہیں۔"

"اپنے پرانے رفیق سے ایسی بے رخی۔"

"یہ آپ کو کس نے بتایا؟ محبت تو ایک طرف رہی' مجھے آپ سے باقاعدہ نفرت بھی نہیں ہے۔"

"میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ جب میں تمہارے انار کے دانوں جیسے دانت' چیری جیسے ہونٹ' سیب جیسے گال۔۔۔"

"یہ کسی لڑکی کا ذکر ہو رہا ہے یا فروٹ سلاد کا۔"

"کیا بتاؤں؟ بس یوں سمجھ لو کہ مجھے اظہار محبت کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔"

"تو کیا میں ڈکشنری ہوں؟"

"آج میں تمہارا فیصلہ سن کر ہی جاؤں گا۔"

"مجھے ڈر ہے کہ میرا فیصلہ آپ کے نظام اعصابی کے لیے مضر ثابت ہو گا۔ لو سن لو۔۔۔ ہماری راہیں بالکل الگ الگ ہیں۔"

"بے شک ہماری راہیں الگ الگ ہیں تم اپنی راہ پر جاؤ اور میں۔۔۔ تمہاری راہ پر جاؤں تم نہیں سمجھتیں کہ تم میری بے کار زندگی میں کتنی خوش گوار تبدیلیاں لے آئی ہو۔ پہلے میری زندگی کے افق پر سیاہ بادل چھائے رہتے تھے۔ بجلیاں کڑکتی تھیں۔ آندھیاں چلتی تھیں' طوفان آتے تھے' تمہارے آنے پر گھٹائیں چھٹ گئیں' فضا نکھر گئی' سورج نکل آیا' ہوا کے لطیف جھونکے چلنے لگے۔"

"یہ اظہار محبت ہے یا موسم کی رپورٹ؟ آخر میں کس طرح آپ کو یقین دلاؤں کہ میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"اچھا کیا تم چند وجوہات بتا سکتی ہو کہ تم مجھ سے کیوں شادی نہیں کر سکتیں۔"

"پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مجھے آپ پسند نہیں ہیں

دوسری وجہ یہ ہے کہ مجھے آپ پسند نہیں تیسری وجہ یہ کہ مجھے آپ پسند نہیں۔"

"اور جو میں اتنے عرصے سے تمہاری ناز برداریاں کرتا رہا ہوں۔ پورے چار سال سے تمہارے پیچھے پیچھے پھرتا رہا ہوں۔۔۔ یہ۔۔۔"

"اس کے لیے آپ کیا چاہتے ہیں؟ پینشن؟"

"کیا تمہیں سچ مچ میرا خیال نہیں۔ کیا تمہیں میں کبھی یاد نہیں آتا؟"

"صرف ایک دن یاد آئے تھے۔"

"کس دن؟"

"اس دن میں چڑیا گھر گئی ہوئی تھی۔"

جب وہ واپس جا رہے تھے تو لڑکی کہہ رہی تھی۔

"آپ تو سچ مچ ناراض ہو گئے میں تو مذاق کر رہی تھی۔"

اور لڑکا کہہ رہا تھا "تم جیسی لڑکی سے شادی کرنے سے بہتر ہے انسان کسی مگرمچھ سے شادی کر لے۔"

(شفیق الرحمن۔۔۔ حماقتیں)
بیا۔۔۔ ترنڈہ محمد پنا

خوش گمان

ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں درندگی' بے ایمانی' سفاکی' بد عنوانی اور حیوانیت عام ہے۔ ہم جس کی مدد کرتے ہیں وہی بری طرح ہمارا استحصال کرتا ہے۔ ہم جنہے تربیت پرواز دیتے ہیں' وہ اڑتے ہوئے ہمیں ہی اپنے پنجوں میں جھپٹ لیتے ہیں۔ ایسے میں بندہ خوش گمان کیسے رہ سکتا ہے۔

(صائمہ اکرم چوہدری۔۔۔ بات عمر بھر کی ہے)
شازیہ اعجاز۔۔۔ فیصل آباد

ہمارا ملک

"ایران میں کون رہتا ہے؟"

"ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے۔"

"انگلستان میں کون رہتا ہے؟"

"انگلستان میں انگریز قوم رہتی ہے۔"

"فرانس میں کون رہتا ہے؟"

"فرانس میں فرانسیسی قوم رہتی ہے۔"

"یہ کون سا ملک ہے؟"

"یہ پاکستان ہے۔"

"اس میں پاکستانی قوم رہتی ہو گی؟"

"نہیں اس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی ہے۔"

"اس میں پنجابی قوم رہتی ہے۔"

"اس میں بنگالی قوم رہتی ہے۔"

"اس میں یہ قوم رہتی ہے۔"

"اس میں وہ قوم رہتی ہے۔"

"لیکن۔۔۔ پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں؟ سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں؟ پھر یہ الگ ملک کیوں بنایا تھا؟"

"غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیجیے۔۔۔ آئندہ نہیں بنائیں گے۔"

(ابن انشاء۔۔۔ اردو کی آخری کتاب)
فوزیہ تمرسٹ۔۔۔ گجرات

مایوسی

مایوسی شیطان کا مہلک ہتھیار ہے۔ اس کے پاس اس سے مہلک اور کوئی ہتھیار نہیں مومن کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ کوئی ناکامی کی راہ نہیں روک سکتی' ناکامی شاندار کامیابی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جب تک کوئی ناکام نہیں ہوتا' کامیاب نہیں ہوتا۔ اللہ کی راہ سیدھی راہ ہے۔ سیدھی راہ پہ چلتے جو مشکل درپیش ہو' پروا مت کر' اپنی راہ مت چھوڑ! عطا و بلا سے بے نیاز ہو کر چل! سینہ تان کر دندناتا ہوا چل! اس منزل میں تدبیر کوئی معنی نہیں رکھتی البتہ عزم اللہ کی تقدیر ہوتا ہے۔ تیرا عزم اللہ کی تقدیر ہے۔

(رضیہ بٹ)
صدف سمیع۔۔۔ کراچی

مائیں

ماؤں کی ضرورت زندگی بھر کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ان کی محبت آکسیجن کی طرح ہوتی ہے جس کی ضرورت آخری سانس تک رہتی ہے اور جب یہ نہیں رہتیں تو ان کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔

(تنزیلہ ریاض۔۔۔ عہد الست)
نوشابہ۔۔۔ ظہیر بارو

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

کڑی کشمیری چاولوں کے ساتھ

اشیاء :

بیسن — ایک سو پچیس گرام
دہی — آدھا کلو
لہسن ادرک کا پیسٹ — دو کھانے کے چمچے
تیل — حسب ذائقہ
نمک — حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر — دو کھانے کے چمچے
ہلدی پاؤڈر — آدھا کھانے کا چمچہ
پیاز (باریک باریک کاٹ لیں) ایک عدد

پکوڑوں کے لیے

بیسن — ایک پاؤ
نمک — حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر — حسب ذائقہ
زیرہ پاؤڈر — ایک چائے کا چمچہ
میٹھا سوڈا — چٹکی بھر
پانی — حسب ضرورت
تیل — تلنے کے لیے
ہرا دھنیا (کٹا ہوا) — آدھا کپ
ہری مرچ (کٹی ہوئی) — چار سے چھ عدد
پیاز (چوکور کٹی ہوئی) — ایک عدد

کشمیری چاولوں کے لیے

اشیاء :

چاول (ابلے ہوئے) دو سے تین کپ
زیرہ — آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچیں (کٹی ہوئی) — دو عدد
کڑی پتے — چار سے چھ پتے

تڑکے کے لیے

تیل — حسب ضرورت
ہری مرچیں — چار عدد
زیرہ — ایک کھانے کا چمچہ
کڑی پتے — آٹھ سے دس عدد

ترکیب :

دہی میں بیسن ' نمک ' لال مرچ پاؤڈر ' ہلدی پاؤڈر ' پیاز اور لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ ایک پتیلے میں دہی اور بیسن کا پھینٹا ہوا آمیزہ ڈال کر ایک جگ پانی میں شامل کر دیں اور پہلے ابال تک مسلسل چمچہ چلاتے رہیں۔ جب ابال آجائے تو درمیانی آنچ پر کڑی کے گاڑھے ہونے تک پکنے دیں۔

پکوڑوں کے لیے

ترکیب :

ایک باؤل میں بیسن ڈال کر اس میں ہرا دھنیا ' ہری مرچیں ' پیاز ' لال مرچ پاؤڈر ' زیرہ پاؤڈر ' نمک اور میٹھا سوڈا شامل کریں اور پانی سے بیسن پھینٹ کر گاڑھا آمیزہ تیار کر لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے اس آمیزے کے پکوڑے بنالیں اور کڑی میں ڈال کر دس سے بارہ منٹ تک ہلکی آنچ پر پکالیں۔

تڑکے کے لیے

تیل گرم کر کے اس میں ہری مرچیں ' کڑھی پتا اور زیرہ ڈال کر کڑکڑائیں اور کڑھی پر تڑکا لگا کر ڈش میں

کشمیری چاول کے لیے

تیل گرم کریں۔ اس میں زیرہ ' ہری مرچیں اور کڑی پتا ڈال کر کڑکڑائیں اور اس میں چاول شامل کر کے مکس کر لیں۔ کشمیری چاول تیار ہیں۔ کڑی کے ساتھ سرو کریں۔
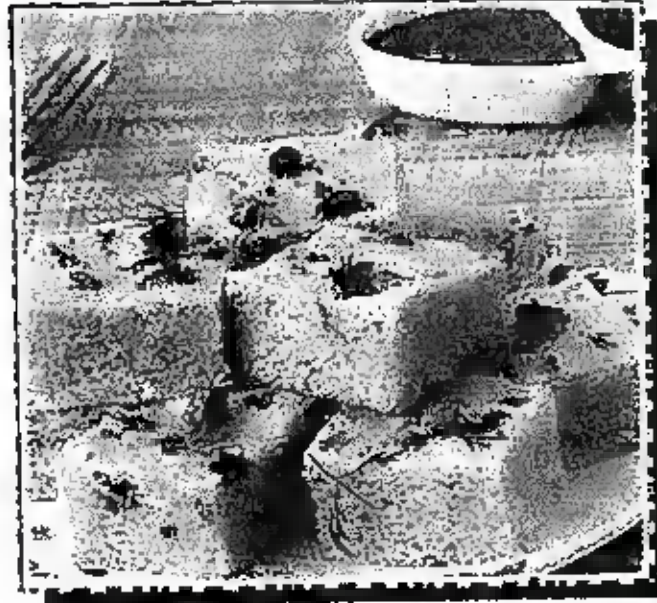
ڈھوکلے

اشیاء :

چاول — ایک پیالی
چنے کی دال — تین چوتھائی پیالی
لہسن پسا ہوا — آدھا چائے کا چمچہ
نمک — حسب ذائقہ
دہی — دو پیالی
خمیر پاؤڈر — ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ (پسی ہوئی) — آدھا چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا (پسا ہوا) — آدھی گٹھی
تازہ میتھی کے پتے (پسے ہوئے) آدھی گٹھی
ہری مرچ (پسی ہوئی) — دو عدد
تیل — دو کھانے کے چمچے

بگھار کے لیے

کڑی پتا — چند پتے
سفید زیرہ — ایک چائے کا چمچہ
رائی — ایک چائے کا چمچہ
تل — ایک چائے کا چمچہ
تیل — چار کھانے کے چمچے
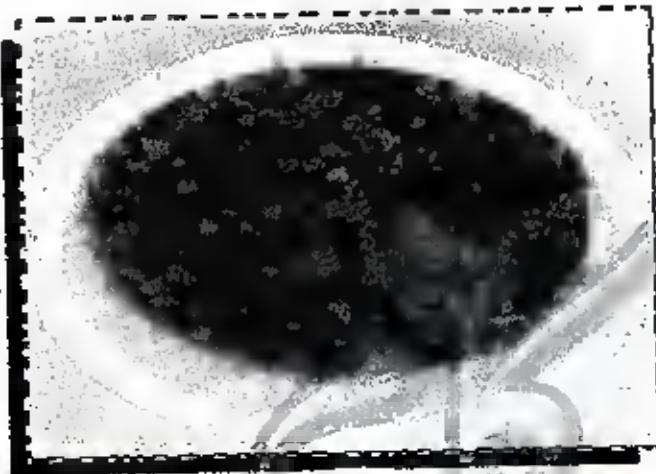
ترکیب :

چاول اور دال کو علیحدہ علیحدہ رات بھر بھگو دیں اور دونوں کو ملا کر باریک پیس لیں۔ پھر لہسن ' نمک ' دہی ' خمیر ' لال مرچ ' ہرا دھنیا ' میتھی اور ہری مرچیں شامل کر دیں اور ڈھک دیں ' دو سے تین گھنٹوں کے لیے گرم جگہ پر رکھ دیں۔ کیک یا پڑا بنانے والے سانچے میں تیل لگا کر ڈھوکلے کا آمیزہ پھیلا دیں۔ سانچے کے ناپ کی دیگچی میں پانی ابالیں اور اس پر سانچہ رکھ کر تیس سے پینتیس منٹ تک پکائیں۔ ڈھوکلے کے درمیان میں تیلی ڈال کر چیک کریں۔ تیلی صاف نکل آنے پر چولہے سے اتار لیں اس کے بعد تیل کو فرائنگ پین میں درمیان آنچ پر دو سے تین منٹ ہلکا گرم کریں اور بگھار کے تمام مسالے ڈال کر فرائی کر کے ڈھوکلے پر ڈال دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر ڈھوکلے کے چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔ ڈھوکلے کو لہسن کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

مرغ چھولے

اشیاء :

چلن	ایک کلو
سفید چنے (ابلے ہوئے)	ایک پیالی
ادرک لہسن (پسا ہوا)	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	دو عدد درمیانی
ٹماٹر (چوکور کٹے ہوئے)	تین عدد درمیانے
کالی مرچ (پسی ہوئی)	ایک کھانے کا چمچہ
دھنیا پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
تیل	آدھی پیالی

سجانے کے لیے

ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی)	تین سے چار عدد
ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا)	آدھی گٹھی

ترکیب :

دیگچی میں تیل کو درمیانی آنچ پر دو سے تین منٹ کے لیے ہلکا سا گرم کر کے پیاز کو سنہرا فرائی کرلیں۔ پھر ادرک لہسن اور کالی مرچ ڈال کر ایک منٹ تک فرائی کریں اور ٹماٹر ڈال کر اتنی دیر پکائیں کہ اچھی طرح گل جائیں۔ نمک' دھنیا' زیرہ اور چلن ڈال کر اتنی دیر بھونیں کہ تیل علیحدہ نظر آنے لگے۔ چنے ڈال کر دو پیالی پانی ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر دس سے بارہ منٹ تک پکائیں۔ ڈش میں نکال کر ہری مرچیں اور ہرا دھنیا چھڑک دیں اور نان کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

کھٹا ڈالچہ

اشیاء :

مسور کی دال	دو پیالی
لوکی (چھیل کر چوکور ٹکڑے کرلیں)	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
ادرک لہسن پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	دو عدد درمیانی
ٹماٹر	دو عدد
لال مرچ (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
املی کا گودا	آدھی پیالی
کڑی پتا	چند پتے
ہری مرچیں	چار سے چھ عدد
دار چینی (پسی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	تین چوتھائی پیالی

ترکیب :

دال کو دھو کر دو پیالی پانی اور دو کھانے کے چمچے تیل کے ساتھ ابال لیں۔ دال جب اچھی طرح گل جائے تو لکڑی کے چمچے سے گھوٹ لیں یا بلینڈر میں ڈال لیں۔ پھر ہلدی' نمک' لال مرچ' ادرک لہسن اور دو پیالی پانی میں شامل کرلیں۔ دیگچی میں تیل کو درمیانی آنچ پر دو سے تین منٹ کے لیے ہلکا سا گرم کر کے کڑی پتا ڈال دیں۔ ایک منٹ بعد پیاز ڈال کر سنہرا فرائی کریں۔ لوکی ڈال کر پانچ سے سات منٹ تک بھونیں اور اس میں دال شامل کر کے ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ لوکی گل جائے تو ہری مرچیں اور املی ڈال دیں۔ دس منٹ کے بعد ٹماٹر ڈال کر پسی ہوئی دار چینی چھڑک دیں۔ ہلکی آنچ پر دس سے پندرہ منٹ تک پکا کر چولہے سے اتار لیں۔ اُبلے ہوئے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

روبینہ شریف

بل

لڑکے نے ایک لڑکی سے پوچھا۔ "میں آخری بار پوچھ رہا ہوں کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "نہیں!"

لڑکے نے کہا۔ "سوچ لو۔"

لڑکی نے پھر سے کہا۔ "کہا نا نہیں!"

لڑکے نے ویٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ویٹر! باجی کا بل الگ بنانا۔"

حنا خان۔۔۔ کراچی

نجات

ایک سہیلی نے دوسری سہیلی کو کہا۔ "تمہارے شوہر کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

پہلی سہیلی نے جواب دیا۔ "مجھے تو شوہر سے نجات مل گئی ہے۔"

"تم نے کوئی علاج بھی کیا؟"

"اگر علاج کرتی تو نجات کیسے ملتی؟"

آمنہ شاہ۔۔۔ لاہور

جہازی کھیل

جہاز میں کچھ پاگلوں کو دوسرے ملک لے جایا جارہا تھا۔ سارے پاگل بہت شور کر رہے تھے اور جہاز میں ہی کھیل رہے تھے پائلٹ کو بہت غصہ آیا۔

ایک پائلٹ نے جا کر انہیں چپ کروایا' جب واپس آیا تو پھر پاگلوں نے کھیلنا اور شور مچانا شروع کر دیا۔

اسی پائلٹ نے پھر جا کر منع کیا اور جب واپس آیا تو پاگلوں نے پھر کھیلنا اور شور مچانا شروع کر دیا۔ دوسرے پائلٹ کو بہت غصہ آیا اور باہر گیا اور کچھ دیر بعد واپس آگیا۔ کافی دیر تک خاموشی رہی تو ساتھ والا پائلٹ حیران ہو گیا اور پوچھا۔ "ان سے کیا کہا جو اب شور نہیں ہو رہا؟"

پائلٹ نے جواب دیا۔ "میں نے کہا۔ اگر کھیلنا ہے تو باہر جا کر کھیلو۔"

فردوس۔۔۔ لاہور

ناراض

ڈاکٹر نے نرس کو بلا کر پوچھا۔

"وہ کنجوس مریض اب کیوں ناراض ہو رہا ہے' آخر اب کیا ہوا؟"

نرس نے جواب دیا۔ "وہ اب اس بات پر ناراض ہو رہا ہے کہ دوائیاں ختم ہونے سے پہلے وہ ٹھیک کیوں ہو گیا۔"

منال کاشف۔۔۔ کراچی

انعام

ماں نے اپنے بیٹے سے کہا۔

"یقیناً" اگر تم اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے تو میں ایک قلم انعام میں دوں گی۔"

بیٹے نے پوچھا۔ "ماں! اگر فیل ہو گیا تو؟"

ماں نے غصے سے کہا۔ "تو جوتے۔"

بیٹے نے فوراً" کہا۔ "بس امی! مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے کیونکہ میرے جوتے پھٹ چکے ہیں۔"

شازیہ گلزار۔ بھکر

قلم

ایک آدمی نے اپنے گھر میں پینٹ کروایا۔ اس نے

خوش ہو کر کاریگر کو مزدوری کے علاوہ پانچ سو روپے انعام دیا اور کہا۔ "یہ لو' بیگم کے ساتھ فلم دیکھنے چلے جانا۔"
شام کو دروازے پر دستک ہوئی' اس آدمی نے باہر دیکھا تو اسے رنگ والا کاریگر سوٹ پہنے کھڑا نظر آیا۔ مالک نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"
کاریگر نے جواب دیا۔ "وہ جی بیگم کو بھیج دیں' فلم دیکھنے جانا ہے۔"

فائزہ، فریبہ۔ حیدرآباد

عقلمند کیسے کیسے!

ایک صاحب ایک تحریر کا نمونہ لے کر اس کا تجزیہ کرانے ماہر تحریر شناس کے پاس پہنچے۔ وہ تجزیہ کرنے کے بعد بولے۔ "یہ الفاظ لکھنے والا شخص انتہائی تحمل مزاج ہے۔ صابر' شائستہ اور بامروت بھی ہے۔"
"بس بس.... ٹھیک ہے۔" وہ صاحب مطمئن ہو کر بولے۔ "دراصل میں جس نئی کالونی میں شفٹ ہوا ہوں' یہ وہاں کے جنرل اسٹور کا مالک ہے۔ میں اس سے ادھار سودا لینا شروع کر رہا ہوں۔"

شہزادی تانیہ.... عارف والا

سزا

انٹرویو کے دوران ایک مشہور جج سے مختلف جرائم اور ان کی سزاؤں کے بارے میں کچھ اخباری نمائندے سوال کر رہے تھے مختلف سوالوں سے گزرتے ہوئے ایک نمائندے نے جج سے دریافت کیا۔ "جناب والا! یہ بتایئے کہ دو شادیاں کرنے والے کی ہمارے ملک میں انتہائی سزا کیا ہے؟"
جج نے اطمینان سے جواب دیا۔ "دو ساسیں۔"

ریما فہیم.... جدہ

عقل بند' عقل بند

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ "میرا نوکر اتنا بے وقوف ہے کہ میں بتا نہیں سکتا' تم دیکھو میں ابھی ثابت کرتا ہوں۔" پھر اس نے نوکر کو بلا کر کہا۔ "یہ لو سو روپے اور سوزوکی کار لے آؤ۔" نوکر نے سو روپے لیے اور چلا گیا۔
دوست نے کہا۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں' میرا نوکر تمہارے نوکر سے بھی زیادہ ———— بے وقوف ہے' ابھی دیکھو۔" اس نے اپنے نوکر کو بلا کر کہا۔ "گھر جا کر دیکھ کر آؤ کہ میں گھر پر موجود ہوں یا نہیں۔" اس کا حکم سن کر نوکر چلا گیا۔
دوسری طرف دونوں نوکر ملے تو پہلے نوکر نے دوسرے نوکر سے کہا۔ "میرا مالک بہت بے وقوف ہے' اس نے سو روپے دے کر نئی سوزوکی منگوائی ہے' جبکہ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ آج اتوار ہے اور سارے شوروم بند ہیں۔"
دوسرا نوکر بولا۔ "یار میرا مالک تمہارے مالک سے بھی زیادہ بے وقوف ہے۔ اس نے مجھے گھر بھیج کر معلوم کروایا ہے کہ وہ گھر پر موجود ہے یا نہیں' جبکہ وہ یہ بات ٹیلی فون پر بھی معلوم کر سکتے تھے۔"

فاطمہ علی.... سرگودھا

سوا سیر

کسی دعوت میں ایک شاعرہ کی ملاقات ایک اداکارہ سے ہوئی۔ اداکارہ نے کہا۔
"آپ کی غزلوں کا مجموعہ بہت اچھا تھا' آپ کس سے لکھواتی ہیں؟"
شاعرہ بولی۔ "تعریف کا شکریہ' آپ کو کون پڑھ کر سناتا ہے۔"

غزل.... ملتان

توہین

ہوٹل کے بیرے نے ایک آدمی سے کہا۔ "جناب! آپ نے پانچ روپے ٹپ دے کر میری توہین کی ہے؟"
اس آدمی نے بیرے کو گھور کر دیکھا اور بولا۔ "اور کیا چاہیے؟"
بیرے نے جواب دیا۔ "پانچ روپے اور دیجیے۔"

آدمی نے فوراً کہا۔ "ایک بار پانچ روپے دے کر میں تمہاری توہین کر چکا ہوں دوبارہ یہ ہی عمل دہرا کر میں تمہاری مزید توہین نہیں کرنا چاہتا۔"

عائشہ عامر.... کراچی

بیمار کون؟

ایک خاتون اپنی پڑوسن کو بتا رہی تھیں۔ "ڈاکٹر نے مجھے کھانا پکانے سے منع کر دیا ہے۔"
پڑوسن نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں خیریت' آپ بیمار ہیں کیا؟"
خاتون نے جواب دیا۔ "نہیں نہیں میرے شوہر بیمار ہیں۔"

علشبا آفتاب.... حیدر آباد

چھوڑو بھی.....!

عاشق نے اپنی محبوبہ سے کہا۔ "تمہارے بال دیکھ کر ساون کی گھٹا میں یاد آتی ہیں۔"
محبوبہ نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔ "اچھا"۔
عاشق نے پھر کہا۔ "تمہاری آنکھیں تو بالکل ہی ہرنی جیسی ہیں۔"
محبوبہ نے پوچھا۔ "واقعی؟"
عاشق نے کہا۔ "تم جب چلتی ہو تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی مورنی جنگل میں رقص کر رہی ہو۔" محبوبہ شرم سے دہری ہو گئی اور بولی۔ "اچھا ایسا ہے؟"
عاشق نے پھر کہا۔ "تمہارا چہرہ تو چاند سے بھی حسین اور روشن ہے۔" محبوبہ سے اتنی تعریف سننا اور اسے ہضم کرنا مشکل ہو گیا اور بولی۔ "اب چھوڑو بھی۔"
عاشق نے فوراً کہا۔ "میں اب تک کیا کر رہا تھا' چھوڑ ہی تو رہا تھا۔"

فوزیہ ثمرٹ۔ گجرات

تعارف

ایک جونیئر کلرک نے باس کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا اور اپنی جوان اور حسین بیوی سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "سر! ان سے ملیے" یہ ہیں میری بیگم۔"
"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر....." باس نے خوش خلقی سے کہا۔ پھر جونیئر کلرک کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔ "میری خواہش ہے کہ اب تم میری بیگم سے بھی مل لو' وہ آدھے گھنٹے بعد ایک ٹرین سے پہنچنے والی ہے۔ اس کے ساتھ کافی وزنی سامان بھی ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے اسٹیشن پر ریسیو کرنے کے بعد گھر پہنچا کر آجاؤ میں یہیں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

مسرت طارق۔ مظفر آباد

مشورہ

بیوی نے اپنے میاں سے کہا۔ "سنو جی لڑکا بہت پیسے اڑانے لگا ہے۔ میں جہاں بھی پیسے چھپا کر رکھتی ہوں' وہ ڈھونڈ کر نکال ہی لیتا ہے۔ بتائیں میں آخر پیسے کہاں چھپاؤں؟"
شوہر نے بیوی کی بات سن کر جواب دیا۔ "اس کی درسی کتاب میں رکھ دو' وہ امتحانات تک نہیں ڈھونڈھ پائے گا۔"

بنت عمار..... جہلم

حفاظت

ایک ڈاکو کی بیوی جیل میں اسے ملنے آئی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ڈاکو نے سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا۔ "وہ جو ڈاکے کا اسی لاکھ روپیہ بچا کر رکھا تھا' جسے پولیس بھی مجھ سے برآمد نہ کروا سکی' وہ تو محفوظ ہے نا؟"
بیوی نے جواب دیا۔ "ہاں....." وہ جتنا محفوظ ہے اتنا شاید کسی بینک میں بھی نہیں تھا۔ ڈاکو نے مونچھیں مروڑتے ہوئے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"
بیوی نے سرگوشی میں جواب دیا۔ "جس خالی پلاٹ میں تم نے رقم دفن کی تھی' اس پر دس منزلہ پلازہ بن گیا ہے۔"

عائشہ۔ گوجرہ

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

رضوانہ سحر ...... راجن پور

س : "ذوالقرنین بھائی! اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو دو آنکھیں عطا کی ہیں جو کہ بہت بڑی نعمت ہیں ان آنکھوں سے لوگ اپنا شہتیر دیکھنے کے بجائے لوگوں کے تنکے کیوں تلاش کرتے ہیں؟"

ج : "اس کا جواب اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ دنیا ہم سے ہے ہم ہی جیسے لوگوں سے ہے۔"

ذاکرہ عفت ...... کراچی

س : "عام سی لڑکی کی مسکراہٹ اور ایئر ہوسٹس کی مسکراہٹ میں کیا فرق ہے؟"

ج : "ایئر ہوسٹس کی مسکراہٹ اس کی نوکری کا حصہ ہوتی ہے۔ مگر اب کہاں مسکراتی ہیں یہ؟"

درخشاں لودھی ...... لاہور

س : "ذوقی بھیا! کسان کہتا ہے محنت کرو' ڈاکٹر کہتا ہے آرام کرو' دل کہتا ہے محبت کرو' آپ کیا کہتے ہیں؟"

ج : "میں تینوں چیزوں کا قائل ہوں۔"

نازیہ شاہ ...... میرپور خاص

س : "جب چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ آپ کا کیا خیال ہے؟"

ج : "میں آپ کی بات کی تائید کرتا ہوں۔"

علشبہ انجم ...... کراچی

س :
تجھے آج بھی مغرور ہم نہ پاتے
اگر تجھ کو سر پہ بٹھایا نہ ہوتا

ج : "غلط بالکل غلط میں قطعاً مغرور نہیں ہوا۔"

نجمہ شاہین ...... ڈی آئی خان

س :
دل میں ہو تو کچھ کہیے جب نہ ہو تو کیا کہیے
لفظ مل بھی جاتے ہیں مدعا نہیں ملتا

ج : "اسے ڈھونڈنے کی کوشش کیا کریں۔
اب مدعا کیا وقت بھی نہیں۔"

نوید اختر ...... راولپنڈی

س : "محبت کے بیج تو نایاب ہوتے ہیں تو نفرت کے بیج عام کیوں ملتے ہیں؟"

ج : "آج کل اس نفرت کی فصل پر بہار جو آئی ہوئی ہے۔"

مدیرہ کرن

نامے میرے نام

صائمہ مشتاق ...... بھاگٹانوالہ سرگودھا

ٹائٹل سے لے کر مسکراتی کرنوں تک بہت پسند آیا۔ آپ کا بہت شکریہ کے "نامے میرے نام" میں تھوڑی سی جگہ دی۔ اب آتی ہوں ناولوں کی طرف سب سے پہلے سلسلے وار ناول پڑھے۔ آسیہ مرزا کا "من مورکھ کی بات نہ مانو" میں حوریہ کے کردار میں مجھے اپنی جھلک نظر آتی ہے۔ اور آسیہ مرزا کا انداز تحریر بہت اچھا ہے۔ آپ ہر کسی کا دل موہ لیتی ہیں اور نگہت سیما جی۔ آپ کے ناول کے بارے میں کیا لکھوں۔ آپ کی تعریف کے لیے شاید میرے پاس لفظ ہی ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی کہوں گی ویل ڈن۔ آپ ایسے ہی ہمارے دلوں پر راج کریں گی۔ نادیہ احمد کا مکمل ناول "اور رے پیا" بہت پسند آیا خاص کر سکندر کا کردار اور رباب' رافع سے دھوکا کھانے سے پہلے ہی بچ گئی۔ رابعہ افتخار کا ناولٹ۔ "تم آؤ تو عید کریں" ویل ڈن رابعہ جی آپ کے ناول میں سلطان کا کردار بہت پسند آیا۔ سلطان کوئی بھی بات دل میں نہیں رکھتا اور صاف گوئی سے بات کرتا' ایسا ہی انسان کو ہونا چاہیے۔ رابعہ افتخار جی اسی طرح ہمارے لیے لکھتی رہیں۔ افسانے سارے اچھے تھے۔ صائمہ قریشی کے افسانے "محبت برسا دینا" میں مجھے مومنہ کے کردار میں صائمہ قریشی کی جھلک نظر آئی خاص کر وہاں پر جہاں سسرال کی شادی میں جانے سے انکار کرتی ہے وہ بھی شادی سے پہلے' یہاں پر مجھے صائمہ جی اپنے آپ کو بیان کرتی نظر آتی ہیں۔ اس کے بعد "ملن کی پہلی عید" "مقابل ہے آئینہ" میں قرۃ العین کو پڑھا۔ ویسے ایک گلہ آپ سے ہے کہ "مقابل ہے آئینہ" میں مجھے شامل نہیں کیا آپ نے اچھا کوئی بات نہیں آپ کی مجبوری ہم سمجھ سکتے ہیں۔ کرن کا دسترخوان بہت پسند آیا۔ خالدہ جیلانی جی میں بھی کچھ ڈشز لکھ کر بھیجوں تو شامل کریں گی۔ ایک سوال پوچھوں کہ خواتین اور شعاع بھی آپ کے ہی رسالے ہیں۔

ج : صائمہ جی' سب سے پہلے تو آپ کو یہ بتا دیں کہ کرن' شعاع اور خواتین بھی ایک ہی ادارے کے ڈائجسٹ ہیں۔ آپ کرن کے دسترخوان کے لیے کوئی ریسیپی بھیجنا چاہتی ہیں تو ضرور بھیجیں بشرطیکہ لذیذ ڈش ہو۔ "مقابل ہے آئینہ" میں ہم سب کو شریک کرنا چاہتے ہیں آپ کا نمبر آئے گا تو آپ کو شریک ضرور کریں گے۔ آپ کی کہانی موصول ہو گئی ہے قابل اشاعت ہوگی تو ضرور شائع ہوگی۔

اقرا ممتاز ...... مدینہ کالونی بھاگٹانوالہ' سرگودھا

ٹائٹل گرلز اچھی لگیں رنگوں سے بھرپور۔ "حمد و نعت" پڑھ کر دل و ذہن کو سکون ملا۔ سب سے پہلے چھلانگ لگائی "دست مسیحا" پر نگہت سیما نے کیا خوب لکھا ہے۔ ان کی تحریر ہمیشہ دل کو چھو جانے والی ہوتی ہے۔ نگہت جی نے تو حیران ہی کر دیا کہ موحد' اہل اور ہشام کزنز نکلے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ نگہت جی اینڈ بھی اچھا ہی کیجیے گا۔ اب آتے ہیں "اور رے پیا" نادیہ احمد کی تحریر بھی کسی سے کم ہے کیا نادیہ جی نے تو کمال ہی کر دیا سکندر کا کردار فیورٹ رہا۔ اب آگے بات کرتے ہیں "تم آؤ تو عید کریں" رابعہ افتخار نے کیا امیزنگ لکھا ہے۔ رابعہ نے صحیح لکھا ہے کہ آج کے دور میں سچی بات کو بھلا کہاں برداشت کیا جاتا ہے۔ باقی ناولٹ اور افسانے ہلکے پھلکے لگے لیکن زبردست لگے "مقابل ہے آئینہ" میں قرۃ العین عینی کو پڑھ کر اچھا لگا۔ انٹرویو میں منیب بٹ کو جان کر بہت خوشی ہوئی۔ منیب بٹ تو بڑے ہیرو نکلے۔

ج : پیاری اقرا کرن کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ آئندہ بھی تبصرہ کرتی رہیے گا۔

طاہرہ ملک ...... جلال پور' پیروالا

خوب صورت سرورق سے سجا کرن جونہی ہاتھوں میں

سارا دل خوشی سے بھر آیا ہمیشہ کی طرح سیدھے پہنچے "نامے میرے نام میں" اپنا خط شامل دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مسز تقی نقوی جی Thanks میرا لیٹر پسند کرنے کا اور مائی سوئیٹ سسٹر رضوانہ ملک کی شادی ہو گئی ہے اور وہ ادمان میں ہیں۔ منیب بٹ' ژالے سرحدی سے مل کر بہت اچھا لگا' "ملن کی پہلی عید سروے" دلچسپ تھا۔ قرۃ العین عینی سے مل کر بہت اچھا لگا "من مورکھ کی بات نہ مانو" حازم اور حوریہ کا نکاح واؤ زبردست! عباد گیلانی کی طرح ہمیں بھی بہت خوشی ہوئی اور بابر صاحب کو حدود میں رکھیے گا لگتا ہے وہ ان کی خوب صورت لائف میں تلخیاں بکھیرے گا اور فضہ بے چاری کو نصیر کی صورت میں زہر پینا ہی پڑے گا۔

"سنگ پارس" مہوش افتخار نے بہت زبردست لکھا اتنی دلچسپی سے پڑھ رہی تھی امید ہی نہیں تھی کہ یہ مکمل نہیں ہو گا اینڈ میں تشنگی رہ گئی خیر' بے چینی سے طوبیٰ اور نوفل کی دوری کی وجہ جاننے کے منتظر ہیں۔

"محبت برسا دینا" مومنہ کی اوٹ پٹانگ حرکتیں دلچسپ تھیں ویسے ارینج میرج کا اپنا چارم ہوتا ہے ہماری فیملی میں بھی ٹوٹل ارینج میرج ہوتی ہے میری سسٹر رضوانہ ملک اور بہنوئی ابرار ملک نے بھی شادی والے دن ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

"تم آؤ تو عید کریں" سلطان کی صاف گوئی اچھی لگی لیکن کیا کریں جی آج کل کے دور میں منافقت' چاپلوسی پسند کی جاتی ہے۔ "راپنزل" شہرین کے لیے ہر بار دعا کرتے ہیں کہ ٹھیک ہو جائے' چلیں سمیع کی کچھ تو اپنی بیٹی سے انیچ منٹ ہوئی۔ نیناجی کی ناراضی کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی کہ کیوں زچ کرتی ہے ماں باپ کو' زری میرا نہیں خیال کہ اظفر کی حقیقت کو بغیر ٹھوکر کھائے قبول کرے گی۔

"میری عید تم ہو" سنا تھا کہ محبت کس بل نکال دیتی اور یہاں ولید کی حالت دیکھ کر یقین آگیا ویسے جنت نے کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی "خواب خواہش اور زندگی" رابعہ' شازیہ کی والدہ کی شادی کے حوالے سے گفتگو اچھی لگی رابعہ وقت پر سدھر گئی اچھا لگا۔ ماں باپ بہن بھائی ہی ہوتے ہیں جو نخرے برداشت کرتے ہیں اور لڑ جھگڑ کر پھر سے ایک ہو جاتے ہیں۔

"دست مسیحا" مائی فیورٹ ناول جس کا شدت سے انتظار ہوتا ہے موحد نے بالآخر اظہار کر ہی دیا۔ "اے جذبہ دل" شانہ شوکت جی آپ کا ناولٹ زبردست تھا روبیلہ اور مشعل کی دوستی اچھی لگی کیونکہ آج کل دوستی جیسے خوب صورت رشتے میں Sincerity (مخلص) کی جگہ حسد نے لے لی ہے۔

"اہل وفا کی دھوم" پریشے نے بالآخر حنان کے رویے نے درست فیصلہ کروا ہی لیا۔ "کرن کرن خوشبو" کرن کا دسترخوان ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا کرن کتاب مجھے آپ کی طرف سے خوب صورت گفٹ محسوس ہوتی ہے اس بار لاجواب بھی۔ دلہن کے میک اپ' ڈریسز سب کمال کے تھے میں چاہتی ہوں آپ کرن میں ایک سلسلہ شروع کریں جس میں ہم کرن کے قارئین اور اپنی فیملی کے لیے پیغام بھیج سکیں تاکہ کرن کے قارئین کے درمیان بھی دوستی کا رشتہ استوار ہو سکے۔

ج : طاہرہ جی! ہماری طرف سے رضوانہ ملک کو سلام۔ ادمان میں وہ یقیناً "کرن کی کہانیاں پڑھ رہی ہوں گی۔ کہانیاں پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ آپ نے ایک اچھا مشورہ دیا ہے ہم اس پر غور کریں گے اور اگر ممکن ہوا تو ضرور شروع کریں گے یہ سلسلہ۔

اریبہ گل..... چیچہ وطنی

جولائی کے شمارہ عید کے بعد ہاتھ لگا۔ خوب صورت لباس میں تیکھے نقوش والی ماڈلز نے سرورق کو سجا ہی دیا۔ "حمد اور نعت" سے مستفید ہوئے "منیب بٹ" سے ملاقات کر کے بہت اچھا لگا۔ "ملن کی پہلی عید" کیا زبردست تھا۔ بہت انجوائے کیا' سیلبریٹیز کی عید کا جان کر۔ ناول میں "من مورکھ کی بات" اور "راپنزل" اچھے جا رہے ہیں۔ مکمل ناول بھی ٹھیک رہے اس دفعہ ناولٹ میں "تم آؤ تو عید کریں" واہ! مہوش افتخار نے "سنگ پارس" میں کیا خوب الفاظ کا چناؤ کیا۔ یہ دونوں ناولٹ بہت خوب رہے۔ افسانوں میں "وصل جاناں" مصباح علی نے بہت خوب صورتی کے ساتھ اختتام محبت کی خوشبو پر کیا۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح شاندار ہے۔ کرن میں بہت سی چیزوں میں بہتری آئی ہے۔ دعا ہے خدا

اسے دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے (آمین) مجھے ایک شکایت ہے کہ ہمیشہ کیوں میرا ہی خط شائع نہیں کیا جاتا؟ دیکھیں کیا اب کی بار بھی یہی ہوتا ہے یا نہیں مجھے ایک چیز کی اجازت درکار ہے کہ میں کرن کے لیے اپنا افسانہ بھیج سکتی ہوں؟ جواب ضرور دیجیے گا۔

ج : اریبہ جی! آپ کو کرن میں تبدیلی آئی محسوس ہوئی۔ یہ جان کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ آپ لوگوں کے مشورے اور آراء سے ہی ہم کرن کو بہتر سے بہتر کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ آپ کو جو گلہ ہے ہم سے کہ آپ کا خط شائع نہیں ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا خط ہمیں موصول ہی نہیں ہوا پہلے۔ آپ افسانہ بھیج سکتی ہیں۔ اگر قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع کریں گے۔

ثناء شہزاد..... کراچی

ماڈل دونوں بہت پیاری لگ رہی تھیں اداریہ اور "حمد و نعت" پڑھ کر سب سے پہلے "دست مسیحا" پر انٹری دی۔ نگہت سیما بہت عمدگی سے کہانی کو آگے بڑھا رہی ہیں پچھلی قسط میں مجھے صرف یہ اندازہ ہوا تھا کہ ہشام اور موحد دونوں بھائی ہیں کیونکہ دونوں کی ماں شہرین ہے اب کی قسط میں دونوں کزن نکلے رحمٰن ملک اور ڈاکٹر عثمان دونوں سگے بھائی ہیں اور "راپنزل" میں شہرین کے لیے خود بخود دل سے دعا نکلتی ہے۔ سمیع اس کی جدائی برداشت نہیں کر پائے گا کتنی تڑپ دکھائی ہے سمیع کی محبت میں اپنے رب سے گڑگڑا کر شہرین کی زندگی مانگ رہا ہے اللہ پاک اس کی دعا قبول کرلیں "اور بے پیا" نادیہ احمد نے کیا زبردست لکھا ہے۔ سکندر جیسا ظرف بھی ہر کسی میں نہیں ہوتا میں تو حیران رہ گئی کوئی مرد اتنا وسیع دل اور ٹھنڈے مزاج کا بھی ہو سکتا ہے۔ رباب کی ہر غلطی کو اس نے معاف کر دیا۔ "من مورکھ کی بات" میں حازم اور حوریہ کا نکاح ہو گیا بہت خوشی ہوئی بس بابر حوریہ کی زندگی میں زہر نہ گھولے اور حوریہ کے ساتھ وہ سب نہ ہو جو مومنہ کے ساتھ ہوا تھا۔ مومنہ کے خدشات غلط ثابت ہو جائیں۔ "سنگ پارس" پر ابھی تبصرہ محفوظ ہے اگلے ماہ کروں گی۔ شبانہ شوکت کا "اے جذبہ دل" شاندار تھا۔ روبیلہ کی منگنی جدید سے ہوئی اور منگنی والے دن جدید کو مشعل پسند آگئی ویسے دوستی ایسی ہونی چاہیے جیسے روبیلہ اور مشعل کی تھی۔ میری اور نوشین کی دوستی بھی ایسی ہے "میری عید تم ہو" جنت نے ولید کو خوب سبق سکھایا ہر کلی کے پیچھے بھاگنے والا بھنورا جنت کی محبت میں گرفتار ہو گیا "تم آؤ تو عید کریں" رابعہ افتخار نے بھی اچھا لکھا۔ سلطان جیسے سچے اور کھرے لوگ اس دنیا میں ہیں مگر آٹے میں نمک کے برابر۔ افسانے چاروں بہترین تھے "محبت برسا دینا" میں مومنہ کے اوٹ پٹانگ سوالوں پر ہنسی آئی۔ "وصل جاناں" مصباح علی نے بھی اچھا لکھا شکر ہے امروز وقت پر آگیا اور میرو کا محبت پر جو یقین تھا وہ ٹوٹا نہیں "اہل وفا کی دھوم" میں جاذب کے جذبوں نے اپنا آپ منوا ہی لیا۔ پریشے کو جاذب ہی ملنا تھا۔ بشریٰ ماہا کی تحریر "خواب خواہش اور زندگی" زبردست تھی۔ شازیہ کو صحیح سبق مل گیا مگر شعر لینے تو آجاتا اسے عید کے حوالے سے سروے میں سب کے جواب اچھے تھے۔ مستقل سلسلے تمام کے تمام اے ون تھے۔ آخر میں آپ سب کو جشن آزادی بہت بہت مبارک ہو۔

ج : ثنا جی! کرن پسند کرنے کا بہت شکریہ آپ تو ہماری مستقل ممبر ہیں "نامے میرے نام" کی صفحات کی کمی کی وجہ سے کبھی کبھی ہمیں طویل خط کو مختصر کرنا پڑتا ہے تاکہ ہماری سب بہنیں اس محفل میں شامل ہو جائیں۔ یہ ہماری مجبوری ہے جس کے لیے ہم بہنوں سے معذرت خواہ ہیں۔

راہین ناصر..... راولپنڈی

اس بار ہم سب کزنز نے نانو کے گھر اسلام آباد جا کر عید منانے کا پروگرام بنایا تھا۔ یقین مانیں ایسا جو مزا مل کر

اعتذار

آسیہ مرزا علالت کے باعث "من مورکھ کی بات نہ مانو" کی قسط نہ لکھ سکیں۔ اس لیے اس ماہ "من مورکھ کی بات نہ مانو" کی قسط شامل نہیں ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ بہنیں قسط پڑھ سکیں گی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ڈائجسٹ پڑھنے کا ہے وہ تنہا ہوسٹل میں بیٹھ کر دور ازانہیں آتا۔ ہم نے تین منگوائے اور مل کر پڑھے۔ پھر خوب کہانیوں کے بخیے ادھیڑے اور اپنی مرضی سے سلائی کی۔ واہ بھئی مزا دوبالا ہو گیا۔ ہمارے ماموں زاد کہنے کو تو لڑکے ہیں مگر ڈائجسٹ پڑھنے میں لڑکیوں کو بھی مات دے جاتے ہیں۔ ایسے ایسے تبصرے کیے کہ آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

سب سے پہلے ذکر کروں گی مکمل ناول کا "دست مسیحا" نگہت جی کا وہ میری موسٹ فیورٹ ہیں۔ جتنے حساس موضوع کو باخوبی وہ نبھاتی ہیں۔ شاید کوئی دوسرا لکھ سکے۔ ناولٹ اچھے تھے سب سے زیادہ رابعہ افتخار کا "تم آؤ تو عید کریں" مجھے نمرہ اور سلطان کی دوری کا بہت دکھ ہوا اور سلطان کی سچ بولنے کی عادت ارے واہ۔ ویری گڈ رابعہ۔ "سنگ پارس" تو ابھی لمبا ہی چلے گا اگلے خط میں رائے دوں گی۔ افسانوں میں "وصل جاناں" مصباح علی کا No.1 لو اسٹوری جیت گئیں۔ ویسے آپ نے افسانے پر ہی ٹرخا دیا۔ "فصیل دل" جیسا ناول لے کر حاضر ہوں سائڈی فریش سے "خواب 'خواہش اور زندگی "بشریٰ باہا نے سادہ سے پیرائے میں بہت اچھا اور سبق آموز لکھا۔ ایسے لگا قلم اٹھائے بنا رانی اور شازی کی باتیں لکھتی جارہی ہیں۔ ابھی تو شکر ہے رانی جیسی مغرور لڑکی بغیر خاص سزا کے ٹھیک ہو گئی۔ مستقل سلسلے سارے اچھے تھے۔ فرحت عباس شاہ کی نظم بہت اچھی لگی۔ اس ماہ نیب بٹ سے ملاقات ارے واہ جی مزا آگیا۔ بڑا انتظار تھا ان کا۔

میں نے ایک کتاب منگوانی ہے "دست کوزہ گر" اس کا منی آرڈر آپ کے نام پر بھیجنا پڑے گا یا مکتبہ عمران ڈائجسٹ کے نام۔

ج : رامین جی! آپ سب کزنز نے مل کر کرن پڑھا واقعی میں اچھی سنگت بھی انسان کے لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ لیکن ہمیں آپ سے ایک شکایت ہے اگر آپ تھوڑے سے وہ تبصرے بھی ہمیں بھیجتیں جو آپ کے کزنز نے کیے تھے تو ہمیں بھی اور مزا آتا۔ اب کرن کے نمبر پر فون کر لیجئے گا ناول منگوانے کے لیے آپ کو بتا دیا جائے گا۔

فوزیہ ثمریٹ 'فاطمہ 'ہانیہ 'عمران ...... گجرات

عید کے حوالے سے سرورق اچھا لگا۔ ماڈل کے ڈریس اور بیوٹی اسٹائل بہت پیارے لگ رہے تھے ہاتھوں پر مہندی دونوں نے نہیں لگائی کیوں؟

"حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول ہمیشہ کی طرح دل و دماغ کو تر و تازہ کرتی ہیں۔ انٹرویو میں "نیب بٹ" سے ملاقات اچھی رہی۔ میری بھی سنیے ثنا لے سرحدی سے ملاقات مزے کی رہی۔ ثنا لے ویسے کامیڈی اداکاری میں اچھی لگتی ہیں۔

"ملن کی پہلی عید" بہت اچھا لگا اپنے سبھی فیورٹ اداکاروں کی عید کی خوشیاں پڑھ کر۔ خاص تحفہ عید کا صائمہ اکرم کا لگا۔ پیارا اکپل۔

"مقابل ہے آئینہ" قرۃ العین عینی کی باتیں بھی خوب لگیں۔ میرے خیال میں اس سلسلے کو ابھی جاری رہنا چاہیے۔

میں فہرست کے مطابق کرن ڈائجسٹ پڑھتی ہوں کیونکہ ایک نشست میں پڑھنا کبھی نصیب ہی نہیں ہوا۔ کوئی نہ کوئی منتظر یا پھر میرے پیارے بیٹے ہادی حسن کی فرمائشیں۔

سب سے پہلے "من مور کھ" کی بات کہہ دوں اس بار کی قسط سو سو رہی۔ جہاں عباد گیلانی کو اب پچھتاوے پریشان کر رہے ہیں۔ وہاں حازم کی خوشی عباد گیلانی کے خوشی کا باعث ہے۔ حوریہ کا حال مومنہ کی طرح نہیں ہونا چاہیے۔ اینڈ اچھا ہوا قسط کا۔

"وصل جاناں" ابتدائی فقرے متاثر کن تھے۔ میرو اور مروز کی لازوال محبت جیسے زمانے کے ظالم سماج والے بھی ختم نہ کر سکے۔

"اور ے پیا" تھوڑی اچھی لگی شکر ہے یہ وڈیروں اور حویلیوں کے رہنے والوں کی اسٹوری جدائیوں اور قتل و غارت پر ختم نہیں ہوئی۔ ایک ہیپی اینڈ ہمارے ذہن کی بس غلط فہمی کو دور کر گیا۔

اللہ کتنے شوق سے "سنگ پارس" پڑھا جا رہا تھا۔ کہ پھر سے باقی آئندہ ماہ ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ مجھے لگتا ہے۔ نوفل بھی تک بے خبر ہے کہ طوبی کے والد نے اس کے والد کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ سچ ہے یہ لالچ انسان کو لے ڈوبتا ہے۔ ہوس ہر چیز کی برباد کر دیتی ہے۔ لگتا ہے نگین طوبی کے مقابل آنے والی ہیں۔ دیکھتے ہیں۔ اگلی قسط میں کیا ہوتا ہے۔

"محبت برسا دینا" صائمہ جی کی یہ کاوش اچھی تھی تھوڑا سا ڈرامہ ٹچ لگا پھر۔ بھی مزا آیا پڑھ کر۔ کبھی کبھی ایسا ایڈونچر زندگی میں چینج لاتا ہے عید کے حوالے سے یہ اچھی تحریر تھی۔

ناولٹ "تم آؤ تو عید کریں" شروع کی شاعری اچھی تھی۔ پھر ہماری تحریر مزے کی لگی پہلے تو لگا سلطان کوئی بی جمالو ٹائپ شوہر ہیں جیسے سسرال میں لگائی بجھائی کی عادت ہے۔ یہ ہماری تحریر پڑھ کے واضح ہوا کہ وہ تو اپنی اچھی عادت کے مطابق سچ بولتا ہے اور ڈنکے کی چوٹ پر بولتا ہے۔ پر افسوس ہمارے معاشرے میں ایسا انسان کو جو منہ پر سچ بولے۔ اسے بدزبان اور بدلحاظ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بڑی ہنسی آئی تھی جب سچ بول کے سب بے چارے کو سب کی سننی پڑی تھی۔

ویسا ایسا شوہر تھا جو اپنا حق لینا اور دینا دونوں ایمانداری سے پورا کرتا رہا اور ایسے لوگوں کی زندگی میں آسانیاں اللہ پاک کر دیتے ہیں۔ یہ بھی ہمیں عید کی وصولی ہی لگا کرن کی طرف سے۔

"راپنزل" چلو جی کاشف پھر ایک بیٹی کا باپ بن گیا۔ کیا اب بھی اس کے سدھرنے کے چانس ہے یا پھر ایسا ہی رہنا ہے اس نے۔ اس سے تو اچھا ہے حبیبہ سے شادی کر لے۔ شہرین کا آپریشن کامیاب ہونا چاہیے۔ سمیع بے چارہ تو مر جائے گا شہرین کے بغیر۔

نیبنا اور سلیم کی ملاقات میں دونوں کی نوک جھونک زیادہ ہونی چاہیے۔ یہی تحریر کا زندہ دل کردار ہے۔ "میری عید تم ہو" جنت نے تو اچھا سبق دیا۔

"خواب خواہش اور زندگی" ایک منفرد لڑکی کی کہانی۔ ضروری نہیں آنکھیں جو خواب بنیں تعبیر بھی آپ کی مرضی کی ملیں۔ صد شکر رابعہ کو ایک ہی جھٹکے میں سمجھ آ گئی۔ کہ دولت سے زیادہ زندگی میں رشتوں کی اہمیت زیادہ ہے۔

"دست مسیحا" کو میں نے چھوڑ دیا پہلی اور لاسٹ قسط اکٹھی پڑھ کے رائے دوں گی۔ کیونکہ سب قارئین بہن کہہ رہی ہیں اچھی تحریر ہے تو میں ایویں ہی دیکھ کر رونا ڈال دوں نہیں اچھی لگ رہی۔ ہاں ناں دوبارہ سے پڑھ لوں گی۔ شاید میرا بھی دل متفق ہو جائے اس بارے میں "اے جذبہ دل" میرے خیال میں ابن ماہ کی بیسٹ تحریر۔ کافی کامیڈی تحریر تھی۔ رومیلہ اور ہادی کی جوڑی خوب لگی۔

"اہل وفا کی دھوم" چلو جی ایک بات تو پکی ہو گئی کہ بنت سحر صرف درد کے نوحے نہیں لکھتیں وہ دوسروں کو ہنسانے کے کام بھی کرتی ہیں۔ اچھی لگی یہ تحریر۔ کافی مزاحیہ لکھا ہے۔ میرے خیال میں ایک آدھ مہینے آپ کی تحریر ایسی ہو جانی چاہیے اچھا لگا بنت سحر یہ کوشش جاری رکھنا۔

"مجھے یہ شعر پسند ہے" فرسٹ کا شعر اچھا تھا۔ "مائے میرے نام" ثمینہ اکرم کا خط کوثر خالد کی طرح اچھا اور مثبت ہوتا ہے پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ میرے ابو جی کا نام بھی اکرم تھا۔ ثمینہ جی آپ کے بیٹے معیز کی وفات 11 نومبر ہے اور میرے ابو جی کی 12 نومبر۔ جب میں ان کو قرآن پاک بخشتی ہوں تو آپ کے بیٹے کو بھی ثواب بھیجتی ہوں اللہ پاک سب مرحومین کی بخشش فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔

ج : فوزیہ ثمر جی! ہمیشہ کی طرح آپ کا خط بہت دلچسپ ہے ہمیں آپ کا خط پڑھ کر ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ سچے دل سے اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں۔ جو پسند آتا ہے اس کا بھی لکھتی ہیں اور جو ناپسند ہوتا ہے اس کے بارے میں بھی آگاہ کرتی ہیں۔ آپ اسی طرح خط لکھتی رہیں۔ کرن کتاب کے بارے میں جو آپ نے خواہش ظاہر کی ہے اسے پورا کرنے کی ہم ضرور کوشش کریں گے۔

اسماء سیف اللہ ...... چکوال

آج مجھے خط لکھنے کی توفیق موسم کی خوشگواریت کی وجہ سے ہو گئی۔ کہانیوں پر رائے دینے کا الگ ہی لطف ہے اور میں لطف اندوز ہو رہی ہوں۔ تنزیلہ آپی کا ناول بہت مزے سے آگے بڑھ رہا ہے۔ کاشف اور حبیبہ کو بیٹے کو دل کرتا ہے۔ شہرین کی صحت کے لیے دل سے دعائیں ہیں۔ آسیہ مرزا جاندار لکھ رہی ہیں جہاں نگہت سیما نے ماؤں کے دو روپ دکھائے۔ وہاں نیا شروع ہونے والا "سنگ پارس" میں مہوش نے دوستی کا بہروپ دکھا دیا۔

ناولٹ میں بشریٰ گوندل کا اچھا تھا۔ شبانہ شوکت کا "جذبہ دل" خاصہ ڈرامائی انداز لگا۔ مصباح علی میری فیورٹ بن گئی ہیں۔ اور بنت سحر بھی پیچھے نہیں رہیں۔

بشریٰ ماہانیا اضافہ اچھا لگا۔

ج : اسماء جی چلیں آپ نے خط تو لکھا موسم کی خوش گواریت کی وجہ سے ہی سہی۔ آپ کی محفل میں آمد کا بے حد شکریہ۔

زیبی ..... گوجر خان

ہماری عید کرن کے ساتھ خاص مزے کی گزری۔ اس کی ریسیپی بنا بنا کر کھائیں اور سب کو کھلا کر اپنے سگھڑ ہونے کی شاباش لی۔

مجھے ساری کہانیاں بہت پسند آئیں۔ میں سب کی نسبت بہت کم نقص نکالتی ہوں آخر بھئی جس نے لکھا ہے بہت محبت اور کوشش سے لکھا ہے۔ سلسلے وار ناول میں مجھے آسیہ مرزا بہت پسند ہیں۔ اللہ انہیں اور حسن قلم دے۔ مکمل ناول دونوں اچھے تھے۔ ناولٹ میں شبانہ شوکت کا "اے جذبہ دل" زیادہ پسند آیا۔ افسانہ مصباح علی کا "وصل جاناں" بیسٹ رہا۔

اس بار جو خاص بات لگی وہ یہ کہ اکثر کہانیوں میں گانے کے بول یا شعر تھے۔ مجھے ایسی کہانیاں پسند ہیں جن میں اشعار بھی ہوں۔ باقی اللہ آپ کے ادارہ کو خوب ترقی دے۔ (آمین)

ج : زیبی جی' یہ ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے کرن کے دسترخوان استفادہ حاصل کیا۔ آخر یہ آپ سب کے لیے تو شائع کر رہے ہیں۔ کہانیوں کو پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ ایک گزارش ہے کہ بے شک رائٹرز بہت محنت سے لکھتے ہیں لیکن پھر بھی آپ کو کوئی کہانی پسند نہ آئے تو ہمیں ضرور آگاہ کیجیے تاکہ ہم "کرن" کو آپ کی پسند کے مطابق ترتیب دے سکیں۔

زاہدہ حمایت اللہ ..... میانوالی

یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ رسالے کی ترتیب بہت خوب تھی سب سے پہلے فہرست میں اپنی تینوں پسندیدہ مصنفین کے نام دیکھ کر سکون آگیا۔ کسی ایک کی تعریف دوسری کے احساسات مجروح کرنے کے مترادف ہے۔ تینوں ہی باکمال ہیں خاص طور پر "راپنزل" میں جب شہرین کو اپنی بیماری کا پتا چلا یقین مانیں میرے بھی آنسو چھلک گئے۔ تنزیلہ ہمیشہ بیسٹ لکھتی ہیں۔ آسیہ کی بات لفظوں میں لپٹ کر جہاں دل کو لگتی ہے وہاں نگہت سیما کو سمجھنے کے لیے کچھ دیر کی تنہائی چاہیے۔ میری ان تینوں بہنوں کو سلام۔

نادیہ احمد کا "اور رے پیا" شروع میں تحریر اچھی تھی لیکن آخر..... سکندر کا رد عمل کچھ بھایا نہیں سچی بات ہے۔ مرد بھلے کتنا ہی مصالحت پسند ہو لیکن اپنی بیوی کو یوں سر عام عاشق کے ساتھ بے حال ہوتے دیکھ کر ہونہہ۔ جو رد عمل رافع کا تھا وہ سکندر کا ہونا چاہیے تھا نہ کہ منہ میں گھنگنیاں ڈالے کھڑا رہے۔

چاروں ناولٹ میں موسیٰ افتخار کا "سنگ پارس" بازی لے گیا۔ موسیٰ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ حقیقتاً "بہترین دوست بھی مشکل وقت میں ساتھ چھوڑ جاتے ہیں جیسے طوبیٰ کے باپ نے نوفل کے باپ کا چھوڑا۔ کہانی کافی کھل چکی ہے' اگلی قسط شاید آخری ہو۔

شبانہ شوکت کا "اے جذبہ دل" نام سے تو 14 اگست کی لگ رہی تھی پر یہ کیا زیادہ ہی دل والوں کی لکھی۔

ہر طرح کا رکھ رکھاؤ بالائے طاق رکھ۔ جیسے بچے کھلونے بدل لیتے ہیں ویسے ہی کرداروں نے کیا۔ افسانے بھی چاروں اچھے تھے اور عید کے حوالے سے بھی..... مصباح علی کا "وصل جاناں" بہت زبردست تھا۔ بہت کم ہوتا ہے کوئی مصنفہ ہر موضوع اور ہر انداز میں اپنا رنگ جمالے۔ مصباح علی کی تنوع مزاجی اپنا رنگ جمانے میں کمال ہے ان سے کوئی بڑا سلسلہ لکھوائیں۔

بنت سحر بھی پیچھے نہیں رہیں۔ ان کے "اہل وفا کی دھوم" سنائی دی۔

صائمہ قریشی کی کوشش کو ویلکم کہوں گی۔ پہلی عید کے سروے میں بشریٰ انصاری نے صاف دامن چرالیا۔ البتہ صائمہ اکرم اور ندا یاسر کی یادگار شاپنگ ہمیں بھی یاد رہے گی۔

ج : کرن کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ آئندہ بھی اپنی رائے سے آگاہ کیجیے گا۔

✡ ✡